دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی

نومبر 2009

معراج رسول

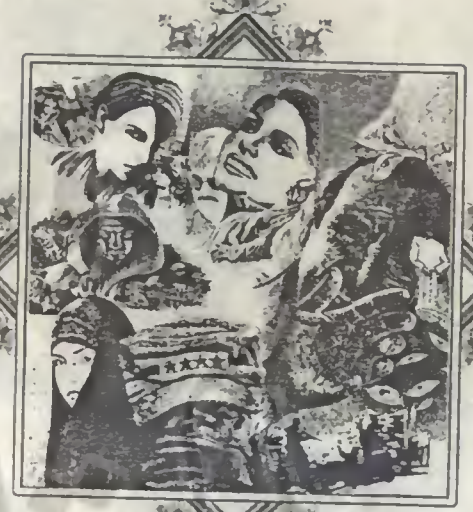

جاسوسی ڈائجسٹ

11 — چینی نکتہ چینی — مدیر اعلیٰ
قارئین کی کرم فرمائیاں کج ادائیاں نامہ و پیام محبتیں عنایتیں اور شکایتیں

18 — ریت کا دیا — اقبال کاظمی
آنکھوں کی زبان سے دل کی دہلیز پر رقم ہونے والے گلاب واقعات جو کبھی نہیں مرجھاتے

67 — فطرت — آصف ملک
ایک بچے کی محرومیاں... جس کی محبت دوست فطرت نے اس کی زندگی بدل ڈالی

79 — بارش — ڈاکٹر سلیم عادل
ایک خوبصورت دوشیزہ کے غیاب اور قتل کے پس منظر میں مخفی راز کی سنسنی خیز داستان

89 — خون آشام — ثمر عباس
اردگرد کے ماحول کو پراسرار بنا دینے والی غیر متوقع انجام کی کہانی

100 — گرداب — اسما قادری
تقدیر کی فسوں گری قسمت کی چیرہ دستی مقدر کا کھیل ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

141 — بڑا درندہ — محمد عمر نعمان
ایک درندے کا کھیل جس کے مقابل ایک بڑا درندہ تھا

155 — اختتامِ سفر — شکیل ادریس
موت کے سفر پر گامزن... زندگی کی تلاش میں سرگرداں ایک عورت کی جدوجہد

174 — بے سمت — کاشف زبیر
ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا... کی عملی تفسیر... ایک سنگ عنان کا کارنامہ

201 — اصل اہمیت — مریم کے خان
ان افراد کی عکاس تحریر جو وقت کو بہت قیمتی سمجھتے تھے

211 — تیرِ نیم کش — پروین زبیر
ایک پُرعزم نوجوان کے جذبات جو ایک سنسنی خیز اور پُرجوش زندگی کا خواہاں تھا

244 — تماشائے زر — سلیم فاروقی
سلیم فاروقی کے قلم کا شاہکار سُرخ رنگ آپ کے ذوقِ طبع کی نذر

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

جلد 38 • شمارہ 11 • نومبر 2009 • زرِ سالانہ 500 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 40 روپے • سعودی عرب 12 ریال یا مساوی
E-mail:jdpgroup@hotmail.com (021) 5802551 فیکس (021) 5895313 فون • 74200 خط وکتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

اس کے لہجے کی حدت سے آباد ہے میرا دل

میرے سامنے معراج صاحب کا ایک خط رکھا ہے۔ یہ کوئی اٹھارہ سال پرانا خط ہے۔ یہ خط سسپنس میں میری پہلی کہانی "انجان" کے حوالے سے لکھا گیا تھا۔ اس خط میں سارے ہی الفاظ چمکیلے اور یادگار ہیں...... لیکن ایک فقرہ بہت اہم ہے۔ "طاہر! تم میں خداداد صلاحیت ہے۔ لکھنا جاری رکھو۔"

لکھ تو میں تین چار سال پہلے سے رہا تھا۔ نوائے وقت سے آغاز کیا تھا پھر لاہور کے ایک دو ڈائجسٹوں میں بھی پذیرائی ملی...... لیکن معراج صاحب کے مندرجہ بالا فقرے نے میرے قلم کو ایک نیا حوصلہ اور توانائی بخشی۔ مجھے لگا میرے سامنے پُرتاثیر کہانیوں کا ایک انبار سا لگ گیا ہے۔ میرا قلم حرکت میں آیا اور لکھتا چلا گیا۔ یہ میرے قلم کو تھپکی تھی...... اس کے پیچھے توانائی اور محبت تھی۔ یہ تھپکی، توانائی اور محبت ایک ایسے قلم شناس نے دی تھی جو تخلیق کار کے اندر جھانک سکتا تھا۔ اس کی خوبیوں اور خامیوں کو سمجھتا تھا...... اور اس کو تخلیق کے لیے نہ صرف آسودہ ماحول فراہم کرتا تھا بلکہ اس کے ساتھ مل کر کہانی لکھتا بھی تھا۔

کہانی سے معراج صاحب کو بہت گہری دلچسپی رہی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ علالت سے پہلے وہ فی الواقع مدیر تھے اور تمام رائٹرز کی کہانیاں پڑھتے تھے۔ وہ لاہور آتے تو بھی عموماً ان کے ساتھ کہانیوں کا پلندا ہوتا تھا۔ ایک بار میرے ساتھ لاہور کے تفریحی مقامات دیکھ رہے تھے۔ ایک جگہ پارکنگ کے بغیر گاڑی کھڑی کرنا پڑی۔ کہنے لگے "گاڑی چوری کی تو زیادہ فکر نہیں لیکن اس کی ڈکی میں گاڑی کی مالیت سے زیادہ قیمت کی کہانیاں موجود ہیں۔"

لاہور میں ان سے جو ملاقاتیں ہوتی رہی ہیں...... وہ یادگار ہیں۔ ہر ملاقات ایک روشن روشن پُربہار واقعے کی طرح میرے ذہن میں تازہ ہے اور میرے قلم کے لیے طاقت کا سرچشمہ ہے۔ وہ اور بھابی عذرا رسول اکثر ہمارے گھر بھی تشریف لاتے رہے۔ معراج صاحب گھل مل جاتے اور اپنی محبت بھری باتوں سے مسحور کر لیتے۔ لاہور میں آفاقی صاحب اور مجھ سے ملنا...... اور پی سی ہوٹل کے آرام دہ کمرے میں بیٹھ کر ہر موضوع پر شگفتہ گفتگو ان کے لاہور ٹور کا خاص "ایجنڈا" ہوتا تھا۔

کوئی سات آٹھ سال پہلے کی بات ہے، معراج صاحب ہمارے ہاں تشریف لائے تو میری چھوٹی بچی جانے انہیں دیکھا اور بڑے بھائی کو جا کر بتایا کہ "ماتھے والے انکل جی" آئے ہیں۔ وہ بعد میں انہیں پیار سے "ماتھے والے انکل" ہی کہتی رہی۔ اگلی ملاقات میں میں نے بے ساختہ معراج صاحب کے ماتھے کو غور سے دیکھا اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ ننھی بچی کو معراج صاحب کا ماتھا ہی کیوں نظر آیا۔ بات سمجھ میں آنے لگی۔ اس ماتھے نے بچی کی توجہ کو بے وجہ نہیں کھینچا تھا۔ یہ ایک نہایت روشن ماتھا تھا اور اس کے پیچھے جو دماغ تھا وہ بھی روشن اور توانا تر تھا۔ ہمارے اردگرد بے شمار ایسے لوگ ہیں جو بغیر ماتھے کے ترقی کی منزلیں طے کرتے ہیں۔ کیسے کرتے ہیں؟ یہ میں اور آپ سب جانتے ہیں مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو پہلے زینے سے بلند ترین زینوں تک پہنچنے کے لیے ساری درکار توانائی اپنی عالی دماغی اور خداداد صلاحیتوں سے حاصل کرتے ہیں۔ یقیناً ہمارے معراج صاحب بھی ان میں سے ایک ہیں۔

جب پہلی بار میں نے ماتھے والے معراج صاحب کو دیکھا تو ان کی دبنگ شخصیت کو دیکھ کر یہی لگا کہ وہ بہت بارعب اور نو دی پوائنٹ قسم کی گفتگو کریں گے۔ ویسی ہی گفتگو جو اسٹاک ایکسچینج کے اتار چڑھاؤ اور دیگر کاروباری اعداد و شمار کے بارے میں کی جاتی ہے۔ گفتگو کرتے ہوئے بار بار گھڑی دیکھی جاتی ہے اور طویل سوالوں کے مختصر جواب دے کر اپنی توانائی اور وقت کے سود و زیاں کا خیال رکھا جاتا ہے...... لیکن جب معراج صاحب کو جاننے پہچاننے کا عمل شروع ہوا تو پتا چلا کہ اس بظاہر باتکلف انسان کے اندر ایک نہایت گداز، مہربان اور رومانی شخص پوشیدہ ہے۔ ان کی گفتگو کے بیشتر دریچے ماضیٔ بعید کی طرف کھلتے تھے...... جہاں بچپن کی گلیاں تھیں، لڑکپن کی بہاریں تھیں اور بدلتے موسموں کے رنگ تھے۔ ماضی میں ان کی دلچسپی کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ معراج صاحب چاہتے تو خود بھی بہت اچھا لکھ سکتے تھے۔ کہانی کیا ہے؟ ماضی کی تصویر کشی ہی تو ہے۔ یقینی بات ہے کہ اگر معراج صاحب نے "لکھوانے" میں معراج حاصل کی تو لکھنے میں بھی معراج حاصل کر سکتے تھے۔ ہم جیسے قلم کاروں کو کہیں پیچھے چھوڑ سکتے تھے۔

وہ کہانیوں میں رہے اور خود بھی ایک کہانی ہیں۔ محنت، محبت اور برداشت کا درس دیتی ہوئی ایک بے مثال کہانی۔ اس کہانی نے اپنے گرد و پیش کو بے شمار خوبصورت و توانا جذبوں سے آشنا کیا ہے اور اب بھی کر رہی ہے۔ ہر کہانی کا ایک اختتام ہوتا ہے...... لیکن کچھ کہانیوں کے بارے میں دل چاہتا ہے کہ وہ اپنی تمام تر خوبصورتیوں کے ساتھ کبھی ختم نہ ہوں۔

میرا بھی یہی دل چاہتا ہے۔ میرے سامنے ٹیلی فون رکھا ہے۔ دل کرتا ہے گھنٹی بجے...... میں ریسیور اٹھاؤں تو دوسری طرف سے روشن ماتھے والے معراج صاحب کی آواز آئے۔ "ہاں بھئی طاہر! کہاں ہو؟ میں پی سی پہنچ گیا ہوں۔ بھئی تمہارا لاہور تو آگ اگل رہا ہے۔ سڑکیں انگارہ ہو رہی ہیں لیکن خیر، شام کو تو موسم اچھا ہوگا آفاقی صاحب بھی آ جائیں گے۔ نہر کے ساتھ ساتھ گاڑی میں ذرا گھومیں گے۔ سنا ہے نہر آج کل پھولوں سے لدی ہوئی ہے؟"

ہاں معراج صاحب! نہر پھولوں سے لدی ہوئی ہے
نیالے پانی پر خوش رنگ کشتیاں تیرتی ہیں
لیکن آپ کہاں ہیں؟

آپ یہاں سے دور ایک بستر پر خاموش لیٹے ہیں۔ سب کچھ دیکھ رہے ہیں، سُن رہے ہیں...... لیکن بولتے کچھ نہیں۔ آپ نے بولنا چھوڑ دیا ہے۔ آپ تو بہت اچھا بولتے تھے۔ مسحور کر لیتے تھے۔ آپ نے کیوں سماعتوں کو ویران کیا؟ چلیں جو بھی ہے۔ یہ احساس تو موجود ہے کہ آپ ہم سب کے درمیان ہیں اور سیانے کہتے ہیں جب تک سانس تب تک آس۔ ہماری آسیں بھی برقرار ہیں اور ان میں سے ایک آس یہ بھی ہے...... چمکیلی شام...... نہر کا کنارہ...... پھولوں سے لدا ہوا راستہ...... اور ایک خوشبودار سفر......"

طاہر جاوید مغل

چینی، نکتہ چینی

مدیر اعلیٰ

عزیزانِ من...... السلام علیکم

۲۰۰۹ء کے گیارھویں ماہ کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ عزیز دوستو! زمانہ معلوم کی تاریخ سے عصرِ حاضر تک کا جائزہ لیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کو اپنے اشاروں پر چلانے والوں نے بے بسوں پر اپنی حکمرانی قائم رکھنے کے لیے نت نئے اصول تراشے۔ دنیا پر اپنی فتح کے جھنڈے گاڑنے والے سکندرِ اعظم کے پیش رو فتح کے خمار میں اب تک وہی کیے چلے جا رہے ہیں جو ان جیسے پہلے کر چکے ہیں...... خاک، خون، لاشیں اور گھروں سے محروم مجبور لوگ...... سب "انمول تحفے" ہیں ان نظاموں کے جن کی پشت پناہی پر حکمرانی کی خواہش موجود رہی ہے۔ دنیا میں کتنے نظام دیکھے...... حکمران کے نفاذ میں ہمیشہ انسان...... اور انسانیت کی پامالی کا سفر اب تک جاری ہے...... ٹی وی یا اخبار میں بے گور و کفن لاشیں آج کی کہانی نہیں سناتیں، سطوتِ شاہی اور شوقِ حکمرانی کی صدیوں پرانی داستان بیان کرتی ہیں...... جہاں جلال شاہی کی بنیادوں کو مضبوط بنانے کے لیے یہ گوشت پوست کے انسان ہمیشہ گارے مٹی کا ہی کام دیتے رہے ہیں...... اشتراکیت، سرمایہ داری اور مذہب کے نام پر صرف اور صرف انسانیت لہولہان ہو رہی ہے۔ ان دل گرفتہ باتوں کے باوجود دل میں کہیں تمنا ہے مونی جم لو ہے...... جو ناامید نہیں ہونے دیتی...... کاش! ایسا ہو کہ کوئی اٹھے اور دنیا پر انسانی عظمت اور علم کا پرچم لہرانے کے لیے لشکر کشی کرے۔

آیئے اب رخ کرتے ہیں اپنی محفل باؤ ہو کا جہاں شگفتگی ہے، زندگی ہے اور ترنگ ہے۔

نوشی چودھری کی باتیں حافظ آباد سے "ہر دفعہ کی طرح اس بار بھی جاسوسی ڈائجسٹ معطر ہوا کے جھونکوں کی طرح ڈاک سے واپسی پر خوش گوار صبح کو موصول ہوا۔ سرورق سے لے کر پس ورق تک نہایت دیدہ زیب اور دل فریب سے مسحور کن احساس نے مسحور رکھا۔ سرورق سے لطف اندوز ہونے کے بعد چھ مد اشتہارات کو بے ثباتی سے رد کرتے ہوئے ہم نے فہرست کا جائزہ لیا جہاں ہمارے پسندیدہ رائٹرز طمطراق سے براجمان ہیں۔ فہرست سے سیدھے محفل کا رخ کیا اور اپنی چشم بے تاب سے خود کو تلاشا۔ تلاش آخری صفحے پر جا کے تمام ہوئی تو اطمینان بھری سانس لینے کے بعد اداریے سے مستفید ہوئے۔ نور الہدیٰ عرصے بعد تشریف لائی ہیں۔ ویلکم بیک۔ فور ڈیئر، آپ بھی ان نامور تبصرہ نگاروں میں شامل ہو جن کے مدلل و چٹ پٹے تبصرے پڑھ پڑھ کر ہمیں بھی لکھنے کی تحریک ہوئی۔ سو تھنکس ہماری خوابیدہ صلاحیتوں کو بے دار کرنے کے لیے۔ کبیر عباسی صاحب دوسروں کو نشانہ بناتے وقت یاد رکھا کریں کہ ہر عمل کا ردِعمل بھی ہوتا ہے۔ ندا مثل یار اتنی جلدی ہار مان کے صنفِ نازک کو شرمندہ تو نہ کرو۔ چاچا انجم نجوی نے لگتا ہے اقبال کا شعر پڑھ لیا ہے کہ خودی کو کر بلند اتنا... مصدق صاحب آخر صنفِ نازک کے تبصروں سے ہی کیوں آپ کو کبھی خوشبو اور کبھی دل کو سکون ملتا ہے؟ شان احمد گنگوری حد کر دی آپ نے۔ آپ تو ہمارے انکل کو خوشامد پسند قرار دے گئے۔ آپ پر تو دفعہ 302 لگنی ہی چاہیے کیوں انکل؟ فاطمہ گل کاش آپ کو میری کمی محسوس نہ ہوئی ہوتی۔ رضوان صاحب آپ کے کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے، گلاب کو کسی بھی نام سے پکارو وہ گلاب ہی رہتا ہے۔ حسینہ صاحبہ یہ تو مرد حضرات کے جملہ خصائل ہیں۔ آپ اسے اتنا سنجیدہ کیوں لے رہی ہیں؟ فارگیٹ اٹ۔ کہانیوں میں اس دفعہ گرداب کا عمو قدرے سلو رہا۔ جو شیلے شہریار صاحب بہ خوشی چودھری افتخار کے بچھائے ہوئے جال میں جا پھنسے۔ مرنے والی یقیناً ماہ بانو نہیں ہوگی۔ دیکھتے ہیں اساجی ماہ بانو کو کیسے بچاتی ہیں۔ پرواز کا اینڈ پا کر ہمیں خوش گوار سی حیرت ہوئی۔ اختتام ہماری سوچوں سے قدرے مختلف افسردہ سا رہا۔ بلقیس صاحبہ ملکِ عدم سدھاریں اور خاور صاحب بڑھاپے میں بھی عشق جواں رکھتے ہیں۔ کہانی میں کوئی خاص دم خم نہیں تھا۔ کاشف زبیر صاحب جلیل اور شامی دونوں کے ساتھ تشریف لائے۔ محبت، دولت اور راجا میں جلیل صاحب کوئی خاص کارنامہ سرانجام نہ دے پائے، کچھ خاص مزہ نہیں آیا۔ دوسرے رنگ تلاشِ گمشدہ میں اس دفعہ شامی کے بجائے تیمور صاحب سرگرم نظر آئے۔ کہانی سو سو تھی۔ پہلا رنگ دنیا گول ہے، لکھ کر احمد اقبال صاحب نے ثابت کیا کہ استاد آخر استاد ہوتا ہے۔ بہت زبردست اور سبق آموز تحریر تھی۔ ترجمہ شدہ تحاریر میں وقت کا قیدی عجیب سی تحریر تھی جس میں خاصے جھول تھے لیکن کارل کا انجام پسند آیا۔ مریم کے خان کی جہد بقا جدائی، تنہائی اور انتظار کا مرکب تھی اچھی تحریر تھی۔"

مانسہرہ سے ڈاکٹر نعیم اکبر سحر کے خیالات "جاسوسی کے سرورق سے افق پر ٹائٹل گرل کی تعریف نہ کرنا یقیناً زیادتی ہوگی۔ میں اگر شاعر ہوتا تو اس کاغذی حسینہ کے حسن میں اگر کوئی دیوان نہیں تو کم از کم ایک آدھ "قصیدۂ حسن" ضرور لکھ مارتا۔ اگر ذاکر انکل اس حسینہ کے کان بھی بنا دیتے یا لگا دیتے تو یہ حسینہ بکھری بکھری کے بجائے نکھری نکھری دکھائی دیتی۔ دوسری بات کہ ٹائٹل گرل کی دائیں آنکھ مصنوعی دکھتی ہے۔ ممکن ہے یہ میری نظر کا قصور ہو یا فتور ہو دماغ کا۔ مگر سچ کہنے سے باز نہیں آ سکتا۔ چینی، نکتہ چینی میں تمام تبصرے بور اور پھیکے محسوس ہوئے۔ آخرکار پرواز ختم ہی گئی اور بڑی جلدی ختم گئی۔ طاہر جاوید مغل صاحب! آپ اپنی تحریروں کے حوالے سے میری بستیِ دل کے مکین ہیں۔ ہر فیلڈ میں کوئی نہ کوئی اسپیشلسٹ ہوتا ہے۔ میری نظر میں آپ پنجاب کے دیہاتی پس منظر میں خوب صورت جذبوں سے مزین کہانیاں لکھنے کے اسپیشلسٹ ہیں۔ خدانخواستہ مقصد یہ نہیں کہ آپ کی اور کہانیاں جو اس تھیم سے ہٹ کر لکھی گئی ہیں، وہ اچھی نہیں ہیں... نہیں نہیں، وہ بھی اچھی ہیں مگر مخصوص فیلڈ میں جب آپ کا قلم چلتا ہے تو گویا کیا مثال دوں! حقیقت کا گمان ہوتا تو ایک ادنیٰ سی تشبیہ ہے۔ درحقیقت اپنے جسم و جان کا حصہ محسوس ہوتے ہیں تمام کردار۔ میرا پُرزور اصرار ہے کہ اسی تھیم کے ساتھ، انہی پاکیزہ جذبوں سے لبریز کوئی تخلیق آپ کی جانب سے ہمیں جلد از جلد پڑھنے کو ملے۔ آخر یہ اصرار کرنا ہمارا حق ہے کہ ہم جناب کے پنکھے ہیں۔ وقت کا قیدی، ثمر عباس صاحب نے بتایا کہ کم ظرف کو، اس کے ظرف سے بڑھ کر اگر اختیار مل جائے تو وہ ایسی مصیبتوں کا شکار ہوتا ہے۔ اسما قادری کا گرداب تو اے سی شہریار کو لپیٹ رہا ہے۔ اپنے اے سی صاحب تو جوان اور جذباتی اور مقابلے میں چودھری افتخار جیسے خبیث اور مانے ہوئے شکاری۔ مگر اے سی صاحب حق پر ہونے کی وجہ سے اس چودھری سے اچھا مقابلہ کریں گے۔ کافی عرصے بعد کاشف زبیر صاحب جلیل نامہ لے کر حاضر ہوئے۔ دولت محبت اور راجا میں غزل کی تحمل عرف گجو کی درگت بنی،

مزہ آیا۔''

قیصر عباس ٹانوری کی خیال آفرینی اٹھارہ ہزاری جھنگ سے ''3 اکتوبر کو جاسوسی کی آمد ہوئی لیکن ہمارے پاس 4 تاریخ کو پہنچا۔ سرورق کے پس منظر میں شاید صحرائی آندھی چل رہی تھی۔ بینگر پر لٹکتی لاش مضحکہ خیز تھی۔ باقی تو نارمل ہی تھا۔ فہرست کا ڈیزائن بھی اس بار اچھا تھا۔ محفل میں پہنچے تو ندا مغل اور حسینہ نے تو سینگوں پر اٹھالیا۔ ایک بزدل کہتی ہے تو دوسری بے وقوف۔ ویسے آپ دونوں کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟ لگتا ہے ابھی تک آپ دونوں کو لگام نہیں ڈالی گئی۔ ملک محمد اسماعیل! آپ کو بہترین تبصرے پر مبارک باد۔ ہمارا تبصرہ پسند کرنے پر مصدق محمود دانش کا شکریہ۔ کہانیوں میں عکس در عکس پروین زبیر کی اچھی کہانی تھی جس نے آخر تک اپنا سسپنس اور دلچسپی برقرار رکھی۔ ولی رحمٰن کا ہیرو شیر شاہ جس نے بُرا ہوتے ہوئے بھی کسی کے بُرا بننے کو برداشت نہیں کیا۔ طاہر جاوید مغل کی سلسلے وار تحریر پرواز بھی اختتام پذیر ہوئی۔ کہانی میں جذبات، احساسات اور کردار نگاری پر زور دیا گیا تھا۔ آخری قسط میں شاہ خاور، بلقیس بیگم کو حاصل کر کے بھی کھو بیٹھا۔ کیا ہوتا اگر دونوں اکٹھے ہی رہتے۔ الغرض پرواز ہر لحاظ سے ایک پُرتجسس، دلچسپ اور مکمل تحریر تھی۔ سرورق کا دوسرا رنگ تلاشِ گمشدہ کاشف زبیر کی ایک دلچسپ اور پُرلطف تحریر تھی۔ احمد اقبال کی دنیا گول ہے کوئی خاص تاثر نہ دے سکی۔ گرداب چودھریوں، وڈیروں کی روایتی داستان ہے پھر بھی مصنفہ کی محنت زبردست انداز کی حامل ہے۔ ثمر عباس کی سائنس فکشن کہانی وقت کا قیدی اچھی اور بہترین کہانی تھی۔ فیصلہ میں ایک کم ہمت شخص کو دکھایا گیا جو ارادے کی تکمیل کے لیے بیس بچوں کو مارنے کا گھناؤنا کام کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔ پل ایک تعمیری سوچ کی غماز سبق آموز تحریر تھی۔ جاسوسی کہانی دو روپے کا نوٹ پُرتجسس کہانی تھی۔ باقی سب کہانیاں نارمل تھیں۔ مجموعی طور پر اکتوبر کا جاسوسی بہترین تھا۔''

غلام مصطفیٰ کا تارے والی پل سے دل شکستگی کا اظہار ''اکتوبر کا ڈائجسٹ عید کی خوشیوں کے ساتھ چمکتا، دمکتا 6 تاریخ کو ملا۔ میں اس خط میں صرف ایک کہانی پرواز پر تبصرہ کروں گا (اجازت ہے)۔ ٹائٹل گرل بہت اچھی تھی۔ ٹائٹل گرل کے بعد چینی، نکتہ چینی میں گئے، وہاں بہت گہما گہمی لگی ہوئی تھی۔ حسینہ فرام ملکہ کوہسار صاحبہ! آپ کا بہت بہت شکریہ آپ نے ہمیں یاد فرمایا۔ آپ کا خط بہت اچھا تھا۔ ایس ایس ناز ملتانی آپ کو چینی، نکتہ چینی میں (ویری ویلکم)۔ خطوں سے نظر ہٹائی تو کہانیاں انتظار کر رہی تھیں۔ کہانیوں میں پہنچے تو سب سے پہلے پرواز ہمیں مایوسانہ انداز میں دیکھ رہی تھی۔ جب پرواز پر پہنچے تو وہ تو ویسے ہی مایوس تھی لیکن ہمیں بھی مایوس کر گئی۔ طاہر جاوید مغل صاحب نے پرواز کو ختم کر کے ہمارا دل ہی توڑ دیا۔ ہمارا دل ہی نہیں۔ سب بہن بھائیوں کا دل توڑ دیا ہوگا۔

غزل خون دل سے لکھا مت کرو۔''

محمد ارشد ساجد بھٹی اینڈ الطاف حسین انجم کی جگیاں غلام فرید (اوکاڑہ) سے آمد ''جاسوسی سے ہمارا تعلق کافی پرانا ہے لیکن خط لکھنے کی جسارت پہلی دفعہ کر رہے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ آپ اور قارئین ہمیں ویلکم کہیں گے (خوش آمدید)۔ اس دفعہ خلافِ معمول رسالہ 6 تاریخ کو ملا۔ سرورق اس دفعہ اتنا جاذبِ نظر نہیں تھا، اس لیے آگے کی سوچی اور اشتہارات کو نظر انداز کرتے ہوئے محفل چینی، نکتہ چینی میں پہنچے۔ سبھی دوستوں کے خطوط زبردست تھے۔ خاص طور سے نور الہدیٰ کی شاعری سے لطف اندوز ہوئے۔ محمد کبیر عباسی، چاچا نجم نجوی، ندا مغل، نوشی چودھری کے تبصرے زبردست تھے۔ اس کے بعد اپنے پسندیدہ سلسلے پرواز کی طرف پرواز کی۔ لیکن یہ کیا؟ آخری قسط۔ بہت افسوس ہوا مغل صاحب! اتنی جلدی اینڈ کر دیا۔ خاور ے کی شادی بھی ہوگئی۔ بے گناہی بھی ثابت ہوگئی۔ بلقیس کا اچانک چلے جانا۔ سب کچھ عجیب سا لگا۔ اینڈ اچھا نہیں لگا۔ اس کے بعد گرداب کی باری آئی جہاں ماہ بانو کی ہلاکت نے چونکا دیا۔ ہم تو سوچ رہے تھے کہ اس کے بعد شہریار اور ماہ بانو کا افیئر چلے گا لیکن خیر۔ عکس در عکس پروین زبیر صاحبہ کی زبردست تحریر تھی جو مدتوں یاد رہے گی۔ ہر برے انسان میں کچھ نہ کچھ اچھائی ضرور ہوتی ہے۔ جہاں تک ہو سکے وہ دوسروں کو برائی سے بچاتا ہے۔ شکستِ خواب کوئی خاص تاثر چھوڑنے میں ناکام رہی۔ دو روپے کا نوٹ یعقوب جمیل صاحب کی دلچسپ تحریر تھی۔ کیٹی کا کردار پسند آیا۔ پولیس کی ہیرا پھیری خوب رہی۔ وقت کا قیدی درمیانے درجے کی تحریر تھی جس میں کارل کی بدمعاشیاں عروج پر تھیں۔ مدد مرزا ظفر بیگ کی بہت زبردست تحریر تھی جس میں جان اپنے بچھائے ہوئے جال میں خود ہی پھنس گیا۔ سچ ہے جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ دولت محبت اور راجا میں جلیل اور راجا کی نوک جھونک سے لطف اندوز ہوئے اور یہ کمال صرف کاشف زبیر صاحب ہی کر سکتے تھے۔ ویل ڈن کاشف صاحب۔ پل اور فیصلہ بس ٹھیک تھیں۔ سرورق کے رنگ دونوں اچھے تھے لیکن پہلا رنگ دوسرے کی نسبت کافی اچھا تھا۔''

مکھن خان کا مکھن پور سے مکھن لگا کے ''باادب باملاحظہ ہوشیار، اسی فیر آگئے... مکھن لگا کے۔ اکتوبر کا جاسوسی ہمارے ہاتھ پر اور ہم کھاٹ پر، سرورق کی حسینہ کی ہرنی جیسی آنکھیں، ناگن جیسے بال، گلاب کی پتی کے مانند ہونٹ اور ستواں ناک... ہماری آنکھوں کو خیرہ کر گئے... مکھن لگا کے۔ جاسوسی کے قیمتی صفحات کے پیشِ نظر ہم پہنچے چینی، نکتہ چینی میں۔ انکل جی! اپنے تبصرے میں پاکستانی کرکٹ ٹیم کو مکھن لگاتے نظر آئے جو کہ شکست خوردہ واپس پہنچ چکی ہے... مکھن لگا کے۔ فاطمہ گل جی لڑکیاں، لڑکیوں سے متاثر نہیں ہوتیں اسی لیے سرورق نے کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑا، ویسے بھی یہ دیکھنے والے کی نظر پر منحصر ہے... مکھن لگا کے۔ (پھر تو بڑا مزہ آتا ہوگا)۔ ندا مغل جی... محمد کبیر عباسی محبوب کی گلی کے اتنے چکر اس لیے نہیں لگاتے کیونکہ جوتے جو پڑتے ہیں وہ بھی... مکھن لگا کے۔ رضوان کریزوی... آپ کا نام پڑھتے ہی منہ کا ذائقہ کڑوا ہو جاتا ہے۔ نوشی جی آپ کو اوئے ہوئے آپ نے تو حسینہ کے بخیے اُدھیڑ کے رکھ دیے مکھن لگا کے۔ سرورق سنگین کیوں لگا مکھن لگا کے۔ تڑکا، خوشبو اور نسوار لگانے والے بھائیوں... آپ بھی آ جایئے ہم بھی تو آگئے ہیں مکھن لگا کے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے جلیل کی معرکہ آرائی پڑھی۔ جلیل نے اپنی خالہ اور غزل کو خوب الو بنایا مکھن لگا کے۔ گرداب میں پتا نہیں ماہ بانو کی جگہ کس کی شامت آئی ہے کیونکہ اب ہیروئن تو مرنے سے رہی، مکھن لگا کے۔ تلاشِ گمشدہ شامی اور تیمور کا نیا کارنامہ کچھ خاص نہیں رہا۔ دنیا گول ہے میں ہر ایک شخص دوسرے کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا... مکھن لگا کے۔ فیصلہ میں بندر نے بدحواسی میں بہت غلط قدم اٹھایا۔ پرواز کی آخری قسط پر خوش گوار احساس ہوا، مکھن لگا کے۔ مدد میں ہربرٹ نے مسز جان کو پھانس لیا مکھن لگا کے۔ ایک بات یہ کہ اس بار خلافِ توقع جاسوسی میں کوئی بھی تحریر چونکا دینے والی نہ تھی۔ (اچھا آپ نے تو چونکا دیا مکھن لگا کے)۔''

مہرا ے ڈی سیال کی خانیوال سے انٹری ''اس مرتبہ سرورق کی ماہ جبیں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اسمبلی ہال میں پہنچے تو اپنے آپ کو قائد حزبِ اختلاف منتخب پایا۔ جناب خاتون وزیرِ اعظم فاطمہ گل سیال صاحبہ! عابد خان پر برہم ہوتے ہوئے حزبِ اختلاف عرف عام بلیک لسٹ والوں کو

مکھن لگانے کی کوشش نہ کریں۔ آپ کے ہر اقدام پر ہماری نظر ہے۔ اسپیکر جاسوسی اسمبلی شان احمد لشکوری! آپ بھی امریکا سے کسی طور کم نہیں، ایک طرف تو جمہوریت کا راگ الاپ رہے ہیں اور دوسری طرف کامران شہزاد پر خوشامدی ہونے کا شک کر رہے ہیں۔ نور الہدیٰ صاحبہ اپنی گھسی پٹی شاعری اور اوٹ پٹانگ باتوں سے اپنے آپ کو وزارت برائے ادبی امور کے لیے اہل ثابت کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ چاچا نجم نجوی جی! ہم ڈرون حملوں کی پُرزور مذمت کرتے ہیں اور مطالبہ کرتے ہیں کہ حکومت ہنگامی بنیادوں پر ان کا سدِباب کرے۔ اے اے زیدی صاحب! چینی ناپید ہو چکی ہے اس لیے آپ کو اس طرح لڈوؤں کی بے حرمتی نہیں کرنا چاہیے۔ وزیر برائے اخلاقِ نسواں مس نوشی چودھری! آپ کو اتنی اچھی تقریر کرنے پر ایوارڈ دیا جانا چاہیے۔ اس کے بعد ہم تمام وزارتوں اور وزیروں کو بھلاتے ہوئے واپس فہرست میں پہنچے تو اپنے فیورٹ رائٹر کاشف زبیر صاحب کو دو تحریریں اور دونوں ٹاپ رول راجا اور شامی اینڈ کمپنی کو لیے موجود پایا جنہیں پڑھنے کے بعد ہمارا الیکشن ہارنے کا غم رفع دفع ہو گیا۔ پہلا رنگ دنیا گول ہے ایک بہت ہی جذباتی کہانی تھی جس میں راجا اصغر نے لازوال قربانی دیتے ہوئے اپنی بیوی اور بچے کو بچالیا۔ پرواز کی آخری قسط میں بیگم بلقیس نے افسانوی قربانیوں کی طرح خودکشی نہیں کی بلکہ حقیقی قربانی دیتے ہوئے شاہ خاور کو جاگیر میں روک دیا اور اپنے خاندان کو بھی جھگڑوں سے بچالیا۔ گرداب پر اس مرتبہ کچھ جمود سا طاری رہا۔ اس لیے اس قسط نے کچھ خاص مزہ نہ دیا۔ ابتدائی صفحات کی کہانی عکس در عکس پروین زبیر کی ایک بہت ہی اچھی تحریر تھی مگر کچھ ادھوری سی اسٹوری لگی۔ لعل اسٹوریز میں شکستِ خواب جس میں روشنیوں کی چاہ رکھنے والی ایمی کو فریڈ نے اپنی کھوکھلی محبت کے جال میں پھنسا کر تاریکیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل دیا۔ جہد بقا جسے پڑھنے کے بعد ہمیں اس دور اور آج کے دور میں کوئی خاص فرق نظر نہ آیا۔''

نور الہدیٰ ملکہ کوہسار کے کچن سے ''چکھتی ہیں'' ''لگتا ہے اس دفعہ لوگ جب چھتوں پر کھڑے چاند تلاش کر رہے تھے، ذاکر انکل چاند چہرے کے متلاشی تھے۔ چاند چہرے کے ساتھ لنگور چہرہ غالباً چاند چہرے کو نظرِ بد سے بچانے کے لیے ہے۔ اس کے بعد پہنچے فہرست پر جہاں مختلف انواع کی ڈشز خوب صورتی سے سجی دیکھ کر ہمارے منہ میں پانی بھر آیا۔ آغاز کیا اس ڈش سے جو کافی عرصے سے درد کی ہانڈی اور دکھوں کے چولہے پر پک رہی تھی۔ ایکشن وتھرل کا تڑکا لگا کے طاہر انکل نے آخر اسے فائنل ٹچ دے ہی دیا مگر اینڈ میں غم کا مسالا اتنا ڈال دیا کہ ہماری آنکھوں کے ساتھ ناک بھی رواں ہوگئی۔ پھر زبان کا ذائقہ چینج کرنے کے لیے جلیل کی سوئٹ ڈش کھائی جس سے منہ میں مزاح کی شیرینی گھل گئی اور ایک دم سے موڈ فرسٹ کلاس ہو گیا۔ اس خوش گوار موڈ کے ساتھ گرداب نامی ڈش سے انصاف کرنا شروع کیا جو اتنی لذیذ تھی کہ اپنے نازک سے معدے کا خیال کیے بغیر ایک ہی دفعہ میں ساری چٹ کر گئے۔ دنیا گول ہے سے بڑی سوندھی سوندھی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ آخر ہم سے بھی رہا نہ گیا مگر خلافِ توقع یہ ڈش کافی پھیکی رہی۔ اس سے ہونے والی خرابی موڈ کو بہتر کرنے کے لیے پھر سوئٹ ڈش یعنی تلاشِ گمشدہ سامنے رکھی جو ہماری فیورٹ آئس کریم کے مانند رہی جس کو جتنا کھاؤ طلب کم نہیں ہوتی۔ ہم اس کے کک یعنی کاشف زبیر سے اس لذیذ ڈش کے پیش کیے جانے پر شکریہ ادا کرتے ہیں اور جلد ہی اسے پھر سے پیش کرنے کی درخواست کرتے ہیں۔ اِدھر اُدھر کافی منہ مارنے کے بعد اس ڈش کی طرف متوجہ ہوئے جو ہمارے سب سے قریب رکھی تھی۔ آئی مین، اس کے بعد باری تھی لیڈی کک یعنی پروین زبیر کی عکس در عکس نامی ڈش کی۔ اس ڈش سے ہمارا پیٹ تو بھر گیا مگر کچھ خاص سواد نہیں آیا۔ اپنے دیس کی ڈشز ختم کرنے کے بعد بھارتی ڈش کا مزہ چکھا تو بے اختیار پنجابی جملہ منہ پر آگیا یعنی سواد آگیا بادشاہو۔ ترک ڈش ہماری صحت کے لیے تو ٹھیک تھی مگر ذائقہ کچھ خاص نہ تھا۔ مریم کے خان نے بڑی پرانی ڈش پیش کی جس کے اجزا یعنی کردار و واقعات اکثر ہمارے کھانے کا حصہ بنتے ہیں چنانچہ کچھ خاص مزہ نہیں آیا۔ ثمر عباس نے ایک نئے ذائقے سے روشناس کرایا۔ وقت کا قیدی نامی یہ ذائقہ اچھا لگا۔ اور اب ذکر ہو جائے ہماری موسٹ فیورٹ ڈش یعنی چینی، نکتہ چینی کا۔ شان احمد کی گستاخی ملاحظہ کی انکل جی آپ نے؟ کیسے موصوف پورا منہ پھاڑ کے آپ کو خوشامد پسند کہہ رہے تھے، اپنا تبصرہ مزے کا لگا۔ کبیر عباسی! زبان تو مردوں کی واقعی ایک ہوتی ہے مگر بات یا قول ایک نہیں ہوتا۔ چاچا نجم! آپ تو ہمارے بزرگ ہیں اس لیے آپ کے ساتھ شرارت نہیں کرنی چاہیے۔ نوشی اینڈ ندا شاباش۔ بھرپور نمائندگی کر رہی ہیں آپ صنفِ نازک کی۔ رضوان تنولی! یہ کریزوی کیا ہوتا ہے؟ حسینہ ڈیئر آپ نے پکارا اور ہم دوڑے چلے آئے۔ آپ بھی آتی رہا کریں۔''

محمد کبیر عباسی کی باتیں مری سے ''واہ ذاکر انکل! کیا خوب صورت چاند چہرہ بنایا ہے اس دفعہ ٹائٹل پر۔

چاند چہرہ سنبھال رکھنا
میری وفا کا خیال رکھنا

اوپر بنا مجوبہ تو ایویں سا ہی تھا مگر نیچے لٹکے آدمی کا پوز سمجھ میں نہ آنے کے باوجود انفرادیت کے باعث متاثر کر گیا۔ مجموعی طور پر ٹائٹل کافی اچھا لگا۔ فہرست کا خوب صورت انداز دل کو بھا گیا۔ ڈیئر فاطمہ سسٹر آپ کی بڑی مہربانی کہ آپ نے اس دفعہ اپنے دل کی دھڑکنیں اپنے تبصرے میں ہمیں سنانے کی کوشش نہیں کی۔ شان احمد! ویلڈن! سلیم شبلی کو بڑے مزے کا جواب دیا آپ نے۔ نور الہدیٰ! آپ کی شاعری سن کے ٹائٹل پر پستول نمودار ہو گیا جبکہ ہمیں گولیاں خریدنی پڑیں ڈسپرین کی! آخر اتنی درد بھری شاعری تھی آپ کی۔ چاچا نجم نجوی کا تبصرہ مزے کا تھا۔ پرواز کی آخری قسط... اتنی اچانک! بہت رلایا طاہر صاحب نے آخری قسط میں۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو کہانی رومانس، ایکشن اور سازشوں کا آمیزہ رہی۔ ایکشن بھرے واقعات تو ہمیں کچھ خاص نہیں لگے تاہم رومانوی واقعات اور منظر نگاری غضب کی تھی جس کی وجہ سے پرواز کو آپ ہماری پسندیدہ کہانیوں میں شمار کر سکتے ہیں۔ گرداب واقعی ایک ایسا گرداب ہے جس میں نہ صرف ماہ بانو پھنسی ہے بلکہ قاری بھی اسے پڑھتے ہوئے اپنے آپ کو ایک ایسے گرداب میں پھنسا ہوا محسوس کرتا ہے جس سے اینڈ ہونے سے پہلے نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ماہ بانو کے سلسلے میں رائٹر کو تھوڑا سا ٹریک تبدیل کرنا چاہیے تھا تاکہ یکسانیت پیدا نہ ہو۔ بہرحال، موجودہ قسط میں لگتا ہے شاید ایسا اگلی قسط میں ہو جائے۔ پروین زبیر کی اولین صفحات پر تحریر پڑھی۔ ڈائیلاگز اور واقعات کی وجہ سے کچھ بوریت ہوئی مگر تھیم اچھی ہونے کے باعث ہم اسے بہ مشکل ہی سہی پاسنگ مارکس دے دیتے ہیں۔ احمد اقبال ہمارے پسندیدہ رائٹر ہیں مگر ہمیں ان سے بہت سی شکایات ہیں۔ دنیا گول ہے میں اتنے زیادہ جھول دیکھنے میں ملے کہ کہانی کا سر پیر ہی نہیں رہا۔ کاشف زبیر کی دونوں سیریز کی ایک ہی شمارے میں اقساط پڑھ کر مزہ آگیا۔ تلاشِ گمشدہ کا پلاٹ تو گو کہ کافی کمزور تھا مگر پُرمزاح جملوں کی وجہ سے کہیں بھی بوریت کا احساس نہیں ہوا۔ پل از محمد عفان اچھی لگی۔ مرزا ظفر بیگ کی مدد بھی کافی بہتر تھی۔ مریم کے خان کی جہد بقا عام واقعات اور کردار خاص ٹھیک ہی تھی۔ کترنیں پرانی تھیں البتہ کارٹونز اچھے تھے۔''

افتخار حسین اعوان کی کوششیں آزاد کشمیر سے "ٹائٹل گرل کی تعریف میں کچھ نہیں کہوں گا۔ سب سے نمایاں چیز آنکھیں تھیں، بلیک جمیل سی آنکھیں جن میں ڈوبتا اور ابھرتا رہا۔ ہینگر میں قمیص لٹکی ہوئی تو بہت دفعہ دیکھی پر آج قمیص کے اندر بندہ لٹکا ہوا پہلی دفعہ دیکھا ہے۔ پرواز طاہر جاوید مغل صاحب کی کاوش اپنی پرواز مکمل کر چکی، مدتوں یاد رہنے والی اسٹوری تھی۔ گرداب اسما قادری کی تحریریں ہمیشہ دل کو چھوتی ہوئی گزر جاتی ہیں۔ ماہ بانو اور شہریار کا کردار یادر فل ہے۔ بس ایک خواہش ہے کہ چودھری افتخار کا انجام عبرت ناک ہونا چاہیے۔ دنیا گول ہے۔ احمد اقبال صاحب جیسے ماہر لکھاری کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ ویسے بھی جسے دنیا گول ہے پر اعتراض ہو تو نور الہدیٰ سے نسوار کی چٹکی لے کر منہ میں رکھے۔ خود ہی لگ پتا جائے گا۔ فیصلہ بھی اچھی کہانی تھی۔ مختصر کہانیاں ابھی نہیں پڑھ سکا۔ عکس در عکس کی گرہیں کھولنے میں مصروف ہوں اور اسرار کا پردہ چاک کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہوں۔"

تصور العین اوکاڑہ سے اپنے ادھورے تبصرے میں لکھتی ہیں "اس دفعہ جاسوسی کا ٹائٹل بہت پسند آیا۔ خصوصاً دوشیزہ تو بہت ہی پیاری تھی۔ اوپر ہی ایک مخص دانت نکالے شاید اشتہار کے لیے پوز دے رہا تھا۔ سائڈ کے ہینگر میں لٹکے مردہ مخص کو دیکھتے ہی ہم نے صفحہ پلٹ دیا اور پہنچے چینی، نکتہ چینی کے دربار میں۔ فاطمہ گل! اپنے تبصرے میں تقریباً سب ہی کی ہی تعریفیں کھینچتی نظر آئیں۔ شان احمد کشندری آپ اب تو خوش ہو گئے خط شائع ہونے پر۔ چچا مجم نجومی کا خط بہت پسند آیا۔ چاچا آپ سچ مچ نجومی ہیں بھی یا صرف نام کے نجومی ہیں۔ ندا مغل کا تبصرہ اچھا تھا۔ نوشی چودھری نام پسند کرنے کا شکریہ۔ باقی تمام تبصرے اچھے تھے۔ چینی، نکتہ چینی کی محفل سے ہم پہنچے پروین زبیر کی عکس در عکس پر۔ کہانی اور مضمون دونوں چیزیں بہت اچھی تھیں لیکن کہانی کو خوامخواہ لمبا کر دیا گیا۔ اگر مختصراً لکھا جاتا تو شاید اور بھی پسند آتی۔ گرداب کی قسط ہمیشہ کی طرح شان دار تھی۔ شہریار اور چودھری افتخار دونوں ہی کو اندازہ ہو گیا کہ وہ ایک دوسرے سے دشمنی نبھا رہے ہیں تو میرے خیال میں اسما قادری اب آپ ان دونوں کو کھلے میدان میں لے آئیں تو بہتر ہے۔ میرے خیال میں عامر کے گھر لگنے والی آگ میں عامر کی ماں اور جمیلہ نامی لڑکی ہی مری ہوگی۔ کاشف زبیر کی دولت محبت اور راجا ہمیشہ ہی کی طرح بہت اچھی تھی۔ میرے خیال میں تو اسے (کہانی) کو ہر ماہ شائع ہونا چاہیے مگر نہ جانے کیوں کاشف زبیر صاحب بیچ میں وقفہ لے لیتے ہیں۔ لیجیے جناب، انکل طاہر نے تو پرواز کا اینڈ کر دیا اور ہم منہ دیکھتے رہ گئے۔ انکل نے ایک ہی جھٹکے میں خاور کے تمام دشمنوں کا خاتمہ کر دیا لیکن مجھے جس چیز نے متاثر کیا، وہ تھا اس کہانی کا انجام۔ اس کا اینڈ جتنا مجھے پسند آیا شاید کسی کو نہ آیا ہو۔ انکل اس دفعہ جاسوسی میں کوئی ایسی قسط دار کہانی شائع ہونی چاہیے جو مجاہد، موت کے سوداگر یا سرکش کی یاد تازہ کر دے۔ احمد اقبال کی دنیا گول ہے، بہت اچھی لگی۔ اکبر اپنے دشمن سے انتقام بھی نہ لے سکا اور خوامخواہ اتنا عرصہ جیل میں بھی رہنا پڑا۔ باقی ڈائجسٹ پڑھا نہیں۔"

اے جے کسانہ، سرگودھا سے لکھتے ہیں "اکتوبر کا شمارہ 2 تاریخ کو ملا۔ محمد وقاص اچھا کیا جو گستاخیاں چھوڑ دیں ورنہ سارے جہاں کی چڑیلیں آپ کے در پہ ہوتیں، سمجھ گئے نا۔ ندا مغل جی، سندس جبیں صاحبہ آپ نے ہمارے جرم کے بارے میں پوچھا۔ یقین کریں 10 سال سے یہی سوال ہم بھی کر رہے ہیں۔ خدارا ہمیں بتایئے کیونکر ہمیں کال کوٹھڑی کی نذر کر دیا گیا۔ نوشی چودھری صاحبہ! آپ نے ہمیں دعائیں ہی نہیں صدائیں بھی دیں۔ خوشی سے مر نہ جاتے گر اعتبار ہوتا، تھینک یو۔ شکر ہے نور الہدیٰ صاحبہ کو شاعری سنانے کا موقع مل گیا۔ سب دوستوں کے تبصرے اچھے تھے، نیو آمد کو ویلکم۔ پرواز کے اختتام میں تھوڑا گداز پیدا ہو گیا۔ ہجر و فراق کے طویل لمحات ہم نے بھی محسوس کیے۔ شاہ خاور کی خوش نصیبی کہ وصال کی چند گھڑیوں سے آشنا ہو گیا۔ ایسی گھڑیاں جن کے سہارے زندگی گزار دی جاتی ہے۔ وگرنہ تو کوچۂ محبت میں تو عمریں رائگاں چلی جاتی ہیں۔ تلاشِ گمشدہ، معاشرے کے ناسوروں کی کہانی۔ دنیا گول ہے، اس اسٹوری میں اکبر کے بیوی بچوں کا ذکر آیا لیکن شادی کہیں بھی ثابت نہیں۔ عکس در عکس ایک مجرم کی مکافاتِ عمل کی منہ بولتی تصویر ہے۔ یہ کہانی ہمیں بتاتی ہے کہ مجرم بھی انسان ہوتا ہے۔ اس کے اندر بھی ضمیر ہوتا ہے جو کبھی خود بے دار ہو جاتا ہے اور کبھی کرنا پڑتا ہے۔ بعض زندگی کا احاطہ کرتی اوقات حالات بھی انسان کو برائی کی راہ پر لے جاتے ہیں۔ گرداب، ماہ بانو کی مشکلات کا بڑا اچھا صلہ ملے گا۔ اب اے سی اور چودھری آمنے سامنے آ چکے ہیں اور ماہ بانو ایک بار پھر گردشِ ایام کا شکار ہو گئی۔ اس کہانی میں بھی اچھائی اور برائی کا ٹکراؤ دکھایا جا رہا ہے۔"

فتح پور، لیہ سے آمنہ پٹھانی کا ہنستا مسکراتا تبصرہ "عید مبارک کے الفاظ سے سجا، خوب صورت چہرے سے مزین اور جاسوسیت سے بھرپور سرورق بہت اچھا لگا۔ چینی، نکتہ چینی میں آپ کی تمہیدی باتیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ فاطمہ گل! ڈیئر آپ کی خواہش قابلِ قدر ہے لیکن ہم پٹھان ہیں سو مجھے پٹھانی رہنے دیں۔ نور الہدیٰ! خط پسند کرنے کا شکریہ۔ آپ کا تبصرہ بھی لاجواب ہوتا ہے۔ ایس ایس ناز خوش آمدید۔ محمد کبیر عباسی آپ کا تبصرہ واقعی جان دار ہوتا ہے... لیکن ہمارے بارے میں ہاتھ ہمیشہ ہولا ہی رکھنا... ورنہ یاد رکھنا میں بھی پٹھانی ہوں۔ ندا مغل! جاناں میں تو کئی محاذوں پر اکیلی جدوجہد کر رہی ہوں، بس آپ ہماری حوصلہ افزائی کرتی جائیں۔ رضوان تنولی کریزوی کراچی آپ کا نام لیتے لیتے زبان اینٹھ جاتی ہے، پلیز نام بدل لیں۔ مصدق محمود دانش! آپ نے چودھری سرفراز کے متعلق بالکل بجا فرمایا ہے۔ حسینہ فرام ملکہ کوہسار! کبیر عباسی کے خط کی تعریف میں حقیقت پسندی پوشیدہ تھی۔ ویسے آپ کی نصیحت بھی قابلِ غور ہے۔ آخرکار پرواز بھی اختتام پذیر ہوئی۔ ویلڈن انکل طاہر جاوید! بس اس سے زیادہ تبصرہ ہم سے نہیں ہو سکے گا کیونکہ پرواز سے جدائی کے باعث ہم شاک کی کیفیت میں ہیں۔ گرداب سلو ہونے کے باوجود کافی دلچسپ ہوتی جا رہی ہے۔ قسط کا اختتامیہ دہلا دینے والا تھا۔ احمد اقبال بہت عرصے بعد نظر آئے، جب آئے تو خوب آئے۔ دنیا گول ہے موضوع، پلاٹ اور کردار نگاری کے حوالے سے ایک یادگار تحریر تھی۔ دوسرا رنگ کاشف زبیر نے بھی خوب لکھا۔ شامی اور تیمور کی جملے بازی لاجواب ہوتی ہے۔ ابتدائی صفحات پر پروین زبیر کی عکس در عکس موضوع کے اعتبار سے انوکھی اور اچھوتی تحریر ثابت ہوئی۔ کہانی ختم کر لینے کے بعد بھی یہ احساس رہا کہ جیسے کہانی ادھوری ہے۔"

بہاولپور سے نومی اے کی طویل عرصے بعد حاضری "کسی کو میرا نام یاد تو نہیں ہوگا کیونکہ طویل علالت کے باعث جہاں دوسرے کام چھوڑنے پڑے وہاں ہردلعزیز جاسوسی کو بھی خیرباد کہنا پڑا۔ بیماری کی وجہ سے پڑھنا تو درکنار، اٹھنا بھی محال تھا۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے دروازے وا کیے اور صحت عطا کی۔ حسبِ معمول جاسوسی کے درشن 2 اکتوبر کو ہوئے۔ ہمیشہ کی طرح سرورق ذاکر انکل کی انتھک محنت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ اشتہارات پر نظر دوڑاتے ہوئے اپنے پیاروں کی محفل میں پہنچے جہاں سب کی نوک جھوک جاری تھی۔ ندا مغل، نوشی چودھری اور اے جے کسانہ کے تبصرے ہمیشہ دلچسپ اور میرے فیورٹ ہوتے ہیں۔ ندا مغل جی، صنفِ نازک کا خوب پوسٹ مارٹم کیا۔ ندا باجی مایوسی گناہ ہے حوصلہ رکھیں۔ نوشی آپی نے پہلی بار اپنی صنف کے خلاف لکھا ہے۔ میں آپ کے سچ کی داد دیتا ہوں۔ ویسے نوشی جی آپ سب کے کان کھینچنے میں بہت ماہر ہیں۔ نجومی چاچا زیادہ خوش فہمی میں نہ رہا کریں۔ مس

حسینہ خلوص کا یقین دلانے والا آوارہ ہوتا ہے کیا؟ کہانیوں میں ابتدائی صفحات کی عکس در عکس آج کل کے حالات و واقعات کا عکس تھی لیکن آج کل شیر شاہ جیسے لوگ کم ہیں جو مجرم ہوتے ہوئے بھی کسی کو سدھار جائیں۔ سرورق کے پہلے رنگ نے انتہائی بور کیا۔ تلاشِ گمشدہ میں شامی اور تیمور اس مقولے حرکت میں برکت ہے پر عمل کرتے نظر آئے۔ کہانی میں پہلے جیسی سنسنی خیزی نہیں تھی لیکن پھر بھی مزہ دے گئی۔"

حسینہ فرام ملکہ کوہسار "ذاکر انکل نے تو اس دفعہ کمال ہی کر دیا۔ اتنی خوب صورت حسینہ۔ ویسے ٹائٹل گرل اور ہم میں ایک بات مشترک تھی کہ وہ بھی حسینہ اور ہم تو... حسینہ کے پیچھے موجود صنفِ کرخت ہینگر پر لٹکے آدمی کو دیکھ کر کھلکھلا رہا تھا۔ اس شمارے کا ٹائٹل بہت ہی شان دار تھا۔ ٹائٹل کے جائزے کے بعد ایک ہی جمپ میں پہنچے محفل مٹھاس و ترش میں۔ شان احمد! آپ کے خط کے نہ شائع ہونے کے دکھ میں ہم برابر کے شریک ہیں۔ نور الہدیٰ کا تبصرہ تو پڑھتے ہوئے اتنی ہنسی آئی کہ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ واقعی بہت شان دار تبصرہ تھا۔ کبیر عباسی! اتنے ویلے آپ ہی ہیں جو ہر ماہ اتنے لمبے لمبے تبصرے بھیجتے ہیں اور کمال ہے کہ شائع بھی ہو جاتے ہیں۔ لیڈیز کے پاس اتنا فالتو ٹائم نہیں ہوتا۔ چاچا جی! وہ تو ہم جان کے کھا لیتے ہیں ماتیں اکثر کو عرفِ عام میں انگور کھٹے ہیں کہتے ہیں۔ نور الہدیٰ کی شاعری پڑھ کے ہم میں بھی شاعری کا ذوق پیدا ہوا تو ندا جی آپ کے لیے ایک مصرعہ عرض ہے۔

پیوستہ رہ محفل سے امید صدارت رکھ

نوشی چودھری ویلڈن۔ بڑا مزہ آیا آپ کا تبصرہ پڑھ کے۔ اپنا تبصرہ جو بال بال بلیک لسٹ ہونے سے بچ گیا تو پڑھ کے پورا ایک چھٹانک خون بڑھ گیا۔ اس کے بعد کہانیوں پر تبصرہ ہو جائے۔ سب سے پہلے اپنی فیورٹ داستان گرداب پڑھی جہاں پر ماہ بانو کی مشکلات بالکل بھی کم ہوتی نظر نہیں آ رہیں۔ طاہر جاوید مغل کی پرواز کی آخری قسط میں رومانس اور ایکشن کافی تھا لیکن آخر میں جاوید انکل نے بہت ہی غم زدہ کر دیا۔ بڑی مشکل سے اپنے آنسوؤں کو بہنے سے روکا۔ رنگوں میں احمد اقبال کی دنیا گول ہے میں کافی جھول تھے۔ اس لیے کچھ خاص پسند نہیں آئی جبکہ تلاشِ گمشدہ مزاح سے بھرپور ہونے کی وجہ سے بہت پسند آئی۔ شامی اور تیمور کے کردار بہت ہی دلچسپ ہیں۔ چھوٹی کہانیوں میں دولت محبت اور راجا چھوٹی سی تحریر تھی مگر بہت پسند آئی۔ اس کے علاوہ شکستِ خواب اور دو روپے کا نوٹ بھی اچھی تحریریں تھیں۔ پروین زبیر کی عکس در عکس کچھ خاص تحریر نہیں تھی۔"

ہمایوں سعید رومیو کا شکریہ نامہ بنوں سے "اکتوبر کے شمارے کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ یہ غالباً پہلا سرورق ہے جس نے مجھے متاثر کیا۔ اورنج کلر کے بیک گراؤنڈ میں حسینہ کی سوچ میں ڈوبی آنکھیں اور خوب صورت متناسب ماتھے نے بار بار دیکھنے پر مجبور کیا۔ ویل ڈن انکل جی! ہینگر میں لٹکے ہوئے مرحوم اور دانتوں کی نمائش کرتے ولن بھی ہمارا موڈ خراب کرنے میں ناکام رہے اور مسکراتے ہوئے پہلی بار اشتہارات کا بھی ایک اجمالی جائزہ لیا۔ یونہی ہنستے مسکراتے فہرست پر پہنچے اور وہاں جلیل میاں کی حاضری کا سن کر دل باغ باغ ہو گیا۔ ارے... یہ کیا؟ کاشف زبیر، کے زبیر! ہم الجھن میں پڑ گئے اور اس سے فوری طور پر نکلنے کے لیے ہم نے کے زبیر کی لکھی ہوئی کہانی تک پہنچنے کے لیے طویل جمپ لگائی۔ یقین کریں وہاں شامی اور تیمور کو دیکھ کر ہمارے ہاتھوں کے سارے طوطے، کبوتر اڑ گئے۔ ایک ہی شمارے میں جلیل، راجا، شامی، تیمور! عید کا اس سے پیارا تحفہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ خیر، اپنا جوش دباتے ہوئے واپس فہرست پر آئے اور ٹائم ضائع کیے بنا جاسوسی کی آن، جاسوسی کی شان اور ہماری جان یعنی محفل دوستاں میں پہنچے۔ نور الہدیٰ! آپ کا یہ شکوہ قطعاً بے جا ہے کہ ہم آپ کو بھول گئے ہیں۔ آپ کا تبصرہ اور شعر دونوں بے حد پسند آئے۔ عباسی صاحب محبوب کی گلی کے اتنے چکر مت لگائیں اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ چاچا جی! کیا آپ واقعی نجومی ہیں؟ ندا جی! آپ کے لیے تو صرف اتنا کہوں گا کہ اس دفعہ آپ پہلے نمبر کی حق دار تھیں۔ رضوان تنولی کریزوی صاحب اتنا چراغ پا ہونے کی ضرورت نہیں، ہمیں ندا مغل سے مکمل اور سرکاری اتفاق ہے کہ آپ کا نام واقعی بے حد مشکل ہے۔ حلق میں پھنس جاتا ہے۔ نوشی جی پلیز اجمل بھائی کو بلاؤ۔ شاید آپ کی بات مان لیں ہماری تو کوئی نہیں سنتا۔ بس ان سے یہ گزارش ہے کہ نسوار گھر چھوڑ کے آئیں۔ ہمیں سخت الرجی ہے اس کی بو سے۔ شعاع باجی کو غیر حاضر پا کر ہم خاور کے پاس پہنچے اور بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گئے۔ یہ کیا؟ آخری قسط؟ مگر اتنی جلدی کیوں؟ دل تھا کہ جس سے گزارا رہنا مشکل ہو رہا تھا اور مسلسل بیٹھا جا رہا تھا مگر اوپر سے دماغ صاحب نے اسے تسلی دی کہ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ اب خاور پر درد کا موسم گزر جائے گا اور خوش گوار اختتام ہو جائے گا۔ خیر، اللہ کا نام لے کر شروع ہوئے۔ خاور کی شادی نے سیروں خون بڑھایا مگر پھر لمبی جدائی نے ہمیں بے طرح اداس کر دیا۔ ویل ڈن مغل جی! آپ نے جس خوب صورتی سے انسانی رویوں اور جذبات کی وضاحت کی ہے وہ بلاشبہ لائقِ تحسین ہے۔ حسبِ معمول شامی اور تیمور نئے مسائل میں الجھتے نظر آئے۔ شامی کے مسئلے نے ہمیں بھی پسینے سے شرابور کر دیا۔ اگر سچ مچ شامی صاحب کی ڈائری نواب صاحب کے ہاتھ لگ جاتی تو کیا ہوتا؟ پہلا رنگ شروع سے آخر تک ہمیں بور کرنے میں کامیاب رہا۔ کہانی کا پلاٹ بے حد کمزور تھا۔ اصغر صاحب کو آج سے 20 سال پہلے اغوا کار مختلف نمبر بدل بدل کر فون کرتے رہے۔ ہے نا کتنی عجیب بات؟ عکس در عکس دل پر گہرا نقش چھوڑ گئی۔ واقعی اچھائی ہر انسان میں موجود ہوتی ہے۔ شیر شاہ نے ولی کو اچھائی کے راستے پر ڈال کر اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔ محمد عفان کی پلی نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ بے تحاشا مخالفت کے باوجود بھی وقت نے ثابت کر دیا کہ بابا جلال کا فیصلہ درست تھا۔ بابا جلال اور ان کے بیٹوں کی قربانی نے ہمارے اندر بھی ایثار، ہمدردی اور محبت کے بے شمار جراثیم پیدا کر دیے۔ دو روپے کا نوٹ اور جہد بقا بھی بے حد پسند آئیں۔ عید کا اتنا خوب صورت تحفہ دینے کا شکریہ انکل جی!"

سائرہ مسعود کی پہلی کوشش آزاد کشمیر سے "جاسوسی کی اس بارونق محفل میں پہلی مرتبہ شرکت کر رہی ہوں۔ یقیناً خوش دلی سے ویلکم کیا جائے گا۔ (یقیناً) اب آتے ہیں اکتوبر کے شمارے کی جانب۔ اکتوبر کا شمارہ دو تاریخ کو ملا۔ اس مرتبہ ٹائٹل حسبِ توقع ہلکے اور خوب صورت رنگوں سے مزین ٹھنڈک کا تاثر لیے ہوئے ہے۔ سیاہ زلفوں کی بدلیوں سے روشن پیشانی، غزالی آنکھوں، تیکھی ناک، گلابی ہونٹوں، ماہتابی چہرے اور شہابی گردن کی تمام رعنائیاں لیے حسینہ کسی کی سوچ میں ڈوبی معصومیت کا پیکر نظر آئی۔ (صنفِ نازک کی خوب صورتی تو ذاکر انکل کا کمال مہارت ہے)۔ ساتھ میں ایک خوفناک انداز میں لٹکی لاش غالباً بابر صاحب ہی کی ہے نہایت مضحکہ خیز لگ رہی تھی جبکہ اوپر صنفِ کرخت طاہر سن گلاسز پہنے فاتحانہ قہقہہ بلند کر رہا ہے۔ ہمیشہ کی طرح طاہر انکل کی پرواز سے اسٹارٹ لیا۔ لیکن یہ کیا؟ پرواز اتنی جلدی پرواز کر جائے گی، ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ خیر، ہر چیز کا انجام تو ہوتا ہی ہے۔ گزشتہ تمام اقساط کی طرح یہ قسط بھی متاثر کن رہی۔ یہ کہانی نہایت گہرائی اور درد کا تاثر لیے ہوئے تھی۔ طاہر انکل کی غیر معمولی کردار نگاری انہیں تمام مصنفین میں منفرد و ممتاز بناتی ہے۔ اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے انہوں نے پرواز میں حقیقت کا رنگ بھر دیا۔ محبت کے اس طویل سفر میں بلقیس کو جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا اور خاور

پہ جوظلم وستم ڈھائے گئے، ان کو جواں مردی سے جھیلنے کے بعد بھی دونوں نے اپنی محبت کو جاگیر اور اس سے وابستہ لوگوں پر قربان کردیا۔ بہ قول شاعر

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
کہیں زمیں تو کہیں آسماں نہیں ملتا

بہت سے قارئین کو پرواز کا اختتام پڑھ کر انتہائی مایوسی ہوئی ہوگی لیکن اس میں ایک تلخ حقیقت چھپی ہوئی ہے۔ طاہر انکل نے اپنی اس لازوال تحریر میں رشتوں کے احساسات کو جس خوب صورتی اور گہرائی سے بیان کیا، مدتوں ہمیں سحرزدہ رکھے گی۔ طاہر انکل اتنی شاہکار کاوش تحریر کرنے پر آپ کو بہت بہت مبارک باد۔ تغیر وتبدل میں ڈوبی پُرتجسس وحیرت انگیز داستان گرداب نہایت سنسنی خیز ہے۔ محترمہ اسما قادری نے نہایت خوب صورتی سے بہت عمدہ کردارنگاری کی ہے۔ اتنی پُرتاثیر اور شان دار تحریر پر محترمہ کو صدقِ دل سے دادِ تحسین۔ پروین زبیر کی عکس در عکس قابلِ تحسین اور سبق آموز تحریر تھی۔ باوجود قتل و غارت اور ڈاکازنی کے۔ شیرشاہ کا ضمیر زندہ تھا لیکن وہ اس راستے پر آچکا تھا جہاں واپسی کے تمام دروازے بند ہوجاتے ہیں اور اس راستے پر چلتے رہنا بھی اس کی مجبوری تھی۔ شیرشاہ کے کڑے امتحان نے ولی کو شیرشاہ جیسا قاتل بننے سے روک دیا۔ خوابوں کی دنیا میں زندگی کی رنگینیاں تلاش کرنے والی ایلی نے جب فریڈ جیسے خودغرض شخص کو شریکِ سفر بنایا تو جلد ہی فریڈ کی گھٹیا محبت اس پر آشکار ہوگئی۔ اس کے سارے خواب چکنا چور ہوگئے لیکن اس نے اپنی عزت و وقار کو مجروح ہونے سے بچالیا اور فریڈ کو اس کے انجام تک پہنچادیا۔ شکستِ خواب ایک اچھی تحریر تھی۔ دوروپے کے نوٹ کا معمّا حل کرنے والے کرم چند واقعی جینیئس ثابت ہوئے۔ اپنی حاضر دماغی سے پچیس ہزار بھی وصول کرلیے اور سزا سے بھی بچ گئے۔ ثمر عباس کی وقت کا قیدی میں کارل جو کہ وقت کو اپنی گرفت میں لینا چاہتا تھا لیکن وقت نے اسے مہلت نہ دی اور وہ وقت کے ہاتھوں عبرت ناک انجام کو پہنچا۔ محبت کے سفر میں منزل تک پہنچنے کے لیے نیمو اور کارا کی کو جو سختیاں درپیش آئیں اور دونوں نے جس طرح ڈٹ کر ان کا مقابلہ کیا، یہ جذبۂ محبت ہی تھا جس نے انہیں فاتح بنادیا۔ مصائب اور جدوجہد سے بھرپور داستانِ محبت نے بہت متاثر کیا۔ بلاشبہ مریم کے خان کی جہدِ بقا ایک لاجواب تحریر تھی۔ مدو میں جیل کی غیر اخلاقی حرکات اسے لے ڈوبیں۔ جان اپنی غیر معیاری منصوبہ بندی سے اپنے سنگین جرائم چھپانے میں ناکام رہا اور ہربرٹ نے اس کی ناکامی سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ دولت، محبت اور راجا طنز ومزاح اور شوخیوں سے بھرپور ہلکی پھلکی کہانی تھی جسے پڑھتے وقت بے اختیار قہقہے لگانے پر مجبور ہوگئے۔ پل میں جلال بابا نے ایک فصل کے نقصان پر اپنی عقل مندی اور محنت سے گاؤں میں پل تعمیر کرکے نہ صرف آئندہ کی فصلیں بچائیں بلکہ انعام حاصل کرنے کے ساتھ اپنا نام بھی ہمیشہ کے لیے امر کردیا۔ فیصلہ میں بن فورڈ جونیئر کے حاسدانہ، بدترین اور غیرانسانی رویے نے ایلٹ کی زندگی اس قدر برباد کی کہ انتقام کی خاطر وہ قاتل بننے پر مجبور ہوگیا اور اس نے بیس بچوں کو قتل کرنے سے دریغ نہ کیا۔ بن فورڈ جیسے قابلِ نفرت لوگ معاشرے کے لیے عبرت ہیں۔ سرورق کا پہلا رنگ دنیا گول ہے، احمد اقبال کی بہترین کاوش تھی جس کی روداد معاشرے میں ہونے والے عوامل کے گرد گھومتی ہے۔ دوسرا رنگ تلاشِ گمشدہ اسرار وتجسس اور مزاح سے بھرپور تھا۔ بے چارے بابر کا ائمد عاشق اسے موت کی وادیوں میں دھکیل گیا۔ تیمور کی حاضر دماغی نے شائلہ اور خود کو طاہر سے بچالیا۔ اور اب ہوجائے کچھ تبصرہ دوستوں پر۔ ٹرپل ایس ہمیں آپ کا نام اور منفرد اندازِ تحریر بہت اچھا لگتا ہے۔ آپ صرف کہانیوں کے خلاصے ہی لکھا کریں، وہ بھی خوب طویل کرکے۔ آپ کدھر غائب ہوگئے ہیں؟ جلدی سے محفل میں واپس آجائیں۔ اے جے کسانہ آپ کا خط نہ پاکر محفل خالی خالی سی لگتی ہے۔ پلیز حاضری دیں۔ شان احمد جیسے آپ جلے ہیں، ایسے ہی دوسرے لوگ بھی جلتے ہیں، ٹرپل ایس کے منفرد اندازِ تحریر سے۔ اس میں پوچھنے والی کیا بات ہے۔ اب اجازت چاہتی ہوں اس امید کے ساتھ

اب تو جاتے ہیں بزم سے اے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لائے''

امتیاز علی، بلوچستان سے ''5 اکتوبر کو جاسوسی خرید کے گھر کا 4 کلومیٹر کا فاصلہ 8 منٹ میں طے کیا، جی نہیں پیدل نہیں سائیکل پر۔ ٹائٹل پر لوہے کے ہینگر پر لٹکے ہوئے نوجوان سے نظریں ہٹائیں۔ کھلی زلفوں اور بھیگی آنکھوں والی لڑکی بہت خوب صورت تھی۔ اوپر ایک شخص اپنی فتح کے جوش میں قہقہہ لگا رہا تھا۔ اس کے بعد ایک لمبی سی چھلانگ لگا کر پرواز کے پاس پہنچا جہاں شاہ خاور آخری دیدار کے لیے ہمارے ہی منتظر تھے۔ پرواز کی جدائی اور شاہ خاور کے دکھوں کو پڑھنے کے بعد اس وقت مزید پڑھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ایک دن تک جاسوسی ڈائجسٹ کو ہاتھ بھی نہ لگایا۔ اگلے دن پورے ڈائجسٹ کو چاٹ ڈالا۔ عکس در عکس میں شیرشاہ نے ولی کو احساس دلایا نہ ہوتا تو وہ بھی موت کے راستے پر نکل جاتا۔ شکستِ خواب میں ایلی جین کی عقل ٹھکانے پر آئی۔ دوروپے کا نوٹ میں کرم چند نے گاجر کھا کھا کر دوروپے کے دو کروڑ روپے بنائے اور کیس حل کیا۔ وقت کا قیدی بہت کوشش کے باوجود وقت کو قید نہ کرپایا۔ گرداب میں پھنسی ماہ بانو اتنی جلدی نہیں مرسکتی، ابھی چودھری کو سبق سکھانا ہے۔ جہدِ بقا میں کارا کی اور نیمو نے کافی جدوجہد کے بعد اپنی محبت پائی اور اس جاہل معاشرے سے جان چھڑائی۔ مدو میں ہربرٹ کی مدد حاصل کرنے کے علاوہ جان کے پاس اور کوئی راستہ نہ تھا۔ اس بار بھی جلیل نے خوب ہنسایا۔ شرارت کرکے خالہ اور بجو کو بھگایا اور عید کو رنگین بنایا۔ پل میں بابا جلال نے مستقبل سوچتے ہوئے پل بنایا۔ گاؤں والوں کی فصل بچائی اور خود خوب فائدہ اٹھایا۔ فیصلہ میں بنڈر پاگل ہوگیا تھا کیونکہ بدلہ لینے کے لیے آخر میں بیس بچوں کو مارنے کا فیصلہ کیا۔ سرورق کے پہلے رنگ میں اکبر گول گول گھومتا ہوا آخر اپنے پرانے گھر میں آیا۔ شامی اور تیمور کی شرارتیں کئی دنوں کے بعد دیکھنے کو ملیں۔''

مبشر ریاض ضلع وہاڑی سے لکھتے ہیں ''اس ماہ کا شمارہ خاصا لیٹ ملا۔ سرورق پر موجود حسینہ ایشیائی اور یورپی حسن کا شاہکار تھی۔ اس کے بالکل پاس ہینگر میں کپڑے ٹنگے ہوئے تھے جس میں نئی بات ان کپڑوں کے اندر لاش کا پایا جانا تھا۔ پس منظر میں ایک ولن ٹائپ صاحب عینک پہنے بتیسی کی نمائش کررہے تھے جو کہ ان کے چہرے کے تاثرات سے بالکل لگا نہیں کھارہی تھی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے پرواز پڑھی۔ آخرکار طاہر جاوید مغل کا عقاب اپنی پرواز مکمل کرکے منزل تک پہنچ ہی گیا۔ کہانی خاصی تیز رفتار رہی، اتنی جلدی ختم ہونے کی توقع نہیں تھی۔ عکس در عکس کے ساتھ ایک نصیحت تھی کہ جرائم پیشہ افراد کو کبھی آئیڈیل نہیں بنانا چاہیے۔ شکستِ خواب میں جین نے ایک غلط آدمی کا انتخاب کیا جس سے پتا چلا کہ گواہی کی طرح عورت کی عقل بھی آدھی ہوتی ہے۔ وقت کے قیدی میں یہ ثابت ہوا کہ وقت کو آگے پیچھے کرنے سے کچھ نہیں بدلتا جیسا کہ گھڑیوں کو ایک گھنٹا آگے کرنے سے لوڈشیڈنگ میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ البتہ گرداب کی پروگریس کافی اچھی ہے۔ اسما قادری کی کہانی پر گرفت ابھی کمزور نہیں ہوئی

دل بہار انجم بستی ملوک سے رقم طراز ہیں ''اکتوبر کا جاسوسی بنا کسی مشکل کے مل گیا۔ ذاکر انکل نے سرورق کی حسینہ پر کافی طبع آزمائی کی ہے تبھی تو اتنی شان دار حسینہ سرورق کی زینت بنی۔ ساتھ میں ایک بُری شکل والا شخص بے ڈھنگے انداز میں دانت نکال رہا ہے۔ اسماعیل اوچ! وہ کہاوت ہے نا بندر کیا جانے ادرک کا سواد... اسی لیے آپ کو سرورق کی اہمیت نہیں معلوم۔ ہم تو جب تک اس پر تبصرہ نہ کریں، انگلیوں میں کھجلی ہوتی رہتی ہے۔ ویسے مبارک باد۔ فاطمہ گل جی... لگتا ہے آپ کے بھائی کوئی فیڈر پیتے بچے ہیں جو انہوں نے سرورق کا حشرنشر کیا۔ شان احمد گشکوری یہ سب آپ کی دُعا سے ہے ورنہ بندۂ خاکسار کیا چیز ہے۔ نورالہدیٰ جی، غالباً آپ کی نظر کمزور ہے۔ ایس ایس ناز... جی آیاں نو۔ کبیر عباسی، لیڈیز سے اتنی خار چنگی نہیں ہوتی۔ چاچا نجم نجومی لگتا ہے پانی والے پسٹل سے پچکاریاں مارنے والی عادت بھولے نہیں ہیں۔ بدرامغل جی گستاخی معاف، بھینس کے آگے بین بجا کے بندہ خوار ہی ہوتا ہے۔ مصدق محمود، کنٹرول یار! کہیں مرگی کا دورہ نہ پڑ جائے۔ تبصرہ پسند کرنے کا تھینکس۔ نوشی چودھری، ماہ نور کو آپ کا پیغام مل گیا ہوگا کیونکہ وہ باقاعدگی سے پڑھتی ہے۔ حسینہ جی، آخر تجزیہ بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ باقی جن بہن بھائیوں نے تبصرہ پسند کیا، ان کا شکرگزار ہوں۔ کہانیوں میں گرداب پہلے پڑھی جہاں پر شہریار اناڑی کی طرح مات کھا گیا۔ پرواز کے خاتمے پر خاور کی جان بھی چھوٹ گئی اور ہماری بھی۔ انکل جی اس بار آتش فشاں یا شکاری جیسی کوئی سلسلے وار کہانی شائع کریں۔ دولت، محبت اور راجا میں جلیل کی ایک چال نے سب کچھ پلٹ دیا۔ دوروپے کا نوٹ پُرمزاح تحریر تھی۔ فیصلہ ہمارے سر پر سے گزر گئی۔ مدو میں ہربرٹ تو اپنی بیوی سے بھی دو ہاتھ آگے نکلا۔ شامی اور تیمور کی تلاش گمشدہ میں کے زبیر کے مزاحیہ فقرات بہت اچھے لگے۔''

حسنی یوگو بلتستانی کی شمولیت کراچی سے ''گھنیری زلفیں، غلافی آنکھیں، چاند سا مکھڑا اور گلابی ہونٹ جو بہ قول میر تقی میر پنکھڑی اک گلاب کی سی۔ اتنی خوب صورت دوشیزہ تو بولی ووڈ کی موویز میں بھی نظر نہیں آتی۔ یقیناً یہ ذاکر انکل کے تخیل کی آخری حد ہوگی۔ امیزنگ ٹائٹل۔ شان بھائی عرصے بعد وارد ہوئے اور جان دار تبصرے کے ساتھ پوری شان سے کھڑے تھے۔ رضوان تنولی صاحب آپ کا نام کتنا مشکل ہے۔ یہ پتا لگانے کے لیے آپ اپنے نام کو ایک دفعہ پڑھ بھی لیں۔ نوشی چودھری بھی چھچھاری تھیں۔ اس بار ابنِ مقبول صدیقی بھائی خود سے بھی روٹھے ہوئے نظر آرہے تھے۔ خیر تو ہے بھئی۔ ملکۂ کوہسار کی شہزادی نام کی حد تک حسینہ تھیں اور ان کی باتیں... خیر چھوڑیں جی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے پرواز پڑھنے کے لیے محفل سے پرواز کی۔ مگر یہ کیا؟ آخری قسط... یقین کریں یہ دیکھ کر ہم اتنے حواس باختہ ہوگئے جتنا تو خاور، بیگم بلقیس کی طرف سے شادی کا پیغام سن کر نہیں ہوا ہوگا۔ اگر میں سادہ سے لفظوں میں کہوں تو یہ کہوں گا کہ یہ تو بہت بڑی زیادتی ہوئی۔ ابھی تو کہانی مکمل طور پر جوان بھی نہیں ہوئی تھی اور آپ نے اسے بے موت مار دیا۔ آخری قسط پڑھ کر ہمیں تو ایسا لگا کہ مغل صاحب ہم سے ناراض ہوگئے ہیں اور کہانی کا اینڈ کرکے اپنی ناراضی جتا رہے ہیں۔ بہرحال، کہانی انتہائی جان دار رہی۔ اس نے شروع سے لے کر آخر تک ہمیں اپنی گرفت میں رکھا۔ پرواز سے جدا ہوکر ہم اب کہاں جاتے۔ بڑی مشکل سے خود کو اس سانحے پر تسلی دی۔ کاشف زبیر نے اس کا ازالہ کرنے کے لیے جلیل میاں اور شامی گروپ دونوں کو میدان میں اتارا تھا اور ہم بہت حد تک پرواز کے المیے سے خود کو نکالنے میں کامیاب ہوگئے۔ گرداب کی یہ قسط کچھ خاص نہیں تھی۔ دنیا گول ہے، مفاد پرستوں اور لالچی لوگوں کی خودغرض کہانی تھی جس میں درسِ عبرت بھی تھا اور فسانہ لذت بھی۔ باقی کا رسالہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔ آخر میں تمام قارئین اور خصوصاً محفل ہاؤ ہو کے یاروں کو ایک اطلاع دوں کہ میں اب تک ایف اے حسنی یوگوی کے نام سے خطوط لکھتا رہا ہوں آج سے میں اپنے نئے نام حسنی یوگو بلتستانی سے خطوط لکھا کروں گا۔''

عبدالعزیز ممکوئی کی خامہ فرسائی میانوالی سے ''سب سے پہلے ہم سب آپ کی صحت کے لیے دعاگو ہیں۔ انکل! آپ کی صحت یابی کے لیے میں نے خود کئی بار قرآن مجید ختم کیا اور اللہ سے رو رو کر دعائیں مانگیں کیونکہ انکل آپ ہی ہمارا سب کچھ ہیں۔ آپ ہمارے لیے ایک سرسبز وشاداب درخت کے مانند ہیں۔ انکل! میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ آپ کو یقین دلاسکوں کہ آپ میرے بلکہ ہم سب کے لیے کیا ہیں۔ (ہمیں آپ کے الفاظ اور نیت پر شک نہیں۔ آپ کے پُرخلوص جذبات کے شکرگزار ہیں لیکن آپ کی دعاؤں کی ابھی اور ضرورت ہے۔ آپ کے انکل کی طبیعت ابھی کوئی خاص اچھی نہیں)۔ اس دفعہ جاسوسی بہت لیٹ ملا۔ اس دفعہ بھی جاسوسی کا سرورق خوب صورت تھا۔ سرورق پر تبصرے کے بجائے آگے بڑھتے ہیں۔ سرورق کے بعد اشتہاروں کو پھلانگتے ہوئے اپنی پیاری محفل میں نورالہدیٰ کی صدا پر لبیک کہتے ہوئے ملک محمد اسماعیل کے پاس جاگرے۔ جب حواس بحال ہوئے تو ملک محمد اسماعیل کا ونگ تبصرہ پڑھا جو ایویں ہی تھا۔ ملکہ کوہسار نورالہدیٰ صاحبہ آپ نے دوسرا شعر کچھ غلط لکھ دیا ہے۔ شعر اس طرح ہونا چاہیے تھا۔

گئے کچھ اس ادا سے تبصرہ نگار کہ جاسوسی ہی بدل گیا
کچھ لوگ محفل سے ساری چینی ساتھ لے گئے

پہلے بجلی کی لوڈشیڈنگ ہوتی تھی۔ اب چینی کی بھی لوڈشیڈنگ شروع ہوگئی ہے۔ سب سے پہلے تو پرواز پڑھی۔ پرواز کے ساتھ اینڈ آخری قسط دیکھ کر جلدی جلدی پڑھنی شروع کردی۔ ہم خوش تھے کہ اینڈ اچھا ہوگا۔ پر... کہانی کا اختتام اور شاہ خاور کا انجام پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ آنکھیں بے اختیار اشک بار ہوگئیں۔ دیر تک روتا رہا۔ طاہر جاوید صاحب آپ واقعی بلند پائے کے ادیب ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں مگر ہم غریبوں کا بھی خیال رکھا کیجیے جو آپ کی تحریروں کے دلدادہ ہیں۔ انکل! اگر آپ شاہ خاور اور بلقیس کو ملا دیتے تو آپ کا کیا جاتا؟ ہم دکھ کے ماروں کا بھلا ہوجاتا۔ پرواز بہت اچھی کہانی تھی۔ اسما قادری کی گرداب پڑھی۔ گرداب بہت اچھی کہانی ہے اور بہت اچھی جارہی ہے۔ شہریار اور ماہ بانو کے کردار بہت پسند آئے۔ اس دفعہ کی قسط بہت اچھی تھی۔ گرداب کے بعد اولین صفحات کی کہانی عکس در عکس پڑھی۔ بہت اچھی کہانی تھی۔ شیرشاہ کا کردار بہت اچھا تھا۔ اس نے بُرا ہوکر بھی ولی رحمٰن کو بُرا ہونے سے بچایا۔ یقین مانیں انکل کہ جب کہانی ختم ہوئی تو بے اختیار آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ پروین صاحبہ اتنی خوب صورت کاوش پر مبارک باد قبول کریں۔''

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے مکتوبات شائع نہ ہوسکے۔

ایس ایس ناز، ملتان۔ زوار انجم، جہلم۔ بدیم مغل، گجرات۔ عابد خان بلوچ، خانیوال۔ نثار احمد شیخ، اسلام آباد۔ عبدالسلام صدیقی، ملتان۔ بلیک زیرو پاکیشیا گجرات۔ لبنیٰ کنول، ضلع چکوال (تحفے کا شکریہ)۔ ایم احمد ہاشمی، بونیر۔ مصدق محمود دانش، ضلع گجرات۔ ٹرپل ایس کے اسماعیل، خیبر ایجنسی شاہ کس۔ رشید احمد عادل، مالاکنڈ ڈویژن۔ حافظ محمد وقار اعظم، تحصیل تلہ گنگ۔ یاسمین گل (ای میل)۔ محمد وقاص، گوجرانوالہ۔ ناصر محمود، آزاد کشمیر۔ سرفراز چودھری، ضلع مظفرگڑھ۔ اے اے زیڈ، انجرا آر ایس۔ ہما ساحل، (جگہ نامعلوم)۔

اقبال کاظمی

کائناتِ کل میں دولت ایک ایسا طلسم ہے جو گہرے جذبات یا اتھاہ گہرائیوں میں موجزن محبت ...... کی طاقت کو بھی اپنے سحر میں مقید کرلیتا ہے۔ اس کے سامنے کوزے سے سمندر تک ہر شے بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ ایک بڑے مالیاتی ادارے کے مالک کی زندگی کے گمشدہ اوراق ..... جس کے ایک ایک ورق میں اَن گنت کہانیاں پنہاں تھیں۔

عرصۂ دراز کے بعد آپ کے پسندیدہ مصنف کی پُراثر کاوش اولین صفحات کی سوغات

یہ زندگی بڑی عجیب چیز ہے۔ ہر ایک کی چہیتی، ہر ایک کو پیاری، انسان ہو کہ حیوان، کوئی بھی خوشی سے اس کا دامن چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتا۔ ہر کوئی زندگی سے چپکا رہنا چاہتا ہے۔ خواہ لبِ گور ہی کیوں نہ بیٹھا ہو۔

لیکن... میں زندگی سے دامن چھڑانا چاہتا ہوں۔ آج میری زندگی کا آخری دن ہے بلکہ یہ کہوں گا کہ آخری لمحات گزار رہا ہوں۔ شاید چند منٹ اور اس کے بعد مجھے اس زندگی سے نجات مل جائے گی۔

بات آگے بڑھانے سے پہلے میں آپ کو یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ بیمار، نحیف وناتواں، جو کسی معمولی سی نقل وحرکت کے لیے بھی دوسروں کا محتاج ہے۔ بالکل تنہا، کسی کو مجھ سے محبت نہیں، کوئی مجھے چاہنے والا نہیں، کسی کو میری پروا نہیں۔ اس کے برعکس مجھے ذہنی اذیت اور دکھ پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا جاتا۔ زندگی جب اس کرب میں گزر رہی ہو تو میرے خیال میں اس سے نجات حاصل کرلینا ہی بہتر ہوتا ہے۔ اس لیے میں نے بھی اس بے رحم... سفاک زندگی سے پیچھا چھڑانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ بس کچھ ہی وقت باقی ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹا۔ اس کے بعد میرا نام تو رہے گا لیکن میں نہیں رہوں گا... میرا وجود مٹ جائے گا۔

میں آپ کو ایک... بات بتاتا چلوں کہ میں کوئی کنگلا اور قلاش آدمی نہیں ہوں۔ بے روزگاری کا بھی شکار نہیں ہوں۔ غربت ومفلسی میرا مسئلہ نہیں ہے۔

فولاد، کنکریٹ اور شیشے کی بنی ہوئی یہ چودہ منزلہ عالی شان بلڈنگ، جس میں اس وقت میں بیٹھا ہوا ہوں، میری ملکیت ہے۔ اس کے چاروں اطراف میں ایک ایک میل کا علاقہ بھی میری ملکیت میں شمار ہوتا ہے۔ اس بلڈنگ میں قائم کمپنی، جس میں اس وقت تقریباً دو ہزار ملازمین کام کرتے ہیں، اس کا مالک بھی میں ہوں۔ اس کے علاوہ دنیا بھر میں میرے ملازمین کی تعداد دس ہزار سے بھی زیادہ ہے جنہیں میں اپنی جیب سے تنخواہ دیتا ہوں۔ نیشنل گیس فیلڈ سے آنے والی وہ گیس پائپ لائن بھی میری ملکیت ہے، جس سے آدھے سے زیادہ شہر کو گیس سپلائی کی جاتی ہے۔ رات کے اندھیرے میں اس شہر کو جگمگانے والی روشنیاں بھی میری ہی الیکٹرسٹی کمپنی کی مرہونِ منت ہیں۔ زمین سے میلوں دور اوپر ان دیکھی فضا میں قائم وہ سیٹلائٹ بھی میری ملکیت ہے، جس سے دنیا بھر میں ٹی وی پروگرام دیکھے جاتے ہیں۔

میرے اثاثوں کی مالیت اس وقت گیارہ بلین ڈالرز (اربوں روپے) سے بھی زیادہ ہے جنوبی افریقا میں ہیرے، سکم میں سونے، نیپال میں تانبے اور کرد مائٹ کی لاتعداد کانیں میری ملکیت ہیں۔ کینیا میں چائے اور ملائیشیا میں ربر کے بے شمار باغات اس کے علاوہ ہیں۔ انڈونیشیا میں خام تیل اور قدرتی گیس کے ذخائر پر بھی میری اجارہ داری ہے۔ دنیا کے بیشتر ممالک میں شہروں کو روشن رکھنے کے لیے میری ذیلی کمپنیاں بجلی فراہم کرتی ہیں۔ کمپیوٹر تیار کرنے والی ایک کمپنی اور لاتعداد پبلشنگ ہاؤسز میری ملکیت ہیں۔ میری ہی کمپنیوں کو دنیا کے مختلف ممالک میں بڑے بڑے ڈیم تعمیر کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

دنیا کا کوئی ایسا کھلونا نہیں جو میرے پاس موجود نہ ہو، قیمتی کشتیاں، جیٹ ہوائی جہاز، دنیا کی حسین ترین عورتیں،

یورپ کے مختلف ممالک میں عالی شان بنگلے، کئی ممالک میں زرعی... مویشیوں کی افزائشِ نسل کے فارمز، بحرالکاہل میں ہزاروں مربع میل پر مشتمل ایک خوب صورت جزیرہ بھی میری ملکیت ہے لیکن اب میں اتنا بوڑھا ہو چکا ہوں کہ ان کھلونوں سے جی بہلانے کا وقت بھی گزر چکا ہے۔

آپ یقیناً سوچ رہے ہوں گے کہ اتنی بے حساب دولت ہونے کے باوجود مجھے کیا پریشانی ہو سکتی ہے کہ میں زندگی سے اس قدر عاجز آ گیا ہوں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ میری یہ دولت ہی میری پریشانیوں کی اصل جڑ ہے۔

میں اس دنیا میں بالکل اکیلا اور تنہا بھی نہیں ہوں۔ میں نے اپنی طویل زندگی کے مختلف ادوار میں تین عورتوں سے شادیاں کیں جن سے سات بچے ہوئے۔ ایک بچے کا انتقال ہو گیا۔ میری تینوں سابقہ بیویاں اور چھ بچے میرے سینے پر مونگ دلنے کے لیے اب بھی زندہ ہیں اور ہر وہ کام کرتے ہیں جن سے مجھے ذہنی اذیت پہنچ سکتی ہو۔ میرے ساتویں بچے کا انتقال ہوا تو میں اس وقت ہندوستان میں نہیں تھا۔ مجھے بعد میں پتا چلا کہ اس کی موت میری بیوی کی غفلت اور بے پروائی کی وجہ سے ہوئی تھی لیکن بہر حال، اچھا ہوا جو وہ مر گیا۔ آج اگر وہ زندہ ہوتا تو دوسرے بہن بھائیوں کی طرح وہ بھی اپنی حرکتوں سے مجھے اذیت پہنچانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتا۔

میں اپنی ان سابقہ بیویوں اور بچوں سے تنگ آ چکا ہوں۔ آج وہ سب یہاں جمع ہیں کیونکہ آج زندگی کا طویل سفر ختم کر کے میں موت کے قریب پہنچ رہا ہوں اور وقت آ گیا ہے کہ اپنی دولت ان میں تقسیم کر دوں۔

اس دن کا تو مجھے بہت عرصے سے انتظار تھا اور میں نے بہت سوچ سمجھ کر اس کی باقاعدہ منصوبہ بندی کی تھی۔ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ یہ عالی شان بنگلا چودہ منزلوں پر مشتمل ہے اور بہت لمبے چوڑے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کے سامنے کے رخ پر بہت بڑا پختہ کمپاؤنڈ اور پچھلی طرف وسیع و عریض سرسبز لان اور باغ ہے۔ میں خود چودھویں منزل پر رہتا ہوں۔ یہاں میری رہائش بھی ہے اور پرائیویٹ آفس بھی۔ اکیلے آدمی کے لیے بارہ ہزار مربع فٹ کی جگہ! دوسروں کو حیرت ہو گی مگر مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر میرے لیے آٹھ بائی آٹھ فٹ کا کمرا بھی ہوتا تو مجھے کوئی پریشانی نہ ہوتی۔ بہر حال، یہ سب کچھ میں نے اپنی ذہانت اور محنت سے بنایا تھا اور مجھے اس پر بجا طور پر فخر ہے۔ مجھے یہ بھی حق حاصل تھا کہ میں اپنی اس دولت کو جس طرح چاہوں خرچ کروں، جیسے چاہوں تقسیم کروں لیکن المیہ یہ تھا کہ مجھے چاروں طرف سے شکاری کتوں کی طرح گھیر لیا گیا تھا۔

مجھے اس سے بھی غرض نہیں کہ میری اس دولت سے کسی کو کیا ملتا ہے۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو میں یہ کہوں گا کہ میں نے اس سے ہر وہ فائدہ اٹھایا ہے جس کی توقع کی جا سکتی ہے۔ میں اس وقت وہیل چیئر پر بیٹھا وقت گزرنے کا انتظار کر رہا ہوں اور میں وہ بھی سوچ رہا ہوں جو میں نے زندگی میں نہیں کیا۔ لیکن مجھے ایسی کوئی چیز یاد نہیں آ رہی تھی جو میں نے اس دولت کے بل بوتے پر حاصل نہ کی ہو۔ دنیا کی کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں میں نہ گیا ہوں۔ عیاشی میں بھی کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی اور اب ایسی کوئی خواہش نہیں رہی تھی جسے پورا کرنے کی تمنا ہو۔ میری زندگی کی ہر خواہش، ہر تمنا پوری ہو چکی تھی اور اب میں بہت تھک گیا ہوں۔ اب آرام کرنا چاہتا ہوں۔ ابدی نیند سو جانا چاہتا ہوں۔

جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میری اس دولت سے کسی کو کیا ملتا ہے لیکن میں اس بات کا خیال رکھوں گا کہ اس سے محروم کون رہتا ہے۔

یہ عالی شان بلڈنگ، جس میں اس وقت میں بیٹھا ہوا ہوں، اس کا ڈیزائن میں نے خود تیار کیا تھا۔ میں اس کے ایک ایک پتے سے واقف ہوں کہ کہاں کیا ہے۔ اس لیے میں بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ اس چھوٹی سی تقریب میں کس کو کہاں ہونا چاہیے۔ وہ سب لوگ یہاں پہنچ چکے ہیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ان میں سے کوئی بھی کسی معاملے میں چند سیکنڈ بھی انتظار کرنا پسند نہیں کرتا۔ لیکن آج انہیں یہ انتظار نہیں کھل رہا۔ آج تو انہیں بے لباس کر کے چلچلاتی دھوپ میں بھی کھڑا کر دیا جائے تو وہ بے چون و چرا گھنٹوں کھڑے رہیں گے۔

میری پہلی بیوی کا نام دوزری ہے جس سے میرے چار بچے پیدا ہوئے۔ دوزری کا شمار ایسی عورتوں میں کیا جا سکتا ہے جو اپنے شوہروں کو بھی شاذ و نادر ہی قریب آنے دیتی ہیں اور مجھے حیرت ہے کہ اس عورت سے میرے چار بچے کیسے پیدا ہو گئے تھے۔

دوزری سے میری شادی ہوئی تو اس وقت میری عمر چوبیس سال اور دوزری اٹھارہ سال کی تھی۔ اب وہ بھی میری طرح بوڑھی ہو چکی ہے۔ میں نے کئی برسوں سے اسے نہیں دیکھا اور آج بھی اس سے ملاقات یا اسے دیکھنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ ہم دونوں کی علیحدگی کو پچاس سال ہو چکے ہیں۔

اس نے آج تک دوسری شادی نہیں کی اور میں یہ بات بھی یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت وہ کسی وفا شعار سابقہ بیوی کی طرح غم و اندوہ کی تصویر بنی ہوئی ہو گی اور ممکن ہے اس نے اپنے ہینڈ بیگ میں سیاہ ماتمی لباس بھی رکھا ہوا ہو کہ میری موت کی خبر سنتے ہی وہ لباس پہن کر دھاڑیں مارنا شروع کر دے۔

اس کا سب سے بڑا بیٹا مہتاب باہمن سینتالیس سال کا ہو چکا ہے۔ اس نے میرے نام (باہمن) کی جس طرح مٹی پلید کی ہے اس کا اندازہ کچھ میں ہی لگا سکتا ہوں۔ اس نے مجھے ذلیل و رسوا کرنے میں کبھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ وہ جب انیس سال کا تھا تو منشیات کے استعمال اور منشیات فروشی کے استعمال میں اسے کالج سے نکال دیا گیا تھا۔

مہتاب باہمن کو اس کی اکیسویں سالگرہ پر میں نے ..... ایک کروڑ روپے دیے تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ اس رقم سے کوئی کاروبار کر کے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی کوشش کرے گا۔ لیکن اس نے بھی اپنے بہن بھائیوں کی طرح یہ رقم اپنی عیاشیوں پر پانی کی طرح بہا دی اور تھوڑے ہی عرصے میں قلاش ہو گیا۔

دوزری کے بچوں کی حالت دیکھ کر مجھے دکھ بھی ہوتا ہے اور خون بھی کھولتا ہے۔ میں نے انہیں جو کچھ بھی دیا انہوں نے بے دردی سے اڑا دیا اور اب نہ صرف ان کا بال بال قرضے میں جکڑا ہوا ہے بلکہ اس قابل بھی نہیں ہیں کہ کوئی کام کر کے اپنے حالات میں کوئی خوش گوار تبدیلی لا سکیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ دنیا بھر کی دولت ان میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکتی۔

آج میں اپنی وصیت پر دستخط کرنے والا ہوں۔ وہ سب یہاں جمع ہیں۔ یہ شاید ان کی زندگی کا اہم ترین اور نازک ترین مرحلہ ہے۔ ہر ایک نے امیدوں کے دامن تھام رکھے ہیں۔

نائر میری دوسری بیوی ہے۔ دوزری کے رویے سے دل برداشتہ ہو کر میں اس کی طرف مائل ہوا تھا۔ اپنے حسن و شباب کی بدولت نائر کسی بھی مرد کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی قوت رکھتی تھی۔ وہ میری کمپنی میں اکاؤنٹس کے شعبے میں سیکریٹری کی حیثیت سے ملازم ہوئی تھی۔ میں نے پہلی مرتبہ اسے دیکھا تو اس کے حسن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے اسے ترقی دے کر اپنی پرائیویٹ سیکریٹری بنا لیا اور کاروباری دوروں پر اسے اپنے ساتھ لے جانے لگا۔ اس طرح کچھ ہی عرصے بعد میں نے دوزری کو طلاق دے کر نائر سے شادی کر لی۔ شادی کے وقت نائر عمر میں مجھ سے بائیس سال چھوٹی تھی۔ وہ میری فطرت کو کسی حد تک سمجھ چکی تھی اس لیے یکے بعد دیگرے دو بچے پیدا کرنے میں اس نے دیر نہیں لگائی۔ اس نے مجھے اپنے قریب رکھنے کے لیے بچوں کا سہارا لے رکھا تھا۔ اس کا چھوٹا بیٹا سدھو اپنے دو دوستوں کے ساتھ اسپورٹس کار کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا۔ صورتِ حال خاصی سنگین ہو گئی تھی اور اس معاملے کو عدالت سے باہر طے کرنے میں مجھے پندرہ لاکھ روپے خرچ کرنے پڑے تھے۔

میری تیسری بیوی کا نام سیتا ہے۔ اس سے شادی کے وقت میری عمر چونسٹھ سال تھی جبکہ سیتا اپنی تیسویں سالگرہ منانے کی تیاری کر رہی تھی۔ وہ شادی کے فوراً ہی بعد حاملہ ہو گئی تھی اور ٹھیک نویں مہینے میں اس نے بیٹے کو جنم دیا تھا جس کا نام راون رکھا گیا۔ میں نہیں سمجھ سکا تھا کہ سیتا نے یہ نام کیوں رکھا تھا لیکن وہ اسم بامسمّیٰ نکلا۔ آوارہ گردی میں اس کا کوئی ثانی نہیں۔ دنیا کی ہر برائی کے جراثیم اس میں نظر آتے ہیں۔ وہ ابھی صرف چودہ سال کا ہے لیکن ایسے ایسے گل کھلا چکا ہے کہ مجھے تو سوچ کر بھی شرم آتی ہے۔ ایک مرتبہ کسی دکان سے چیزیں چرانے اور ایک مرتبہ منشیات رکھنے کے الزام میں گرفتار ہو چکا ہے۔ تیسری مرتبہ اپنے سے ایک سال چھوٹی لڑکی کے ساتھ رنگ رلیاں منانے کی کوشش کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان معاملات کو طے کرنے میں مجھے کتنی رقم خرچ کرنی پڑی ہو گی... اور دوسروں کے سامنے کتنی ندامت کا سامنا کرنا پڑا ہو گا۔

راون میں وہ تمام صفات موجود ہیں جو ایک آوارہ گرد اور بدکردار لڑکے میں ہونی چاہئیں۔ تیل میں چپڑے ہوئے

اپریل فول

ایک خاتون کپڑوں پر استری کر رہی تھیں کہ ان کی بچی دوڑی دوڑی آئی۔ ''امی... امی... غضب ہو گیا۔ باورچی خانے میں ایک آدمی گھس آیا ہے اور ملازمہ کو سینے سے لگائے پیار کر رہا ہے۔''

خاتون بری طرح چونک گئیں۔ ''میں ابھی دیکھتی ہوں۔ کون کم بخت شخص ہے؟'' وہ استری رکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''اپریل فول... اپریل فول...!'' بچی نے تالی بجاتے ہوئے کہا۔ ''وہ کوئی اجنبی نہیں بلکہ ڈیڈی ہیں۔''

لمبے بال، جو اوپر سے کھوپڑی پر چپکے رہتے ہیں اور گردن پر قمیص یا کوٹ کے کالر کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔ کانوں میں سونے کی بالیاں، دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں انگوٹھیاں اور بائیں کلائی میں کڑا۔ اسے پڑھنے لکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کبھی موڈ ہوتا ہے تو اسکول چلا جاتا ہے بصورت دیگر آوارہ دوستوں کے ساتھ گھومتا رہتا ہے۔

راون کو دوستوں کے سامنے اس بات کی شرمندگی تھی کہ اس کا باپ اسی سالہ بوڑھا ہے اور بوڑھے باپ کو یہ ندامت تھی کہ اس کا سب سے چھوٹا بیٹا اس نوعمری میں ایسے ایسے گل کھلا رہا ہے کہ بڑے بھی شرما جائیں۔

اپنے دوسرے بہن بھائیوں کی طرح راون بھی یہ امید لگائے بیٹھا ہے کہ میری اس وصیت میں اس کا بھی نام ہوگا اور دوسروں کی طرح اسے بھی خطیر رقم ملے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب بہن بھائی مل کر میری ساری دولت کو چند مہینوں میں اڑا دیں گے۔

میں زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ کسی مرتے ہوئے بوڑھے کو کسی سے نفرت نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن میں اس معاملے میں مجبور ہوں۔ اپنے جذبات پر قابو پانا میرے اختیار میں نہیں رہا۔ یہ سب احسان فراموش، خودغرض اور لالچی ہیں۔ ان کی مائیں مجھ سے نفرت کرتی ہیں اور بچوں کو بھی یہی سکھایا گیا ہے کہ مجھ سے نفرت کریں۔

میں انہیں انسان نہیں سمجھتا۔ یہ گدھ ہیں جو تیز دانت اور نکیلے ناخنوں والے پنجے پھیلائے ہوئے میرے اردگرد منڈلا رہے ہیں اور اس بات کے منتظر ہیں کہ میرا دم نکلے تو میری دولت پر ٹوٹ پڑیں۔

میری ذہنی کیفیت بھی ان سب کے لیے مسئلہ بنی ہوئی ہے ان کا خیال ہے کہ میرے دماغ میں رسولی ہے اور میں بعض اوقات بہکی بہکی باتیں کرنے لگتا ہوں۔ بزنس میٹنگز اور ٹیلی فون پر کسی سے باتیں کرتے ہوئے بھی میں بہک جاتا ہوں۔ ایسے مواقع پر میرے آس پاس بیٹھے ہوئے معاون آپس میں سرگوشیاں کرنے لگتے ہیں اور ایک دوسرے کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ میرے دماغ میں واقعی ٹیومر ہے۔

دو سال پہلے بھی میں نے ایک وصیت لکھی تھی اور اس نوخیز حسینہ کو اپنی ساری دولت کا وارث قرار دیا تھا جو میرے اپارٹمنٹ میں ایک مختصر سا لباس پہنے میرے آس پاس منڈلاتی رہتی تھی۔ میں بھی اس کا دیوانہ تھا۔ اس کی عمر صرف بیس سال تھی اور اس بالی عمریا میں اس نے مجھے اس طرح اپنے سحر میں جکڑ رکھا تھا کہ میں اس کے سوا کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتا تھا لیکن ایک مرتبہ میں نے اسے فون پر کسی سے باتیں کرتے ہوئے سن لیا۔ وہ کوئی خطرناک منصوبہ بنا رہی تھی۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اسے اٹھا کر باہر پھینک دیا اور وصیت کے پُرزے پُرزے کر دیے۔

اس واقعے سے ایک سال پہلے بھی میں نے ایک وصیت... لکھی تھی اور سو سے زائد خیراتی اداروں کو اپنی ساری جائداد اور دولت کا وارث قرار دیا تھا۔ اس کے چند روز بعد ہی اپنے سب سے بڑے بیٹے مہتاب باہمن سے میرا جھگڑا ہو گیا۔ ہم نے دل کھول کر ایک دوسرے کو برا بھلا کہا۔ غصے میں، میں نے مہتاب کو اپنی اس وصیت کے بارے میں بھی بتا دیا۔

یہ ان کے لیے ایک سنسنی خیز انکشاف تھا۔ مہتاب باہمن، اس کی ماں دوزری اور دوسرے بچوں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ انہوں نے میرے خلاف عدالت میں کیس کر دیا۔ ان کا مؤقف یہ تھا کہ چونکہ میرا ذہنی توازن درست نہیں ہے اس لیے مجھے علاج کے لیے ذہنی امراض کے اسپتال میں داخل کرا دیا جائے اور اس وصیت کو منسوخ قرار دیا جائے۔ اگر ان کے وکلا ذہین ہوتے تو شاید اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے مگر وہ پرلے درجے کے احمق ثابت ہوئے۔ وہ عدالت میں اپنا کیس ثابت نہیں کر سکے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میرے وکلا نے انہیں نکلنے ہی نہیں دیا تھا۔ میرے پینل پر ہندوستان کے بہترین وکیل موجود ہیں جنہیں میں گراں قدر معاوضہ دیتا ہوں۔ وہ میرے کسی بھی کیس کی پیروی کرتے ہوئے اپنی تمام تر ذہانت اور قانونی ہتھکنڈوں کو بروئے کار لاتے ہیں اور قانون کو میرے حق میں فیصلہ دینے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اس کیس میں بھی ایسا ہی ہوا۔ مہتاب باہمن گروپ کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ مجھے پاگل خانے بھجوانے کا ان کا خواب چکنا چور ہو گیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت میں بھی ہل کر رہ گیا تھا۔ میں ایسا بددل ہوا کہ اس وصیت نامے کو خود ہی پُرزے پُرزے کر کے جلا کر راکھ کر ڈالا۔

اتنا کھرب پتی ہونے کے باوجود میں بہت سادہ زندگی گزار رہا ہوں۔ میں عام طور پر سفید سلک کا گھٹنوں تک لمبا لبادہ پہنتا ہوں اور بدھ راہبوں کی طرح سر منڈھواتا ہوں۔ میری خوراک بھی بہت سادہ اور معمولی سی ہے۔ اس لیے جسمانی طور پر بہت دبلا پتلا اور کمزور سا نظر آتا ہوں۔

مجھے عام طور پر بدھ کا پیروکار سمجھا جاتا ہے لیکن میں درحقیقت زرتشت ہوں۔ میرے آباواجداد عرصہ پہلے ایران سے آ کر ہندوستان میں آباد ہوئے تھے۔ بعض لوگ مجھے عیسائی بھی سمجھتے ہیں لیکن میرے خیال میں ان لوگوں کے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں کس عقیدے کا حامی ہوں کیونکہ وہ خود بھی عقیدوں کے فرق کو زیادہ نہیں سمجھتے اور ہندوستان جیسے ملک میں تو یہ بحث کچھ اور بھی مشکل نظر آتی ہے۔

میں اس وقت عقیدوں کی بحث میں نہیں الجھنا چاہتا کیونکہ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں تو آپ کو موجودہ صورتِ حال کے بارے میں بتا رہا تھا اور اس وقت صورت حال یہ ہے کہ دوزری (میری اس بیوی کا تعلق بھی ایک زرتشت خاندان سے ہے) اور اس کے بچے مجھ سے نیچے یعنی تیرھویں منزل کے ایگزیکٹو کانفرنس روم میں موجود ہیں۔ یہ بہت وسیع و عریض کمرا ہے بلکہ اسے ہال کہنا مناسب ہوگا۔ دیواروں پر چار فٹ تک دنیا کا بہترین ماربل اور اس سے اوپر مہاگنی کے پینل بنے ہوئے ہیں۔ فرش پر دبیز قالین بچھے ہوئے ہیں اور کمرے کے وسط میں بہت بڑی بیضوی شکل کی میز ہے جس کے گرد شاندار کرسیاں رکھی ہوئی ہیں۔ اطراف میں آرام دہ صوفے بچھے ہوئے ہیں۔

میں چشمِ تصور سے دیکھ رہا ہوں کہ اس کمرے میں موجود دوزری اور اس کے بچے شدید اضطراب کا شکار ہیں۔ یہ لوگ اپنے قانونی مشیروں کو بھی ساتھ لائے ہیں اور یہ میرے لیے حیرت کی بات نہیں کہ ان سے زیادہ تعداد ان کے وکیلوں کی ہے۔ دوزری اور اس کے چار بچوں کے ساتھ ایک ایک جبکہ مہتاب باہمن کے ساتھ تین وکیل ہیں۔ مہتاب باہمن ان میں سب سے بڑا ہے اور شاید اپنی اہمیت جتانے کے لیے قانونی مشیروں کی پوری ٹیم کو اپنے ساتھ لے کر آیا ہے۔ میز کے ایک طرف بہت بڑی ڈیجیٹل اسکرین لگی ہوئی ہے جس پر اس تقریب کی کارروائی دکھائی جائے گی۔

میرا دوسرا بیٹا مہتاب کا چھوٹا بھائی فرشید ہے جو اس وقت چوالیس سال کا ہو چکا ہے۔ اس نے حال ہی میں امبر نامی ایک ایسی ہندو عورت سے شادی کی ہے جو پلے بوائے جیسے میگزین کے لیے عریاں تصاویر کھنچوانے میں خاصی شہرت رکھتی ہے۔ میرا خیال ہے یہ فرشید کی تیسری بیوی ہے۔ مجھے نہیں معلوم فرشید نے اس سے پہلی دو بیویوں کا کیا کیا تھا۔ یہ تیسری تھی یا چوتھی۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بہرحال وہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ یہاں موجود ہے اور

> ایک معمر لکھ پتی عموماً لڑکیوں کو یہ بتاتا ہے کہ وہ دل کا مریض ہے اور ڈاکٹر نے سختی سے اسے نارمل رہنے کا مشورہ دیا ہے۔ حالانکہ دل کے مرض اور ڈاکٹروں کے مشورے والی بات غلط ہے مگر لڑکیاں اس کے جھوٹ پر اعتبار کر لیتی ہیں۔
>
> پھر جب وہ کسی لڑکی کو گھر لے جاتا ہے تو ایک اور جھوٹ بولتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے وصیت کی ہے کہ میری ساری دولت اسی کو دے دی جائے جو میری موت کے وقت میرے پاس ہو۔
>
> اور تب وہ لڑکی اپنی سی ہر ممکن کوشش کر ڈالتی ہے کہ انتہائی محبت اور انتہائی مہربانی سے اسے اسی رات قتل کر دے۔

دوسروں کی طرح وہ بھی اس انتظار میں ہے کہ میری کھربوں کی دولت کس طرح تقسیم کی جاتی ہے۔

دوزری کی پہلی اور میری سب سے بڑی بیٹی سمرا بھی اس کمرے میں موجود ہے۔ سمرا کو میں اپنی اولاد میں سب سے زیادہ چاہتا تھا لیکن کالج جا کر وہ مجھے بھول گئی اور جب اس نے ایک سکھ سے شادی کر لی تو میں نے اس کا نام اپنی وصیت سے کاٹ دیا۔

سوسن، دوزری کی سب سے چھوٹی بیٹی ہے جس نے ایک ڈاکٹر سے شادی کر لی تھی۔ ڈاکٹر کا خیال تھا کہ سوسن سے شادی کے بعد وہ کروڑ پتی بن جائے گا لیکن بہت جلد اس کا یہ خواب چکنا چور ہو گیا اور اب اس کا بال بال قرضے میں جکڑا ہوا ہے۔

میری دوسری بیوی نائر اور اس کی بیٹی دسویں منزل کے ایک کمرے میں بیٹھے بڑی بے چینی سے وقت گزرنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ کئی سال پہلے میرے طلاق دینے کے بعد نائر نے دو شادیاں اور کی تھیں مگر دونوں مرتبہ اسے طلاق ہو گئی تھی۔ آج کل وہ اکیلی رہ رہی ہے۔ پہلے مجھے شبہ ہوا تھا کہ اس جیسی عورت مرد کے بغیر کیسے رہ سکتی ہے۔ میں نے ایک پرائیویٹ سراغ رساں ادارے سے اس کے بارے میں تحقیق بھی کروائی تھی مگر میرا یہ شبہ غلط نکلا تھا۔ بہت طویل عرصے سے کسی مرد کو اس کی خواب گاہ میں نہیں دیکھا گیا تھا۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ اس کا بیٹا سمدھو کار کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا البتہ اس کی بیٹی مرینہ اس وقت اپنے دوسرے شوہر کے ساتھ اس کمرے میں موجود ہے۔ مرینہ کا شوہر ایم بی اے ہے۔ میرے خیال میں ڈگری بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔ وہ کام کرنے کا سلیقہ جانتا ہی

نہیں۔ اگر اسے دس کروڑ روپے بھی دے دیے جائیں تو وہ اس رقم کو بھی دو تین سال میں اڑا دے گا۔

راون پانچویں منزل کے ایک کمرے میں آرام دہ صوفے میں دھنسا بائیں ہاتھ کی انگلی میں انگوٹھی کو بار بار ہونٹوں کے کنارے دباتے ہوئے ماں کو گھور رہا تھا۔ اس وقت اس کے حلیے میں ایک مضحکہ خیز تبدیلی یہ آئی تھی کہ اس نے اپنے بال گہرے براؤن رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

راون کا خیال تھا کہ وہ آج رات سے پہلے پہلے کروڑ پتی بن جائے گا۔ وہ بھی اپنے ساتھ ایک قانونی مشیر لایا ہوا تھا جو لباس اور شکل وصورت سے گیا گزرا ہی لگتا تھا۔ اس وکیل کو راون کی ماں سیتا نے ایک ٹی وی پروگرام میں دیکھا تھا اور اسے تلاش کر کے اپنا قانونی مشیر مقرر کر لیا تھا۔ سیتا بھی اس کمرے میں موجود تھی۔ اس کی گود میں لمبے بالوں والا ایک چھوٹا سا کتا تھا جس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ کبھی راون اور کبھی وکیل کی طرف دیکھ رہی تھی۔

یہ سب میرے اپنے تھے۔ ان میں کوئی بھی اجنبی نہیں تھا۔ میں ایک ایک کو اچھی طرح بلکہ بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔

میں وہیل چیئر پر بیٹھا ان لوگوں کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ وکرم دروازے میں داخل ہوا۔ وہ میرا پرانا خدمت گار تھا۔ تیس سال سے میرے ساتھ تھا اور میرے مزاج کو بھی اچھی طرح سمجھتا تھا۔ وہ قدموں کی آواز پیدا کیے بغیر چلتا ہوا میرے سامنے آ کر مؤدبانہ انداز میں جھکا اور دونوں ہاتھ ناف پر باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

''کیسی طبیعت ہے مہاراج؟'' اس نے نہایت مؤدبانہ لہجے میں پوچھا۔

میں نے جواب نہیں دیا۔ اس کے ہر سوال کا جواب دینا میں ضروری نہیں سمجھتا تھا۔

''کافی پینا پسند کریں گے مہاراج؟'' اس نے پوچھا۔ وہ مجھے ہمیشہ مہاراج ہی کہتا تھا۔

''نہ۔'' اس مرتبہ میں نے مختصر سا جواب دیا۔

وکرم نے پلکیں جھپکا کر میری طرف دیکھا۔ پہلے سے کچھ زیادہ جھکا اور سیدھا ہو کر دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ بھی امید لگائے بیٹھا ہے کہ میرے مرنے کے بعد میری دولت میں سے اسے بھی کچھ حصہ ملے گا اور میرا خیال ہے دوسروں کی طرح وہ بھی میری زندگی کے دن گن رہا ہے۔

دولت مند ہونے کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ آپ کے آس پاس رہنے والا ہر شخص آپ سے کوئی نہ کوئی امید لگائے رکھتا ہے۔ کوئی قیمتی تحفہ... کسی کھرب پتی آدمی کے لیے دس بیس لاکھ کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ کیا فرق پڑے گا آپ کو؟ مجھے دس بیس لاکھ روپے قرض دے دو اور پھر ہم دونوں ہی اسے بھول جائیں گے۔ اور نہیں تو چلو اپنی وصیت ہی میں میرا نام لکھ دو۔ اس وصیت نامے میں میرے نام کے لیے تھوڑی بہت گنجائش تو ہو گی۔

وکرم کو آپ اتنا سیدھا سادہ مت سمجھیے۔ وہ بہت گھنا اور چالاک آدمی ہے۔ ہمیشہ اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھتا ہے۔ ہر وقت کسی نہ کسی تاک میں رہتا ہے۔ کئی سال پہلے میں نے اسے اپنی ایک میز کی دراز کی تلاشی لیتے ہوئے پکڑ لیا تھا۔ اسے شاید اسی وصیت نامے کی تلاش تھی جو ان دنوں میں نے تیار کر رکھا تھا۔ وکرم بھی دوسروں کی طرح میری جلد موت کا خواہاں تھا۔ اسے توقع ہے کہ میری موت کے بعد چند لاکھ روپے اسے بھی مل جائیں گے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسے مجھ سے ایسی توقع وابستہ رکھنے کا کیا حق پہنچتا ہے؟ میں نے کئی سال پہلے ہی اسے نوکری سے نکال دیا ہوتا۔

میں نے اپنی وصیت میں کہیں اس کا تذکرہ تک نہیں کیا تھا۔

وکرم نے ٹرے میرے سامنے رکھ دی۔ اس میں رنز بسکٹ کا بند ڈبا، شہد کی ایک چھوٹی سیل بند بوتل اور بارہ اونس جوس کا ڈبا۔ وکرم کو ان باتوں کا خیال رکھنا پڑتا تھا کہ کوئی بھی کھلی ہوئی چیز میرے سامنے نہیں لائی جا سکتی تھی۔ وہ اس بات سے اچھی طرح واقف تھا کہ کسی معمولی سی غلطی پر میں اسے کھڑے کھڑے نوکری سے نکال سکتا تھا۔

میں نے اسے جانے کا اشارہ کیا۔ پہلے شہد کی چوڑے منہ والی بوتل کھولی پھر بسکٹ کا ڈبا کھول کر ایک بسکٹ نکالا اور شہد میں ڈبونے لگا۔ یہ میرا آخری کھانا تھا۔

☆☆☆

میں وہیل چیئر پر بیٹھا شیشے کی دیوار سے باہر دیکھ رہا تھا۔ دن روشن اور صاف ہو تو میں اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے کئی میل دور ممبئی بندرگاہ تک بھی آسانی سے دیکھ سکتا ہوں۔ لیکن آج مطلع صاف نہیں تھا۔ آسمان پر ہلکے بادل تھے اور دھندسی پھیلی ہوئی تھی۔ تیز ہوا کے جھونکے چل رہے تھے جس سے فضا میں خنکی سی آ گئی تھی اور میرے خیال میں آج کا دن مرنے کے لیے بہترین تھا۔

مجھے اپنے آپ کو موت کے منہ میں دھکیلنے کا کوئی افسوس نہیں تھا اور نہ ہی یہ خوف تھا کہ مجھے کوئی تکلیف ہو گی۔ اگر تھوڑی بہت تکلیف ہو گی بھی تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں نے تو پوری زندگی اذیت و کرب میں گزاری ہے۔

میں نے ایک بٹن دبا دیا۔ بزر کی آواز معدوم ہونے سے پہلے ہی وکرم الہ دین کے جن کی طرح حاضر ہو گیا اور میرا اشارہ پا کر وہ پیچھے سے میری وہیل چیئر دھکیلنے لگا۔ اپنے کمرے کے دروازے سے نکل کر ہم مختصر سی راہداری میں آ گئے۔ اس سے آگے ماربل ہال تھا جس کے دوسری طرف ایک اور دروازہ تھا۔ ہم لمحہ بہ لمحہ قریب پہنچ رہے تھے لیکن میرے دل میں نہ تو کوئی تجسس تھا اور نہ ہی دماغ میں کوئی سنسنی۔

وہ لوگ دو گھنٹوں سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ گھڑیاں اور پل گن رہے تھے۔ انہیں تو ایک ایک لمحہ صدیوں پر بھاری محسوس ہو رہا ہو گا۔

دفتر والے کشادہ کمرے سے گزرتے ہوئے میں نے اپنی نئی سیکرٹری کی طرف دیکھ کر سر ہلا دیا۔ رتنا کی عمر بائیس تیئس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کے حسین ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں تھا۔ اسے یہاں آئے ہوئے صرف چار مہینے ہوئے تھے اگر میں اس پر ذرا سی بھی توجہ دیتا تو وہ میری بیوی نمبر چار بن سکتی تھی۔ لیکن اب میرے پاس کسی پر توجہ دینے کا وقت نہیں رہا تھا۔ میرے پاس زندگی کے صرف چند منٹ ہی تو رہ گئے تھے۔

میرے وارثوں کا ایک ہجوم میرا منتظر ہے۔ ان کے ساتھ قانون داں بھی ہیں اور ماہرین نفسیات بھی جو اس امر کا جائزہ لیں گے کہ میں ذہنی طور پر صحت مند ہوں یا نہیں۔ وہ سب میرے کانفرنس روم میں ایک لمبی میز کے گرد جمع ہیں۔ جب میں کمرے میں داخل ہوا تو اس طرح خاموشی چھا گئی جیسے وہاں کسی ذی روح کا وجود ہی نہ ہو۔ ہر شخص سانس روکے... پلکیں جھپکائے بغیر مجھے دیکھ رہا تھا۔ وکرم نے میری وہیل چیئر میز کے ایک طرف روک دی تھی جہاں میرے ساتھ ہی ایک کرسی پر میرا قانونی مشیر سلطان زیدی بیٹھا ہوا تھا۔

کمرے میں کئی ویڈیو کیمرے بھی موجود ہیں اور کیمرا مین ایک ایک چیز، ایک ایک چہرے کو فوکس کر کے سلولائیڈ کے فیتے پر محفوظ کر رہے ہیں۔ اس کمرے میں ہونے والی ہر سرگوشی، ہر حرکت اور ہر آواز ریکارڈ کی جائے گی۔ کیوں نہ ہو... بازی بہت اونچی ہے۔ کھربوں روپے کی وراثت داؤ پر لگی ہوئی ہے۔

میں نے جس پچھلے وصیت نامے پر دستخط کیے تھے اس میں میرے بچوں کے لیے بہت کم حصہ رکھا گیا تھا۔ یہ وصیت نامہ بھی ہمیشہ کی طرح میرے قابل اعتماد قانونی مشیر سلطان زیدی ہی نے تیار کیا تھا اور آج صبح میں نے وہ وصیت نامہ پھاڑ دیا تھا۔

آج میں یہاں ان لوگوں کے سامنے اس لیے بیٹھا ہوں کہ یہ ثابت کر سکوں کہ میں ذہنی طور پر بالکل تندرست ہوں اور اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق اپنی نئی وصیت تیار کر سکتا ہوں۔ میری ذہنی تندرستی ثابت ہو جانے کے بعد میرے اثاثوں کی تقسیم کے حوالے سے کوئی بھی اعتراض نہیں کر سکے گا۔ کوئی سوال نہیں اٹھایا جائے گا۔

میرے سامنے میز کے دوسری طرف تین ماہرین نفسیات بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان تینوں کو میری سابق بیویوں اور بچوں نے بھاری معاوضہ دے کر یہاں بلایا ہے۔ ایک ماہر نفسیات میری ایک فیملی کی نمائندگی کرتا ہے۔ گویا تین فیملیوں کے تین نمائندے۔ ان کے سامنے رکھے ہوئے کارڈز پر ان کے نام بھی لکھے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر پریم شرما، ڈاکٹر ہیرا سنگھ اور ڈاکٹر ریاض مرزا... میں نے باری باری ان کے چہروں کا جائزہ لیا اور آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ مجھے اپنے آپ کو صحیح الدماغ اور ہوش مند ثابت کرنا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ میں ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کروں۔

شاید وہ مجھے بے وقوف سمجھ رہے ہوں لیکن میں نے بھی سوچ لیا ہے کہ اپنی باتوں سے ان کے ہوش اڑا دوں گا۔

اس شو میں کمپیئرنگ کے فرائض سلطان زیدی کو ادا کرنے تھے۔ جب تمام انتظامات مکمل ہو گئے۔ ہر شخص اپنی جگہ پر بیٹھ گیا اور کیمرے آن ہو گئے تو سلطان زیدی نے کیمروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

احتیاط

ایک شخص نے اپنے دوست سے پوچھا۔ ''کیوں بھئی تم نے گانے کی مشق کیوں چھوڑ دی؟''

''اپنے گلے کی وجہ سے۔'' دوست نے جواب دیا۔

دوست نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیوں گلے کو کیا ہوا؟''

دوسرے دوست نے جواب دیا۔ ''پڑوسیوں نے دبانے کی دھمکی دی تھی۔''

(انتخاب، عتیق عابد، مصری شاہ لاہور)

''میرا نام سلطان زیدی ہے اور میں مسٹر فیروز باہمن کا قانونی مشیر ہوں۔ جو میرے دائیں طرف وہیل چیئر پر بیٹھے ہوئے ہیں۔'' اس نے ہاتھ سے اشارہ کر کے میری نشان دہی کی۔

میں ایک بار پھر باری باری ان ماہرین نفسیات کی طرف دیکھنے لگا۔ میں ان کی آنکھوں میں اس طرح دیکھتا رہا کہ انہیں خود ہی نظریں جھکا لینی پڑیں یا وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔

ان تینوں نے سیاہ بزنس سوٹ پہن رکھے تھے۔ پریم شرما اور ہیرا سنگھ کے چہروں پر ہلکی ڈاڑھیاں تھیں۔ ریاض مرزا نے بوٹائی پہن رکھی تھی اور اس کی عمر تیس سے زیادہ نہیں تھی۔ میری تینوں سابق بیویوں اور ان کے بچوں کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ جس ماہرِ نفسیات کی خدمات چاہیں حاصل کر سکتے ہیں۔

سلطان زیدی کہہ رہا تھا۔

''اس میٹنگ کا مقصد ماہرین نفسیات کی موجودگی میں یہ ثابت کرنا ہے کہ مسٹر فیروز باہمن دماغی طور پر اپنی وصیت تیار کرنے کے اہل ہیں یا نہیں۔ اگر تینوں ماہرین نفسیات نے انہیں ذہنی طور پر تندرست اور ہوش و حواس میں پایا تو مسٹر فیروز باہمن اس وصیت نامے پر دستخط کر دیں گے جس کی رو سے ان کے انتقال کے بعد ان کے اثاثے تقسیم ہوں گے۔''

سلطان زیدی خاموش ہو کر سامنے میز پر رکھے ہوئے وصیت نامے کے کاغذات کے ایک انچ موٹے پلندے پر ہاتھ مارنے لگا۔ کیمروں کا رخ فوراً ہی کاغذات کے اس پلندے کی طرف مڑ گیا۔ مجھے یقین ہے کہ میری تینوں فیملیوں کے افراد اپنے سامنے لگی ہوئی اسکرینز پر کاغذات کا یہ پلندا دیکھ کر سانس لینا بھول گئے ہوں گے۔

ان میں سے کسی نے یہ وصیت نہیں دیکھی تھی اور نہ ہی کسی کو یہ حق حاصل تھا۔ وصیت نامہ ایک ایسی پرائیویٹ دستاویز ہوتی ہے جسے وصیت کرنے والے کی موت کے بعد ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ ورثا صرف یہ قیاس آرائیاں ہی کر سکتے ہیں کہ اس میں ان کے لیے کیا ہوگا۔ میرے ورثا کو کچھ اشارے مل گئے تھے۔ ان میں کچھ جھوٹ بھی تھا اور کچھ مبالغہ بھی۔

میں نے بڑی ہوشیاری سے یہ ساری پلاننگ کی تھی جس سے وہ لوگ یہ یقین کرنے کو تیار ہو گئے تھے کہ میری دولت کا بڑا حصہ میرے بچھ بچوں میں تقسیم ہو جائے گا اور میری سابقہ بیویوں کو اتنے قیمتی تحائف ملیں گے کہ وہ مطمئن ہو جائیں گی۔

ایسی ہی وصیت کے لیے تو وہ ہفتوں بلکہ مہینوں سے گڑگڑا کر دعائیں مانگ رہے تھے، یہ ان کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ تھا کیونکہ وہ سب قرضوں کے بوجھ تلے اس قدر دبے ہوئے تھے کہ دو دو تین تین جنم لینے کے بعد بھی سر نہیں اٹھا سکتے تھے۔

میرے سامنے پڑی ہوئی وصیت سے گویا یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ وہ راتوں رات کروڑ پتی بن جائیں گے اور ان کی تمام مشکلیں ختم ہو جائیں گی۔

یہ وصیت نامہ میرے قانونی مشیر سلطان زیدی نے تیار کیا تھا اور میری ہدایت کے مطابق اس نے جیسے بے خیالی میں فائل کور پر موٹے موٹے حروف میں لکھ دیا تھا، میرے ہر بچے کو پانچ سو سے آٹھ سو ملین روپے ملیں گے جبکہ پچاس ملین تک کی رقم میری تینوں سابقہ بیویوں کو بھی ملے گی۔ حالانکہ طلاق کے وقت انہیں ان کا حق ادا کر دیا گیا تھا۔ لیکن میں نے پچھلے تمام حساب بھلا دیے تھے۔ تینوں فیملیز میں مجموعی طور پر پانچ بلین روپے کی رقم تقسیم ہوگی جبکہ باقی رقم ٹیکس کی ادائیگی کے بعد خیراتی اداروں کو دے دی جائے گی۔

یہ فائل کور میری سابقہ بیویوں اور بچوں کے وکیل دیکھ چکے تھے۔ فائل کور پر لکھی ہوئی باتیں ان تک بھی پہنچ چکی تھیں اور اس لیے وہ سب آج یہاں جمع تھے۔ ان میں سے کسی کے چہرے پر میرے لیے ہمدردی یا افسوس کے تاثرات نہیں ہیں۔ البتہ وہ بے چین ضرور ہیں کہ کہیں وقت پر میں اپنی وصیت نہ بدل دوں۔ انہوں نے اپنے ساتھ لائے ہوئے ماہرینِ نفسیات کو بھی خبردار کر دیا تھا۔

''اس بوڑھے پر زیادہ دباؤ مت ڈالنا، ہم اسے صحیح الدماغ اور ہوش مند ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔''

اگر ہر کوئی اپنی جگہ پر خوش ہے اور مطمئن ہے تو پھر یہ ماہرین نفسیات کا ڈراما کیوں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں انہیں آخری لمحوں تک کھینچنا چاہتا ہوں۔ ماہرینِ نفسیات والی تجویز میری ہی تھی۔ لیکن میری سابقہ بیویاں، میرے بچے اور ان کے قانونی مشیر اس قدر کند ذہن ثابت ہوئے تھے کہ اس معاملے کی باریکی کو نہیں سمجھ سکے تھے۔

ماہرین نفسیات نے میری ذہنی کیفیت جانچنے کے لیے سوالات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ پہل ڈاکٹر پریم شرما نے کی تھی۔

''مسٹر فیروز باہمن! کیا آپ بتانا پسند کریں گے کہ آج کیا تاریخ ہے، اس وقت کیا بجا ہے اور یہ کون سی جگہ ہے؟''

اس سوال پر میں اپنے آپ کو پہلی کلاس کا بچہ سمجھنے لگا۔ میں نے سر جھکا لیا۔ میں جواب دینے سے پہلے اتنا وقت لینا چاہتا تھا کہ ان میں تھوڑی سی بے چینی تو پیدا ہو۔

''آج پیر کا دن ہے۔'' بالآخر میں نے مدھم لہجے میں جواب دیا۔ ''پیر، 9 دسمبر 1996ء اور یہ جگہ میرا دفتر ہے۔''

''وقت؟'' اس نے سوال کا ایک حصہ دہرایا۔

''تقریباً ڈھائی بجے دوپہر۔'' میں نے جواب دیا حالانکہ میرے پاس گھڑی نہیں تھی۔

''اور آپ کا یہ آفس کہاں پر ہے؟'' اگلا سوال کیا گیا۔

''چوپاٹی، ممبئی میں۔ ساحلِ سمندر کے قریب۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیا آپ اپنے بچوں کے نام اور ان کی تاریخِ پیدائش بتا سکتے ہیں؟'' یہ سوال ڈاکٹر ہیرا سنگھ نے کیا تھا۔

''نام تو بتا سکتا ہوں لیکن تاریخِ پیدائش نہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ آپ نام ہی بتائیے؟'' ڈاکٹر ہیرا سنگھ نے کہا۔

میں چند لمحے خاموش رہا۔ جان بوجھ کر فوری طور پر جواب نہیں دیا۔

''مہتاب باہمن!'' بالآخر میں نے کہا۔ ''فرشید، سمرا، سوسن، مرینہ اور راون۔'' میرا انداز ایسا تھا جیسے یہ نام لیتے ہوئے بھی مجھے تکلیف ہو رہی ہو۔

''آپ کا ایک ساتواں بچہ بھی تھا؟'' یہ سوال بھی ہیرا سنگھ ہی نے کیا تھا۔

''ہاں، اس کا نام سدھوتھا۔'' میں نے جواب دیا۔

''اس کا انتقال کیسے ہوا تھا؟''

''وہ کار کے حادثے میں ہلاک ہوا تھا۔'' میں نے کہا۔ میں بالکل سیدھا بیٹھا باری باری ان تینوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کیمرے میرے سامنے تھے۔ میں یہ چاہتا تھا کہ یہ کیمرے بھی میرے چہرے کے تاثرات ریکارڈ کر لیں۔ مجھے یقین تھا کہ دوسرے کمروں میں موجود میری تینوں سابقہ بیویاں، ان کے بچے اور قانونی مشیر اپنے سامنے لگی ہوئی اسکرینز پر یہ سب کچھ دیکھ رہے ہوں گے اور مجھے اس قدر ہوش مند پا کر بہت خوش ہو رہے ہوں گے۔ میری آواز اگرچہ کچھ مدھم تھی۔ اپنے حلیے سے بھی احمق لگ رہا ہوں گا لیکن میں نے ان کے سوالوں کے بالکل ٹھیک ٹھیک جوابات دیے تھے۔

تعارف

شرابی رات دو بجے شراب کے نشے میں روڈ پر جا رہا تھا۔ ایک کانسٹیبل نے اسے روکا اور پوچھا۔ ''صاحب آپ کون ہیں؟''

شرابی نے کہا۔ ''میں کوئی بھی ہوں۔ تم سے میرا کیا کام؟''

کانسٹیبل نے کہا۔ ''بتاؤ ورنہ چالان کر دوں گا۔''

شرابی نے جواب دیا۔ ''پھر میرا پتا سنو۔ یہاں سے سیدھے گلی نمبر 6 میں جاؤ، وہاں مڑ کر مکان نمبر 48 دیکھو اور وہاں گھنٹی بجاؤ۔ نکلنے والے سے پوچھو کہ مائیکل گھر پر ہے اگر وہاں سے جواب ملے ادھر نہیں ہے تو سمجھو کہ وہ میں ہی ہوں۔''

(انتخاب: امداد اللہ سوکڑی کریم خان، ہنوں)

''آپ کی موجودہ فزیکل کنڈیشن کیسی ہے مسٹر باہمن؟'' ڈاکٹر ریاض نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں اور بہتر محسوس کر رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''سنا ہے آپ کو کینسر ٹیومر ہے؟''

''میرا خیال ہے یہ میرا ذہنی آزمائش کا پروگرام ہے اس میں کسی جسمانی تکلیف کا ذکر نہیں ہونا چاہیے۔'' میں نے سلطان زیدی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ ان ماہرین نفسیات کو کسی بھی قسم کا سوال کرنے کی اجازت تھی، یہ کوئی عدالت تو نہیں تھی کہ کسی سوال پر اعتراض کیا جاتا۔

''آپ کا خیال درست ہے مسٹر فیروز باہمن۔'' ریاض مرزا نے کہا۔ ''لیکن ہمارا کوئی بھی سوال غیر متعلق نہیں ہوگا۔ کیا آپ میرے سوال کا جواب دینا پسند کریں گے؟''

''کس سلسلے میں؟'' میں نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''ٹیومر!'' ریاض مرزا بولا۔ ''کیا یہ درست ہے کہ آپ کو کینسر ٹیومر ہے؟''

''میرے دماغ میں رسولی ہے۔ گولف کی گیند کے برابر۔ جو روز بروز بڑھ رہی ہے۔ آپریشن ہونا ممکن نہیں اور میرے ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ تین مہینے زندہ رہ سکوں گا۔'' میں چشمِ تصور سے اپنی سابقہ بیویوں اور بچوں

کے چہروں پر مسکراہٹ دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنے دماغ میں ٹیومر کی تصدیق کر دی تھی اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ تین مہینوں سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکوں گا اور وہ لوگ شاید دل ہی دل میں جشن منانے کے منصوبے بنا رہے تھے۔

''کیا اس وقت آپ کسی مسکن دوا، نشہ آور دوا یا الکحل کے زیر اثر ہیں؟''

''نہیں، میں نے ایسی کوئی چیز استعمال نہیں کی۔''

''کیا اس وقت آپ کے پاس کوئی ایسی دوا موجود ہے جس کے استعمال سے فوری طور پر درد رفع ہو سکے۔ میرا مطلب ہے کوئی پین کلر؟''

''نہیں۔'' اس مرتبہ میرا جواب بہت مختصر تھا۔

''مسٹر باہمن!'' ڈاکٹر پریم شرما ایک بار پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تین مہینے پہلے فوربس میگزین نے یہ انکشاف کیا تھا کہ آپ کا نقد سرمایہ پچاس ارب روپے سے زیادہ ہے۔ کیا یہ درست ہے یا محض اندازہ؟''

''فوربس کے ماہرین کے اندازے ہمیشہ غلط ثابت ہوئے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ فوربس کے یہ اعداد و شمار درست نہیں ہیں؟''

''بالکل نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اس وقت میرا نقد سرمایہ پچیتر اور اسی ارب کے درمیان ہے۔ مارکیٹ کے اتار چڑھاؤ سے اس میں تھوڑی بہت کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔'' میرا لہجہ اگرچہ دھیما تھا مگر الفاظ میں کاٹ اور اتھارٹی تھی۔ میرے اس نقد اثاثے کے بارے میں کسی کو شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے جو اعداد و شمار بتائے تھے وہ درست تھے۔

''مسٹر فیروز باہمن!'' ڈاکٹر ہیرا سنگھ نے کہا۔ ''کیا آپ اپنی آرگنائزیشن کے حصص کے بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گے؟''

''کیوں نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''باہمن گروپ ایک پرائیویٹ کارپوریشن ہے جس کے تحت ستر مختلف کمپنیاں کام کر رہی ہیں۔ ان کمپنیوں میں ستانوے فیصد حصص باہمن گروپ کی ملکیت ہیں جبکہ تین فیصد حصص ملازمین کو دیے گئے ہیں۔''

''کیا اسپن کمپیوٹر میں بھی آپ کی کمپنی کا کوئی حصہ ہے؟'' ریاض مرزا نے پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے جواب دیا اور اپنی کمپنیوں کے جنگل میں اسپن کمپیوٹر کے بارے میں سوچنے لگا۔

''اس کمپنی میں آپ کے حصص کی مالیت کیا ہے؟''

''اسّی فیصد۔'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔

''کیا اسپن کمپیوٹر پبلک کمپنی ہے؟''

''ہاں۔'' میرا جواب اس بار بھی مختصر تھا۔

ڈاکٹر ریاض مرزا اپنے سامنے رکھے ہوئے فائل کے کاغذات کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ میں نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے دیکھ لیا تھا کہ وہ اسپن کمپیوٹر کی سہ ماہی اور سالانہ رپورٹس تھیں۔ میں دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ صورت حال بالکل ایسی تھی جیسے میٹرک کے اسٹوڈنٹ امتحان دینے آئے ہوں اور اپنے ساتھ نقل کا سامان بھی لائے ہوں۔

''آپ نے اسپن کمپیوٹر کمپنی کب خریدی تھی؟'' اس نے پوچھا۔

''تقریباً چار سال پہلے۔'' میں نے جواب دیا۔

''ادائیگی کس حساب سے اور کتنی کی تھی؟''

''تیس روپے فی شیئر کے حساب سے تین سو ملین روپے کی ادائیگی کی گئی تھی۔'' اس نے جواب دیا۔ اس قسم کے سوالات کے جواب میں بہت سوچ سمجھ کر اور کچھ وقفے سے دینا چاہتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی میں انہیں کچھ سوچنے کا موقع فراہم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں اندازہ لگا رہا تھا کہ ان ماہرینِ نفسیات کے اعصاب جواب دینے لگے تھے۔ کم از کم ڈاکٹر ریاض مرزا کے بارے میں تو میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اب وہ ہتھیار ڈالنے ہی والا تھا۔

''اور اب اس کی کیا مالیت ہے؟'' یہ سوال بھی ریاض مرزا ہی نے کیا تھا۔

''کل اس کا بھاؤ ساڑھے تینتالیس پر بند ہوا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''جب سے میں نے یہ کمپنی خریدی ہے اس وقت سے اب تک اس کے بھاؤ مسلسل بڑھتے رہے ہیں اور اس وقت مجموعی مالیت آٹھ سو پچاس ملین سے کچھ زیادہ ہے۔''

میرا خیال ہے میری ذہنی آزمائش بنیادی طور پر یہاں ختم ہو چکی تھی۔ میں نے اسپن کمپیوٹر کا گزشتہ روز پر جو بھاؤ بتایا تھا، ریاض مرزا نے اپنے کاغذات سے اس کی تصدیق کر لی تھی اور وہ مطمئن ہو گیا تھا۔ میں نے ان کے چہروں پر ہلکی سی مسکراہٹ بھی دیکھ لی تھی۔

ڈاکٹر پریم شرما بھی خاصا مطمئن دکھائی دے رہا تھا لیکن شاید میری یادداشت کا امتحان لے کر وہ مزید تسلی کر لینا چاہتا تھا۔

''مسٹر فیروز باہمن!'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ کہاں پیدا ہوئے تھے؟''

''پونا میں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میری تاریخ پیدائش 12 مئی 1918ء ہے۔''

''آپ کی والدہ کا انتقال کب ہوا تھا؟''

''1940ء میں۔ جب ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف تحریک شروع ہوئی تھی۔'' میں نے جواب دیا۔

''اور آپ کے والد؟''

''ان کے بارے میں آپ کیا جاننا چاہتے ہیں؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''ان کا انتقال کہاں ہوا تھا؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں اس وقت بہت چھوٹا تھا۔ ہم پونا سے ممبئی منتقل ہو چکے تھے۔ میرے والد کاروباری سلسلے میں گوا گئے تھے اور پھر لوٹ کر نہیں آئے۔ ان کا گمنامی میں انتقال ہو گیا تھا یا کسی اور وجہ سے لاپتا ہو گئے تھے۔ ان کا کبھی کوئی سراغ نہیں ملا۔ مجھے میری والدہ نے بڑی محنت سے پروان چڑھایا تھا۔''

ڈاکٹر پریم شرما نے ہیرا سنگھ کی طرف دیکھا۔ ہیرا سنگھ کی نظریں اپنے سامنے رکھے ہوئے پیڈ پر جھکی ہوئی تھیں جس پر اس نے لاتعداد سوالات لکھ رکھے تھے۔

''آپ کی سب سے چھوٹی بیٹی کون ہے؟'' ڈاکٹر پریم شرما نے سوال کیا۔

''کس بیوی سے؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''پہلی بیوی سے؟''

''سوسن... اس کا نام سوسن ہے۔''

''اس نے تعلیم کون سے کالج سے حاصل کی تھی؟'' ایک اور سوال ہوا۔

''کوئن وکٹوریہ کالج دہلی سے۔'' میں نے جواب دیا۔

''اس کے مضامین کیا تھے؟'' ایک اور سوال پوچھا گیا۔

''سوسن کے مضامین کے بارے میں تو شاید میں ٹھیک سے نہ بتا سکوں لیکن اس نے کالج کی تعلیم کے دوران میں ہی شادی کر لی تھی اور دوسرے بہن بھائیوں کی طرح اس کا جیون ساتھی کا انتخاب بھی بہت ہی بُرا تھا۔ انہیں یہ بُرائی شاید میری طرف سے ورثے میں ملی تھی۔'' میری اس بات پر ان تینوں نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں چشمِ تصور سے اپنے بچوں اور سابقہ بیویوں کو بھی دیکھ رہا تھا۔ میری اس بات پر وہ بھی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکے ہوں گے۔ میں نے تین شادیاں کی تھیں اور تینوں ناکام ہو گئی تھیں۔

ڈاکٹر ہیرا سنگھ مطمئن ہو کر بیٹھ گیا لیکن ریاض مرزا شاید اپنے معاوضے کا پورا پورا حق ادا کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ایک اور سوال کیا۔

''کیا یہ درست ہے کہ ماؤنٹین کمپیوٹر میں بھی سب سے زیادہ حصص آپ کے ہیں؟''

''ہاں۔ یہ اگرچہ پبلک کمپنی ہے لیکن مجھے کنٹرولنگ اتھارٹی حاصل ہے اور تمہارے سامنے رکھے ہوئے کاغذات اس کی تصدیق کریں گے۔'' میں نے اس کی فائل کی طرف اشارہ کیا۔

''اس کمپنی میں آپ کا ابتدائی سرمایہ کتنا تھا؟''

''اٹھارہ روپے فی شیئرز کے حساب سے دس ملین شیئرز کا حساب لگا لو۔''

''اور اب یہ...''

''گزشتہ روز اس کے بھاؤ ایکس پر بند ہوئے ہیں۔'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''پہلے چھ سالوں کے دوران اس کمپنی کی کارکردگی بہت عمدہ رہی۔ اب اس کی مالیت چار ہزار ملین سے زیادہ ہے۔ میرا خیال ہے آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا۔''

''جی ہاں۔'' ریاض مرزا نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''مزید کتنی کمپنیاں آپ کے زیرِ دست ہیں؟''

''پانچ۔'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔

ڈاکٹر ہیرا سنگھ، پریم شرما کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں بھی اب اکتاہٹ سی محسوس کرنے لگا تھا۔ یہ معاملہ میری توقع سے زیادہ ہی طول پکڑتا جا رہا تھا۔ سلطان زیدی نے بھی میرے چہرے سے میری اندرونی کیفیت کا اندازہ لگا لیا تھا۔

''کوئی اور سوال؟'' اس نے باری باری ان تینوں کی طرف دیکھا۔ ہم انہیں یہ سیشن ختم کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ہم چاہتے تھے کہ میری ذہنی کیفیت کے بارے میں وہ اپنا مکمل اطمینان کر لیں۔

''کیا آپ آج نئی وصیت پر دستخط کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟'' شرما نے پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

''کیا یہی وہ وصیت نامہ ہے، جس پر آپ دستخط کرنے والے ہیں؟'' اس نے میرے سامنے رکھے ہوئے کاغذات کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا تو اس نے اگلا سوال کیا۔ ''کیا اس وصیت کے مطابق آپ کے اثاثوں کا بڑا حصہ آپ کے بچوں کو ملنے والا ہے؟''

''ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے۔'' میں نے گول مول سا جواب دیا۔

''کیا آپ ابھی اور اسی وقت وصیت نامے پر دستخط کرنے کو تیار ہیں؟''

''ہاں۔'' میرا جواب مختصر تھا۔

ڈاکٹر پریم شرما نے اپنا پین میز پر رکھ دیا۔ دونوں بازو سینے پر لپیٹ لیے۔ چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر سلطان زیدی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''میری رائے میں مسٹر فیروز باہمن پوری طرح اپنے ہوش و حواس میں ہیں۔ ان کی ذہنی کیفیت پر کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس وقت وہ اپنے اثاثوں کی تقسیم کے وصیت نامے پر دستخط کرنا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

دوسروں نے بھی اپنی رائے کا اظہار کرنے میں پیچھے رہنا مناسب نہیں سمجھا۔

''مجھے بھی مسٹر باہمن کی ذہنی تندرستی پر کوئی شبہ نہیں ہے۔'' ڈاکٹر ہیرا سنگھ نے سلطان زیدی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت ان کی ذہنی کیفیت کسی بھی قسم کے شک و شبے سے بالاتر ہے۔''

''تو گویا آپ مطمئن ہیں؟'' سلطان زیدی نے پوچھا۔

''ہر لحاظ سے۔'' ڈاکٹر ہیرا سنگھ نے جواب دیا۔

''اور ڈاکٹر ریاض مرزا آپ؟'' سلطان نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''مسٹر فیروز باہمن اچھی طرح جانتے ہیں کہ انہیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔'' ڈاکٹر ریاض مرزا نے جواب دیا۔ ''یہ ذہنی طور پر بالکل تندرست ہیں بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ کسی بھی معاملے میں ہم سے بہتر طور پر سوچ سکتے ہیں۔''

میں دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے باری باری ان تینوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے جو معاوضہ لیا تھا، اس کا پورا پورا حق ادا کر دیا تھا۔

''تو گویا یہ طے ہو گیا کہ مسٹر فیروز باہمن ذہنی طور پر بالکل تندرست ہیں اور ان کے کسی فیصلے پر کوئی شبہ یا اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔'' سلطان زیدی نے مزید تصدیق کے لیے کہتے ہوئے باری باری ان تینوں کی طرف دیکھا۔

''بالکل۔'' ان تینوں نے بیک وقت اثبات میں سر ہلا دیا۔

سلطان زیدی نے وصیت کے کاغذات کا وہ پلندا اور پین میری طرف بڑھا دیے۔

''یہ میری یعنی فیروز باہمن کی آخری وصیت ہے۔'' میں نے باری باری ان سب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس سے پہلے میری تمام وصیتیں یا اس قسم کی تمام دستاویزات منسوخ کی جاتی ہیں۔''

نوّے صفحات پر مشتمل یہ وصیت نامہ سلطان زیدی نے اپنے دفتر میں کسی معاون کی مدد سے تیار کیا تھا۔ میں نے یہ وصیت نامہ نہیں پڑھا لیکن فائل کور پر لکھے ہوئے الفاظ میرے لیے خاصے دلچسپ ہیں۔ میں نے کاغذات پلٹ کر آخری صفحے پر ایک نام ٹھیسٹ دیا جو کسی سے پڑھا نہیں جا سکتا تھا اور فائل کور بند کر کے اپنے دونوں ہاتھ اس پر رکھ دیے۔

میں جانتا تھا کہ ان گدھوں (میرے وارثوں) میں سے کوئی بھی اس وصیت نامے کو کبھی نہیں دیکھ سکے گا۔

سلطان زیدی نے یہ میٹنگ ختم ہونے کا اعلان کر دیا۔ تینوں ماہرینِ نفسیات اپنے کاغذات سمیٹنے لگے۔ کیمرامینوں نے بھی اپنے کیمرے آف کر دیے۔ میری ہدایت پر مجلی منزلوں پر موجود میری تینوں فیملیز کو بھی ہدایت کر دی گئی کہ اب وہ لوگ بھی اس عمارت سے رخصت ہو جائیں۔

ایک کمرا اب بھی آن تھا اور مجھے فوکس میں لیے ہوئے تھا۔ تینوں ماہرینِ نفسیات اور ان کے ساتھ قانونی مشیر بڑی عجلت میں کمرے سے نکل رہے تھے۔ اب صرف سلطان زیدی اور اس کا ایک قابلِ اعتماد ماتحت راج پنڈت کمرے میں رہ گئے ہیں۔ میں نے سلطان زیدی کو اپنے قریب کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اپنے سفید ریشمی لبادے کے اندر سے ایک لفافہ نکال کر کھول لیا اور اس میں سے پیلے رنگ کے تین کاغذ، جو قانونی دستاویزات کی تیاری میں استعمال ہوتے ہیں، نکال کر میز پر رکھ دیے۔

میری زندگی کی ڈور ختم ہو رہی ہے۔ صرف چند لمحات ہی رہ گئے ہیں۔ ایک عجیب سا خوف مجھے اپنی لپیٹ میں لینے کی کوشش کر رہا ہے۔ پورے جسم میں سنسنی سی پھیلتی جا رہی

ڈاک خانے

ہمارا ڈاک کا نظام کتنا عمدہ اور فعال ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ چند سال پہلے ایک پوسٹ ماسٹر ریٹائر ہوئے انہوں نے محکمے کو عرض داشت لکھی جس میں استدعا کی گئی کہ

''برائے کرم مجھے پنشن کی رقم بذریعہ ڈاک کبھی نہ بھیجی جائے۔ میں ہر ماہ خود آ کر یہ رقم لے جایا کروں گا۔ آپ کی بڑی مہربانی ہو گی دوسری صورت میں مجھے فاقوں مرنا پڑے گا۔''

(انتخاب، نجل حسین حیدری، محلہ مسجد کھجور، پنڈ دادن خان)

ہے۔ مجھے اپنے آپ کو سنبھالنے میں خاصی دشواری پیش آرہی ہے۔

سلطان زیدی، راج پنڈت اور میرا ذاتی خدمت گار بڑی عجیب سی نظروں سے میرے سامنے میز پر رکھے ہوئے ان پیلے کاغذوں کو دیکھ رہے ہیں۔

''یہ میری وصیت ہے۔'' میں نے پین اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ وصیت نامہ میں نے چند گھنٹے پہلے تیار کیا تھا اور اس کا ایک ایک لفظ میرے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ قانون کی زبان میں اسے ہولوگرافک ول (HOLOGRAPHIC WILL) کہا جاسکتا ہے۔ اس پر آج کی تاریخ درج ہے اور آج ہی کی تاریخ میں آپ لوگوں کی موجودگی میں اس پر دستخط کررہا ہوں۔'' میں نے تینوں کاغذوں پر نیچے اپنا نام لکھ کر دستخط کردیے۔ سلطان زیدی پھٹی پھٹی سی نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی ان کاغذات کو دیکھ رہا ہے۔ ''اس وصیت نامے کی رو سے میری تمام پچھلی وصیتیں بہ شمول وہ جس پر پانچ منٹ پہلے میں نے دستخط کیے ہیں، منسوخ سمجھی جائیں اور یہ جس پر میں ابھی دستخط کررہا ہوں میری آخری وصیت سمجھی جائے۔'' میں نے وہ تینوں کاغذ تہ کرکے دوبارہ لفافے میں رکھ دیے۔

میرے دانت بھنچ گئے... میری مرنے کی خواہش شدید تر ہوگئی۔ میں نے وہ لفافہ سلطان زیدی کی طرف سرکا دیا اور اس کے ساتھ ہی ایک جھٹکے سے وہیل چیئر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میری ٹانگیں ہولے ہولے کانپ رہی تھیں اور دل کی دھڑکن خطرناک حد تک تیز ہوگئی تھی۔ سفید ریشمی لبادے کے نیچے جسم کے مسام تیزی سے پسینا اگلنے لگے۔ صرف چند سیکنڈ... مجھے یقین تھا کہ نیچے گرنے سے پہلے ہی میں ختم ہو چکا ہوں گا۔

''اے...''

''کسی کے چیخنے کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ اور میرا خیال ہے یہ میرے ذاتی خدمت گار وکرم کی آواز تھی لیکن میں نے اس کی طرف دیکھا نہیں اور ایک دم سے حرکت میں آگیا۔

وہ سب پھٹی پھٹی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے حواس بھی شاید مختل ہو چکے ہیں۔ ایسا ہونا ہی چاہیے۔ ٹانگوں سے معذور شخص جو برسوں سے وہیل چیئر پر پڑا ہو، اگر وہ اچانک ہی اٹھ کر چل پڑے تو دیکھ لینے والوں کے حواس پر بجلی تو گرنی ہی چاہیے۔

میں تیز تیز چل رہا ہوں بلکہ اب تو دوڑ رہا ہوں۔ چمڑے کے کشن والی کرسیوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے، دیوار پر آویزاں اپنے اس پورٹریٹ کے قریب سے، جو کئی سال پہلے میری ایک بیوی نے تحفے میں دیا تھا، یہ پورٹریٹ مجھے کبھی بھی پسند نہیں آیا تھا اور نہ جانے کیوں اب تک یہاں لگا ہوا تھا۔ میں سلائڈنگ ڈور کے قریب پہنچ گیا۔ یہ دروازہ مقفل نہیں تھا۔ چند گھنٹے پہلے میں یہ ریہرسل کر چکا تھا اور دروازے کا تالا میں نے ہی کھلا چھوڑا تھا۔

''اے... رک جاؤ...'' کسی نے چیخ کر کہا۔

وہ لوگ مجھے روکنے کے لیے میرے پیچھے دوڑے لیکن میں دروازے کے قریب پہنچ چکا ہوں۔ میں نے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر زوردار جھٹکا دیا۔ دروازہ کھلتے ہی ٹھنڈی ہوا کا تیز جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا۔ میں دروازے سے نکل کر ٹیرس پر آگیا جس کے آگے حفاظتی جنگلا لگا ہوا تھا۔ میں تیزی سے آگے بڑھ کر اس جنگلے پر جھک گیا۔

☆☆☆

وکرم، مسٹر فیروز باہمن سے دو قدم پیچھے تھا۔ اس کا خیال تھا وہ اسے پکڑ لے گا۔ وہ باہمن کا ذاتی خدمت گار تھا۔ برسوں سے اس کے پاس تھا۔ اس نے کبھی بھی مسٹر فیروز باہمن کو وہیل چیئر سے اٹھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اب نہ صرف اسے کرسی سے اٹھتے بلکہ ٹیرس والے دروازے کی طرف دوڑتے دیکھ کر اس کے حواس پر واقعی بجلی سی گری تھی۔ ایک لمحے کو تو وہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکا تھا اور اس کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے باہمن کے پیچھے دوڑ لگادی مگر اسے بہت دیر ہوچکی تھی۔ باہمن دروازے سے نکل کر ٹیرس تک پہنچ چکا تھا۔ وکرم بڑی تیزی سے اس کے پیچھے لپکا لیکن اس سے پہلے کہ وہ ہاتھ بڑھا کر باہمن کو پکڑتا، وہ حفاظتی جنگلے سے چھلانگ لگا چکا تھا۔

وکرم آہنی جنگلے سے ٹکرا گیا۔ اس کے منہ سے خوفناک چیخ نکل گئی۔ وہ پھٹی پھٹی سی نظروں سے فیروز باہمن کو نیچے گرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ باہمن کا سفید لبادہ ہوا میں اڑ رہا تھا۔ وہ قلابازیاں کھاتا ہوا نیچے گر رہا تھا اور پھر وہ نیچے پختہ فرش پر گرا۔ دھپ کی ہلکی سی آواز وکرم کی سماعت سے ٹکرائی۔ اس کے دونوں ہاتھ بڑی سختی سے ریلنگ پر جم گئے اور پھر دوسرے ہی لمحے اس نے چیخنا شروع کردیا۔

سلطان زیدی بھی تیزی سے دوڑتا ہوا وکرم کے پیچھے ہی ٹیرس کے کنارے پر پہنچ گیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے ریلنگ کو تھام لیا اور فیروز باہمن کو نیچے گرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ یہ سب کچھ اچانک اور بڑی تیزی سے ہوا تھا لیکن

یوں لگا تھا جیسے چھلانگ لگانے کے بعد فیروز باہمن کے نیچے گرتے ہوئے پورا گھنٹا لگ گیا ہو۔ ایک سو پچاس پاؤنڈ وزنی آدمی کو تین سو فٹ کی بلندی سے زمین تک آنے میں پانچ سیکنڈ لگتے ہیں مگر فیروز باہمن کو گرتے ہوئے دیکھ کر اسے یوں لگا جیسے وہ دیر تک پرندے کے بے وزن پر کی طرح ہوا میں تیر تا رہا ہو۔

سلطان زیدی کا ماتحت راج پنڈت بھی ریلنگ کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اس نے نیچے جھانک کر دیکھا تو اس کی روح تک کانپ اٹھی۔ فیروز باہمن کی لاش عمارت کے مین انٹرنس اور ڈرائیو وے کے درمیان پختہ فرش پر پڑی تھی۔ راج پنڈت نے ایک ہاتھ سے ریلنگ کے پائپ کو گرفت میں لے رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ میں باہمن کی وصیت والا وہ لفافہ تھا جو کمرے سے نکلتے ہوئے اس نے غیر ارادی طور پر میز سے اٹھا لیا تھا۔ اب یہ لفافہ اسے منوں وزنی محسوس ہو رہا تھا۔ وہ متوحش نظروں سے نیچے پڑی ہوئی لاش کو دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

موت کے منہ میں جاتے ہوئے بوڑھے فیروز باہمن کا یہ آخری خواب پورا نہیں ہوسکا تھا کہ اس کے بچے اور تینوں سابق بیویاں بھی اس کے مرنے کا یہ خوفناک منظر دیکھ سکیں گی۔ شاید اس سے اندازے کی غلطی ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ جب وہ چھلانگ لگائے گا تو اس کی بیویاں اور بچے عمارت کے مرکزی دروازے سے باہر نکل رہے ہوں گے اور اپنی آنکھوں سے اسے مرتے ہوئے دیکھیں گے لیکن نیچے اسے دیکھنے والا صرف ایک ہی آدمی تھا۔

وہ کمپنی کا ایک کلرک تھا جو لنچ کے بعد دیر سے لوٹا تھا۔ وہ پارکنگ سے باہر آرہا تھا کہ ایک آواز سن کر اس نے اوپر دیکھا اور دوسرے ہی لمحے وہ کانپ اٹھا۔ ایک برہنہ آدمی چودھویں منزل سے نیچے گر رہا تھا۔ اس کے بازوؤں کے

WWW.JBDPRESS.COM

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

آخری معرکہ 300/-
جب سومنات کے بڑے بت کو توڑنے کی باری آئی تو ہندو راجے اور پجاری سلطان کے قدموں میں گر پڑے اور کہا "ہم آپ کے وزن کے برابر سونا دینے کیلئے تیار ہیں"۔ سلطان کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا اور اس نے جواب دیا "میں بت فروش نہیں، بت شکن کہلانا چاہتا ہوں"۔ نسیم حجازی کی ایک ولولہ انگیز تحریر

اندھیری رات کے مسافر 225/-
اندلس میں مسلمانوں کی آخری سلطنت غرناطہ کی تباہی کے دلخراش مناظر، بوڑھوں، عورتوں اور جوانوں کی ذلت و رسوائی کی اذیتناک داستان

قیصر و کسریٰ 300/-
ظہور اسلام سے قبل عرب و عجم کے تاریخی، سیاسی، اخلاقی، تمدنی، مذہبی حالات اور رزمِ اسلام کے بدلتے نقوش کی داستان

پاکستان سے دیارِ حرم تک 125/-
تاریخی پس منظر میں لکھا جانے والا ایک دلچسپ سفر نامہ حجاز

گمشدہ قافلے 300/-
انگریز کی اسلام دشمنی، بنیئے کی عیاری و مکاری اور سکھوں کی معصوم بچوں اور مظلوم عورتوں کو خون میں نہلانے کی لرزہ خیز سچی داستان

داستانِ مجاہد 200/-
فتح دیبل کے بعد راجہ داہر نے راجوں مہاراجوں کی مدد سے دو سو ہاتھیوں کے علاوہ 50 ہزار سواروں اور پیادوں کی نئی فوج بنائی، فاتح سندھ کی معرکۃ الآرا داستان

پردیسی درخت 275/-
اسلام دشمنی پوشی ہندوؤں اور سکھوں کے گٹھ جوڑ کی کہانی جنہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے تمام اخلاقی حدود کو پامال کرنے سے بھی گریز نہ کیا

قافلہ حجاز 300/-
راہ حق کے مسافروں کی ایک بے مثال داستان

خاک اور خون 300/-
سسکتی، تڑپتی انسانیت، قیامت خیز مناظر، تقسیم برصغیر کے پس منظر میں داستان خونچکاں

معظم علی 275/-
لارڈ کلائیو کی اسلام دشمنی، میر جعفر کی غداری، بنگال کی آزادی و حریت کے ایک مجاہد معظم علی کی داستان شجاعت

سفید جزیرہ 150/-
بحر اوقیانوس کے کسی نامعلوم جزیرے کی داستان

کلیسا اور آگ 225/-
فرڈی نینڈ کی عیاری، مسلمان سپہ سالاروں کی غداری، سقوط غرناطہ اور اندلس میں مسلمانوں کی شکست کی داستان

پورس کے ہاتھی 125/-
1965 کی جنگ کے پس منظر میں بنیوں اور برہموں کے سامراجی عزائم کی شکست کی داستان، جنہیں ہر محاذ پر منہ کی کھانی پڑی

محمد بن قاسم 225/-
عالم اسلام کے 17 سالہ ہیرو کی تاریخی داستان، جس کے حوصلے اور حکمت عملی نے ستاروں پر کمندیں ڈال دیں

ثقافت کی تلاش 100/-
نام نہاد ثقافت کا پرچار کرنے والوں پر ایک تحریر، جنہوں نے ملک کی اخلاقی و روحانی قدروں کو طبلوں کی تھاپ، گھنگروؤں کی چھنا چھن کے ساتھ پامال کیا

آخری چٹان 275/-
سید خوارزم جلال الدین خوارزمی کی داستان شجاعت جو تاتاریوں کے سیل رواں کے لیے ایک چٹان ثابت ہوا

اور تلوار ٹوٹ گئی 300/-
شیر میسور (ٹیپو سلطان شہید) کی داستان شجاعت، جس نے محمد بن قاسم کی غیرت، محمود غزنوی کے جاہ و جلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم و استقلال کی یاد تازہ کردی

شاہین 275/-
اندلس میں مسلمانوں کے نشیب و فراز کی کہانی

سو سال بعد 125/-
گاندھی جی کی مہاتمائیت، اچھوتوں اور مسلمانوں کے خلاف سامراجی مقاصد کی منہ بولتی تصویر

انسان اور دیوتا 225/-
برہمنی سامراج کے ظلم و بربریت کی صدیوں پرانی داستان جس نے اچھوتوں کو ردِعمل اختیار کرنے پر مجبور کیا

یوسف بن تاشفین 225/-
اندلس کے مسلمانوں کی آزادی کیلئے آلام و مصائب کی تاریک راتوں میں امید کی قندیلیں روشن کرنے والے سپاہی کی داستان

جہانگیر بکس
• لاہور 042-7220879 • راولپنڈی 051-5539609 • ملتان 061-4781781 • فیصل آباد 041-2627568 • حیدرآباد 0300-3012131 • کراچی 021-2765086

قریب کوئی سفید چادر سی لپٹی ہوئی تھی جو ہوا میں اڑ رہی تھی۔ بڑی تیزی سے نیچے گرتا ہوا وہ آدمی دھپ کی آواز سے پختہ فرش سے ٹکرایا۔

کلرک پارکنگ سے نکل کر تیزی سے اس طرف دوڑا۔ باہمن ٹاور کے مین گیٹ پر کھڑے ہوئے گارڈ نے بھی کوئی بات محسوس کی اور وہ گیٹ چھوڑ کر تیزی سے اس طرف دوڑ پڑا۔ یہ کتنا بڑا المیہ تھا کہ اس کلرک یا گارڈ نے آج تک اپنے مالک فیروز باہمن کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے پتا نہیں کون بدقسمت اوپر سے گر کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔

وہ بوڑھا برہنہ تھا۔ ایک سفید کپڑا اس کے سینے کے قریب سمٹا ہوا تھا۔ لاش ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ فرش پر دور دور تک خون نظر آ رہا تھا۔

فیروز باہمن چھلانگ لگانے کے لیے تیس سیکنڈ مزید انتظار کر لیتا تو شاید اس کی آخری خواہش بھی پوری ہو جاتی۔ وہ سب لوگ اس وقت تک پانچویں منزل پر جمع ہو چکے تھے اور پھر سیتا، راون، ڈاکٹر ریاض مرزا اور ان کے وکلا سب سے پہلے عمارت کے مرکزی دروازے سے باہر نکلے تھے۔ فیروز باہمن اس وقت تک ملبے کا ڈھیر بن چکا تھا۔

باہر سے آنے والوں میں وہ لاش سب سے پہلے سیتا نے دیکھی تھی۔ وہ چیخ اٹھی لیکن اس کی چیخ میں نہ سابق شوہر کی جدائی کا صدمہ تھا نہ دکھ کا احساس۔ یہ چیخ تو باہمن کی شکستہ لاش کو دیکھ کر بے اختیار اس کے منہ سے نکل گئی تھی۔ وہ بہرحال، اس زور سے چیخی تھی کہ اس کی آواز چودھویں منزل کی ریلنگ کے ساتھ کھڑے ہوئے سلطان زیدی، راج پنڈت اور وکرم نے بھی سن لی تھی۔

راون بڑی عجیب سی نظروں سے لاش کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ٹی وی اور ویڈیو گیمز کے رسیا اس لڑکے پر باپ کی موت کا زیادہ اثر نہیں ہوا۔ اس کے برعکس بہتا ہوا خون دیکھ کر وہ اپنے آپ میں ایک عجیب سنسنی کی سی کیفیت محسوس کرنے لگا۔ اس نے اپنی ماں کی طرف دیکھا جو اب بھی چیخ رہی تھی۔ پھر وہ آگے بڑھ کر باپ کی لاش کے قریب جھک گیا اور بہتے ہوئے خون کو دیکھنے لگا۔ سیکیورٹی گارڈ نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ راون کو وہاں سے ہٹانا چاہتا تھا۔

''یہ... یہ... فیروز باہمن ہے...'' ایک وکیل لاش کی طرف دیکھتے ہوئے ہکلایا۔

''کیا...؟'' سیکیورٹی گارڈ اچھل پڑا۔

''اوہ!'' قریب کھڑے ہوئے کلرک کے منہ سے بھی عجیب سی آواز نکلی۔ وہ دونوں غیر یقینی انداز سے اس وکیل کو دیکھ رہے تھے جس نے لاش کے بارے میں ان کے لیے یہ سنسنی خیز انکشاف کیا تھا۔

کچھ اور لوگ دوڑتے ہوئے عمارت سے باہر آ رہے تھے۔ نائر اور مرینہ، ماہر نفسیات ڈاکٹر ہیرا سنگھ اور اپنے قانونی مشیروں کے ساتھ عمارت سے باہر آئیں تو فیروز باہمن کی لاش دیکھ کر نہ تو وہ چیخی تھیں اور نہ ہی کسی پر سکتہ طاری ہوا تھا۔ وہ دونوں سیتا گروپ سے دور ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے کھڑی رہیں اور پھر عام لوگوں کی طرح آگے بڑھ کر باہمن کی لاش دیکھنے لگیں۔

ایک اور سیکیورٹی گارڈ وہاں پہنچ گیا اور وہاں جمع ہونے والے لوگوں کو پیچھے ہٹانے لگا۔ اس نے اپنے سیل فون پر موبائل کے لیے بھی کہہ دیا تھا۔

''اب کیا ہو گا؟'' کلرک نے پہلے گارڈ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ لاش دیکھنے والا وہ پہلا شخص تھا اور اپنے آپ کو بڑا اہم سمجھنے لگا تھا۔

راون لاش کے قریب بیٹھا اینٹوں کے فرش پر بہتے ہوئے خون کو دیکھ رہا تھا۔ خون کی ایک دھار اینٹوں کے بیچ باریک سی درز میں بہتی ہوئی فلیگ پول کے چبوترے کی طرف جا رہی تھی۔

عمارت کی کشادہ لابی میں اوپر سے آنے والی لفٹ رکی۔ دروازہ کھلا اور دوزری اپنے بچوں کے ساتھ لفٹ سے برآمد ہوئی۔ مہتاب باہمن اور فرشید پہلے بھی اس بلڈنگ میں آتے رہے تھے۔ سیکیورٹی گارڈز انہیں پہچانتے تھے۔ اس لیے آج بھی انہیں کاریں اندر لانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ ان کی کاریں عقبی پلاٹ پر تھیں۔ وہ اس طرف جانے کے لیے جیسے ہی بائیں طرف والے دروازے کی طرف مڑے ایک چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

''مسٹر فیروز باہمن نے بلڈنگ سے چھلانگ لگا دی۔''

وہ سب ایک جھٹکے سے رک گئے اور مڑ کر تیزی سے چلتے ہوئے مرکزی دروازے سے نکل کر اس جگہ پہنچ گئے جہاں فیروز باہمن کی لاش پڑی تھی۔

انہیں بوڑھے فیروز باہمن کے دماغ میں رسولی پھٹنے کا انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔

☆☆☆

ذہنی جھٹکا بہت شدید تھا... سلطان زیدی کو سنبھلنے میں پورا ایک منٹ لگ گیا۔ وہ ریلنگ کے قریب کھڑا نیچے جھانک

رہا تھا اور جب اس نے باہمن کی تیسری بیوی کو اپنے بیٹے اور وکیلوں کے ساتھ عمارت کے مرکزی دروازے سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا تو اس نے وکرم اور راج پنڈت کو اندر چلنے کا اشارہ کیا اور خود بھی وہاں سے ہٹ گیا۔

کیمرا ابھی تک آن تھا۔ وکرم کیمرے کے سامنے آ گیا۔ سیدھا ہاتھ اٹھا کر سچ بولنے کا حلف اٹھایا اور آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے رندھی ہوئی آواز میں وہ سب کچھ بتانے لگا جو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ سلطان زیدی نے لفافے میں سے تینوں پیلے کاغذ نکال کر اس طرح کیمرے کے سامنے کر دیے کہ پوری طرح فوکس میں آ سکیں۔

''ہاں، میں نے انہیں ان کاغذات پر دستخط کرتے ہوئے دیکھا تھا۔'' وکرم نے کہا۔ ''چند سیکنڈ پہلے... یہ صرف چند سیکنڈ پہلے کی بات ہے۔''

''اور کیا یہ اس کے دستخط ہیں؟'' سلطان نے پوچھا۔

''ہاں... یہ مسٹر فیروز باہمن ہی کے دستخط ہیں۔'' وکرم نے جواب دیا۔

''کیا مسٹر فیروز باہمن نے یہ وضاحت کر دی تھی کہ یہ اس کی آخری وصیت ہے؟''

''ہاں... انہوں نے بتایا تھا کہ یہ ان کی آخری وصیت ہے۔'' وکرم نے جواب دیا۔

کھلے ہوئے کاغذات وکرم کے چہرے کے سامنے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ ان پر لکھی ہوئی تحریر پڑھ سکتا، سلطان زیدی نے کاغذ اس کے سامنے سے ہٹا لیے۔ پھر اس نے راج پنڈت سے بھی کیمرے کے سامنے اسی قسم کا بیان ریکارڈ کرایا اور پھر خود کیمرے کے سامنے آ کر اپنا بیان ریکارڈ کرانے لگا۔

اس کام سے فارغ ہو کر سلطان زیدی نے اسٹینڈ پر لگا ہوا آٹومیٹک کیمرا آف کر دیا اور راج پنڈت اور وکرم کے ساتھ کمرے سے نکل کر راہداری کی طرف لپکا۔

لفٹ میں کمپنی کے ملازم بھرے ہوئے تھے۔ ہر چہرے پر شدید حیرت اور افسردگی کے ملے جلے تاثرات تھے۔ فیروز باہمن کی موت کی خبر سے سب کو یہ دھچکا پہنچا تھا اور ہر کوئی باہمن کی لاش اٹھنے سے پہلے اس کی آخری جھلک دیکھ لینا چاہتا تھا۔

سیکیورٹی گارڈز لوگوں کو لاش سے دور رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کہیں سے ایمبولینس کے سائرن کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ کسی نے پولیس کو بھی فون کر دیا تھا۔

تجارت

افغانستان سے آ کر کشمش، میوے، سلاجیت اور ہینگ بیچنے والے آغا، ہوتے تو دکان دار ہی ہیں لیکن ڈیل کارنیگی کی کتابیں ذرا کم پڑھے ہوتے ہیں لہٰذا کاروبار کرتے وقت بھی اپنی خودی کو بلند رکھتے ہیں۔ ایسے ہی ایک کابلی آغا نے ہمارے ایک میر صاحب کو کاندھے سے جھنک کر کہا۔ ''خو ہینگ خرید و ہینگ!''

میر صاحب لکھنؤ کے تھے۔ نہایت شستگی سے بولے۔ ''قبلہ آغا صاحب! اس ہیچمداں کو ہینگ درکار نہیں۔''

آغا موصوف نے لال پیلے ہو کر ایک جھٹکا دیا اور فرمایا۔ ''خو... کافر کا بچہ! کیسے نہیں خریدے گا۔ ہم کوئی تمہارے باپ کا نوکر ہے جو اتنی دور سے اٹھا کے لایا ہے، نکالو پیسے۔''

(اقتباس ابن انشا کی کتاب ''دنیا گول ہے'' سے)

کمپنی ہی کے ایک شوقیہ فوٹو گرافر نے لاش کی تصویریں بھی کھینچ لی تھیں اور پھر ایک سیاہ کمبل لاش پر ڈال دیا گیا۔

فیروز باہمن کے بچوں اور سابقہ بیویوں کے ذہنوں کو لگنے والے دھچکے کا اثر زائل ہو چکا تھا اور اب باہمن کی موت کا صدمہ اپنا تھوڑا بہت اثر دکھا رہا تھا۔ ان کے سر اگرچہ جھکے ہوئے تھے مگر نظریں لاش پر پڑے ہوئے سیاہ کمبل پر مرکوز تھیں۔ وہ سب اپنے آپ کو ذہنی طور پر آنے والے وقت کے لیے تیار کر رہے تھے۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ ان میں سے کوئی فیروز باہمن کی طرف دیکھتا اور دولت کے بارے میں نہ سوچتا۔ صدمہ اور دکھ نصف بلین روپے کے راستے میں رکاوٹ نہیں بن سکتا تھا۔

کمپنی کے ملازمین کی بات مختلف تھی۔ صدمہ انہیں بھی پہنچا تھا لیکن اب وہ کنفیوژن کا شکار تھے۔ ان میں سے بہت سے لوگوں نے یہ تو سنا ہوا تھا کہ فیروز باہمن اس عمارت کے ٹاپ فلور پر رہائش پذیر ہے لیکن ان میں سے بہت کم ایسے تھے جنہوں نے کبھی اسے دیکھا ہو۔ اسے سنکی، بیمار اور مخبوط الحواس سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بارے میں وقتاً فوقتاً دلچسپ افواہیں پھیلتی رہتی تھیں اور حقیقت تو یہ تھی کہ فیروز باہمن خود بھی لوگوں سے ملنا پسند نہیں کرتا تھا۔ کمپنی کے دو چار اہم قسم کے وائس پریذیڈنٹس سال میں ایک آدھ بار اس سے مل لیا کرتے تھے۔ کمپنی اس کے بغیر بھی منافع دے رہی تھی۔ اس لیے نیچے

سے اوپر تک کسی ملازم کو اپنی نوکری کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔

تینوں ماہرین نفسیات پریم شرما، ہیرا سنگھ اور ڈاکٹر ریاض مرزا کی حالت البتہ سب سے مختلف تھی۔ وہ ٹینشن کا شکار تھے اور ان کے اعصاب میں شدید تناؤ تھا۔ انہوں نے ایک شخص کو ذہنی طور پر بالکل تندرست اور ہوش مند قرار دیا تھا اور چند ہی منٹ بعد اس شخص نے چودھویں منزل سے چھلانگ لگا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا تھا۔ اگر کوئی پاگل بھی ہوتا تو ان لوگوں کے عمارت سے باہر نکل جانے تک کا تو انتظار کرتا۔

قانون کی اصطلاح میں اسے LUCID INTERVAL کہا جاتا ہے۔ یعنی دیوانگی کے درمیان کا وہ وقفہ جب مریض ذہنی طور پر بالکل صحت مند اور ہوش مند نظر آتا ہے۔ اور اس دوران میں وہ ہوش مندی کا کوئی بھی کام کر سکتا ہے۔ وہ شاید دیوانگی کے درمیان ایسا ہی وقفہ تھا جب ان تینوں ماہرینِ نفسیات نے سوال در سوال کر کے اسے ذہنی طور پر تندرست اور ہوش مند قرار دیا تھا اور اس نے ایک اہم ترین دستاویز، اسّی ارب روپے کی وصیت پر دستخط کر دیے تھے۔ اور اس کے چند ہی منٹ بعد عمارت سے چھلانگ لگا دی تھی۔

ان تینوں نے اپنے طور پر فیصلہ کر لیا تھا کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے اپنے مؤقف پر قائم رہیں گے اور یہ بھی مقام شکر تھا کہ فیروز باہمن کے انٹرویو کی ساری کارروائی ویڈیو ٹیپ پر محفوظ ہو چکی تھی۔

جہاں تک باہمن کے بچوں اور سابقہ بیویوں کے قانونی مشیروں کا تعلق تھا تو انہوں نے بھی اس صدمے سے نجات حاصل کر لی تھی۔ وہ کن انکھیوں سے اپنے مؤکلین کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے خیال میں تمام ورثا بوڑھے فیروز باہمن کے دماغ کے ٹیومر کے پھٹنے تک کے انتظار کی اذیت سے بچ گئے تھے اور خود انہیں اور وکلا کو بھی اپنے مؤکلین سے بھاری فیس کی امیدیں پکی ہو گئی تھیں۔

ایمبولینس گیٹ میں داخل ہو کر ہجوم میں راستہ بناتی ہوئی لاش سے چند گز کے فاصلے پر رک گئی۔ سلطان زیدی نے آگے بڑھ کر گارڈز سے کچھ کہا اور اس کے فوراً ہی بعد فیروز باہمن کی لاش کو ایمبولینس میں ڈال دیا گیا اور ایمبولینس تیزی سے روانہ ہو گئی۔

☆☆☆

سلطان زیدی سے فیروز باہمن کی ملاقات بڑے ڈرامائی انداز میں ہوئی تھی۔ باہمن ٹاور نام کی یہ بلڈنگ نئی نئی تعمیر ہوئی تھی اور فیروز باہمن ان دنوں کسی قانونی الجھن کا شکار تھا۔ عدالت میں کیس چل رہا تھا۔ سلطان زیدی مخالف پارٹی کی پیروی کر رہا تھا۔ اس نے کچھ ایسے قانونی داؤ پیچ استعمال کیے کہ فیروز باہمن وہ مقدمہ ہار گیا۔ باہمن کو سلطان زیدی کا انداز پسند آیا۔ ویسے بھی وہ اس کی ذہانت کا قائل ہو گیا تھا۔ مقدمہ ختم ہونے کے چند ہی روز بعد اس نے سلطان زیدی سے ملاقات کی اور معقول معاوضے پر اس کی خدمات حاصل کر لیں۔

فیروز باہمن سے وابستہ ہونے کے بعد سلطان زیدی کو بے پناہ مالی فوائد حاصل ہوئے۔ پہلے دس برسوں کی محنت کے بعد آج اس کی فرم کا شمار ہندوستان کی چند بڑی لا فرموں میں ہوتا ہے۔ پچھلے چند برسوں کے دوران سلطان زیدی واحد شخص تھا جو فیروز باہمن کے سب سے زیادہ قریب سمجھا جاتا تھا۔

فیروز باہمن کی لاش اٹھوانے کے بعد سلطان زیدی، راج پنڈت کے ساتھ چودھویں منزل کے کانفرنس روم میں واپس آ گیا اور دروازہ اندر سے لاک کر دیا۔ وکرم کو کچھ ہدایات دے کر کہیں اور بھیج دیا گیا تھا۔

ویڈیو کیمرا آن کر کے سلطان زیدی سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور لفافہ کھول کر تینوں پیلے کاغذ نکال لیے۔ پہلا کاغذ فیروز باہمن کی طرف سے اس کے نام خط تھا۔ وہ کیمرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میرے نام ہاتھ سے لکھے گئے اس خط پر آج 9 دسمبر 1996ء کی تاریخ درج ہے۔ فیروز باہمن کی طرف سے لکھا گیا یہ خط پانچ پیروں پر مشتمل ہے۔ میں یہ پورا خط پڑھ رہا ہوں۔ 'ڈیئر سلطان! مرنے سے پہلے میں نے تمہارے لیے کچھ ہدایات لکھ دی ہیں اور میری خواہش ہے کہ تم ان پر عمل کرو۔ اس کے لیے اگر تمہیں قانونی جنگ بھی لڑنی پڑے تو پیچھے نہیں ہٹو گے۔ تمہیں ہر حالت میں ان پر عمل کرنا ہے۔ نمبر ایک: میرے مرنے کے فوراً بعد میری لاش کا مکمل معائنہ AUTOPSY کروانا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ تمہیں بعد میں ہو گا۔ نمبر دو: میرے مرنے کے بعد تجہیز و تکفین اور کسی قسم کی رسومات نہیں ہوں گی۔ میری خواہش ہے کہ میری لاش کو جلا کر اس کی راکھ کسی دریا میں بہا دی جائے۔ نمبر تین: میری وصیت کو 15 جنوری 1997ء تک خفیہ رکھا جائے۔ قانون تمہیں فوری طور پر وصیت کھولنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ تقریباً ایک مہینا تمہیں میرے وصیت نامے کی حفاظت کرنی ہے۔'

'امید ہے تم میری ان ہدایات پر سختی سے عمل کرو گے... تمہارا فیروز باہمن۔'

سلطان زیدی نے وہ کاغذ میز پر رکھ دیا اور احتیاط سے دوسرا کاغذ اٹھا لیا۔ وہ چند لمحے اس کاغذ کی تحریر کو دیکھتا رہا پھر کیمرے کی آنکھ میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''یہ دستاویز صرف ایک کاغذ پر مشتمل ہے جو مسٹر فیروز باہمن کی آخری وصیت کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں اس کا مکمل متن پڑھ رہا ہوں۔''

''فیروز باہمن کا آخری وصیت نامہ... میں فیروز باہمن بہ قائمی ہوش و حواس اپنی تمام پچھلی وصیتیں اور اس مفہوم میں لکھی جانے والی دستاویزات منسوخ کرتا ہوں اور اپنی دولت و جائداد کے درج ذیل حساب سے اپنے وارثوں میں تقسیم کرتا ہوں۔

''میرے بچو! مہتاب باہمن، فرشید باہمن، سمرا، سوسن، مرینہ اور راون کو اتنی رقم ادا کی جائے جس سے وہ اپنے آج تک کے تمام قرضے ادا کر سکیں۔ آج کی تاریخ کے بعد کا کوئی قرضہ اس رقم میں شامل نہیں ہو گا۔ اگر میرے بچوں میں سے کسی نے اس وصیت کو چیلنج کرنے کی کوشش کی تو وہ میری طرف سے ملنے والی اس رقم کے حصے سے بھی محروم ہو جائے گا۔

''میری سابق بیویوں دوزری، نائر اور سیتا کو میری دولت اور جائداد میں سے کچھ نہیں ملے گا کیونکہ طلاق کے وقت ان کا حق ادا کر دیا گیا تھا۔

''اپنی باقی دولت اور جائداد میں اپنی بیٹی گگن دیپ کے نام کرتا ہوں جو دو نومبر 1954 کو گوا کے کیتھولک اسپتال میں الزبتھ نامی عیسائی عورت کے بطن سے پیدا ہوئی تھی۔ الزبتھ کا عرصہ پہلے انتقال ہو چکا ہے۔''

سلطان زیدی کے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ فیروز باہمن کے گھر کے تمام افراد کو جانتا تھا لیکن گگن دیپ اور الزبتھ کے بارے میں پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ اپنی کیفیت پر قابو پانے کے بعد وہ دوبارہ وصیت پڑھنے لگا۔

''میں اپنے قابل اعتماد قانونی مشیر سلطان زیدی کو اس وصیت کا عامل مقرر کرتا ہوں اور اس کی تعمیل کے لیے اسے تمام اختیارات حاصل ہوں گے۔ اس دستاویز کو ہولوگرافک دل سمجھا جائے۔ اس کا ایک ایک لفظ میں نے اپنے ہاتھ سے تحریر کیا ہے۔ اور یہ قائمی ہوش و حواس اس پر دستخط کرتا ہوں... دستخط... فیروز باہمن... 9 دسمبر 1996ء تین بجے سہ پہر۔''

سلطان زیدی نے یہ کاغذ بھی میز پر رکھ دیا اور کیمرے کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ وصیت پڑھتے ہوئے وہ اپنے آپ میں ایک عجیب سی کیفیت محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ تازہ ہوا کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ ایک مرتبہ جی میں آیا بھی کہ اٹھ کر باہر کا ایک چکر لگا آئے لیکن پھر یہ خیال ذہن سے نکال دیا اور تیسرا کاغذ اٹھا کر کیمرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''اس کاغذ کی تحریر صرف ایک پیراگراف پر مشتمل ہے اور مجھے ہی مخاطب کیا گیا ہے' میں اس کا متن پڑھتا ہوں۔ 'سلطان! گگن دیپ سیام اور برما کی سرحد پر واقع ورلڈ ٹرائبس مشنری کی ایک تبلیغی جماعت میں شامل ہے۔ وہ ان جنگلوں میں آباد ناگا شان اور دوسرے قبائل میں تبلیغی خدمات انجام دے رہی ہے۔ قریب ترین شہر دیبور گڑھ ہے۔ میں نے ایک مرتبہ اسے تلاش کرانے کی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ پچھلے بیس سال سے میرا اس سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ مجھے امید ہے کہ تم اسے تلاش کر لو گے... دستخط... فیروز باہمن...''

سلطان زیدی کے اشارے پر راج پنڈت نے کیمرا آف کر دیا اور مضطربانہ انداز میں میز کے اردگرد ٹہلنے لگا۔ سلطان اپنی جگہ پر بیٹھا بارہا ان کاغذات کا مطالعہ کر رہا تھا۔

''کیا آپ کو معلوم تھا کہ اس کی کوئی ناجائز بیٹی بھی ہے؟''

راج پنڈت کی آواز سن کر سلطان زیدی نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ چند لمحے دیوار کو گھورتا رہا پھر راج پنڈت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''اب تک میں فیروز باہمن کی گیارہ وصیتیں تیار کر چکا ہوں لیکن اس نے کبھی اپنی اس بیٹی کا تذکرہ نہیں کیا۔''

''سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نے یہ بات اب تک دوسروں سے کیوں چھپائے رکھی؟ بہرحال ہمیں اس کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' راج پنڈت نے کہا۔

سلطان زیدی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ فیروز باہمن کے حوالے سے پریشانی کا لفظ اس کے لیے بے معنی سا ہو کر رہ گیا تھا۔ بزنس اور پرائیویٹ زندگی میں بھی وہ متلون مزاج آدمی تھا۔ نہ کبھی خود چین سے بیٹھتا تھا نہ دوسروں کو بیٹھنے دیتا تھا۔

سلطان زیدی کی جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو ابتدائی دنوں میں ہی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ چکا ہوتا۔ سلطان نے بڑے تحمل اور بردباری سے کام لیتے ہوئے اس کے ساتھ وقت گزارا تھا اور کسی بھی موقعے پر اسے آپے سے باہر نہیں ہونے دیا تھا لیکن اب جو کچھ بھی ہوا تھا، وہ سلطان جیسے شخص کا بھی دماغ ماؤف کر دینے کے لیے کافی تھا۔ کتنی عجیب بات تھی

کہ وہ بیٹھے بیٹھے اچانک ہی اپنی وہیل چیئر سے اٹھا اور دوڑتے ہوئے چلانگ لگا دی اور اب صرف ایک صفحے پر مشتمل اس کی وصیت سلطان کے سامنے تھی۔ ایک ایسی ہستی کو اربوں روپے کی دولت منتقل کر دی گئی تھی جسے کوئی جانتا تک نہیں تھا۔ اور شاید وہ نامعلوم ہستی بھی اتنی بڑی دولت کا مفہوم نہیں سمجھتی ہوگی۔

''میرا حلق خشک ہو رہا ہے راج!'' سلطان نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہاں کچھ پینے کو مل جائے گا؟''

''صرف سادہ پانی۔'' راج پنڈت نے میز پر رکھی ہوئی پانی کی بوتلوں کی طرف اشارہ کیا اور ایک گلاس میں پانی انڈیل کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

پانی پینے کے بعد سلطان نے گلاس میز پر رکھ دیا اور وہ دونوں ایک دروازے سے گزرتے ہوئے باہمن کے دفتر میں آ گئے۔ تمام الماریاں اور میزوں کی درازیں غیر مقفل تھیں۔ حالانکہ باہمن درازوں کو ہمیشہ تالے لگا کر رکھا کرتا تھا لیکن شاید اسے یہ اندازہ تھا کہ اس کی موت کے بعد سلطان زیدی اس کے دفتر کی تلاشی لے گا۔ اس لیے اس نے تمام الماریوں اور میزوں کی درازیں کھلی چھوڑ دی تھیں۔

فیروز باہمن کی نئی سیکریٹری اور دوسرے تمام لوگ ابھی تک گراؤنڈ فلور پر ہی تھے۔ سلطان اطمینان سے تلاشی لینے لگا۔ میز کی درمیان والی دراز سے مختلف نذر آتش کرنے والی ایک کمپنی کا ایگریمنٹ مل گیا۔ یہ اس معاہدے کی ڈپلی کیٹ کاپی تھی جس کے تحت باہمن نے اس کمپنی کو اپنی لاش نذرِ آتش کرنے کا اختیار دیا تھا۔ اس پر پانچ ہفتے پہلے کی تاریخ درج تھی۔ اس دراز میں ایک ایسی فائل بھی مل گئی جس کے کور پر موٹے موٹے حروف میں 'ورلڈ ٹرانجس مشن' لکھا ہوا تھا۔

سلطان زیدی نے اس دفتر سے وہ تمام چیزیں جمع کر لیں جن کی فوری طور پر اسے ضرورت تھی۔ پھر وکرم کو بلا کر اپنے سامنے دفتر بند کروا دیا۔

''اس آخری وصیت میں کیا لکھا ہوا ہے سلطان مہاراج جی۔'' وکرم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس کے لہجے میں ہلکی سی کپکپاہٹ اور چہرے پر زردی تھی۔ آنکھیں بھی سوجی ہوئی تھیں۔ وہ تیس سال سے فیروز باہمن کے لیے خدمات انجام دے رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ باہمن نے اپنی وصیت میں اس کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور چھوڑا ہوگا۔

''ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔'' سلطان زیدی نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ ''میں یہاں تمام چیزوں کی فہرست تیار کرنے کے لیے کل آؤں گا اور تم کسی کو اس کمرے میں داخل مت ہونے دینا۔''

''ٹھیک ہے، سمجھ گیا مہاراج۔'' وکرم نے جواب دیا۔ اس کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو بہہ نکلے۔

جب وہ فیروز باہمن کے دفتر سے نکلے تو ویٹنگ روم میں ایک پولیس آفیسر ان کا منتظر تھا۔ سلطان زیدی اسے بتانے لگا کہ کس طرح فیروز باہمن باتیں کرتے ہوئے اچانک ہی اٹھ کر بھاگ کھڑا ہوا تھا اور ٹیرس کے حفاظتی جنگلے سے چلانگ لگا دی تھی۔ اس نے پولیس آفیسر کو وہ جگہ بھی دکھائی جہاں سے باہمن نے چلانگ لگائی تھی۔ ان گواہوں کے نام بھی بتائے جو اس وقت وہاں موجود تھے۔ لیکن اس لفافے سے برآمد ہونے والی آخری وصیت اور دوسرے کاغذات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ یہ سیدھا سادہ خودکشی کا کیس تھا۔ پولیس آفیسر نے ان کے بیانات لکھنے کے بعد کیس وہیں پر بند کر دیا اور رخصت ہو گیا۔

پولیس آفیسر سے فارغ ہوتے ہی وہ اسپتال پہنچ گئے۔ سلطان زیدی میڈیکل آفیسر سے پوسٹ مارٹم کے بارے میں بات کرنے لگا۔

''پوسٹ مارٹم کیوں؟'' راج پنڈت نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''اس کی کیا ضرورت ہے؟''

''یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اس نے کوئی نشہ آور دوا یا الکحل استعمال نہیں کی تھی۔ ایسی رپورٹ کی موجودگی میں اس کے آخری فیصلے کو چیلنج کرنا آسان نہیں ہوگا۔ وہ بہت ذہین آدمی تھا۔ مرنے سے پہلے اس نے تمام انتظامات کر لیے تھے۔'' سلطان نے کہا۔

وہ شام چھ بجے سے پہلے اسپتال سے فارغ نہیں ہو سکے تھے۔ سلطان کا حلق خشک ہو رہا تھا اور دماغ میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ کچھ پینے کی طلب شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ وہ ایک ریسٹورنٹ میں آ گئے۔ یہاں سے ان کا دفتر بھی زیادہ دور نہیں تھا۔ ٹھنڈے پانی کے دو گلاس حلق سے اتارنے کے بعد ہی سلطان کو اپنے حواس بحال ہوتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ پہلی بار اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ بھی آ گئی۔ اس نے ویٹر سے کافی کے لیے کہہ دیا۔

''وہ بہت ذہین آدمی تھا۔'' وہ راج پنڈت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مرنے سے پہلے اس نے ہر بات کا خیال رکھا تھا۔ کسی معمولی سی بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔''

''بہت ظالم ہے وہ۔'' راج پنڈت بڑبڑایا۔

''ہے نہیں، تھا۔'' سلطان نے تصحیح کی۔

''نہیں، وہ اب بھی زندہ ہے۔ ہمارے آس پاس کہیں موجود ہے۔ اس کی چیختی دھاڑتی آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔'' راج پنڈت نے کہا۔

سلطان نے عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا پھر گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''کیا تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ وہ احمق لوگ اگلے مہینے کے دوران کس بے دردی سے رقم خرچ کریں گے۔''

''میرا خیال ہے انہیں خبردار کر دینا چاہیے۔'' راج پنڈت بولا۔

''نہیں۔'' سلطان نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''یہ ہماری ذمے داری نہیں ہے۔ ہمارے کرنے کو اور بھی بہت سے کام ہیں۔''

☆☆☆

فوربس میگزین کے مطابق فیروز باہمن ہندوستان کا تیسرا امیر ترین آدمی تھا۔ اس کی موت نے ایک تہلکہ سا مچا دیا تھا۔ مزید برآں اس نے مرنے کے لیے جو طریقہ اختیار کیا تھا اس نے نہ صرف سنسنی پھیلا دی تھی بلکہ پریس کو طویل عرصے کے لیے بہت دلچسپ مواد فراہم کر دیا تھا۔

دوزری کے عالی شان مینشن کے باہر پریس رپورٹرز کی ایک معقول تعداد جمع تھی۔ وہ کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھے جو اس فیملی کی طرف سے ترجمان کے فرائض انجام دیتے ہوئے کوئی نیا سنسنی خیز انکشاف کر سکے۔ لیکن ابھی تک ایسا کوئی شخص سامنے نہیں آیا تھا۔ وہ مینشن میں آنے جانے والے ہر شخص کو روک کر سوالات کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے پڑوسیوں کا بھی ناطقہ بند کر دیا تھا۔

مینشن کے اندر فیروز باہمن کے چاروں بچے اپنے دوسرے افرادِ خانہ کے ساتھ بیٹھے آنے والے مہمانوں سے تعزیت وصول کر رہے تھے۔ کسی مہمان کی موجودگی میں ان کے چہروں پر افسردگی اور صدمے کے تاثرات نمایاں ہو جاتے۔ آواز بھی گلوگرفتہ سی لگتی لیکن مہمان کے جاتے ہی ڈرامائی انداز میں ان کی آوازیں اور چہروں کے تاثرات بدل جاتے۔ مہنگی شراب اڑائی جا رہی تھی۔ اپنے آپ کو نڈھال کرنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ ان کے بچے بھی، جن کی مجموعی تعداد گیارہ تھی، شراب نوشی میں اپنے والدین کا غم غلط کرنے کے لیے ان کا بھرپور ساتھ دے رہے تھے۔

ٹی وی پر زی چینل سیٹ کر کے اسے چلتا چھوڑ دیا گیا تھا اور زی والے ہر آدھے گھنٹے بعد فیروز باہمن کی ڈرامائی موت کے بارے میں نئے نئے انکشافات کر رہے تھے۔ ایک فنانشل رپورٹر نے پورے دس منٹ تک فیروز باہمن کی دولت اور جائداد کے بارے میں تفصیل بیان کی تھی جسے سن کر ان سب کے چہرے کھل اٹھے تھے۔

پر کوئی شبہ نہیں تھا۔ وہ اس بات پر متفق تھے کہ خودکشی کرنے سے پہلے باہمن پوری طرح ہوش و حواس میں تھا۔ اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جس سے اس پر کوئی معمولی سا شبہ بھی ہو سکتا۔ آخر میں انہوں نے متفقہ طور پر یہ رائے دی تھی کہ خودکشی کرنے کے لیے دماغ خراب ہونا ضروری نہیں ہوتا۔

ان تینوں ماہرینِ نفسیات کے علاوہ وکیلوں کی تعداد تیرہ تھی۔ وہ تین گھنٹوں تک صورتِ حال کے ہر پہلو کا جائزہ لیتے رہے اور بالآخر ستیش چوپڑا نے میٹنگ برخاست کر دی۔ اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے۔

☆☆☆

فیروز باہمن کی تینوں سابق بیویوں اور بچوں کے درمیان میں اگرچہ آپس کی بول چال بند تھی۔ سوتیلے پن نے انہیں ایک دوسرے سے بہت دور کر دیا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ ایک دوسرے کی صورت تک دیکھنے کے روادار نہیں تھے لیکن ان کے قانونی مشیروں کے آپس میں صلاح مشورے اور میٹنگ حیرت کی بات تھی۔ اس میٹنگ کا کریڈٹ ستیش چوپڑا ہی کو جاتا تھا جو کئی برسوں سے فرشید باہمن کے قانونی مشیر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہا تھا۔

باہمن ٹاور سے واپس آنے کے بعد ہی اس نے میٹنگ کے لیے کوششیں شروع کر دی تھیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جب فیروز باہمن کی لاش ایمبولینس میں رکھی جا رہی تھی، ستیش چوپڑا نے اس وقت مہتاب اور سمرا کے وکیلوں سے سرگوشیاں کرتے ہوئے میٹنگ کے سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کر دیا تھا۔

دوسرے وکیلوں کے خیال میں بھی یہ ایک اچھا آئیڈیا تھا۔ اس طرح انہیں صورتِ حال کا اندازہ لگانے اور آنے والے وقت کے مقابلے کی تیاری کرنے میں آسانی رہتی۔ ..... وہ طے شدہ پروگرام کے مطابق اس روز پانچ بجے ستیش چوپڑا کے دفتر پہنچ گئے۔ ڈاکٹر بیرا سنگھ، پریم شرما اور ریاض مرزا بھی ان کے ساتھ تھے۔

فیروز باہمن کی خودکشی نے وقتی طور پر ان سب کو بدحواس کر دیا تھا۔ وکیلوں کے اس گروپ نے تینوں ماہرینِ نفسیات سے الگ الگ طویل بحث کی تھی۔ فیروز باہمن کے چلانگ لگانے سے پہلے اس کی ذہنی کیفیت کے بارے میں لاتعداد سوال کیے تھے۔

تینوں ماہرینِ نفسیات کو فیروز باہمن کی دماغی تندرستی

دوزری سوگوار بیوہ کی بہترین اداکاری کررہی تھی۔ مہمانوں کے سامنے تو وہ سسکیاں اور آہیں بھرتی لیکن ان کے جاتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آجاتی۔ وہ چونکہ فیروز باہمن کی پہلی بیوی تھی اور اصولی طور پر اس پر کچھ ذمے داریاں بھی عائد ہوتی تھیں۔ وہ اپنے آپ کو آنے والے کل کے لیے تیار کررہی تھی تاکہ تجہیز و تکفین کے انتظامات کا جائزہ لے سکے۔

دس بجے کے قریب ستیش چوپڑا بھی پہنچ گیا۔ اس نے بتایا کہ وہ سلطان زیدی سے مل کر آرہا ہے۔ اس کے کہنے کے مطابق نہ تو تجہیز و تکفین ہوگی اور نہ ہی کوئی اور رسم۔ پوسٹ مارٹم کے بعد میت کو نذرِ آتش کردیا جائے گا اور راکھ دریا میں بہادی جائے گی۔ یہ سب کچھ فیروز باہمن کی خواہش کے مطابق ہوگا۔ سلطان کے پاس باہمن کی تحریری ہدایات موجود تھیں اور اگر کوئی مزاحمت کی گئی تو وہ عدالت تک جائے گا۔

دوزری یا اس کے بچوں کو اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ فیروز باہمن کی کوئی آخری خواہش پوری ہوتی ہے یا نہیں۔ انہیں اس سے بھی کوئی غرض نہیں تھی کہ اسے دفن کیا جاتا ہے یا لاش کو جلا کر راکھ کردیا جاتا ہے۔ لیکن ستیش چوپڑا کے سامنے خاموش رہنا مناسب نہیں تھا۔ اسے کسی نہ کسی ردِعمل کا اظہار ضرور کرنا چاہیے ایک وکیل کے سامنے ان کا احتجاج تو ریکارڈ پر آنا چاہیے اور دوزری نے احتجاج کیا۔ ''کوئی دعائیہ رسم نہ ہونا فیروز باہمن کی روح کے ساتھ زیادتی ہوگی۔'' قریب کھڑی ہوئی سمرا بھی اپنی آنکھوں میں آنسو لانے میں کامیاب ہوگئی تھی۔

''لیکن ہم اسے ایشو نہیں بنا سکتے۔'' ستیش چوپڑا نے انہیں سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر باہمن نے مرنے سے پہلے یہ سب کچھ لکھ کر رکھا ہوا تھا اور عدالت بھی اس کی خواہشات کا احترام کرے گی۔''

دوزری وغیرہ نے بات کو آگے نہیں بڑھایا۔ فضول بحث پر وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کی صورت میں کورٹ فیس کی مد میں رقم الگ ضائع ہوگی اور معاملہ مزید الجھتا۔ وہ سب سلطان زیدی کو بھی اچھی طرح جانتے تھے۔ اس سے تصادم کی راہ اختیار کرکے اپنے لیے کسی قسم کی مشکلات پیدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔

''ٹھیک ہے۔'' بالآخر دوزری نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ہم اس کی آخری خواہشات کا احترام کریں گے۔''

قریب کھڑے ہوئے اس کے چاروں بچوں نے بھی ماں کی تائید میں سر ہلا دیا۔

ستیش چوپڑا نے وصیت کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی اور نہ ہی ان میں سے کسی نے پوچھا تھا۔ انہیں چند گھنٹے انتظار کرنا تھا۔ چونکہ تجہیز و تکفین اور دیگر رسومات کا مسئلہ بھی ختم ہوگیا تھا اس لیے انہیں رات بھر جاگنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ دوزری کا خیال تھا کہ ستیش چوپڑا کو کل صبح جلدی بلا لیا جائے تاکہ متوقع ورثے کے بارے میں بات کی جاسکے۔

''لیکن پوسٹ مارٹم کیوں کرایا جارہا ہے؟'' فرشید نے پوچھا۔

''اس کی کوئی وجہ میری سمجھ میں نہیں آسکی۔'' ستیش چوپڑا نے کہا۔ ''سلطان زیدی کے کہنے کے مطابق یہ ہدایت بھی تحریری طور پر موجود ہے۔ لیکن میرے خیال میں وہ بھی اس کی وجہ نہیں سمجھ سکا۔''

ستیش چوپڑا کے جانے کے بعد وہ ایک بار پھر شیمپین سے غم غلط کرنے لگے۔ مہمانوں کی آمد رفت بھی رک گئی۔ دوزری اپنے بیڈ روم میں آگئی۔ سمرا اور سوسن اپنے شوہروں اور بچوں کے ساتھ اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں۔ مہتاب اور فرشید بیسمنٹ میں بلیئرڈ روم میں آگئے اور دروازہ بند کرکے شراب نوشی کرنے لگے۔ وہ اپنے باپ کی موت کے بجائے متوقع طور پر ملنے والی دولت کا جشن منا رہے تھے۔

☆☆☆

فیروز باہمن کی موت کے دوسرے دن صبح آٹھ بجے سلطان زیدی کمپنی کے ڈائریکٹروں کی میٹنگ سے خطاب کررہا تھا۔ دو سال پہلے باہمن نے سلطان کا نام بھی بورڈ آف ڈائریکٹرز کی فہرست میں شامل کردیا تھا لیکن اس کے خیال میں بورڈ میں اس کا کردار برائے نام ہی تھا۔ محض خانہ پُری کے لیے۔

گزشتہ چھ برسوں کے دوران میں فیروز باہمن نے عملی طور پر کمپنی کی کاروباری سرگرمیوں میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا لیکن اس کے باوجود اس عرصے میں کمپنی نے معقول منافع کمایا تھا۔ باہمن کی عدم دلچسپی کی وجہ دوسروں کی سمجھ میں نہیں آسکی تھی لیکن سلطان زیدی چونکہ اس کے سب سے زیادہ قریب تھا اس لیے وہ سمجھ گیا تھا کہ بعض گھریلو الجھنوں کی وجہ سے وہ ڈپریشن کا شکار ہے۔ روزمرہ کی کاروباری سرگرمیوں میں اس کی دلچسپی ختم ہوگئی تھی۔ اس کی توجہ صرف ہفتہ وار رپورٹس تک محدود ہوکر رہ گئی تھی جس سے اسے پتا چل جاتا کہ کمپنی کتنا منافع کمارہی ہے۔

امرناتھ کمپنی کا موجودہ چیف ایگزیکٹو تھا۔ تمام کاروبار وہی سنبھالے ہوئے تھا۔ وہ تقریباً بیس سال پہلے ایک معمولی کلرک کی حیثیت سے کمپنی میں ملازم ہوا تھا۔ محنت اور ذہانت کے بل بوتے پر ترقی کرتا ہوا اس عہدے تک پہنچا تھا۔ فیروز باہمن کو اس پر مکمل اعتماد تھا۔ باہمن کی ناگہانی موت نے دوسروں کی طرح اسے بھی بدحواس کررکھا تھا۔ صبح آٹھ بجے سلطان زیدی جب کانفرنس ہال میں داخل ہوا تو اس وقت بھی امرناتھ کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات نمایاں تھے۔

پریشانی اور تشویش کی وجہ معقول تھی۔ کمپنی میں فیروز باہمن کی تینوں سابق بیویوں اور بچوں کے کچھ ہمدرد اور حمایتی بھی موجود تھے اندیشہ اس بات کا تھا کہ اگر کمپنی کی اونرشپ ان لوگوں کے ہاتھ میں چلی گئی تو اسے دِوالیا ہونے میں زیادہ عرصہ نہیں لگے گا۔

سلطان زیدی نے اپنی تقریر کا آغاز فیروز باہمن کی تجہیز و تکفین کے موضوع سے کیا تھا۔

''تدفین نہیں ہوگی۔'' اس نے کہا۔ ''کوئی دعائیہ رسم نہیں ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اجتماعی طور پر اس کی مغفرت کی دعا نہیں کرسکیں گے۔''

''کمپنی کا نیا مالک کون ہوگا؟'' امرناتھ نے پوچھا۔

''فی الحال کچھ نہیں کہا جاسکتا۔'' سلطان نے جواب دیا۔ ''مسٹر باہمن نے چھلانگ لگانے سے چند منٹ پہلے ہی وصیت پر دستخط کیے تھے اور مجھے ہدایت کی تھی کہ کچھ عرصے تک اسے خفیہ رکھا جائے۔ ان ہدایات کے مطابق میں اس وصیت کے بارے میں ابھی کسی کو کچھ نہیں بتا سکتا۔''

''کب؟'' امرناتھ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''جلد ہی... لیکن اس وقت نہیں۔'' سلطان نے جواب دیا۔

''تو اس کا مطلب ہے کہ کمپنی کے معاملات معمول کے مطابق چلتے رہیں گے؟''

''بالکل۔'' سلطان زیدی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''بورڈ بھی یہی رہے گا۔ کسی شخص کو اس کی جگہ سے نہیں ہلایا جائے گا۔ تمام کاروباری سرگرمیاں معمول کے مطابق جاری رہیں گی۔''

سلطان زیدی نے اگرچہ یہ بات پورے اعتماد سے کہی تھی لیکن کسی کو یقین نہیں تھا کہ ایسا ہوگا۔ کمپنی کی اونرشپ جلد یا بہ دیر تبدیل ہونے والی تھی۔ فیروز باہمن نے باہمن گروپ کو کبھی بھی پبلک کمپنی بنانے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ کبھی اس کے حصص فروخت نہیں کیے تھے۔ وہ اپنے تمام ملازمین کو بہت معقول تنخواہ دیتا تھا۔ تین فیصد حصص اس نے کمپنی کے چند خاص ملازمین کو دے رکھے تھے۔ اس کے سوا کوئی بھی حصے دار نہیں تھا جس کا مطلب تھا کہ اس کا ستانوے فیصد مالک صرف اور صرف فیروز باہمن تھا۔

میٹنگ تقریباً ایک گھنٹے تک جاری رہی۔ آخر میں متفقہ طور پر ایک پریس ریلیز بھی تیار کی گئی اور میٹنگ برخاست کردی گئی۔

کانفرنس ہال سے نکلتے ہی سلطان زیدی کی ملاقات راج پنڈت سے ہوگئی اور وہ دونوں اسپتال کی طرف روانہ ہوگئے۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ تیار ہوچکی تھی۔ موت کی وجہ تو سامنے کی بات تھی۔ الکحل یا کسی قسم کی نشہ آور چیز کے آثار بھی نہیں ملے تھے اور سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ تھی کہ فیروز باہمن کے دماغ میں نہ تو کوئی رسولی تھی اور نہ ہی کینسر کے کوئی نشان پائے گئے تھے۔ موت سے پہلے وہ طبعی لحاظ سے بالکل تندرست تھا۔

اسپتال سے واپسی پر وہ دونوں دیر تک خاموش رہے۔ راج پنڈت کار کی کھڑکی سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے خاموشی توڑنے میں پہل کی۔

''کیا باہمن نے آپ کو کبھی برین ٹیومر کے بارے میں بتایا تھا؟''

''کئی مرتبہ۔'' سلطان نے بھاری ٹریفک میں گاڑی کی رفتار کم کرتے ہوئے جواب دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ فیروز باہمن کے بارے میں مزید کتنے سنسنی خیز انکشافات ہوں گے۔

''اس نے جھوٹ کیوں بولا تھا؟'' راج پنڈت نے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

''کیا کہہ سکتا ہوں۔'' سلطان نے کندھے اچکا دیے۔ ''تم ایک ایسے آدمی کا تجزیہ کرنے کی کوشش کررہے ہو جس نے ہوش وحواس میں ہوتے ہوئے عمارت کی چودھویں منزل سے چھلانگ لگا کر اپنی جان دے دی تھی۔ جب برین ٹیومر کی بات ہوتی تھی تو اس وقت دوسروں کی طرح میں بھی یہی سمجھا تھا کہ وہ تین چار مہینوں سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکے گا۔ نفسیات کے تینوں ماہرین انٹرویو سے مطمئن ہوگئے تھے کہ وہ ذہنی طور پر بالکل تندرست ہے اور وہ تینوں اب بھی قسم کھانے کو تیار ہیں کہ وہ بالکل ہوش مند تھا۔''

''لیکن اس کا دماغی توازن درست نہیں تھا اگر ہوش مند ہوتا تو چھلانگ نہ لگاتا۔''

''باہمن کو ایک طرح سے پُراسرار آدمی بھی کہا جا سکتا ہے۔'' سلطان نے جواب دیا۔ ''ایسے آدمیوں کو سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے لیکن وہ خود اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے۔''

''اس نے چھلانگ کیوں لگائی تھی؟'' راج پنڈت نے ایک اور سوال کیا۔

''ڈپریشن۔'' سلطان نے جواب دیا۔ ''چھ بچے، نواسے، نواسیاں اور پوتے پوتیاں ہونے کے باوجود وہ تنہا تھا۔''

وہ شہر کے ایک بڑے چوراہے پر پہنچ چکے تھے۔ یہاں ٹریفک کا ازدحام تھا۔ گاڑیاں چیونٹیوں کی طرح رینگ رہی تھیں۔ ان دونوں کی نظریں آگے والی گاڑی کی سرخ عقبی لائٹس پر مرکوز تھیں۔

''کیا یہ دھوکا نہیں؟'' راج پنڈت کہہ رہا تھا۔ ''اس نے اپنی سابق بیویوں اور بچوں کو دولت کی تقسیم کی امید پر لٹکائے رکھا۔ ان کے ماہرینِ نفسیات کو بھی مطمئن کر دیا اور عین آخری لمحات میں ایک ایسی وصیت پر دستخط کر دیے جس میں بہ قول شخصے ان سب کو ٹھینگا دکھا دیا گیا۔''

''تم ایک طرح سے اسے دھوکا بھی کہہ سکتے ہو لیکن یہ کوئی کاروباری معاہدہ نہیں وصیت ہے اور وصیت تو ورثا کے لیے تحفہ ہوتا ہے۔ قانون کے مطابق کسی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مرنے سے پہلے اپنا سب کچھ اپنی بیوی یا اولاد کے نام منتقل کر دے۔''

''لیکن وہ لوگ خاموش نہیں بیٹھیں گے۔'' راج پنڈت بولا۔ ''وہ لوگ ضرور اس وصیت کو چیلنج کریں گے۔''

''شاید۔'' سلطان زیدی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ان کے پاس وکیلوں کی ایک پوری فوج موجود ہے اور پھر بات بھی دو چار لاکھ کی نہیں۔ اتنی ارب روپے کی تصور سے بھی بہت بڑی رقم ہے۔''

''لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ باہمن ان سے اتنی شدید نفرت کیوں کرتا تھا؟''

''وہ ان سے خوف زدہ تھا۔'' سلطان زیدی نے جواب دیا۔ ''وہ جونک کی طرح چمٹے اس کا خون چوس رہے تھے۔ وہ اس سے لڑتے اور اسے دھمکاتے رہتے تھے۔ انہوں نے کبھی خود تو ایک روپیہ تک نہیں کمایا اور اس کی دولت کو پانی کی طرح بہا رہے تھے۔ ہر ایک کا ماہانہ خرچ لاکھوں کے حساب سے تھا۔ فیروز باہمن نے کبھی بھی ان کے لیے کچھ چھوڑنے کا نہیں سوچا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر وہ مہینوں میں کئی کئی ملین کی رقم ضائع کر سکتے ہیں تو اتنی ارب روپے کی اس دولت کو بھی چند برسوں کے اندر اندر ٹھکانے لگا دینے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کریں گے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کا خیال ٹھیک ہی تھا۔''

''گھریلو جھگڑوں میں اس کا اپنا بھی تو قصور ہوگا؟'' راج پنڈت نے کہا۔

''یقیناً۔'' سلطان زیدی نے جواب دیا۔ ''وہ بہت سخت گیر قسم کا آدمی تھا۔ بچے زیادہ تر اس سے دور ہی رہتے تھے۔ ایک مرتبہ اس نے خود مجھے بتایا تھا کہ وہ نہ تو اچھا باپ ہے اور نہ ہی اچھا شوہر۔ بیویوں پر ہاتھ اٹھانے میں بھی اس نے کبھی کوئی عار نہیں سمجھا تھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی کمپنی میں کام کرنے والی کسی بھی عورت کی معمولی سی غلطی پر بھی اس پر ہاتھ اٹھا دیتا تھا۔ وہ انہیں اپنی ملکیت سمجھتا تھا اور انہیں ہوس کا نشانہ بنانا بھی اپنا حق سمجھتا تھا۔''

''مجھے یاد ہے۔'' راج پنڈت بولا۔ ''اس کی ایک سیکریٹری نے اس کے خلاف قانونی کارروائی کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے الزام لگایا تھا کہ باہمن نے اس کی مرضی کے خلاف زبردستی اس کے ساتھ زیادتی کی تھی۔''

''ہاں اور اس معاملے کو دبانے کے لیے فیروز باہمن کو کم از کم پچاس لاکھ روپے خرچ کرنے پڑے تھے۔'' سلطان نے جواب دیا۔

''کیا کسی اور غیر متوقع وارث کے سامنے آنے کا امکان ہو سکتا ہے؟'' راج نے پوچھا۔

''کچھ نہیں کہا جا سکتا۔'' سلطان زیدی نے جواب دیا۔ ''میں نے اس کے چھ بچوں کے علاوہ کسی اور کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا لیکن وصیت میں اس لڑکی کے بارے میں انکشاف ہوا جسے اتنی بڑی دولت کا وارث قرار دے دیا گیا۔ میں اور فیروز باہمن اکثر گھنٹوں بیٹھے اس کی دولت اور اس کی تقسیم کے بارے میں باتیں کیا کرتے تھے لیکن اس لڑکی کا کبھی ذکر بھی نہیں آیا تھا۔''

''لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسے تلاش کیسے کیا جائے؟'' راج پنڈت نے پوچھا۔

''پتا نہیں۔'' سلطان زیدی نے کندھے اچکا دیے۔ ''میں نے ابھی اس کے بارے میں کچھ نہیں سوچا۔''

☆☆☆

سلطان زیدی کی کمپنی کا شمار ممبئی کی گنی چنی چند بڑی فرمز میں ہوتا تھا۔ اس لا فرم میں ساٹھ وکیل تھے۔ سلطان زیدی اس کا بانی اور پرنسپل پارٹنر تھا۔ بعد میں راج پنڈت اور

چار دیگر وکیل بھی پارٹنرشپ میں شامل ہو گئے تھے۔ انہوں نے بڑی محنت کی اور مسلسل آگے بڑھتے رہے۔ تیس سال بہت طویل عرصہ تھا۔ بڑے بڑے گھاگ وکیل اس کمپنی میں آنے کو تیار تھے مگر سلطان ایسے جوان وکلا کو ترجیح دیتا تھا جنہوں نے دس سال تک عدالتوں میں مقدمے لڑے ہوں۔

سلطان زیدی نے بھی کئی مقدمات لڑے تھے لیکن کچھ عرصے پہلے ہارٹ اٹیک ہونے کے بعد وہ جوش و ولولہ ماند پڑ گیا تھا جن کا اظہار عدالت میں مقدمے کی کارروائی کے دوران میں ضروری ہوتا ہے۔ اب وہ دفتر میں بیٹھا کرتا تھا لیکن فیروز باہمن کے تمام معاملات اس نے اپنے ہاتھ میں لے رکھے تھے۔ ان کی دیکھ بھال وہ خود کرتا تھا۔

جب وہ دفتر میں داخل ہوا تو انتظار گاہ میں وکلا کی تین پارٹیاں اس کی منتظر بیٹھی تھیں۔ وہ انہیں نظر انداز کرتا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔ جب وہ کوٹ اتار رہا تھا تو اس کی دو سیکریٹریوں نے وہ پیڈ اس کی طرف بڑھا دیے جن پر اس کی عدم موجودگی میں آنے والے پیغامات لکھے ہوئے تھے۔

''سب سے زیادہ ضروری کیا ہے؟'' اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ پیغام۔'' ایک سیکریٹری نے کاغذ آگے بڑھا دیا۔

وہ ستیش چوپڑا کا پیغام تھا۔ گزشتہ ایک مہینے کے دوران اس سے کم از کم چھ سات ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ سلطان نے ریسیور اٹھا کر نمبر ملایا۔ ستیش سے رابطہ ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد ستیش فوراً ہی اصل موضوع پر آ گیا۔

''میں بڑی مشکل میں ہوں زیدی۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''میرے کلائنٹ وصیت نامہ دیکھنا چاہتے ہیں یا کم از کم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس میں کیا ہے؟''

''نہیں چوپڑا... ابھی یہ ممکن نہیں۔'' سلطان نے جواب دیا۔

''کیوں... کوئی خاص وجہ؟'' ستیش چوپڑا نے پوچھا۔

''خودکشی والے مسئلے نے میرے ذہن کو الجھا رکھا ہے۔''

''کیا... کیا مطلب ہے تمہارا؟'' چوپڑا کی چونکی ہوئی آواز سنائی دی۔

''دیکھو چوپڑا۔'' سلطان نے کہا۔ ''خودکشی کرنے والا کوئی شخص چند سیکنڈ پہلے تک صحیح الدماغ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''لیکن...'' ستیش چوپڑا نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے ماہر نفسیات نے تمہاری موجودگی میں اس کا انٹرویو لیا تھا اور وہ ساری گفتگو ویڈیو ٹیپ پر موجود ہے۔''

''لیکن کیا فیروز باہمن کی خودکشی کے بعد وہ تینوں ماہرین نفسیات اب بھی اپنے مؤقف پر قائم ہیں؟'' سلطان نے پوچھا۔

''کیوں نہیں۔'' ستیش چوپڑا نے جواب دیا۔ ''گزشتہ رات ہم نے ان تینوں کے ساتھ ایک میٹنگ کی تھی۔ ان سے بھی بیسیوں سوالات کیے گئے تھے۔ وہ اب بھی اپنے اس مؤقف پر قائم ہیں کہ فیروز باہمن صحیح الدماغ اور مکمل طور پر ہوش و حواس میں تھا۔ انہوں نے آٹھ صفحات پر مشتمل ایک حلف نامے پر دستخط بھی کر دیے ہیں۔''

''کیا میں وہ حلف نامہ دیکھ سکتا ہوں؟'' سلطان نے کہا۔

''میں ابھی بھجوا رہا ہوں۔''

''میں انتظار کر رہا ہوں۔'' سلطان نے کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔ اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ آ گئی۔

اس نے سیکریٹری کو اشارہ کیا تو اس نے دروازہ کھول دیا اور ویٹنگ روم میں بیٹھی ہوئی وکیلوں کی تینوں پارٹیاں اندر آ گئیں۔ وہ سب ایک طرف قطار میں لگی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ وہ سب جوان تھے۔ ذہانت ان کی آنکھوں سے چھلکتی تھی۔ ان کے چہروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ زندگی میں آگے بڑھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

سلطان زیدی نے فیروز باہمن کی ہاتھ سے لکھی ہوئی وصیت پر مرحلہ وار کام کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ آگے چل کر اس معاملے میں خاصی قانونی پیچیدگیاں پیش آئیں گی۔ وکلا کی پہلی پارٹی کے سپرد جو کام کیا گیا، وہ فیروز باہمن کی وصیت کی حیثیت کا تعین کرنا تھا۔ صحیح الدماغی اور دیوانگی کے درمیانی وقفے پر وہ زیادہ توجہ دینا چاہتا تھا۔ وہ ایسے کیسز کی تفصیلات حاصل کرنا چاہتا تھا جو اس سے ملتی جلتی وصیتوں کے حوالے سے تھے۔

دوسری ٹیم کو ہولوگرافک ول کے بارے میں تفصیلات حاصل کرنے کی ذمے داری سونپی گئی تھی۔ یہی ایک پہلو ایسا تھا جسے چیلنج کیا جا سکتا تھا۔

اب کمرے میں ایک ٹیم رہ گئی تھی۔ سلطان زیدی نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ چند لمحے ان کی طرف دیکھتا رہا پھر سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔

''تمہیں ایک ایسی ہستی کو تلاش کرنا ہے جس کے بارے میں مجھے شبہ ہے کہ وہ سامنے نہیں آنا چاہتی۔'' وہ چند لمحے خاموش رہا پھر انہیں گگن دیپ کے بارے میں بتانے لگا۔ اس کے بارے میں وہ خود بھی اتنا ہی جانتا تھا جتنا اسے

باہمن کی میز کی دراز سے دستیاب ہونے والی فائل سے معلوم ہوا تھا۔

''سب سے پہلے یہ معلوم کرنا ہے کہ ورلڈ ٹرائبس مشن والے لوگ کون ہیں؟ وہ کس طرح لوگوں کو منتخب کرتے ہیں اور انہیں کہاں بھیجتے ہیں اور ان کا طریقہ کار کیا ہے؟ ممبئی میں ایسے لوگ موجود ہیں جو گمشدہ آدمیوں کو تلاش کرنے کا خصوصی تجربہ اور مہارت رکھتے ہیں۔ تمہیں ایسے صرف دو آدمی تلاش کرنے ہوں گے۔ ان کی ذمے داریاں بعد میں بتائی جائیں گی۔

''تیسری بات یہ کہ گگن دیپ کی ماں کا نام الزبتھ ہے۔ اس کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس کے بارے میں تفصیلی معلومات درکار ہوں گی۔ ویسے یہ طے شدہ بات ہے کہ الزبتھ اور فیروز باہمن میں جنسی تعلقات تھے جس کے نتیجے میں گگن دیپ پیدا ہوئی تھی۔''

اس تیسری پارٹی کو بھی رخصت کرنے کے بعد وہ میٹنگ ہال میں آ گیا جہاں راج پنڈت نے ایک چھوٹی سی پریس کانفرنس کا انتظام کر رکھا تھا۔ الیکٹرانک میڈیا کا کوئی نمائندہ نہیں تھا اس لیے کوئی ٹی وی کیمرا بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ صرف چند بڑے اخبارات کے رپورٹرز کو بلایا گیا تھا۔

درجن بھر اخباری رپورٹرز ایک بڑی میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے چھوٹے ٹیپ ریکارڈر اور مائکروفونز بھی رکھے ہوئے تھے۔ چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد سوالات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سلطان بڑے تحمل اور بردباری سے جواب دے رہا تھا۔

''ہاں، مسٹر فیروز باہمن کے ہاتھ کی لکھی ہوئی وصیت موجود ہے لیکن میں اس کے بارے میں فی الحال کچھ نہیں بتا سکتا... جی ہاں... لاش کا پوسٹ مارٹم بھی ہوا تھا لیکن اس حوالے سے بھی کوئی بات نہیں کی جائے گی... جی آپ ٹھیک سمجھے۔ کمپنی کی کاروباری سرگرمیاں حسب معمول جاری رہیں گی اور یہ کہنا قبل از وقت ہے کہ نیا مالک کون ہوگا۔''

سلطان زیدی کو یہ جان کر زیادہ حیرت نہیں ہوئی کہ باہمن کی سابق بیویاں اور بچے بھی اخباری رپورٹرز سے ملاقاتیں کر کے کچھ ''سنسنی خیز انکشافات'' کرتے رہے ہیں۔

''سننے میں آیا ہے کہ مسٹر فیروز باہمن کی آخری وصیت کے مطابق اس کی دولت اس کے چھ بچوں میں تقسیم کی جائے گی۔ کیا آپ اس کی تصدیق یا تردید کرنا پسند کریں گے؟''

''میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ افواہ تو افواہ ہی ہوتی ہے۔'' سلطان نے کہا۔

''کیا یہ درست ہے کہ وہ کینسر میں مبتلا تھا؟'' ایک اور رپورٹر نے پوچھا۔

''میں اس پر کوئی تبصرہ نہیں کر سکتا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ سے حقیقت سامنے آ جائے گی۔''

''ہم نے سنا ہے کہ مسٹر فیروز باہمن کی موت سے تھوڑی دیر پہلے ماہرین نفسیات کی ایک ٹیم نے ان کا انٹرویو کیا تھا اور انہیں ذہنی طور پر تندرست اور ہوش مند قرار دیا تھا۔ کیا آپ اس کی تصدیق کریں گے؟'' ایک اور رپورٹر نے سوال کیا۔

''یہ درست ہے۔'' سلطان زیدی نے جواب دیا۔

اخباری رپورٹر اگلے بیس منٹ تک فیروز باہمن کی ذہنی کیفیت کے بارے میں سوالات کرتے رہے اور سلطان زیدی اس مؤقف پر ڈٹا رہا کہ چھلانگ لگانے سے پہلے فیروز باہمن نارمل ہی نظر آ رہا تھا۔

رپورٹرز نے کمپنی کی مالی حیثیت اور اعداد و شمار کے بارے میں بھی سوالات کیے۔ باہمن گروپ چونکہ ایک بڑی پرائیویٹ کمپنی تھی اس کے حسابات بھی خفیہ ہی رکھے جاتے تھے۔ بعض رپورٹرز کا خیال تھا کہ اس پریس کانفرنس سے فائدہ اٹھا کر کچھ معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں لیکن سلطان زیدی انہیں زیادہ معلومات فراہم نہیں کر سکا تھا۔

☆☆☆

دوپہر کا وقت تھا... مہتاب باہمن صبح سے اپنے کمرے میں بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ وہ کرسی سے اٹھ کر کچھ دیر ٹہلتا رہا۔ پھر اس نے فون کا ریسیور اٹھایا اور اپنے قانونی مشیر کا نمبر ملانے لگا۔ وہ باپ کی وصیت کے حوالے سے تازہ ترین صورت حال معلوم کرنا چاہتا تھا۔

''اس میں کچھ وقت لگے گا مسٹر مہتاب۔'' وکیل نے تسلی دیتے ہوئے جواب دیا۔

''لیکن میں انتظار کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔'' مہتاب باہمن دہاڑا۔ شراب نوشی کی وجہ سے اس کے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔

''یہ کوئی اتنا آسان کام نہیں ہے۔ چند روز تو لگیں گے۔ اس وقت تک...''

پوری بات سنے بغیر مہتاب باہمن نے ریسیور پٹخ دیا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ یہ غنیمت تھا کہ اس کی بیوی اس وقت گھر پر موجود نہیں تھی۔ صبح سے اب تک ان میں تین مرتبہ لڑائی ہو چکی تھی اور شاید وہ اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے شاپنگ کرنے چلی گئی تھی۔ مہتاب کو اب اس سے غرض نہیں

تھی کہ وہ کتنا خرچ کرتی ہے کیونکہ اسے وراثت میں ایک بہت بڑی رقم ملنے والی تھی۔

''بوڑھا بکرا بالآخر مر گیا۔''

مہتاب اونچی آواز میں بڑبڑایا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس کی آواز سننے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کے دونوں بچے بھی کالج گئے ہوئے تھے۔ ان کی فیس وغیرہ دوزیری ہی دیتی تھی۔ اسے طلاق کے وقت شوہر سے جو رقم ملی تھی' اس میں سے تھوڑی بہت اب بھی محفوظ تھی۔ مہتاب باہمن اپنی بیوی درگا کے ساتھ یہاں اکیلا رہتا تھا۔ ازدواجی رشتوں کے لحاظ سے یہ خاندان چوں چوں کا مربع تھا۔ دین دھرم کو کوئی کچھ سمجھتا نہیں تھا اور شادیوں کے حوالے سے بھی مذہب کو طاق پر رکھ دیا گیا تھا۔ اس خاندان میں ہندو بھی تھے، سکھ بھی، عیسائی بھی اور دوسری قومیتوں کو بھی نمائندگی حاصل تھی۔ فیروز باہمن کے اپنے بچوں کا تعلق زرتشت سے تھا لیکن انہیں تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ زرتشت کون تھے... اور وہ لوگ جن سے ان کی رشتے داریاں ہوئی تھیں یا ہو رہی تھیں' وہ بھی اپنے دھرم سے بیگانے تھے۔ مہتاب باہمن کی بیوی درگا ہندو تھی لیکن اس کی طرح وہ بھی اپنے دھرم کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ درگا کا باپ کنسٹرکشن کے شعبے سے وابستہ رہا تھا اور درگا کو بھی اس کام کا وسیع تجربہ تھا۔ اس کے پاس کنسٹرکشن کا لائسنس بھی تھا لیکن اسے کام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ تیس سالہ درگا کی یہ دوسری شادی تھی' اس نے پہلے شوہر سے طلاق لی تھی اور اس سے اس کے دو بچے تھے اور وہ دونوں باپ ہی کے پاس تھے۔

مہتاب باہمن نے بیئر کی ایک اور بوتل کھول لی۔ چند گھونٹ بھرے اور ہال کمرے کی ایک دیوار پر لگے ہوئے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لینے لگا۔

''مہتاب باہمن۔'' وہ آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر بڑبڑایا۔ ''ہندوستان کے تیسرے امیر ترین آدمی فیروز باہمن کا بیٹا... میرا باپ اتنی ارب کی دولت چھوڑ کر مرا ہے۔ دنیا والوں کے لیے مرا ہے۔ ہم اس کا نام زندہ رکھیں گے۔ ہمارے دلوں میں اس کا نام اس وقت تک زندہ رہے گا جب تک اس کی چھوڑی ہوئی دولت ہمارے کام آتی رہے گی۔''

مہتاب باہمن کا یہ مکان خاصا بڑا تھا لیکن برسوں سے رنگ و روغن نہ ہونے اور صفائی کے فقدان کی وجہ سے سیلن کی سی بو کا احساس نمایاں تھا۔ درگا کو گھر کے کاموں سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے تو اپنے موبائل فون پر باتوں ہی سے فرصت نہیں ملتی تھی' فرش پر مختلف چیزیں بکھری رہتی تھیں۔ دیواروں پر کوئی پینٹنگ یا تصویر وغیرہ نہیں تھی۔ جگہ جگہ سے رنگ اُکھڑا ہوا تھا۔ فرنیچر بھی پرانا ہو چکا تھا۔

''یہ فرنیچر تو واقعی بہت پرانا ہو چکا ہے۔'' وہ ایک صوفے کو ٹھوکر مارتے ہوئے بڑبڑایا اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سوچنے لگا کہ مکان کی حالت واقعی بہت خستہ ہو رہی ہے۔ اس کے خیال میں یہ مکان انسانوں کے رہنے کے قابل ہی نہیں تھا۔ اس کے دماغ میں اگرچہ دھما کے ہو رہے تھے مگر وراثت کے تصور سے وہ اپنے آپ کو اونچی ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

اس نے گرے کلر کا اپنا بہترین سوٹ نکال کر پہنا۔ یہی سوٹ اس نے کل بھی پہنا تھا جب اسے دوسروں کے ساتھ باہمن ٹاور بلایا گیا تھا اور وہاں سے واپسی سے پہلے ہی اس کے باپ نے عمارت سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی تھی۔ اب چونکہ تدفین اور دیگر رسومات کا مسئلہ نہیں رہا تھا اس لیے اسے کالے رنگ کا سوٹ خریدنے کی بھی ضرورت نہیں رہی تھی۔

اسے اس بات کی خوشی تھی کہ اس کے پاس اب بھی بی ایم ڈبلیو کار موجود تھی۔ رہنے کو تو وہ اصطبل میں بھی رہ سکتا تھا۔ کسی کو کیا پتا' اندر کیا ہے۔ لوگ تو ظاہری ٹھاٹ باٹ دیکھتے ہیں' اس نے یہ کار بھی قسطوں پر لے رکھی تھی اور ماہانہ قسط جیسے تیسے کر کے پوری کر دیتا تھا۔ وہ مکان سے نکل کر عقبی سمت میں واقع پارکنگ کی طرف آ گیا۔

مہتاب باہمن کی پرورش بڑے اچھے انداز میں ہوئی تھی۔ زندگی عیش و آرام میں گزر رہی تھی۔ اس کی ہر خواہش پلک جھپکنے کی دیر میں پوری ہو جاتی۔ بیس سال کی عمر تک والدین اس کی ضروریات کا خیال رکھے ہوئے تھے۔ اکیسویں سالگرہ پر جب وہ قانونی طور پر بالغ ہو گیا، باپ سے اسے ایک کروڑ روپے کی رقم مل گئی تھی۔ اب وہ اپنے معاملات میں خود مختار تھا۔ اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا تھا اور یہ خطیر رقم اسے اس لیے دی گئی تھی کہ وہ کوئی کاروبار شروع کرے گا لیکن اس نے کبھی سنجیدگی سے کسی بزنس کے بارے میں نہیں سوچا۔ جب وہ تیس سال کا ہوا تو ایک کروڑ کی خطیر رقم اسے داغِ مفارقت دے چکی تھی۔ وہ ایک ایک روپیا خرچ کر چکا تھا۔ باپ نے اسے مزید ایک پائی بھی دینے سے انکار کر دیا تھا۔

ان باپ بیٹے میں لڑائی جھگڑے آئے دن کا معمول بن گئے۔ مہتاب کو کئی مرتبہ باہمن گروپ میں اعلیٰ عہدے بھی دیے گئے۔ تنخواہ بھی لاکھوں میں تھی مگر مہتاب مطمئن نہیں

تھا۔ کمپنی میں اس کی ہر ملازمت لڑائی جھگڑوں پر ہی ختم ہوئی تھی۔ کئی مرتبہ فیروز باہمن نے خود اسے برطرف کیا تھا۔ دراصل اس میں کوئی کام کرنے کی صلاحیت ہی نہیں تھی۔ فیروز باہمن معمولی سی رقم سے کوئی پروجیکٹ شروع کرتا، دو دو سال میں اس پروجیکٹ کی مالیت کروڑوں روپے تک پہنچ جاتی اور مہتاب کروڑوں روپے کی لاگت سے کوئی منصوبہ شروع کرتا تو دو سال کے اندر اندر اس کا انجام دِوالیے اور مقدمے بازی پر ہوتا۔

پچھلے کچھ عرصے سے ان میں لڑائی جھگڑے ختم ہو گئے تھے۔ مہینوں ایک دوسرے سے ملاقات ہی نہیں ہوتی' اس طرح لڑائی جھگڑے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر اتفاق سے کہیں آمنا سامنا ہوتا تو دونوں ایک دوسرے کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے۔ مگر مہتاب نے جب اپنے باپ کے دماغ میں رسولی کے بارے میں سنا تو وہ اپنے تمام ہتھیار صیقل کر کے ایک بار پھر میدان میں اتر آیا۔

اور اب جب اس کا باپ اس دنیا سے رخصت ہو گیا تو مہتاب بھی نئے نئے منصوبے بنانے لگا۔ وہ بہت عرصے سے ممبئی کے مہنگے ترین ساحلی علاقے پر ایک شان دار بنگلا بنانے کی سوچ رہا تھا مگر وہ تو اس کار کی ماہانہ قسط بھی مشکل سے جمع کر پاتا تھا، بنگلے کی تعمیر کے لیے رقم کہاں سے آتی؟ اور اب جبکہ اس کا باپ مر چکا تھا اور اسے وراثت میں اربوں روپے ملنے والے تھے تو عالی شان کوٹھی کا منصوبہ ایک بار پھر اس کے ذہن میں ابھر آیا۔ اس نے یہ بھی فیصلہ کر لیا کہ اس بنگلے کی تعمیر کے لیے اس فرانسیسی خاتون آرکیٹیکٹ کی خدمات حاصل کرے گا جس کا انٹرویو اس نے چند روز پہلے دور درشن ٹی وی کے ایک پروگرام میں دیکھا تھا۔ اس بنگلے کی تعمیر میں وہ راجستھان کا سرخ پتھر اور سنگِ مرمر استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس نے یہ بھی طے کر لیا تھا کہ وہ بنگلے کی تعمیر مکمل ہوتے ہی وہاں منتقل ہو جائے گا اور لوگوں کو بتائے گا کہ اتنی دولت کے ساتھ کیسے رہا جاتا ہے۔

''اربوں روپے کی دولت ہو تو زندگی کا تصور ہی عجیب ہے۔'' اس نے گاڑی ایک سڑک پر موڑتے ہوئے سوچا۔ ''اربوں روپے... جس سے آدھی دنیا خریدی جا سکتی ہے۔''

اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوئی اور وہ کار کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔

شہر کی مختلف سڑکوں پر گھومتے ہوئے اس نے کار ایک شوروم کے سامنے روک لی۔ بی ایم ڈبلیو پورش کاروں کا یہ شوروم اس کے ایک جاننے والے کی ملکیت تھا اور اس نے اپنی بی ایم ڈبلیو اسی سے قسطوں پر لی تھی۔ وہ کار سے اتر کر شاہانہ انداز میں چلتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ اب اگر وہ چاہے تو یہ پورا شوروم خرید سکتا ہے۔

شوروم میں ایک سیلز مین کی میز پر اخبار دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ اس کے باپ کے انتقال کی خبر ہیڈ لائن میں شائع ہوئی تھی۔ اس سرخی کو دیکھ کر اسے ذرا بھی ملال نہیں ہوا۔

دفتر میں بیٹھے ہوئے شوروم کے منیجر کشوری لال نے اسے دیکھا تو اس کے استقبال کے لیے اٹھ کر جلدی سے باہر آ گیا۔

''مجھے افسوس ہے مہتاب...'' کشوری لال اس کے باپ کی تعزیت کے لیے مناسب الفاظ تلاش کرنے لگا۔

''شکریہ۔'' مہتاب نے اس کا جملہ مکمل نہیں ہونے دیا۔ ''ڈیڈی کا چلے جانا ان کے حق میں بہتر ثابت ہوا۔ تم جانتے ہو دماغ کی رسولی کتنی اذیت ناک ہوتی ہے۔''

''بہرحال، مجھے افسوس ہے۔ مرحوم کی مغفرت اور تم لوگوں سے اظہارِ ہمدردی کے لیے...''

''بھول جاؤ اسے۔'' مہتاب نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی اور اس کے ساتھ دفتر میں داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔ اسے باپ کی موت کے حوالے سے لوگوں کے ہمدردانہ رویے اور تعزیتی الفاظ سے اُلجھن ہونے لگی تھی۔

''اخبار نے لکھا ہے کہ مسٹر فیروز باہمن نے موت سے کچھ دیر پہلے وصیت پر دستخط کیے تھے۔''

''ہاں، اس وقت میں بھی وہاں موجود تھا۔'' مہتاب نے تازہ ترین ماڈل کی کاروں کا بروشر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''اس نے اپنی ساری دولت ہم چھ بہن بھائیوں میں تقسیم کر دی ہے۔'' اس نے یہ بات اس طرح کہی جیسے اس کے حصے کی دولت اس کی جیب میں آ چکی ہو۔

کشوری لال کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ کرسی پر بیٹھتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا' مہتاب باہمن اپنے دوستوں پر بوجھ تھا۔ جاننے والے اس کا سامنا کرتے ہوئے گھبراتے تھے کہ کہیں وہ اس سے قرض نہ مانگ لے اور اب یہی مہتاب یکایک ارب پتی بن گیا تھا۔

''میری بیوی درگا ایک پورش خریدنا چاہتی ہے۔'' مہتاب نے بہ دستور بروشر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرے خیال میں اس کے لیے سرخ رنگ کی نو سو گیارہ کیریرا ٹربو ہی مناسب رہے گی۔''

''کب چاہیے؟'' کشوری لال نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''ابھی۔'' مہتاب نے جواب دیا۔

''بندوبست ہوجائے گا لیکن ادائیگی کا کیا ہوگا؟''

''مجھے دراصل اپنے لیے بھی اسی ماڈل کی سیاہ رنگ کی ایک کار چاہیے۔ دونوں کی ادائیگی ایک ساتھ ہوگی۔ قیمت کیا ہوگی؟'' مہتاب نے کہا۔ کشوری لال نے قیمت بتائی تو وہ بولا۔ ''نو پرابلم ڈیلیوری کب ملے گی؟''

''دوسرے ڈیلروں سے معلوم کرنا پڑے گا۔ دونوں کاروں کا بندوبست ہونے میں ایک دو دن تو لگیں گے۔ ادائیگی نقد کرنی پڑے گی۔ ویسے تمہیں ورثے کی رقم کب ملے گی؟'' کشوری لال نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''تقریباً ایک مہینا تو لگ ہی جائے گا۔ تمہاری ادائیگی بھی اسی وقت ہوگی لیکن کاریں مجھے ابھی چاہئیں۔'' مہتاب باہمن نے کہا۔

کشوری لال کا منہ لٹک گیا۔ ''دیکھو مہتاب!'' وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ ''نقد ادائیگی کے بغیر دو نئی کاروں کا بندوبست کرنا میرے لیے مشکل ہوجائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' مہتاب باہمن نے بے نیازی سے کہا۔ ''تو پھر میں جیگوار والوں کے پاس دیکھ لیتا ہوں۔ درگا کو جیگوار بھی پسند ہے۔''

''او... کم آن مہتاب...''

''تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔'' مہتاب نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''میں تمہارا یہ شوروم بمع ان تمام کاروں کے کھڑے کھڑے خرید سکتا ہوں۔ میں اس وقت اس پوزیشن میں ہوں کہ کسی بھی بینک میں جاکر کروڑ دو کروڑ روپوں کا مطالبہ کروں تو وہ ادائیگی میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگائیں گے۔ تم میری بات کا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟''

کشوری لال کے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ اس نے بھویں سکیڑ کر مہتاب کی طرف دیکھا۔ ''تمہیں وراثت میں کتنی رقم ملنے کی توقع ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''اتنی کہ میں بینک بھی خرید سکتا ہوں۔'' مہتاب باہمن نے جواب دیا۔ ''تم مجھے کاریں دے رہے ہو یا میں کہیں اور جاکر دیکھوں؟''

''میں ایک دو دن میں مارکیٹ سے کاروں کا بندوبست کردوں گا۔'' کشوری لال نے کہا۔

''عقل مند آدمی ہو۔'' مہتاب باہمن مسکرا دیا۔ ''میں آج شام کو فون کر کے معلوم کرلوں گا۔'' اس نے بروشر میز پر پھینک دیا اور اٹھ کر دفتر سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

راون کا سوگ منانے کا طریقہ دوسروں سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔ اس نے فلیٹ میں بند ہوکر اندر سے تالا لگا لیا اور ٹیپ ریکارڈر پوری آواز سے کھول کر چرس بھرے سگریٹ پینے لگا۔ اسی دوران میں دو تین مرتبہ باہر سے دروازہ دھڑ دھڑایا گیا۔ میوزک کے شور میں یا تو آواز سنائی نہیں دی اور اگر سنائی دی تھی تو اس نے توجہ ہی نہیں دی تھی۔

راون کی ماں نے اس افسوسناک سانحے کی وجہ سے آج اسکول سے چھٹی کروادی تھی بلکہ پورا ہفتہ چھٹی کرنے کی اجازت دے دی تھی لیکن اگر وہ اسکول سے کچھ معلوم کرلیتی تو اسے پتا چل جاتا کہ وہ تو پہلے ہی ایک مہینے سے اسکول سے غیر حاضر ہے۔

گزشتہ روز باہمن ٹاور سے واپس آتے ہوئے راون کے وکیل نے اسے بتایا تھا کہ اسے ورثے میں ملنے والی رقم ایک ٹرسٹ کی نگرانی میں دے دی جائے گی جو اٹھارہ یا اکیس سال کی عمر میں، جیسی وصیت میں وضاحت ہوگی، اسے ملے گی۔ اس سے پہلے اگر چہ وہ اپنے طور پر اس رقم میں سے کچھ نہیں لے سکے گا لیکن اس کے لیے ایک وظیفہ مقرر کردیا جائے گا اور اخراجات کے لیے ایک معقول رقم اسے ہر مہینے ملتی رہے گی۔

راون نے بھی مستقبل کے لیے ''شان دار'' منصوبے بنا رکھے تھے۔ میوزیکل بینڈ اس کا دیرینہ خواب تھا۔ رقم ملنے کے بعد وہ نہ صرف اپنا بینڈ بنالے گا بلکہ اپنے گانوں کے البم بھی تیار کرائے گا۔ اس کے ساتھ اگر چہ اب بھی کچھ ایسے لڑکے موجود تھے جنہیں گانے بجانے کا شوق تھا مگر وہ سب بکھرے ہوئے تھے۔ ان کے پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ البم تیار کرانے کے لیے کوئی اسٹوڈیو کرائے پر لے سکتے لیکن اب بات کچھ اور تھی۔

اس نے نام بھی سوچ لیا تھا ''ربر بینڈ''۔ وہ اس بینڈ کا ماسٹر ہوگا۔ گانوں میں لیڈ کرے گا۔ لڑکیاں اس کے پیچھے پھرا کریں گی اور وہ اپنی خواہش کے مطابق انہیں استعمال کرے گا۔ سب کچھ نیا ہوگا۔ نئی زندگی ہوگی... سنسنی خیز زندگی!

ان کا یہ مکان خاصا بڑا تھا۔ تیسری منزل پر واقع اسٹڈی روم میں راون کی ماں سیتا نے ٹیلی فون سنبھال رکھا تھا۔ ایک دوست سے گفتگو ختم ہوتی تو دوسرے کا نمبر ملا لیتی۔ اس کے دوست بھی نیم دلی سے اس کے شوہر کی تعزیت

کررہے تھے جس کا اسے کوئی افسوس نہیں تھا۔ بہت سے دوستوں نے محتاط انداز میں اس سے یہ بھی دریافت کیا تھا کہ اسے وراثت میں سے کیا ملے گا لیکن وہ ٹھیک سے جواب نہیں دے سکی تھی۔

فیروز باہمن سے سیتا کی شادی 1982ء میں ہوئی تھی۔ اس وقت اس کی عمر صرف تیئس سال تھی۔ اس وقت اس نے ایک ایسی دستاویز پر بھی دستخط کردیے تھے جس کی رو سے اسے فوری طور پر پچاس لاکھ روپے کی رقم مل گئی تھی اور ایک بہت بڑا مکان، جو طلاق کی صورت میں اس کی ملکیت ہوتا۔ ان کی شادی چھ سال سے زیادہ نہیں چل سکی تھی۔ اس دوران وہ اپنی رقم کا بیشتر حصہ خرچ کر چکی تھی۔ اب اس کے پاس بہ مشکل چند لاکھ روپے بچے تھے۔

سیتا کی ضروریات لامحدود تھیں۔ وہ اگر چہ دل کھول کر خرچ کرتی لیکن دوستوں کے مقابلے میں اپنے آپ کو کمتر سمجھتی۔ اس کے دوستوں نے سوئٹزرلینڈ، فرانس اور انگلینڈ میں عالی شان بنگلے بنوا رکھے تھے جبکہ وہ ان علاقوں کی تفریح کے دوران میں لگژری ٹائپ ہوٹلز میں قیام کرتی۔ اس کے دوست اپنے ملبوسات پیرس اور لندن کے شہرت یافتہ ڈیزائنرز سے تیار کرواتے جبکہ وہ اپنے ملبوسات مقامی طور پر خریدتی تھی۔ ان کے بچے دوسرے شہروں کے نامور بورڈنگ اسکولز میں تعلیم حاصل کررہے تھے اور ان کی سرگرمیوں میں کبھی رکاوٹ نہیں بنے تھے جبکہ راون ایک مقامی اسکول میں زیرِ تعلیم تھا اور بہ قول سیتا کے اس کے پیروں کی بیڑی بنا ہوا تھا۔

سیتا کو یقین تھا کہ فیروز باہمن نے اپنی وصیت میں کم سے کم پانچ کروڑ روپے ضرور چھوڑے ہوں گے۔ وہ اپنے وکیل سے فون پر بات کرتے ہوئے ایک کاغذ پر حساب بھی کرتی جارہی تھی۔ وکیل کے کہنے کے مطابق اسے فیروز باہمن کی دولت کا کم از کم ایک فیصد حصہ ضرور ملنا چاہیے تھا اور اس کے حساب سے یہ ایک فیصد بھی ستر اسّی کروڑ روپے بنتے تھے لیکن اسے اتنے کی توقع نہیں تھی اگر فیروز باہمن نے پانچ کروڑ بھی چھوڑے ہوں تو اس کے لیے بہت ہوں گے۔

☆☆☆

مرینہ کی عمر صرف تیس سال تھی۔ وہ اپنے دوسرے شوہر دشمر سنگھ کے ساتھ بڑی کٹھن زندگی گزار رہی تھی۔ دشمر سے شادی سے پہلے مرینہ نے اس کی خاندانی دولت کے بڑے چرچے سنے تھے لیکن شادی کے بعد انکشاف ہوا کہ دشمر اور اس کے خاندان والوں نے صرف دولت کا نام سنا تھا، دیکھی کبھی نہیں تھی۔

اس میں شبہ نہیں کہ دشمر سنگھ خوبرو اور تعلیم یافتہ آدمی تھا۔ اس نے جے پور یونیورسٹی سے ایم بی اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ وہ اپنے آپ کو دنیا کا سب سے بڑا ماہر اقتصادیات سمجھتا تھا لیکن المیہ یہ تھا کہ اس نے کبھی ٹک کر کہیں کام نہیں کیا تھا۔ کسی بھی کمپنی میں چند مہینوں سے زیادہ نہیں رہ سکا تھا۔ وہ احکامات سننے کا عادی نہیں تھا۔ اس کی اکڑفوں ہی اسے کہیں ٹکنے نہیں دیتی تھی۔

شادی سے پہلے اس نے مرینہ کو اپنی دولت مندی اور قابلیت و ذہانت کے بڑے قصے سنائے تھے۔ اس نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ چند برسوں کے اندر اندر کروڑ پتی بن سکتا ہے لیکن شادی کے چھ سال بعد بھی وہ اپنا کوئی دعویٰ سچ ثابت نہیں کر سکا تھا۔

دشمر کے اپنے پاس دولت نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ شادی کے بعد وہ مرینہ کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلانے کی کوشش کررہا تھا۔ وہ مختلف کاموں میں مرینہ کا پیسا لگاتا رہا اور ضائع کرتا رہا۔ 1992ء میں اس نے بھوپال میں تانبے کی تلاش کے حقوق حاصل کیے۔ اس پروجیکٹ پر مرینہ کی رقم سے سرمایہ کاری کی گئی تھی۔ کھدائی میں تانبا تو نہیں ملا البتہ مرینہ کو لاکھوں روپے سے ہاتھ دھونے پڑے تھے۔ دو سال بعد اسٹاک مارکیٹ میں اسے لاکھوں روپے کا نقصان اٹھانا پڑا۔ اس کی حماقتوں سے مرینہ مسلسل نقصان اٹھاتی رہی۔ رقم اس کے ہاتھوں سے نکلی جارہی تھی۔ اس نے دشمر سے علیحدگی اختیار کرلی اور چار مہینے تک اس کی شکل نہیں دیکھی۔ بالآخر دوستوں نے ان میں راضی نامہ کرادیا۔ اس کے فوراً ہی بعد دشمر نے فروزن چکن کی سپلائی کا منصوبہ مرینہ کے سامنے پیش کیا اور اسے سرمایہ کاری پر آمادہ کرلیا لیکن مرینہ کو اس پروجیکٹ پر بھی دس لاکھ روپے کا نقصان اٹھانا پڑا۔

مرینہ کی رقم اس کا ساتھ چھوڑ رہی تھی۔ وہ ڈپریشن کا شکار رہنے لگی۔ دوستوں نے سیر و تفریح کا مشورہ دیا اور وہ دنیا کی سیاحت پر نکل کھڑے ہوئے۔ وہ دونوں جوان تھے۔ حوصلہ مند تھے اور کسی بھی صورتِ حال کا مقابلہ کرسکتے تھے لیکن دولت بڑی تیزی سے ان کا ساتھ چھوڑ رہی تھی۔ مرینہ کے باپ فیروز باہمن نے اس کی اکیسویں سالگرہ پر جو خطیر رقم دی تھی، وہ سکڑ کر چند لاکھ رہ گئی تھی۔ قرضے بڑھتے جارہے تھے۔ بڑے بڑے قرضے حاصل کرنے اور رقم ضائع کرنے میں بڑا ہاتھ دشمر سنگھ کا تھا۔ مرینہ کو اپنی رقم کے ضائع ہونے کا افسوس تھا۔ ان دونوں میں تلخیاں بڑھنے لگیں۔ ازدواجی

تعلقات اس نہج پر پہنچ گئے کہ نوبت کسی بھی وقت طلاق تک پہنچ سکتی تھی۔ اسی دوران میں وہ سانحہ رونما ہوا۔ فیروز باہمن نے عمارت سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی۔ اس سے صرف تین دن پہلے دشمر سنجیدگی سے مرینہ کو طلاق دینے کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن فیروز باہمن کی خودکشی نے اس کے دل میں ایک نئی امید پیدا کر دی اور اس نے طلاق کا خیال ذہن سے نکال دیا۔

فیروز باہمن کی موت کے اگلے روز انہوں نے مستقبل کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔ وہ سارا دن ساحل کے قریب اُمرا کی اعلیٰ ترین بستی میں اپنے لیے مکان تلاش کرتے رہے۔ یہ شہر کا مہنگا ترین علاقہ تھا اور یہاں رہائش اختیار کرنا ہر دولت مند کا خواب تھا۔ وہ دونوں اپنے لیے کوئی ایسا مکان تلاش کرتے رہے جس کی مالیت ڈیڑھ دو کروڑ کے لگ بھگ ہو۔

دوپہر دو بجے کے قریب انہوں نے ریما نامی ایک خاتون اسٹیٹ ایجنٹ سے ملاقات کی۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں جگمگاتی ہوئی ہیروں کی انگوٹھیاں، دو موبائل فون، تین ریگولر فون، چمچماتی ہوئی لیڈی لاک کار اس امر کی عکاس تھی کہ اس کا بزنس خوب چل رہا تھا۔ مرینہ نے اپنا تعارف مرینہ باہمن کے نام سے کرایا۔ اس کا خیال تھا کہ اس نام پر ریما اچھل پڑے گی لیکن ریما نے شاید توجہ نہیں دی تھی۔ دشمر ریما کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گیا اور سرگوشی میں بتانے لگا کہ مرینہ کون ہے اور باہمن اس کا کون تھا۔

''اوہ! وہ ارب پتی جس نے بلڈنگ سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی تھی۔'' ریما اس بار واقعی اچھل پڑی۔

''ہاں وہی، میں اس کا داماد ہوں۔'' دشمر نے اپنی اہمیت بھی بتا دی۔

ریما نے اس روز انہیں کئی شان دار مکان دکھائے اور بالآخر انہیں ایک محل نما مکان پسند آ گیا جس کی قیمت تین کروڑ روپے بتائی گئی۔ وہ دونوں گھوم پھر کر مکان کا جائزہ لیتے رہے اور ریما ان کی سرگوشیوں سے اندازہ لگا چکی تھی کہ وہ لوگ مکان خریدنے کے لیے تیار ہیں۔ وہ دل ہی دل میں جھوم اٹھی۔ ایسے دولت مند گاہک اس کے پاس کبھی کبھار ہی آتے تھے۔

☆☆☆

مہتاب باہمن کا چھوٹا بھائی چوالیس سالہ فرشید ان دنوں سنگین نوعیت کی مشکلات میں پھنسا ہوا تھا۔ اس کے خلاف ایف بی آئی اور دو اور ایجنسیاں تحقیقات کر رہی تھیں۔

اس کی مشکلات کی ابتدا اس بینک کے دیوالیہ ہونے سے شروع ہوئی تھیں جس میں اس کے بھی شیئرز تھے۔ ایف بی آئی اور بینک کنٹرولنگ اتھارٹی کا خیال تھا کہ بینک کے ساتھ بہت بڑا فراڈ ہوا ہے جس کی وجہ سے وہ دیوالیہ ہو گیا اور بے شمار لوگوں کا کروڑوں کا سرمایہ ڈوب گیا۔

فرشید کے خلاف کئی مقدمات درج ہو چکے تھے اور ایف بی آئی اور دوسری دو ایجنسیاں پچھلے تین سال سے اس کے خلاف تحقیقات کر رہی تھیں۔

بینک دیوالیہ ہونے کے بعد بھی فرشید کا طرزِ زندگی بہت شاہانہ تھا۔ لگتا تھا کہ بینک کے دیوالیہ ہونے کا اسے کوئی غم بھی نہیں ہے۔ بینک سے غبن کی ہوئی دولت پر پردہ ڈالنے کے لیے اس نے ایک آدمی سے ایک نائٹ کلب اور چھ ٹاپ لیس بار خرید لیے تھے۔ اس سودے کے چند روز بعد وہ آدمی بھی ایک گینگ وار میں مارا گیا تھا مگر فرشید کو اس کا بھی کوئی افسوس نہیں تھا۔

ممبئی شہر عریانی، فحاشی اور بے حیائی میں یورپ کے بڑے بڑے شہروں کو بھی پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ شہر کے مختلف علاقوں میں وہ ٹاپ لیس شراب خانے اور نائٹ کلب، جہاں عریاں رقص بھی ہوتا تھا، فرشید باہمن کی آمدنی کا بہترین ذریعہ بن گئے تھے۔ شراب و شباب کا یہ کاروبار فرشید کو راس آ گیا تھا۔ ہر کلب اور شراب خانے سے اسے ہر مہینے لاکھوں روپے کی آمدنی ہو رہی تھی۔

تمام کلب اور شراب خانے فرشید کی بیوی امبر کے نام پر تھے۔ متوسط ہندو گھرانے سے تعلق رکھنے والی امبر خود بھی نیوڈ ماڈل تھی۔ وہ نہ صرف پلے بوائے جیسے جریدوں کے لیے عریاں تصاویر کھنچوایا کرتی تھی بلکہ ایک ٹاپ لیس شراب خانے میں ملازمت بھی کرتی تھی۔

شادی سے پہلے اس کا زیادہ وقت اسی شراب خانے میں گزرتا تھا جہاں وہ جسم کے بالائی حصے پر لباس نام کی کوئی چیز پہنے بغیر گاہکوں کا دل بہلاتی۔ فرشید سے اس کی ملاقات بھی ایک ایسے ہی شراب خانے میں ہوئی تھی۔

صرف یہ شراب خانے اور نائٹ کلب ہی نہیں بلکہ فرشید باہمن کے تمام اثاثے امبر ہی کے نام پر تھے۔ شادی کے بعد فرشید نے اپنا سب کچھ اس کے نام کر دیا تھا اور اسے اس کا کوئی افسوس بھی نہیں تھا۔ نہ ہی اسے یہ خطرہ تھا کہ امبر اس کی دولت ہڑپ کر جائے گی۔ امبر جوان اور حسین تھی۔ فرشید باہمن سے شادی کے بعد اس نے بہت جلد ممبئی کی اونچی سوسائٹی میں اپنے لیے جگہ بنا لی تھی۔ یہاں بہت کم

لوگ اس کے ماضی کے بارے میں جانتے تھے مگر وہ فطرتاً طوائف تھی۔ اس نے یہاں بھی گل کھلانا شروع کر دیے۔ پارٹیوں میں وہ بلاتکلف کپڑے اتار کر رقص کرنے لگتی۔ فرشید نے کئی مرتبہ اسے ایسی حرکتوں سے منع کیا تھا مگر وہ باز نہیں آئی تھی جس کا نتیجہ اختلافات کی صورت میں ظاہر ہونے لگا اور اب پہلی مرتبہ فرشید کو یہ فکر بھی ہونے لگی تھی کہ اس کا سب کچھ امبر کے نام پر تھا اگر امبر نے کسی وقت اسے چت کیا تو وہ کہیں کا نہیں رہے گا۔ یہی سوچ کر فرشید کی راتوں کی نیندیں اڑ گئی تھیں۔

باپ کی موت سے ایک روز پہلے فرشید نے حساب لگایا تو وہ بائیس کروڑ روپے کا مقروض تھا اور اس کے پاس اثاثے یا سرمایہ نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ حتیٰ کہ کاریں بھی اس کی اپنی نہیں تھیں۔ گزشتہ دنوں اس نے ایک بہت عالی شان مینشن خریدا تھا اور اس کے تمام کاغذات امبر کے نام تھے۔ تمام کلبز اور شراب خانوں کی نگرانی ایک ایسی کمپنی کرتی تھی جس کی مالک بھی امبر تھی۔ کمپنی کے کاغذات میں کہیں بھی فرشید کا نام نہیں تھا۔

فرشید اور امبر کی شادی کے وقت کسی کا بھی یہ خیال نہیں تھا کہ وہ کامیاب ازدواجی زندگی گزار سکیں گے کیونکہ وہ دونوں آوارہ گرد تھے۔ لاابالی تھے۔ زندگی کے بارے میں سنجیدگی سے دونوں میں سے کسی نے کبھی نہیں سوچا تھا لیکن شادی کے بعد کا کچھ حصہ تو ایسا گزرا کہ کسی کو بھی اس کی توقع نہیں تھی۔ زندگی میں نشیب و فراز تو آتے ہی رہتے ہیں۔ فرشید اور امبر کی زندگی میں بھی کچھ نشیب و فراز آئے تھے مگر کسی نے سنجیدگی سے اس کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ وہ ایسے معاملات تھے بھی نہیں کہ انہیں دردِسر بنا لیا جاتا۔ لیکن اب صورتِ حال کچھ ایسی پیدا ہو گئی تھی کہ فرشید پریشان ہو کر رہ گیا تھا۔ تمام قرضے فرشید باہمن کے نام پر تھے اور تمام جائداد اثاثے اور بینک اکاؤنٹ امبر کے نام پر۔ ان میں چھوٹے موٹے جھگڑے بھی شروع ہو گئے تھے۔ فرشید ہمیشہ ایسی باتوں کو نظرانداز کرنے کی کوشش کرتا جو کسی بڑے جھگڑے کی بنیاد بھی بن سکتے ہوں۔ کیونکہ وہ جانتا تھا، کوئی ایسی بات ہوتے ہی امبر سب کچھ لے کر غائب ہو جائے گی۔

لیکن باپ کی موت کے ساتھ ہی اس کے دماغ میں ہر وقت چلنے والی اندیشوں، وسوسوں اور پریشانیوں کی فلم رک گئی۔ وہ اپنے آپ کو ایک بار پھر چوٹی پر محسوس کرنے لگا۔ اسے باپ کی طرف سے بہت لمبے چوڑے ورثے کی امید پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے فوراً ہی فیصلہ کر لیا کہ امبر کو اعتماد میں لے کر تمام کلب اور شراب خانے فروخت کر دے گا اور اپنے سارے قرضے ادا کر کے امبر سے بھی پیچھا چھڑا لے گا... اس کے خیال میں اس معاملے میں بڑی احتیاط کی ضرورت تھی اگر امبر کو اس کے منصوبے کی ذرا سی بھی ہوا لگ گئی تو وہ ایک بار پھر اسے چت کر دے گی۔

فرشید نے اگلا دن اپنے قانونی مشیر ستیش چوپڑا کے ساتھ گزارا۔ اسے جلد سے جلد رقم کی ضرورت تھی اور وہ ستیش پر دباؤ ڈال رہا تھا کہ وہ سلطان زیدی سے رابطہ کر کے یہ معلوم کرے کہ اسے ورثے کی رقم کب ملے گی۔ یا کم از کم یہ بتا دے کہ باپ کی وصیت میں اس کے لیے کتنی رقم رکھی گئی ہے۔

فرشید نے ابھی سے منصوبے بنانا شروع کر دیے تھے کہ ورثے میں ملنے والی رقم کو کس طرح خرچ کرے گا۔ یہ تو اس نے طے کر لیا تھا کہ پہلے کی طرح حماقتوں کا شکار ہو کر رقم ضائع نہیں کرے گا۔ اس نے یہ بھی سوچ لیا تھا کہ ستیش چوپڑا کو ساتھ رکھے گا اور اس کے مشوروں کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھائے گا۔

فرشید، باہمن گروپ آف کمپنیز کا کنٹرول حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اسٹاک میں اس کا اپنا حصہ، مہتاب اور دونوں بہنوں کے حصے ملا کر انہیں اکثریت حاصل ہو جائے گی اور وہ باہمن گروپ پر قابض ہو جائے گا لیکن ایک اندیشہ یہ بھی تھا کہ کمپنی میں کسی اور کے حصص نہ ہوں۔

''میں جلد سے جلد وصیت دیکھنا چاہتا ہوں۔''

فرشید بار بار ستیش چوپڑا پر دباؤ ڈالتا رہا اور ستیش اسے ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ فرشید کو لنچ کے لیے ایک شان دار ریسٹورنٹ میں لے گیا جہاں لنچ کے بعد شراب کا دور بھی چلا۔

سہ پہر کے قریب ستیش چوپڑا کے دفتر میں ان دونوں نے اتنی اسکاچ چڑھا لی کہ مدہوش ہو کر صوفوں پر ڈھیر ہو گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد امبر بھی وہاں پہنچ گئی۔ فرشید کو نشے میں دھت دیکھ کر امبر کو بالکل غصہ نہیں آیا۔ اب تو فرشید سے ناراض ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا بلکہ اب تو اسے فرشید پر پہلے سے کہیں زیادہ پیار آ رہا تھا۔

☆☆☆

موسم بہت ٹھنڈا تھا اور ہوا میں خنجر کی سی کاٹ تھی لیکن وہ اس کمرے میں سردی کی شدت اور ہوا کی کاٹ سے بالکل محفوظ تھے۔ گوا میں فیروز باہمن کا یہ بنگلا بھی بہت شان دار تھا۔ سلطان زیدی ایک مرتبہ پہلے بھی بیوی بچوں کے ساتھ

چند روز کے لیے یہاں آچکا تھا لیکن آج اس کے ساتھ راج پنڈت تھا۔

سلطان زیدی میکی کے ہنگاموں سے بھاگ کر یہاں کچھ ضروری کام انجام دینے کے لیے آیا تھا کیونکہ یہاں سکون تھا اور کسی کی مداخلت کی توقع نہیں تھی۔ وہ صبح یہاں پہنچے تھے اور ناشتے کے تھوڑی ہی دیر بعد سلطان زیدی نے میز پر کاغذات پھیلا لیے تھے۔

ماہرین نفسیات ڈاکٹر بریم شرما، ہیرا سنگھ اور ریاض مرزا کے حلف نامے خاصے طویل اور تفصیلی تھے۔ انہوں نے یہ اقرار کیا تھا کہ چھلانگ لگانے سے کچھ دیر پہلے فیروز باہمن ذہنی طور پر ہر لحاظ سے صحت مند اور مکمل طور پر ہوش و حواس میں تھا۔ اس کی ذہنی کیفیت پر کسی قسم کا شک و شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

یہ حلف نامے پڑھ کر سلطان زیدی اور راج پنڈت مسکرائے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جب وصیت کھلے گی تو ان کے مؤکلین ایک لمحہ ضائع کیے بغیر انہیں نااہل قرار دے کر معطل کر دیں گے اور ان کی جگہ کم از کم چھ دوسرے ماہرین نفسیات کو بھرتی کیا جائے گا جو یہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گے کہ وصیت پر دستخط کرتے وقت فیروز باہمن ہوش و حواس میں نہیں تھا۔

گگن دیپ کے حوالے سے ورلڈ ٹرانس مشنری کے بارے میں ابھی زیادہ معلومات حاصل نہیں ہو سکی تھیں لیکن جس کمپنی کو یہ ذمے داری سونپی گئی تھی وہ اپنی تحقیقات جاری رکھے ہوئے تھی۔

ابتدائی طور پر انٹرنیٹ سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق ورلڈ ٹرانس مشنری کا ہیڈ کوارٹر کلکتہ میں تھا جہاں مادام ٹریسا بھی سماجی خدمات میں معروف تھیں۔ یہ تنظیم ہندوستان میں 1920ء میں قائم ہوئی تھی اور اس کے چار ہزار رضا کار دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس تنظیم کا مقصد شہروں سے دور دراز دیہی اور قبائلی علاقوں میں مسیحی تعلیمات کا پرچار اور عیسائیت کا فروغ تھا۔ اس ایک مقصد کے علاوہ اس تنظیم کے کسی بھی قسم کے سیاسی یا غیر سیاسی مقاصد نہیں تھے۔ گگن دیپ کا اس تنظیم میں شمولیت کا یہ مطلب تھا کہ اس نے اپنے باپ کا مذہب قبول نہیں کیا تھا۔

یہ تنظیم ہندوستان کے مختلف دور دراز علاقوں کے علاوہ سیام کے کم از کم بیس اور اس سے ملحق برما کے دس شمالی، جونگ اور ناگا قبائل میں اپنی تبلیغی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھی۔ یہ تمام وہ علاقے تھے جہاں وحشی قبائل آباد تھے۔

تعلیم اور جدید تہذیب کی روشنی ابھی وہاں نہیں پہنچی تھی۔ جو قبائل شہروں کے قرب و جوار کے جنگلات میں آباد تھے، وہ بعض معاملات میں اپنی اپنی حکومتوں کے خلاف برسر پیکار تھے اور ان علاقوں میں برسوں سے گوریلا جنگ جاری تھی۔ ان علاقوں میں جانے والے رضا کاروں کو تھوڑی بہت خصوصی تربیت بھی دی جاتی تھی تاکہ انہیں کم سے کم مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔

سلطان زیدی نے انٹرنیٹ سے حاصل ہونے والی ایک مشنری رضا کار کی دلچسپ کہانی بھی پڑھی تھی جس نے قبائلیوں کی زبان سیکھنے کے لیے ایک جنگل میں سات سال گزارے تھے۔

وہ سفید فام عیسائی تھا۔ آبنوسی رنگت والے وحشی قبائلیوں کی بستی میں وہ داخل ہوا تو ان کی زبان کے صرف دو الفاظ 'ہیلو' اور 'شکریہ' جانتا تھا۔ اگر اسے کھانے کی ضرورت ہوتی تو وہ کسی جانور یا پرندے کو ذبح کر کے پکا کر انہیں سمجھاتا کہ اسے اس چیز کی ضرورت تھی۔

سفید فام اجنبی چونکہ بے ضرر ثابت ہوا تھا اس لیے آبنوسی رنگت والے وحشی قبائل اس سے کچھ مانوس ہوتے چلے گئے تھے۔ پانچ سال بعد وہ اس پر کسی حد تک اعتماد کرنے لگے۔ چھٹے سال سفید فام اجنبی ان کی زبان پر اس حد تک عبور حاصل کر چکا تھا کہ وہ روانی سے ان کی زبان میں بات کرنے لگا تھا۔ جب اس نے وحشی قبائلیوں کو بائبل کی پہلی کہانی سنائی تو وہ بہت حیران ہوئے تھے۔

اس سفید فام رضا کار کو صبر و تحمل اور برداشت کی خصوصی تربیت دی گئی تھی۔ یہ لوگ واقعی اپنے کاموں میں بہت ماہر ہوتے ہیں۔ صعوبتیں برداشت کر کے ان سے دوستانہ تعلقات استوار کرتے ہیں۔ ان کی زبان سیکھتے ہیں۔ ان کی تہذیب سے آگاہی حاصل کرتے ہیں اور پھر ان کا اعتماد حاصل کر کے مسیحی تعلیمات کا پرچار شروع کر دیتے ہیں۔

مہذب دنیا سے دور تاریک جنگلوں میں آباد قبائل اپنی ہی دنیا میں مگن رہتے ہیں۔ ان کی زندگی میں ہزاروں سال تک کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

وہ سفید فام اجنبی بھی سات سال تک ان وحشی قبائل کا اعتماد حاصل نہیں کر سکا تھا اور جب اس نے باور کرا دیا کہ اب وہ ساری زندگی ان کے ساتھ رہے گا اور ان میں سے ایک بن جائے گا تب کہیں وہ اسے بھروسے کے قابل سمجھ سکے تھے۔

گگن دیپ بھی ایسی ہی کسی بستی کے جھونپڑے میں رہ

رہی تھی۔ اسے یقیناً بہت ساری دشواریاں پیش آتی رہی ہوں گی اور اب بھی زندگی اس کے لیے بڑی کٹھن ہوگی۔ ہوسکتا ہے اس نے سونے کے لیے بیڈ اپنے ہاتھوں سے تیار کیا ہو۔ پیٹ بھرنے کے لیے جانور یا پرندے بھی خود ہی شکار کرکے پکائے ہوں یا اس نے اپنے جھونپڑے کے آس پاس کچھ سبزیاں اُگا رکھی ہوں۔ وہ بچوں کو بائبل کی چھوٹی چھوٹی کہانیاں سناتی ہوگی۔ بڑوں کے سامنے مسیحی تعلیمات کا پرچار کرتی ہوگی اور اسے مہذب دنیا کی کچھ خبر نہیں ہوگی۔ اسے تو پروا بھی نہیں ہوگی کہ یہاں کیا ہورہا ہے۔

''ہم اسے کبھی تلاش نہیں کرسکیں گے۔'' راج پنڈت نے کہا۔ اس نے بھی ان کاغذات کا مطالعہ کیا تھا۔ ''اس کے ملنے کی کوئی امید نہیں۔ اسے تلاش کرنے کے لیے جنگلوں اور پہاڑوں کی خاک چھاننی پڑے گی۔''

''مجبوری ہے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔'' سلطان زیدی نے جواب دیا۔

''کیا آپ نے ورلڈ ٹرائبس سے کوئی رابطہ کیا ہے؟''

''ابھی نہیں۔''

''آپ ان سے کیا کہیں گے؟ گگن دیپ کو کیوں تلاش کرنا چاہتے ہیں؟''

''یہ میں نے ابھی نہیں سوچا۔'' سلطان زیدی نے جواب دیا۔ ''لیکن یہ تو بہر حال نہیں کہا جائے گا کہ اس کے نام اتنی ارب کی لاٹری نکل آئی ہے اس لیے ہم اس کی تلاش میں ہیں۔''

''تو پھر انہیں کیا بتایا جائے گا؟'' راج پنڈت نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''یہی کہ ایک نہایت اہم اور پیچیدہ قسم کا قانونی معاملہ ہے... اور گگن دیپ سے ہماری ملاقات ضروری ہے۔'' سلطان زیدی نے جواب دیا۔

ٹھیک اسی وقت فیکس مشین جاگ اٹھی۔ اور اس پر پیغام آنا شروع ہوگئے۔ پہلا پیغام اس کی ایک سیکریٹری کا تھا جس میں صبح سے اب تک اس کے نام آنے والی فون کالز کے بارے میں اطلاع دی گئی تھی۔ زیادہ تر کالز فیروز باہمن کے ورثا کے وکیلوں کی تھیں اور دو کالز پریس رپورٹرز کی طرف سے تھیں جو تازہ ترین صورتِ حال جاننا چاہتا تھے۔

فیکس مشین پر ان ماتحتوں کی رپورٹیں بھی آرہی تھیں جنہیں وصیت کی قانونی حیثیت کے تعین کے سلسلے میں ریسرچ ورک کی ذمے داری سونپی گئی تھی۔ ان رپورٹس سے فیروز باہمن کی وصیت کی قانونی پوزیشن مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جارہی تھی۔

کمرے کی فضا خوش گوار تھی۔ آتش دان میں آگ جل رہی تھی۔ راج پنڈت آتش دان کے سامنے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا جبکہ سلطان زیدی فون کا ریسیور اٹھائے اپنے دفتر کا نمبر ملا رہا تھا۔ اس دوران میں ایک ادھیڑ عمر ملازمہ نے گرما گرم کافی کے کپ ان کے سامنے رکھ دیے۔

☆☆☆

مہندر نام کا وہ نوجوان وکیل گزشتہ چار سال سے سلطان زیدی کے دفتر میں خدمات انجام دے رہا تھا۔ وہ گزشتہ کئی گھنٹوں سے کلکتہ کے گلی کوچوں میں چکرا رہا تھا۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ وہ جس جگہ سے گزرتا گھوم پھر کر پھر وہیں پہنچ جاتا۔ ایک پانچ منزلہ پرانی سی عمارت کے گراؤنڈ فلور پر واقع ورلڈ ٹرائبس مشن کا دفتر تلاش کرنے میں اسے خاصی دشواری پیش آئی تھی۔ اس نے کرائے کی کار عمارت کے سامنے کھڑی کردی۔ کچھ دیر گہرے گہرے سانس لیتا رہا پھر ٹائی کی گرہ درست کرتا ہوا کار سے اتر آیا۔

وہ مسٹر مائیکل سے دو مرتبہ فون پر بات کرچکا تھا۔ دفتر کی تلاش میں وہ اگرچہ ملاقات کے لیے طے شدہ وقت سے ایک گھنٹا لیٹ ہوچکا تھا لیکن اس تاخیر سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ گوکہ مائیکل ایک خوش اخلاق آدمی تھا لیکن مہندر کو ابتدائی گفتگو سے ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ اس کی کوئی مدد نہیں کرے گا۔

''فرمائیے، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟'' مائیکل نے چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''مجھے ایک مشنری رضاکار کے بارے میں کچھ معلومات درکار ہیں۔'' مہندر نے کہا۔ مائیکل نے سر ہلا دیا لیکن تولہ بھر زبان کو حرکت نہیں دی۔ ''اس کا نام گگن دیپ ہے۔'' مہندر بولا۔

''اس نام سے مجھے کچھ یاد نہیں آرہا۔'' مائیکل نے جواب دیا۔ ''ہمارے ادارے میں چار ہزار رضاکار ہیں جو دنیا کے مختلف خطوں میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ محض نام سے کسی ایک کے بارے میں یاد رکھنا ممکن نہیں۔''

''وہ سیام اور برما کی سرحد کے قریب کسی جگہ کام کررہی ہے۔'' مہندر نے کہا۔

''اس کے بارے میں آپ مزید کیا جانتے ہیں؟'' مائیکل نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''زیادہ نہیں۔'' مہندر نے محتاط الفاظ میں جواب دیا۔

''دراصل ہمیں ایک قانونی معاملے میں اس کی مدد کی ضرورت ہے۔''

''کوئی گڑبڑ؟'' مائیکل کی بھویں سکڑ گئیں۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

''نہیں۔ لیکن معاملہ کچھ سیریس ہے اور ہمارا اس سے ملنا ضروری ہے۔''

''کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ اس کے نام کوئی خط دے دیں جو اسے کسی طرح پہنچا دیا جائے گا۔'' مائیکل نے کہا۔

''خط یا پیغام سے کام نہیں چلے گا۔ کچھ کاغذات پر اس کے دستخط کی ضرورت ہے۔'' مہندر بولا۔

مائیکل چند لمحے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر ''ابھی حاضر ہوا'' کہتے ہوئے اٹھ کر اندرونی دروازے میں غائب ہوگیا۔ مہندر دفتر میں بیٹھا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ دفتر کا فرنیچر پرانا اور گھٹیا سا تھا۔ دیواروں پر قبائلی بچوں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں' چند منٹ بعد مائیکل واپس آیا تو وہ ایک بہت مختلف اور بدلا ہوا آدمی تھا۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ غائب تھی اور چہرے پر کسی قدر ناپسندیدگی کے تاثرات ابھر آئے تھے۔

''مجھے افسوس ہے مسٹر مہندر!'' اس نے کھڑے کھڑے کہا۔ ''ہم آپ کی کوئی خدمت نہیں کرسکیں گے۔''

''کیا وہ آسام میں ہے؟'' مہندر نے پوچھا۔

''سوری۔'' مائیکل کا جواب مختصر تھا۔

''برما؟''

''سوری!''

''وہ زندہ بھی ہے یا...''

''میں آپ کی کسی بات کا جواب نہیں دے سکتا۔'' مائیکل نے خشک لہجے میں کہا۔

''کیا آپ کے باس یا سپروائزر سے بات کرسکتا ہوں؟'' مہندر نے کہا۔

''کیوں نہیں۔''

''کہاں ہے وہ؟''

''جہنم میں... یا ہوسکتا ہے اسے جنت میں بھیج دیا گیا ہو۔'' مائیکل نے جواب دیا۔

مہندر اسے گھور کر رہ گیا۔

☆☆☆

وہ رات کے کھانے کے بعد دوسرے کمرے میں آگئے۔ یہاں بھی آتش دان میں آگ بھڑک رہی تھی جس سے کمرے کی فضا خاصی خوش گوار ہورہی تھی۔

''میں ایک اور بات سوچ رہا ہوں۔'' سلطان زیدی نے راج پنڈت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں گگن دیپ کی تلاش میں کسی کو بھیجنا پڑے گا۔''

راج پنڈت سگار کا کش لگا کر اسٹیم انجن کی طرح دھواں اگل رہا تھا۔ وہ محض سر ہلا کر رہ گیا۔ سلطان زیدی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''وہ کوئی عام آدمی نہیں ہونا چاہیے۔ کوئی ایسا شخص جو قانونی معاملات کو سمجھتا ہو۔ معاملے کی رازداری کے خیال سے ہمارے دفتر ہی کا کوئی آدمی ہونا چاہیے۔''

''اور اس تلاش میں کتنا عرصہ لگے گا؟'' راج پنڈت نے دھواں اگلتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں کہا جاسکتا۔'' سلطان زیدی بولا۔ ''آسام اور برما کے علاقے بہت وسیع و عریض رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ہزاروں مربع میل... اور پھر بات شہروں کی نہیں جنگلوں اور پہاڑوں کی ہے جہاں ٹیلی فون اور کار جیسی سہولتوں کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔''

''ان جنگلوں اور پہاڑوں میں آدم خور قبیلے بھی ہوں گے، نہیں بھئی... میں تو نہیں جاؤں گا۔'' راج پنڈت نے سگار کا ایک اور کش لگاتے ہوئے کہا۔

''اطمینان رکھو، تمہیں نہیں بھیجا جائے گا۔'' سلطان زیدی نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ''لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسے بھیجا جائے۔ ہماری کمپنی میں ساٹھ وکیل ہیں اور وہ سب کے سب بے حد مصروف۔ کسی کو فارغ نہیں کیا جاسکتا لیکن وہ جو کوئی بھی ہو وکیل ہی ہونا چاہیے جو قانونی معاملات کو سمجھتا ہو۔'' اس دوران میں ملازمہ کافی لے کر آگئی۔ کافی کے چند گھونٹ بھرتے ہی سلطان اچھل پڑا۔ ''ندیم احمد کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' وہ راج پنڈت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''آپ مذاق تو نہیں کررہے؟'' راج نے چونک کر کہا۔ ''وہ مخبوط الحواس شخص...''

''میں مذاق نہیں کررہا۔'' سلطان زیدی نے اس کی بات کاٹ دی۔

وہ دیر تک ندیم احمد کے بارے میں تبادلہ خیال کرتے رہے۔

ندیم احمد تیس سال سے سلطان زیدی کی فرم میں پارٹنر کی حیثیت سے وابستہ تھا۔ وہ ایک ذہین آدمی تھا لیکن پھر اچانک ہی انکشاف ہوا کہ وہ منشیات کا عادی ہوچکا ہے۔ شراب بھی کثرت سے پینے لگا تھا گزشتہ دس سال کے عرصے

میں اسے کئی مرتبہ علاج کے لیے ری ہیلی ٹیشن سینٹر میں داخل کروایا جا چکا تھا۔ وہ صحت یاب ہو کر آتا لیکن کچھ ہی عرصے بعد دوبارہ منشیات اور شراب کا استعمال شروع کر دیتا۔ آج کل بھی وہ ممبئی سے کچھ دور کھنڈالا کے پُرفضا مقام پر واقع ری ہیلی ٹیشن سینٹر میں داخل تھا۔

اڑتالیس سالہ ندیم دو بیویوں کو طلاق دے چکا تھا۔ اس کے خلاف انکم ٹیکس فراڈ کا ایک کیس بھی عدالت میں چل رہا تھا۔ پولیس اس کے خلاف منشیات کے حوالے سے بھی تحقیقات کر رہی تھی۔

''وہ ری ہیلی ٹیشن سینٹر سے کب نکلے گا؟'' راج پنڈت نے پوچھا۔

''اب اس کی حالت پہلے سے کافی بہتر ہے۔'' سلطان زیدی نے جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے چند روز میں اسے چھٹی مل جانی چاہیے۔''

چار مہینے پہلے ندیم بالکل ٹھیک تھا۔ ان دنوں وہ ایک مقدمے کی پیروی کر رہا تھا۔ حالات اس کے حق میں جا رہے تھے۔ عام تاثر یہی تھا کہ وہ مقدمہ جیت جائے گا۔ اس کا مؤکل بھی مطمئن تھا لیکن پھر اچانک ہی ہوا کا رخ تبدیل ہو گیا۔ ندیم وہ مقدمہ ہار گیا اور اس کے چند روز بعد ندیم کو ایک ہوٹل کے کمرے میں بے ہوش پایا گیا۔ رم کی بوتلیں اور خواب آور گولیوں کی بوتلیں دیکھ کر یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ اس نے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کی کوشش کی تھی۔ اسے ایک بار پھر ری ہیلی ٹیشن سینٹر میں داخل کروا دیا گیا جہاں ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق اب اس کی حالت اطمینان بخش تھی اور چند روز میں اسے چھٹی ملنے والی تھی۔

''یہ مہم اس کے لیے مناسب رہے گی۔'' سلطان زیدی نے کہا۔ ''وہ کچھ عرصے باہر رہے گا تو اس کی صحت پر بھی اچھا اثر پڑے گا۔ میں ایک دو روز میں اس سے ملاقات کرتا ہوں۔''

☆☆☆

وہ فیروز باہمن کی خودکشی کا تیسرا دن تھا۔

ستیش چوپڑا سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی اپنے دفتر پہنچ گیا۔ گزشتہ رات کا کھانا اس نے فرشید باہمن کے ساتھ کھایا تھا اور پھر ایک شراب خانے میں جا کر بیٹھ گئے تھے۔ وہ رات بھر شراب پیتے رہے۔ فیروز باہمن کی وصیت پر بحث کرتے اور حکمتِ عملی تیار کرتے رہے۔ رات بھر جاگنے کی وجہ سے ستیش پر بری طرح تھکن سوار تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ اور دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ وہ دفتر والے کمرے سے ملحق چھوٹے سے کچن میں کافی بناتے ہوئے اپنے آپ کو دن بھر کے کام کے لیے تیار کر رہا تھا۔

اس میں شبہ نہیں کہ پچھلے کچھ عرصے میں ستیش نے خاصی ترقی کی تھی۔ خصوصاً اس کی فیس میں معقول حد تک اضافہ ہوا تھا۔ پچھلے سال اس نے طلاق کے ایک مقدمے کی پیروی کی تھی۔ وہ دولت مند عورت اپنے شوہر سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی۔ ستیش مقدمہ جیت گیا۔ اسے دولت مند عورت سے دو لاکھ روپے معاوضہ ملا۔ طلاق کے معمولی سے کیس میں وہ اس قدر بھاری معاوضے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ستیش جیسے وکیل کے لیے یہ معاوضہ اگرچہ بہت زیادہ تھا مگر وہ اس پر بھی مطمئن نہیں تھا۔ وہ دوسروں کو اپنی فیس بڑھا چڑھا کر بتاتا رہا۔ لیکن چھوٹے چھوٹے مقدمات میں اسے معاوضہ بڑھانے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ بالآخر قسمت اس پر مہربان ہو گئی اور فرشید باہمن نے اس کی خدمات حاصل کر لیں۔

وہ پچھلے چھ دن سے صرف فرشید باہمن کے لیے کام کر رہا تھا۔ اسے اگرچہ زیادہ معاوضے کی توقع نہیں تھی لیکن پارٹی مضبوط تھی اور مستقل وابستگی ہو سکتی تھی مگر اتفاق سے فیروز باہمن نے خودکشی کر لی اور حالات بڑی تیزی سے بدلنے لگے۔ ستیش چوپڑا جیسے لوگ ایسے ہی موقعوں کے منتظر رہتے ہیں جس سے بھرپور فائدہ اٹھایا جا سکے اور ستیش اس موقعے سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

ستیش چوپڑا سر توڑ کوشش کر رہا تھا کہ اسے فیروز باہمن کی وصیت کی نقل مل جائے یا کم از کم یہ معلوم ہو جائے کہ اس میں کیا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وصیت کو بنیاد بنا کر مقدمہ لڑنے کا موقع مل جائے تو نہ صرف اس کے وارے نیارے ہو جائیں گے بلکہ اس کی شہرت بھی دور دور تک پھیل جائے گی۔ یہ ایک بہت بڑا کیس ثابت ہوگا اور ستیش کو اس میں مرکزی کردار کی حیثیت حاصل ہوگی اگر وہ مقدمہ جیت گیا تو بات ہی کچھ اور ہوگی لیکن اس کے خیال میں مقدمہ جیتنا بھی اتنا اہم نہیں تھا۔ کارروائی کے دوران میں ہی وہ اتنا کچھ کما لے گا اور اسے اتنی شہرت مل جائے گی کہ مقدمے کا فیصلہ اس پر اثر انداز نہیں ہو سکے گا۔

وہ حسین سپنے دیکھنے لگا۔ نیا عالی شان دفتر، نیا فرنیچر، نئی کار اور سب کچھ نیا ہو لیکن المیہ یہ تھا کہ وہ ابھی تک ایک چھوٹی سی لا فرم میں پارٹنر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ فرشید باہمن سے اس کا معاملہ طے ہوئے صرف چھ دن ہوئے تھے اور اب لاکھوں کی آمدنی کا حساب لگانے کے بعد وہ سوچ رہا

تھا کہ اس سے پہلے کہ اس کی کمپنی معاملے کی نزاکت کا احساس کر کے فرشید پر قبضہ کر لے، اسے یہ کمپنی چھوڑ دینی چاہیے۔ وہ اپنا الگ دفتر بنا لے۔ فرشید باہمن کے ساتھ مستقل وابستہ رہے۔ اول تو اس کے لیے یہی ایک پارٹی کافی تھی لیکن اگر اس جیسی دو تین اور پارٹیاں بھی مل جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں تھا۔

وہ اپنی کرسی پر بیٹھا کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے مستقبل کی منصوبہ بندی کرتا رہا۔ سلطان زیدی سے ایک طویل قانونی جنگ اس کے منصوبے کا ایک اہم ترین حصہ تھی لیکن اس کے لیے پریشانی کی بات یہ تھی کہ سلطان زیدی نئی وصیت کے بارے میں کچھ بتانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ فیروز باہمن کی موت سے پہلے ایک دو مرتبہ جائداد کے موضوع پر اس سے بات ہوئی تھی۔ اس نے سلطان زیدی کے موڈ کو ہمیشہ خوش گوار پایا تھا لیکن فیروز باہمن کی خودکشی کے بعد اس نے جب بھی وصیت کے بارے میں دریافت کرنا چاہا، سلطان نے ایک دم اپنا رویہ بدل لیا اور اب وہ شہر سے باہر چلا گیا تھا اور ستیش کا اس سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔

ستیش چوپڑا، سلطان زیدی سے قانونی جنگ لڑنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔

نو بجے کے قریب ستیش چوپڑا نے فیروز باہمن کی پہلی بیوی کی دونوں بیٹیوں سمرا اور سوسن سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کا بندوبست ستیش ہی کے اصرار پر فرشید نے کیا تھا۔ ان دونوں خواتین کے اگرچہ اپنے اپنے وکیل موجود تھے لیکن ستیش انہیں توڑ کر اپنے مؤکلین کی فہرست میں شامل کرنا چاہتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ مؤکلین کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ دوسروں پر رعب جما سکتا تھا۔ مزید برآں وہ ان سب سے الگ الگ بھاری معاوضہ وصول کر کے اپنی آمدنی بڑھا سکتا تھا۔

مگر یہ میٹنگ کامیاب نہیں ہو سکی۔ سوسن اور سمرا کو اپنے بھائی فرشید پر ہی بھروسا نہیں تھا تو وہ اس کے وکیل پر کیسے اعتماد کر سکتی تھیں۔ مہتاب باہمن کے اپنے تین عدد قانونی مشیر تھے اور ان کی ماں نے اپنے معاملات کی دیکھ بھال کے لیے الگ قانونی مشیر مقرر کر رکھا تھا۔ ان لوگوں نے آپس میں متحدہ محاذ قائم نہیں کیا تھا تو انہیں دوسروں کے ساتھ ملنے کی کیا ضرورت تھی۔ اربوں روپے کی دولت داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ کسی پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا تو پھر یہ فرشید اور اس کے وکیل کی بات پر کیسے اعتبار کر لیتیں۔ ان دونوں بہنوں نے ستیش کو نکا سا جواب دے دیا۔

☆☆☆

سمرا باہمن خودسر اور سرکش لڑکی تھی۔ وہ اپنی ماں دوزری کو سخت ناپسند کرتی تھی جبکہ اس کا جھکاؤ باپ کی طرف تھا جس سے کبھی کبھار ہی ملاقات ہوتی تھی۔ پھر وہ المیہ رونما ہوا جس سے وہ ذہنی طور پر مزید متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ وہ نو سال کی تھی جب اس کے ماں باپ میں طلاق ہو گئی تھی۔

چودہ سال کی عمر میں دوزری نے اسے اپنے سے الگ کر کے بورڈنگ اسکول بھیج دیا۔ فیروز باہمن کو بچوں، خاص طور پر لڑکیوں کا بورڈنگ اسکول میں داخل کروانا پسند نہیں تھا۔ شاید وہ جانتا تھا کہ اس طرح بچوں پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ وہ سمرا کا دل رکھنے کے لیے کبھی کبھار بورڈنگ اسکول جا کر اس سے ملتا رہتا۔ وہ اسے یہ تاثر دینے کی کوشش کرتا کہ وہ اس کی سب سے چہیتی اور لاڈلی بیٹی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ وہ سمرا کو اپنے بچوں میں سب سے زیادہ چاہتا تھا۔ وہ بڑی ذہین لڑکی تھی۔

لیکن گریجویشن کے وقت فیروز باہمن اسے کامیابی کی مبارک باد اور تحفہ دینا بھول گیا۔ سمرا نے اس بات کو بڑی شدت سے محسوس کیا اور باپ کو ذہنی اذیت پہنچانے کے طریقے سوچنے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ باپ کو موسیقی سے شدید نفرت تھی اور سمرا نے اسے ستانے کے لیے موسیقی سیکھنا شروع کر دی۔

فیروز باہمن کو سمرا کی اس حرکت سے واقعی بہت دکھ پہنچا۔ مزید صدمہ اس طرح ہوا کہ اس نے موسیقی سیکھنے کے لیے جس کیمپس میں داخلہ لیا تھا اس کی شہرت اچھی نہیں تھی۔

فیروز باہمن کے اندیشے درست نکلے۔ سمرا اپنی تعلیم پر توجہ نہ دے سکی البتہ ڈرگ کلچر کا شکار ہو گئی۔ منشیات کے استعمال کے ساتھ جنسی بے راہ روی بھی اس کی زندگی کا ایک حصہ بن گئی۔

سمرا ایک تین منزلہ عمارت میں اسٹوڈنٹس کے ایک ایسے گروہ کے ساتھ رہائش پذیر تھی جنہیں ہر لحاظ سے مادر پدر آزاد کہا جا سکتا تھا۔ اس گروہ میں ہر رنگ و نسل سے تعلق رکھنے والی لڑکیاں اور لڑکے شامل تھے۔ یہ لوگ گھروں سے حصولِ تعلیم کے لیے نکلے تھے لیکن بڑی آسانی سے بھٹک گئے تھے۔ منشیات اور سیکس ان کی اولین ترجیح تھی۔ انہوں نے اپنے جوڑے بنا رکھے تھے اور ہر ہفتے جوڑے تبدیل ہوتے رہتے تھے۔ انہیں کسی بات کی پروا نہیں تھی۔ عیاشیوں کے لیے رقم کا حصول بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ان سب کا تعلق دولت مند گھرانوں سے تھا۔ انہیں اپنے گھروں سے بڑی

بڑی رقمیں مل جاتی تھیں۔ سمرا کو اس گروہ میں سب سے زیادہ دولت مند سمجھا جاتا تھا حالانکہ فیروز باہمن ان دنوں صرف تین سو کروڑ کا مالک تھا۔

سمرا اس زندگی کو بطور ایڈونچر لیتی رہی۔ وہ ہر قسم کی منشیات استعمال کرتی رہی اور بالآخر ہیروئن پر ٹنگ گئی۔ اس کا نشہ ہی کچھ اور تھا۔ ہیروئن اسے ٹینو نامی ایک ایسا شخص سپلائی کیا کرتا تھا جو ایک تھرڈ کلاس نائٹ کلب میں ڈرم بجاتا تھا۔ پینتیس سالہ ٹینو کا کسی اسکول یا کالج سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا لیکن وہ کسی نہ کسی طرح اس گروہ میں شامل ہو گیا تھا اور کسی کو اس کی پروا بھی نہیں تھی۔ ٹینو ہی کے توسط سے انہیں ہیروئن اور دوسری منشیات مل رہی تھیں۔

سمرا کی اکیسویں سالگرہ قریب آ رہی تھی۔ ان دنوں وہ منشیات سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ سالگرہ والے دن اسے اپنے گھر پر ہونا چاہیے تھا۔ فیروز باہمن کی بچی کی اکیسویں سالگرہ کا دن ان کی زندگی کا اہم ترین دن سمجھا جاتا تھا۔ اس روز فیروز باہمن انہیں زندگی کا اہم ترین تحفہ دیا کرتا تھا۔

اولاد کے معاملے میں فیروز باہمن کے نظریات دوسروں سے مختلف تھے۔ اس کے خیال میں بچوں کو اکیس سال کی عمر میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو جانا چاہیے تھا۔ بجائے اس کے کہ وہ جیب خرچ اور دوسرے اخراجات کے لیے آئے دن لڑتے جھگڑتے رہیں، انہیں ایک معقول رقم دے کر اپنا دامن چھڑا لیا جائے۔ اس رقم سے وہ اپنی زندگی بگاڑیں یا سنواریں، یہ ان کی اپنی صوابدید پر منحصر تھا۔

رقم ملنے کے بعد فیروز باہمن کے بچے بگڑے ہی تھے، کسی کو ہوش مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔

سمرا کی اکیسویں سالگرہ کے دن فیروز باہمن گھر پر نہیں تھا۔ وہ نہ شہر میں تھا نہ ملک میں۔ وہ اپنے کاروباری سلسلے میں یورپی ممالک کے دورے پر گیا ہوا تھا۔ فیروز باہمن کی دوسری بیوی سے دو بچے بھی اس دنیا میں آ چکے تھے۔ سدھو اور مرینہ ان دنوں کمسن ہی تھے۔ فیروز باہمن ان کے ساتھ بھی تھوڑا بہت وقت گزارتا تھا مگر پہلی بیوی اور اس کے بچوں سے اب اسے زیادہ دلچسپی نہیں رہی تھی لیکن سمرا کو بھی اب اپنے باپ کی کوئی پروا نہیں تھی۔ فیروز باہمن کے قانونی مشیر نے ایک کروڑ روپے کی رقم اس کے اکاؤنٹ میں جمع کروا دی تھی اور سمرا اس رات شہر کے ایک گھٹیا سے ہوٹل میں ٹینو کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی رہی۔

اس خطیر رقم نے سمرا کا یہ مشکل پانچ سال ساتھ دیا تھا۔ اس دوران میں وہ دو عدد شوہروں کو بھی بھگتا چکی تھی۔ وہ لوگ ان دو شوہروں کے علاوہ تھے جن کے ساتھ وقتاً فوقتاً راتیں گزارتی رہی تھی۔ وہ منشیات استعمال کرنے کے جرم میں تین مرتبہ گرفتار ہوئی، دو مرتبہ سزا بھی بھگتی۔ اس کی اس پانچ سالہ تہلکہ خیز زندگی میں ایک روڈ ایکسیڈنٹ بھی شامل تھا اور اسے کئی مہینوں تک اسپتال میں رہنا پڑا تھا۔ اس کی چال میں اب بھی ہلکی سی لنگڑاہٹ تھی۔

اس کا موجودہ اور تیسرا شوہر ماضی میں لیبر کنٹریکٹر تھا جو منشیات کا عادی ہو گیا تھا۔ سمرا سے اس کی ملاقات ری ہیبلی ٹیشن سینٹر ہی میں ہوئی تھی جہاں وہ بھی علاج کے لیے داخل تھا۔ وہ خاصا بھاری بھرکم آدمی تھا، اس وقت اس کا وزن تین سو پاؤنڈ سے کچھ اوپر ہی تھا، بے تحاشا بڑھی ہوئی ڈاڑھی سینے کو چھو رہی تھی۔ سر پر لمبے بال جوڑے میں بندھے رہتے۔ کرتار سنگھ کا تعلق سکھ دھرم سے تھا لیکن اسے بھی اپنے دھرم سے اتنی ہی دلچسپی تھی جتنی فیروز باہمن فیملی کے دوسرے افراد کو ہو سکتی تھی۔

اس روز ستیش چوپڑا سے میٹنگ کے فوراً بعد سمرا اپنے قانونی مشیر کندن لال کے پاس پہنچ گئی اور ستیش کے بارے میں مکمل رپورٹ اس کے سامنے پیش کر دی۔

کندن لال ایک بہت معمولی سا وکیل تھا۔ اس کے پاس صرف طلاق کے کیسز ہی آتے تھے۔ اگر اس نے شہر کے بعض علاقوں کے بس اسٹاپس پر اپنے نام کے چھوٹے چھوٹے بورڈ نہ لگا رکھے ہوتے تو شاید طلاق کے یہ چھوٹے موٹے کیسز بھی اس کے پاس نہ آتے۔ اس نے سمرا کے ایک طلاق کے مقدمے کی بھی پیروی کی تھی اور سمرا سے اپنا بل وصول کرنے کے لیے اسے پورا ایک سال انتظار کرنا پڑا تھا۔ اس ایک سال میں اس نے سمرا کو اپنے بل کے بارے میں یاد تو کئی بار دلایا تھا مگر ادائیگی کے لیے دباؤ کبھی نہیں ڈالا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ سمرا اب پتی ورتا فیروز باہمن کی بیٹی ہے اور کبھی نہ کبھی اس کے کام ضرور آئے گی اور اس کا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ سمرا نے اپنے تمام معاملات کی دیکھ بھال کے لیے قانونی مشیر کی حیثیت سے اس کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔

سمرا نے اسے ستیش چوپڑا کے بارے میں بتایا تو وہ بھڑک اٹھا۔ اس نے اسی وقت فون کا ریسیور اٹھا کر ستیش کا نمبر ملایا اور تقریباً پندرہ منٹ اسے گالیاں بکتا رہا۔ پھر ریسیور پٹخ کر زخمی شیر کی طرح ٹہلنے لگا۔ ستیش سے فون پر بات کرتے ہوئے اس نے ایک موقعے پر یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اپنی مؤکلہ

کی خاطر وہ کسی کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کرے گا اور سمرا اس کے الفاظ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

کچھ دیر بعد سمرا جب جانے کے لیے اٹھی تو کندن لال دروازے تک رخصت کرنے کے لیے اس کے ساتھ آیا۔ اس کے رخسار پر بوسہ دیا۔ اور اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے اسے تسلی دینے لگا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

سمرا کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے وہ گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کا پیٹ کچھ بڑھ گیا تھا۔ چہرے پر بھی زندگی کی سختیوں کے آثار نمایاں تھے لیکن کندن لال کے خیال میں وہ اب بھی خاصی پُرکشش تھی۔

☆☆☆

پُرفضا پہاڑی مقام کھنڈالا میں واقع ری ہیبلی ٹیشن سینٹر میں سلطان زیدی نے سب سے پہلے ندیم احمد کے معالج سے ملاقات کی۔ چیٹرجی کے کہنے کے مطابق ندیم کی کیفیت بہت بہتر تھی اور چند روز میں اسے چھٹی مل سکتی ہے۔ معالج کی طرف سے اطمینان ہو جانے کے بعد اس نے ندیم سے اس کے کمرے میں ملاقات کی تھی۔

تقریباً دو گھنٹے تک سلطان زیدی اسے فیروز باہمن کی خودکشی، اس کی وصیت اور گگن دیپ کے بارے میں بتاتا رہا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔

''گگن دیپ کا ملنا بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر بہت سی الجھنیں پیدا ہو جائیں گی۔ میں اس کی تلاش کی یہ مہم تمہارے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔''

''وہ کہاں ہے؟'' ندیم نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

''آسام میں... برما کی سرحد کے قریب۔'' سلطان زیدی نے جواب دیا۔ ''وہ جنگلوں میں آباد وحشی قبائل میں مشنری خدمات انجام دے رہی ہے۔''

''مجھے کب تک جانا ہوگا؟'' ندیم نے دریافت کیا۔

''آٹھ دس روز تو لگ جائیں گے۔''

''وہ آسام کے کس علاقے میں ہے؟'' ندیم نے ایک اور سوال کیا۔

''برما کی سرحد کے قریب۔'' سلطان زیدی نے جواب دیا۔ ''ان جنگلوں میں ایسے قبائل آباد ہیں جنہوں نے صدیوں سے اپنی بستیوں سے باہر قدم نہیں رکھا۔ وہ ہماری دنیا کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ ہم نے کچھ ریسرچ کی ہے لیکن یہ اندازہ لگانا دشوار ہے کہ وہ کس جگہ پر ہے۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے مجھے وہ جنگل تلاش کرنے پڑیں گے جہاں ایسے وحشی قبائل آباد ہیں پھر وہ قبیلہ تلاش کرنا پڑے گا اور اس کے بعد...''

''کچھ ایسی ہی صورتِ حال ہوگی۔'' سلطان زیدی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمہارے لیے ایک دلچسپ مہم ثابت ہوگی۔ اس کے لیے باہر کے کسی آدمی کی خدمات بھی حاصل کی جا سکتی تھیں لیکن میں کمپنی ہی کے کسی آدمی کو بھیجنا چاہتا ہوں جو اس سے روبرو بات کر سکے اور وصیت نامے کی نقل دکھا کر اسے معاملے کی اہمیت سے آگاہ کر سکے۔''

''میرا ہی انتخاب کیوں؟'' ندیم نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم کمپنی کے معمولات سے آگاہ ہو۔ ہر شخص مصروف ہے۔'' سلطان نے جواب دیا۔ ''تم بیس سال سے دفتر میں کام کر رہے ہو۔ اتنا عرصہ ایک ہی کام کرتے کرتے آدمی اُکتا جاتا ہے۔ اس سے تمہارے معمولات تبدیل جائیں گے۔ یکسانیت ختم ہو جائے گی اور اس سے تمہاری صحت پر بھی اچھا اثر پڑے گا۔''

''اوہ۔'' ندیم نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تم شاید یہ سمجھتے ہو کہ میں یہاں رہوں گا تو پھر شراب اور منشیات استعمال کرنا شروع کر دوں گا لیکن یقین کرو اب میں بالکل ٹھیک ہوں اور مجھے ان چیزوں سے نفرت ہو گئی ہے۔''

''مجھے یقین ہے۔'' سلطان مسکرا دیا۔ ندیم ہر مرتبہ یہی کہتا تھا لیکن کچھ عرصے بعد پٹڑی سے اتر جاتا تھا۔

''لیکن میرے خلاف مقدمات کا کیا ہوگا؟'' ندیم نے کہا۔ ''میرے خلاف عدالت میں جو مقدمات چل رہے ہیں ان کا فیصلہ ہونے تک ملک سے باہر نہیں جا سکتا۔''

''آسام افریقا یا یورپ میں نہیں۔ ہندوستان ہی کی سرحدوں کے اندر ہے۔'' سلطان زیدی نے کہا۔ ''ویسے میں نے جج سے بات کر لی ہے۔ تمہیں تو بے دن میں واپس آنا ہوگا۔''

ندیم چند لمحے سوچتا رہا پھر سلطان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''اگر میں انکار کر دوں تو؟''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' سلطان نے کندھے اُچکاتے ہوئے نارمل لہجے میں جواب دیا۔ ''میں کسی اور آدمی کا بندوبست کر لوں گا۔ تمہیں تو میں اس لیے بھیجنا چاہتا تھا کہ زندگی کی یکسانیت ختم ہو جائے گی۔ کچھ گھوم

پھر لوگے۔"

"میری روانگی کب تک ہوگی؟" ندیم نے سوال کیا۔

"ایک ہفتے میں۔" سلطان زیدی نے جواب دیا۔ "کچھ انتظامات کرنے پڑیں گے۔"

"ایک ہفتے بعد روانگی اور اس کے بعد مہم میں تقریباً دس دن لگیں گے۔" ندیم بولا۔ "اس کا مطلب ہے کہ میں کرسمس کی چھٹیوں میں یہاں سے دور رہوں گا۔" اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی تھی۔ "اور تم جانتے ہو کہ میری ایک بیوی اینگلو انڈین ہے۔"

"ہاں... اور میرا خیال ہے کہ تم بھی ایسا ہی چاہتے ہو لیکن تمہارے بچے...؟" سلطان نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

ندیم کی دو بیویوں سے چار بچے تھے۔ ایک بیوی مسلمان تھی اور دوسری اینگلو انڈین عیسائی۔ ایک بچہ گریڈ اسکول میں، ایک کالج میں اور دو مڈل اسکول میں تھے۔

"میں چار مہینوں سے یہاں پڑا ہوں لیکن ان میں سے کسی نے مجھے پوچھا تک نہیں۔" ندیم نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں افسردگی تھی۔

"مجھے افسوس ہے۔" سلطان زیدی نے کہا۔

وہ ندیم کے خانگی حالات سے بھی واقف تھا۔ اس کی دونوں سابق بیویوں کو پیسے کے سوا کسی اور چیز سے غرض نہیں تھی۔ ندیم سے رقم نکلوانے کے لیے انہوں نے قانونی مشیروں کی خدمات بھی حاصل کر رکھی تھیں۔ چند روز پہلے ہی ندیم کے سب سے چھوٹے بیٹے نے سلطان کو فون کر کے بتایا تھا کہ اس کے پاس اسکول کی فیس ادا کرنے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ اس نے فرم میں اپنے باپ کے حصے میں سے بڑی رقم کا مطالبہ کیا تھا۔

گفتگو کا سلسلہ مزید دو گھنٹوں تک جاری رہا۔ ندیم اس مہم پر جانے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ سلطان زیدی واپس جاتے ہوئے اس کے لیے کچھ کتابیں، فیروز باہمن کی وصیت کی فوٹو اسٹیٹ کاپی اور اس کی پُراسرار نامعلوم وارث کے بارے میں ایک ضخیم فائل چھوڑ گیا تھا۔ وہ کتابیں آسام، برما اور اس کے آس پاس کے جنگلوں میں آباد وحشی قبائل کے بارے میں تھیں۔

ندیم آٹھ گھنٹوں تک مسلسل وہ کتابیں پڑھتا رہا۔ اس نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ وہ جیسے جیسے کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا، اس کی دلچسپی بڑھتی رہی۔ اس کی یہ خواہش شدت اختیار کرتی گئی کہ وہ ابھی اور اسی وقت اس مہم پر روانہ ہو جائے۔

☆☆☆

فیروز باہمن کے وارثوں کے آپس کے اختلافات بڑھتے جا رہے تھے۔ ان میں آپس میں بول چال بند ہو گئی بلکہ وہ تو ایک دوسرے کی صورت تک دیکھنے کے روادار نہیں تھے۔ ان کا زیادہ وقت اپنے اپنے وکیلوں کے دفتروں میں گزرتا تھا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ کسی کو ابھی تک وصیت کے متن کے بارے میں معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ اور نہ ہی وہ لوگ یہ جان سکے تھے کہ وصیت کب کھولی جائے گی۔ یہ ان سب کے لیے کتنا بڑا المیہ تھا کہ وہ دولت ان کی نگاہوں میں تو تھی مگر ان کی پہنچ سے بہت دور... ان کے مزاج میں چڑچڑاپن آ گیا تھا۔ وہ بات بات پر بھڑک اٹھتے اور دوسروں پر اپنا غصہ اتارتے۔ اس غصے میں کئی وکیلوں کو نکالا جا چکا تھا اور ان کی جگہ نئے اور زیادہ مہنگے قانونی مشیر بھرتی کیے گئے تھے۔

سوسن نے اپنے وکیل کو محض اس لیے نکال دیا تھا کہ اس کی فیس کم تھی اور اس کے خیال میں سستا وکیل کوئی ڈھنگ کا کام نہیں کر سکتا تھا۔ سوسن کا شوہر بہرام جی پارسی تھا اور ایک کامیاب آرتھوپیڈک سرجن تھا لیکن اپنے کام میں اس کی دلچسپی بالکل ختم ہو گئی تھی۔ اس کا زیادہ وقت وکیلوں کے ساتھ بحث و مباحثوں میں گزرتا۔ ان کا نیا قانونی مشیر دھن راج مہتا بہت جوشیلا آدمی تھا۔ سوسن نے پہلے وکیل کے مقابلے میں چار گنا زیادہ معاوضے پر اس کی خدمات حاصل کی تھیں اور اسے یقین تھا کہ دھن راج مہتا کچھ کر کے دکھائے گا۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، فیروز باہمن کے وارثوں کے قرضوں میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ کسی نے نئے محل نما مکان کی خرید کا معاہدہ کر لیا تھا۔ کسی نے دو عدد فراری نئی کاریں خرید لی تھیں۔ پول ہاؤسز کی ڈیزائننگ، پرائیویٹ ہوائی جہاز اور خریدنے کے لیے مناسب پراپرٹی کی تلاش کے لیے مشیروں اور ماہرین کی خدمات حاصل کر لی گئی تھیں۔

اگر ان میں آپس میں لڑائی جھگڑا نہ ہو رہا ہوتا یا اپنے وکیلوں کے ساتھ بحث مباحثوں میں نہ الجھے ہوتے تو شاپنگ کرتے نظر آتے۔ اسی طرح ان کے قرضوں کی فہرست طویل تر ہوتی جا رہی تھی۔ راون سب سے چھوٹا تھا۔ وہ خود تو اگرچہ کچھ نہیں کر رہا تھا لیکن اس کا قانونی مشیر اسے اپنے ساتھ لیے گھومتا رہتا۔ وہ نہ صرف راون کے نام پر بڑے بڑے قرضے لے رہا تھا بلکہ دل کھول کر شاپنگ بھی کر رہا تھا۔

سلطان زیدی کو فیروز باہمن کے ورثا اور ان کے مشیروں کی طرف سے اب باقاعدہ دھمکیاں مل رہی تھیں کہ اگر اس نے وصیت کے متن کے بارے میں کچھ نہ بتایا تو اس کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا جائے گا۔ سلطان زیدی نے نہ صرف وصیت کے بارے میں کچھ بتانے سے انکار کر دیا بلکہ کسی ذریعے سے یہ شوشہ بھی چھوڑ دیا کہ فیروز باہمن کی وصیت قانونی حیثیت نہیں رکھتی۔ اس سنسنی خیز انکشاف پر فیروز باہمن کے ورثا ہتھے سے اکھڑ گئے۔

فیروز باہمن کی خودکشی کے دس دن بعد فرشید کے قانونی مشیر ستیش چوپڑا نے سرکٹ کورٹ میں پٹیشن داخل کر دی جس میں عدالت سے درخواست کی گئی تھی کہ فیروز باہمن کی آخری وصیت کی تکمیل کا حکم جاری کیا جائے۔ ستیش چوپڑا نے بزعم خود ایک اچھا وکیل ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے اخبار "انڈیا ٹائمز" کے ایک رپورٹر کو بھی اس پٹیشن کے بارے میں بتا دیا اور عدالت کے احاطے میں اس کے ساتھ تصویریں بھی کھنچوائیں۔

ستیش چوپڑا نے یہ پٹیشن فیروز باہمن کے تمام ورثا کی طرف سے داخل کی تھی اور ان سب کے نام اور پتے بھی لکھے تھے اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی تھی' یہ سب اس کے مؤکل ہیں۔ اپنے دفتر پہنچتے ہی اس نے پٹیشن کی کاپیاں بھی انہیں فیکس کر دیں اور پھر چند منٹوں بعد ہی اس کے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

اگلے روز صبح اخبار "انڈیا ٹائمز" دیکھ کر ستیش چوپڑا اچھل پڑا۔ پہلے صفحے پر اس کی تصویر تھی۔ اس کے ساتھ ہی پٹیشن کے حوالے سے خبر بھی تھی۔ اخبار نے ستیش کی توقع سے بڑھ کر اس خبر کو اہمیت اور جگہ دی تھی۔ یہ خبر پڑھتے ہی اس نے اپنے دفتر کی طرف دوڑ لگا دی۔

دو گھنٹے بعد، تقریباً نو بجے وکیلوں اور پریس رپورٹرز نے سرکٹ کورٹ کے دفتر پر دھاوا بول دیا۔ وکیل کسی نہ کسی حوالے سے باہمن کیس میں اپنا نام لکھوانا چاہتے تھے اور پریس رپورٹرز یہ جاننا چاہتے تھے کہ ستیش چوپڑا کی پٹیشن کس جج کے پاس بھیجی جاتی ہے اور اس پر کیا فیصلہ ہوتا ہے۔

قرعہ فال پینتیس سالہ جج پرتاب کوہلی کے نام نکلا۔ وہ زیادہ تجربہ کار نہیں تھا لیکن اس میں آگے بڑھنے کی لگن تھی۔ وہ اب تک چھوٹے موٹے مقدمات ہی نمٹا تا رہا تھا لیکن اتنا اہم کیس اپنی میز پر دیکھ کر وہ اپنے آپ میں سنسنی محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

سلطان زیدی کو اگلے دن کے لیے سمن جاری کر دیے گئے۔

ایک انتہائی بدصورت اور بدشکل صاحب اپنی انتہائی خوب صورت اور خوش شکل بیوی کے ساتھ کہیں جا رہے تھے۔ ایک شریر لڑکے نے اس عجیب و غریب جوڑے کو دیکھ کر جملہ چست کیا۔ "پہلوئے حور میں لنگور، خدا کی قدرت!"

ان صاحب نے دوڑ کر لڑکے کو پکڑ لیا اور شروع کر دی اس کی دھنائی۔ ادھر سے گزرتے والے لوگوں نے بڑی مشکل سے لڑکے کو چھڑایا اور ان سے جھگڑے کا سبب دریافت کیا۔

ان صاحب نے کہا۔ "یہ بدمعاش میری بیوی کو لنگور کہہ رہا تھا۔"

اس روز سلطان زیدی صبح ہی عدالت پہنچ گیا۔ جج پرتاب کوہلی کے بارے میں وہ زیادہ نہیں جانتا تھا۔ کبھی واسطہ ہی نہیں پڑا تھا۔ چند چھوٹے کیسز نمٹانے کے بعد جج پرتاب کوہلی نے سلطان زیدی کو بلا لیا۔ چند منٹ تعارفی جملوں میں گزر گئے۔ سلطان بہت محتاط انداز اختیار کیے ہوئے تھا۔

"کیا ایسی کسی وصیت کا وجود ہے؟" بالآخر جج نے سوال کیا۔

"یس یور آنر!" سلطان زیدی نے جواب دیا۔ قانون کے مطابق کوئی وصیت نامہ چھپانا سنگین جرم تھا اور وہ وصیت کی موجودگی سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔

"وصیت نامہ اس وقت میرے دفتر میں موجود ہے جناب۔" اس نے بات پوری کر دی۔

"اٹارنی کون ہے؟" جج نے دوسرا سوال کیا۔

"میں ہوں جناب۔"

"وصیت کب کھولو گے؟"

"میرے مؤکل کی خواہش تھی کہ یہ وصیت پندرہ جنوری سے پہلے نہ کھولی جائے۔" سلطان نے جواب دیا۔

"اس کی کوئی خاص وجہ؟" جج نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

سلطان زیدی کے خیال میں وجہ تھی۔ فیروز باہمن چاہتا تھا کہ مزید دولت کی لالچ میں اس کے حریص و لالچی بچے اپنے پاس موجود ایک ایک پائی خرچ کر ڈالیں اور پھر اچانک ان کے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ لی جائے۔ یہ اگرچہ بے رحمانہ اور ظالمانہ سوچ تھی لیکن سلطان کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔

''مجھے کچھ اندازہ نہیں ہے جناب۔'' سلطان زیدی نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے مؤدبانہ انداز میں جواب دیا۔ ''یہ ہولوگرافک وِل ہے۔ مسٹر فیروز باہمن نے عمارت سے چھلانگ لگانے سے چند منٹ پہلے اس پر دستخط کیے تھے۔''

''ہولوگرافک وِل!'' جج نے اسے گھورا۔ ''کیا اس وقت تم اس کے پاس نہیں تھے؟''

''دستخط میری موجودگی میں کیے گئے تھے۔ لیکن یہ ایک لمبی کہانی ہے۔''

''میں سننا چاہوں گا۔'' جج نے کہا۔

اس وقت دونوں کی اپنی اپنی مصروفیات تھیں اس لیے طے یہ پایا کہ سلطان لنچ جج پرتاب کوہلی کے ساتھ اس کے دفتر میں کرے گا اور اس وقت ساری باتوں کی وضاحت کی جائے گی۔

☆☆☆

ندیم احمد کے معالج چیٹر جی کو اسے آسام بھیجنے کا آئیڈیا پسند نہیں آیا تھا۔ وہ چار مہینوں سے ایک ایسی جگہ پر رہ رہا تھا جہاں مریضوں کی نگرانی کے لیے دروازے اور گیٹ بند رکھے جاتے تھے۔ قلعہ نما عمارت سے میل بھر دور مسلح محافظ بھی راستوں کی نگرانی کرتے تھے تاکہ کوئی مریض فرار ہونے کی کوشش نہ کرے۔ ٹی وی، ریڈیو کے پروگرام، اخبارات، میگزین اور ٹیلی فون کالز بھی مانیٹر کی جاتی تھیں۔

چار مہینے ایسی جگہ گزارنے کے بعد سوسائٹی میں واپسی بعض اوقات مریض کے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ واپسی کے لیے انہیں بہ تدریج تیار کیا جاتا تھا۔ اچانک رونما ہونے والی کوئی بات ان کا دماغی توازن پلٹ سکتی تھی۔

مگر ندیم کو اس کی پروا نہیں تھی۔ اسے عدالت کے حکم پر اس ری ہیبلی ٹیشن سینٹر نہیں بھیجا گیا تھا۔ اسے تو سلطان زیدی نے اپنے طور پر علاج کے لیے یہاں داخل کروایا تھا۔ اب اگر سلطان چاہتا ہے کہ وہ آسام کے جنگلوں میں جا کر وحشی قبائلیوں سے آنکھ مچولی کھیلے تو اسے کیا پروا ہو سکتی تھی۔ چیٹر جی اعتراض کرنے والا کون ہوتا ہے؟

سلطان زیدی سے ملاقات کے بعد چیٹر جی نے ندیم کے روزمرہ کے شیڈول میں کچھ تبدیلی کر دی تھی۔ پچھلے چار مہینوں کے دوران میں اسے بالکل سادہ اور چکنائی کے بغیر خوراک دی جا رہی تھی اور اب اسے ہلکی مقدار میں چکنائی، پنیر اور مصالحے وغیرہ دیے جانے لگے تاکہ اس کا معدہ ان چیزوں کا عادی ہو جائے۔ ان چیزوں کا دوبارہ استعمال شروع ہوتے ہی ندیم کے سسٹم میں گڑبڑ شروع ہو گئی اور اس کا وزن مزید تین پاؤنڈ کم ہو گیا۔

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' چیٹر جی نے اسے تسلی دی۔ ''یہ گڑبڑ وقتی ہے۔ دو چار روز میں ٹھیک ہو جاؤ گے۔''

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ندیم کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔ وہ فوراً یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ چیٹر جی ان چار مہینوں کے دوران میں اس سے بہت مانوس ہو گیا اور اب وہ آہستہ آہستہ اس سے پیچھے ہٹ رہا تھا۔

☆☆☆

جج پرتاب کوہلی وصیت کی تفصیلات جاننا چاہتا تھا مگر سلطان زیدی نے بڑی خوب صورتی سے اسے ٹال دیا۔ دونوں اس وقت جج ہی کے دفتر میں بیٹھے سینڈوچ سے لنچ کر رہے تھے۔ قانونی طور پر سلطان کو اس وقت وصیت کی تفصیلات بتانے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن وہ خود بھی متجسس تھا اور اس وصیت کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین تھا جس کے لیے اتنے ہنگامے ہو رہے تھے۔

''مجھے فیروز باہمن کے ورثا سے ہمدردی ہے۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''انہیں وصیت کی تفصیل جاننے کا حق حاصل ہے۔ لیکن یہ تاخیر میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''میری طرف سے کوئی عذر نہیں جناب۔'' سلطان زیدی نے جواب دیا۔ ''میں تو صرف اپنے مؤکل کی ہدایات پر عمل کر رہا ہوں۔''

''جلد یا بہ دیر... وصیت سامنے تو لانی ہی پڑے گی۔'' جج بولا۔

''جی ہاں جناب۔'' سلطان زیدی نے سر ہلایا۔

جج پرتاب کوہلی نے ڈائری اٹھا کر سامنے رکھ لی اور اس کے اوراق الٹ پلٹ کرنے لگا۔

''آج دسمبر کی بیس تاریخ ہے۔'' وہ سلطان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کرسمس سے پہلے ان سب کو عدالت میں طلب کرنا ممکن نہیں۔ ستائیس تاریخ کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''آپ کے ذہن میں کیا ہے؟'' سلطان نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''ان سب کو وصیت کی تفصیلات سے آگاہ کر دیا جائے۔'' جج پرتاب نے کہا۔

سلطان زیدی چونک سا گیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر

اس کے ذہن میں ایک اور خیال ابھر آیا۔ فیروز باہمن کے تمام وارث، ان کے دوست احباب، قانونی مشیر اور پریس رپورٹرز عدالت میں جمع ہوں گے۔ وصیت پڑھ کر سنائی جائے گی تو ان کا کیا حال ہوگا۔ آہیں، کراہیں، رونا دھونا... کیسا عجیب منظر ہوگا۔

''ٹھیک ہے جناب۔ ستائیس دسمبر کی تاریخ مناسب رہے گی۔'' سلطان زیدی نے جواب دیا، اس نے پندرہ جنوری پر اصرار نہیں کیا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' جج پرتاب کوہلی نے کہا۔ ''میں انہیں ستائیس تاریخ کے سمن بھیج دوں گا، میرا خیال ہے ان سب کو بلانا ضروری ہے۔''

''مسٹر فیروز باہمن کے چھ بیٹے بیٹیاں اور تین طلاق یافتہ بیویاں ہیں جبکہ ان کے قانونی مشیروں کی تعداد نو ہے۔'' سلطان زیدی نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔

''میں یہ تجویز پیش کروں گا کہ وصیت آپ ہی پڑھ کر سنائیں۔''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' جج نے کہا۔ وہ اس وقت بھی اپنے آپ میں عجیب سی سنسنی محسوس کرنے لگا تھا۔ اتنی ارب روپے کی وصیت پڑھ کر سنانا کوئی معمولی بات نہیں تھی، یہ اس عدالت کی تاریخ کا اہم ترین واقعہ ہوتا۔

''میں اندازہ لگا رہا ہوں کہ وہ وصیت کچھ متنازعہ قسم کی ہو گی۔'' جج پرتاب کوہلی نے کہتے ہوئے سلطان زیدی کی طرف دیکھا۔

''کچھ ایسی ہی بات ہے جناب۔'' سلطان زیدی مسکرا دیا۔

جج پرتاب کوہلی کے ہونٹوں پر بھی خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔

☆☆☆

چار مہینے قبل دورہ پڑنے سے پہلے وہ مولانا آزاد روڈ پر ایک پرانے سے مکان میں رہائش پذیر تھا۔ یہ مکان اس نے دوسری بیوی کو طلاق دینے سے پہلے خریدا تھا لیکن اب وہ اس سے بھی محروم ہو چکا تھا۔ مکان پر اس کی دوسری بیوی کا قبضہ تھا اور اب اس کے پاس رات گزارنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔

لیکن سلطان زیدی نے تمام انتظامات پہلے ہی سے مکمل کر لیے تھے۔ وہ خود اسے لینے کے لیے پہنچ گیا تھا۔ اس کی کار میں ایک بیگ بھی رکھا ہوا تھا جس میں ندیم کے لیے کپڑے، معقول رقم، ہدایات پر مشتمل پرچہ ہوائی ٹکٹ اور فرسٹ ایڈ کٹ بھی موجود تھی۔ آسام کے جنگلوں اور اس سے آگے چین اور برما کی سرحد کے قریب اروناچل پردیش میں سیاحوں کے داخلے پر پابندی تھی۔ بریف کیس میں ندیم کے لیے ان علاقوں میں داخلے کا اجازت نامہ بھی موجود تھا۔

ری ہیبلی ٹیشن سینٹر کی اس قلعہ نما عمارت کے گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے ندیم اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ ایک سو چالیس دنوں میں اس کا وزن سترہ پاؤنڈ کم ہو چکا تھا اور وہ ذہنی طور پر بھی اپنے آپ کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔

''تمہاری پہلی منزل کلکتہ ہے۔'' سلطان زیدی کار ڈرائیو کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''وہاں تین گھنٹے انتظار کے بعد تمہیں گوہاٹی کے لیے پرواز مل جائے گی۔ دریائے برہم پترا کے کنارے پر آباد پانچ لاکھ کی آبادی والے اس شہر میں تمہیں ہر قسم کے لوگ ملیں گے۔ بہاری مسلمان، بنگالی ہندو اور بنگلہ دیشی بھی کثیر تعداد میں آباد ہیں۔ بنگلہ دیشیوں اور بنگالی ہندوؤں سے تمہیں بہت زیادہ محتاط رہنا پڑے گا۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''تمہاری اصل منزل دیبور گڑھ ہے۔ گوہاٹی سے دیبور گڑھ چھ گھنٹے کا راستہ ہے۔ دیبور گڑھ میں تم بینرجی نامی ایک وکیل سے ملاقات کرو گے۔ وہ کلکتہ کا بنگالی ہندو ہے۔ میں اس سے بات کر چکا ہوں۔ اچھا آدمی ہے۔ ہر طرح سے تعاون کرے گا۔''

''دیبور گڑھ کی آبادی کتنی ہے؟'' ندیم نے پوچھا۔

''پچاس ساٹھ ہزار... قدیم طرز کا شہر ہے لیکن تمہیں

سبق

ایک خاتون نے اپنے شرابی شوہر کو سبق سکھانے کے لیے سیاہ رنگ کا شیطانی لباس پہنا۔ منہ پر نقاب اور سر پر سینگ لگا کر گلی کے موڑ پر کھڑی ہو گئی۔ رات کو اس کا شوہر جب نشے میں دھت گلی میں داخل ہوا تو خاتون ایک بھیانک چیخ مار کر اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ شوہر نے خوف زدہ ہونے کے بجائے جھومتے ہوئے پوچھا۔ ''کون ہو تم؟''

''میں شیطان ہوں۔'' خاتون نے جواب دیا۔

شوہر نے مسرت آمیز لہجے میں کہا۔ ''ہاتھ ملاؤ یار میں تمہاری بہن کا شوہر ہوں۔''

(انتخاب، اورنگزیب الہی، الشرائع مکہ مکرمہ)

کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ تمہارے لیے ہوٹل میں کمرے کا انتظام ہو چکا ہے لیکن اب بھی وقت ہے اگر تم نہ جانا چاہو تو انکار کرسکتے ہو۔" سلطان زیدی نے کہا۔

"واپسی کا تو اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" ندیم نے جواب دیا۔ "اس پاگل خانے میں واپس جانے کے بجائے میں جنگلوں میں بھٹکنا اور گڑھوں میں بھی سونا پسند کروں گا۔ بہر حال، بینرجی سے مل کر مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"وہاں سے تمہیں چین اور برما کی سرحد کے قریب اروناچل پردیش کے جنگلوں کی طرف جانا ہے۔ چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع جھیل برہما کند کے علاقے میں وہ قبائل آباد ہیں جہاں تمہیں قسمت آزمائی کرنی ہے۔ بینرجی تمہارے لیے گائیڈ کا بندوبست کر دے گا۔" سلطان نے کہا۔

"دیبور گڑھ سے آگے کا سفر کیسے ہوگا؟" ندیم نے پوچھا۔

"غالباً کشتی سے۔" سلطان نے جواب دیا۔ "برہم پترا اس خطے کا مرکزی اور سب سے بڑا دریا ہے لیکن ان جنگلوں میں چھوٹے چھوٹے دریاؤں اور دلدلوں کی بھرمار ہے۔ لوگ زیادہ تر کشتیوں پر ہی سفر کرتے ہیں یا پیدل۔"

"تو پھر وہاں سانپ اور مگرمچھ بھی ہوں گے؟" ندیم نے پوچھا۔

"سانپ اور مگرمچھوں کے علاوہ ناگالینڈ میں کسی جگہ چاچر نامی آدم خور قبیلہ بھی آباد ہے اور..."

"آدم خور قبیلہ..." ندیم ہکلا کر رہ گیا۔

"میں تمہیں بزدل نہیں سمجھتا۔" سلطان نے اسے گھورا۔ "ویسے وہ قبیلہ اب آدم خور نہیں رہا۔ وہ تمہیں نہیں کھائیں گے۔ پچھلی سیٹ پر رکھا ہوا بریف کیس اٹھا کر کھولو، اس میں تمہارے لیے کچھ چیزیں ہیں۔"

ندیم نے براؤن رنگ کا وہ بریف کیس اٹھالیا جو دیکھنے میں تو نیا ہی لگتا تھا لیکن خاصا استعمال شدہ تھا۔ اس نے بریف کیس گھٹنوں پر رکھ کر کھول لیا۔

"اس میں چھوٹا سا یہ آلہ جدید ترین ڈیجیٹل ٹیلی فون ہے۔" سلطان زیدی نے کہا۔ "لیکن دیبور گڑھ میں تم مقامی ٹیلی فون ہی استعمال کرو گے۔ وہاں بھی ٹیلی کمیونیکیشن کے شعبے نے بڑی ترقی کی ہے۔"

"اور یہ کیا ہے؟" ندیم نے ایک اور چھوٹے سے آلے کی طرف اشارہ کیا۔

"کمپیوٹر... اسے ٹیلی فون کے ساتھ منسلک کر کے تم ای میل سے استفادہ کرسکو گے۔" سلطان نے کہا۔

"تمہارا خیال ہے میں ان جنگلوں میں سانپوں، مگرمچھوں، درندوں اور آدم خور وحشیوں سے ای میل پر رابطے کروں گا۔" ندیم نے اسے گھورا۔

"یہ تمہارے استعمال کے لیے نہیں ہے۔" سلطان نے جواب دیا۔ "اس پر میں تم سے رابطہ رکھوں گا۔" وہ چند لمحے خاموش رہا پھر ایک اور آلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"یہ سیٹلائٹ فون ہے۔ اس کے ذریعے تم دنیا کے کسی بھی خطے سے کہیں پر بھی رابطہ کرسکتے ہو۔ اس کی بیٹری چارج رکھو گے تو کئی روز تک کام کرسکے گا۔ لاکھوں مربع میل پر محیط اس خطے میں انسان بھی تمہیں ایک دوسرے سے میلوں کی دوری پر ملیں گے۔ یہ سیٹلائٹ فون ہی واحد چیز ہے جس کے ذریعے تم باہر کی دنیا سے رابطہ کرسکو گے۔ دیبور گڑھ سے نکلنے کے بعد تم کسی سہولت کا تصور بھی نہیں کرسکو گے۔"

"بجلی نہیں ہوگی تو میں اس کی بیٹری کیسے چارج کروں گا؟" ندیم نے کہا۔

"ایک فاضل بیٹری بھی موجود ہے۔ یہ فون تمہیں بہت احتیاط سے استعمال کرنا ہوگا۔" سلطان نے کہا۔

"لگتا ہے میں کسی دوسرے سیارے پر جارہا ہوں۔" ندیم نے خفیف سے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"کچھ ایسی ہی بات ہے۔" سلطان زیدی نے جواب دیا۔ "وہاں جانے کے بعد ہی تمہیں یہ احساس ہوگا کہ کہاں ہو۔"

☆☆☆

ندیم کو وہ رات کلکتہ ائرپورٹ پر ہی گزارنی پڑی تھی۔ وہ سہ پہر پانچ بجے ممبئی سے یہاں پہنچا تھا۔ اسے تین گھنٹے بعد گوہاٹی سے فلائٹ ملنی چاہیے تھی لیکن عین وقت پر بتایا گیا کہ کسی فنی خرابی کی وجہ سے گوہاٹی کی پرواز منسوخ کر دی گئی ہے۔ اگلی فلائٹ صبح سات بجے روانہ ہوگی۔

اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ ندیم اگر چاہتا تو یہ رات شہر کے کسی ہوٹل میں گزار سکتا تھا لیکن اس نے ائرپورٹ پر ہی رکے رہنے کا فیصلہ کیا اور رات کسی نہ کسی طرح اونگھتے جاگتے گزار ہی لی۔ لاؤنج میں گوہاٹی جانے والے مسافروں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی۔ جاپانی، یورپین اور دوسری قومیتوں کے لوگ بھی نظر آرہے تھے۔ مختلف زبانوں کے الفاظ اس کی سماعت سے ٹکرا رہے تھے۔ کلکتہ انٹرنیشنل ائرپورٹ تھا۔ یہاں ہوائی جہازوں کی آمد و رفت رات بھر جاری رہی۔ وقفے وقفے سے مختلف پروازوں کے بارے میں اعلان ہوتے رہے۔

ندیم کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ اپنا بریف کیس اٹھائے ایک کافی کاؤنٹر پر آگیا۔ کافی پینے کے دوران ہی بالآخر گوہاٹی کی پرواز کے لیے اعلان ہوا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ کافی کا آخری گھونٹ بھر کر اس نے بل ادا کیا اور روانگی والے لاؤنج میں داخل ہوگیا۔

727 جہاز نے صبح سات بجے ٹیک آف کیا تھا۔ طیارے کی ائرہوسٹس بڑی پھرتی اور مہارت سے مسافروں میں ناشتا سرو کر رہی تھیں۔ بہت سے مسافر تو اونگھ رہے تھے۔ ندیم نے ناشتے میں صرف دو بسکٹ اور کافی کے ایک کپ پر ہی اکتفا کیا تھا۔ وہ کھڑکی کے باہر دیکھتا رہا۔ نیچے تاحدِ نگاہ سبزہ ہی سبزہ نظر آرہا تھا۔

بنگلہ دیش کے اوپر سے گزر کر جہاز آسام کی فضائی حدود میں داخل ہوگیا۔ میدانی علاقے اور پہاڑیاں جنگل سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ کہیں کہیں کوئی آبادی بھی نظر آجاتی۔ مکانوں کی چھتیں سرخ ٹائلوں کی تھیں۔ جنگلوں میں بل کھاتی ہوئی کہیں کہیں سرمئی سڑکیں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ بالآخر ایک ایسی سڑک دکھائی دی جس پر ٹریفک بھی نظر آرہا تھا اور تقریباً اس وقت جہاز نیچے جھکنے لگا اس کے ساتھ ہی کپتان نے اعلان کیا کہ جہاز گوہاٹی ائرپورٹ پر لینڈ کرنے والا ہے۔ ندیم بہ دستور نیچے دیکھ رہا تھا۔ بلند و بالا عمارتیں واضح ہوتی جارہی تھیں۔ ندیم پہلی مرتبہ یہاں آیا تھا اور اسے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ گوہاٹی خاصا بارونق شہر ہے۔ سڑکوں پر رواں ٹریفک دکھائی دے رہا تھا۔ شہر کے اطراف میں دھواں اگلتی ہوئی فیکٹریاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ پانچ لاکھ کی آبادی پر مشتمل یہ شہر صوبہ آسام کا صدر مقام تھا اور اس کی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ لیکن ندیم کو افسوس تھا کہ وہ اس شہر میں رات نہیں گزار سکے گا۔

جہاز سے اترتے ہی اسے بھوک لگنے لگی۔ صبح ناشتے میں اس نے دو بسکٹ کھائے تھے جو تین گھنٹے کے سفر کے دوران میں ہضم ہو چکے تھے۔ اس نے ائرپورٹ کے ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا اور بریف کیس اٹھا کر باہر آگیا۔

بس اسٹیشن شہر کے بارونق علاقے میں تھا۔ وہاں پہنچ کر انکشاف ہوا کہ دیبور گڑھ جانے والی بسیں صبح آٹھ بجے سے پہلے پہلے نکل جاتی ہیں۔ اگر اسے آج ہی جانا ہے تو وہ شیلانگ چلا جائے وہاں سے اسے جورہاٹ اور اس سے آگے دیبور گڑھ کے لیے بس مل سکتی ہے۔

مزاح

ایک امریکی، ایک فرانسیسی، ایک چینی اور ایک اسکاٹ لینڈ کا باشندہ اکٹھے بیٹھے بیئر پی رہے تھے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ان چاروں کے گلاسوں میں ایک ایک مکھی گر گئی۔ امریکی نے بیئر گرادی۔ فرانسیسی نے گلاس سے مکھی نکالی اور بیئر پی گیا۔ چینی نے بیئر گرادی اور مکھی کھا گیا۔ اسکاٹ لینڈ کے صاحب نے مکھی نکال کر چینی کے ہاتھ بیچ دی اور بیئر پی گیا۔

ندیم کو دیبور گڑھ پہنچنے کی اتنی عجلت نہیں تھی۔ بتایا ہوا راستہ اختیار کرنے کی صورت میں پورا دن سفر میں گزر جاتا اور اسے آرام کرنے کا موقع بھی نہ ملتا۔ اس نے بس اسٹیشن کے قریب ہی ہوٹل میں کمرا لے لیا۔ وہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ بستر پر لیٹتے ہی سوگیا۔

اس کی آنکھ شام ڈھلے کھلی تھی۔ اس کا دل چاہا تھا کہ وہ ہوٹل سے نکلے اور گھوم پھر کر شہر دیکھے لیکن اسے اپنے آپ پر بھروسا نہیں تھا۔ کہیں شراب وغیرہ دیکھ کر بہک نہ جائے۔ اس لیے اس نے دل پر جبر کر کے اپنے آپ کو اسی کمرے کا قیدی بنالیا۔

صبح چھ بجے ہی وہ بس اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ اسے سات بجے والی بس پر جگہ ملی تھی۔ بس کا چھ گھنٹے کا یہ سفر اس کے لیے بڑا اذیت ناک ثابت ہوا تھا۔ مسافر کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ انسانوں کے علاوہ اس بس میں چند مرغیاں اور دو عدد بکریاں بھی سفر کر رہی تھیں۔ مسافروں کا تعلق ان جنگلوں میں آباد مختلف قبائل سے تھا۔ ان میں بدھ مت کے پیروکار بھی تھے اور دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والے بھی۔ عیسائی مشنریاں یہاں مدتوں سے کام کر رہی تھیں۔۔۔ اور اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا تھا۔ کئی قبائل اپنا قدیم مذہب چھوڑ کر عیسائیت کی طرف مائل ہو چکے تھے۔

پورا علاقہ گھنے جنگلوں سے پٹا پڑا تھا۔ کہیں کہیں چھوٹی چھوٹی بستیاں تھیں۔ سفر کے دوران میں ہی یہ سنسنی خیز انکشاف بھی ہوا کہ ان جنگلوں میں عرصے سے ہند سرکار اور علیحدگی پسندوں میں گوریلا جنگ جاری تھی۔ ناگا قبائل نے ہند سرکار کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ وہ اپنے ناگالینڈ کو آزاد کرانا چاہتے تھے جس پر بھارتی حکمرانوں نے بہ زورِ طاقت قبضہ جما رکھا تھا۔ ندیم کے لیے یہ انکشاف بھی بڑا سنسنی خیز ثابت ہوا تھا کہ بعض اوقات گوریلے مسافروں سے بھری ہوئی بسوں کو

بھی اغوا کر لیتے تھے اور ان کی رہائی کے لیے مقامی انتظامیہ سے سودے بازی کرتے تھے لیکن خیریت گزری۔ سفر کے دوران میں اس قسم کا کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ البتہ یہ سفر چھ کے بجائے آٹھ گھنٹوں میں ختم ہوا تھا۔

دیبور گڑھ کے اڈے پر وہ جیسے ہی بس سے اترا تین چار ٹیکسی ڈرائیوروں نے اسے گھیر لیا اور بالآخر ایک ڈرائیور اسے کھینچتا ہوا اپنی پرانی سی مزدا تک لے جانے میں کامیاب ہوگیا۔ ٹیکسی ڈرائیور مقامی باشندہ تھا۔ وہ انگریزی، ہندی یا اردو کا ایک لفظ نہیں سمجھتا تھا لیکن بیلی ویو ہوٹل کے نام سے بہرحال آشنا تھا۔ ٹیکسی دیکھنے میں اگرچہ کشادہ سی تھی اور اس کا انجن بہترین حالت میں تھا۔ وہ تیز رفتاری سے شہر کی مختلف سڑکوں پر دوڑنے لگی۔

سلطان زیدی کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق دریائے برہم پترا کے کنارے پر آباد دیبور گڑھ نامی یہ شہر پچاس ساٹھ ہزار کی آبادی پر مشتمل تھا اور یہ مہذب انسانوں کی آخری بستی تھی۔ اس سے آگے وہ گھنے جنگلات تھے جہاں رہنے والے قبائل تہذیب سے قطعی ناآشنا تھے۔ یہ گھنے جنگل تقریباً چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر درہ چیتک کے اطراف جاکر برما اور چین کی سرحدوں سے جا ملتے تھے اور اسی طرف کہیں وہ قبیلہ بھی آباد تھا جو پہلے انسانوں کا گوشت بڑے شوق سے کھاتے تھے لیکن پھر یہ عادت ترک کردی تھی اور ندیم سوچ رہا تھا کہ اسے دیکھ کر کسی قبائلی کو انسانی گوشت کا ذائقہ یاد آگیا تو اس کا رب ہی راکھا تھا۔ اس پورے خطے میں دریاؤں کا جال بچھا ہوا تھا۔

دسمبر کا مہینا اور سطح سمندر سے بلندی پر ہونے کے باوجود یہاں کسی قدر گرمی تھی۔ ٹیکسی پر سفر کے دوران میں ہی اس نے اندازہ لگالیا کہ دیبور گڑھ ایک چھوٹا اور پُرسکون شہر تھا۔ سڑکیں کشادہ اور صاف ستھری تھیں۔ دونوں طرف درختوں کی قطاریں تھیں۔

ایک چوراہے پر ان کی ٹیکسی ٹریفک جام میں پھنس گئی۔ ڈرائیور نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھ لیے۔ اس کا اطمینان دیکھ کر ندیم کو بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے دوسری گاڑیوں کی طرف دیکھا۔ کسی ڈرائیور کو عجلت نہیں تھی۔ ممبئی جیسے شہر میں اس طرح ٹریفک جام ہوتا تو ڈرائیوروں نے ہارن بجا بجا کر آسمان سر پر اٹھا لیا ہوتا مگر یہ دیبور گڑھ تھا۔ یہاں وقت کی رفتار بہت سست تھی۔ کسی کو کسی کام کی عجلت نہیں تھی۔ وقت کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ ندیم نے بھی سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

بیلی ویو ہوٹل شہر کے وسط میں اس سڑک پر واقع تھا جو بتدریج نشیبی رخ اختیار کرتی ہوئی دریائے برہم پترا کی طرف چلی گئی تھی۔ ہوٹل کے سامنے ٹیکسی سے اتر کر ندیم نے ڈرائیور کو سو کا نوٹ دیا تو اس کا خیال تھا کہ ڈرائیور اسے باقی رقم واپس کرے گا مگر ڈرائیور نے نوٹ جیب میں ٹھونسا، اس کی طرف دیکھ کر پیلے پیلے دانت نکال دیے اور ٹیکسی آگے بڑھا لے گیا اور ندیم اسے دیکھتا رہ گیا۔

تیسری منزل پر واقع اس کا کمرا آٹھ بائی آٹھ فٹ سائز کا تھا۔ دروازے کے دائیں طرف بیڈ تھا جو زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ ایک طرف ایک چھوٹی میز اور کرسی تھی۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹا فریج تھا جس میں پانی، کولا اور بیئر کی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ باتھ روم اگرچہ چھوٹا تھا مگر صاف ستھرا تھا۔ کرائے کے حساب سے یہ کمرا زیادہ برا نہیں تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ندیم نے ہوٹل کے ٹیلی فون سے سلطان زیدی سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔

باون سالہ بینرجی دبلا پتلا منحنی سا آدمی تھا۔ سر کے پچھلے حصے پر صرف چند ہی بال رہ گئے تھے... جنہیں بڑے اہتمام سے وہ تیل میں چپڑ کر کھوپڑی پر چپکایا کرتا تھا۔ اس نے کلکتہ کے لا کالج سے قانون کی ڈگری حاصل کی تھی۔ کچھ عرصے تک کلکتہ ہی میں اپنے چچا کے ساتھ پریکٹس کرتا رہا، پھر گھومتا ہوا دیبور گڑھ آگیا۔ کسی بڑے شہر کے لحاظ سے وہ بہت چھوٹا وکیل تھا مگر دیبور گڑھ میں وہ بہت کامیاب زندگی گزار رہا تھا۔ یہاں عدالتوں میں بہت کم مقدمات پیش ہوتے جبکہ زیادہ تر مقدمات کا فیصلہ عدالتوں کے باہر ہی ہو جاتا تھا۔ بینرجی کبھی عدالت میں پیش نہیں ہوا تھا۔ کبھی کسی عدالت میں مقدمہ لڑنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔

بینرجی کا دفتر بیلی ویو ہوٹل سے تین بلاک کے فاصلے پر کشادہ سڑک پر واقع تھا۔ اس مختصر سی عمارت کو اونچے درختوں نے اپنے سائے میں لے رکھا تھا۔ سڑک پر شرابے کے باوجود وہ اپنے دفتر کی کھڑکیاں کھلی رکھا کرتا تھا۔ اسے یہ شور اچھا لگتا تھا۔

سوا چار بجے اس کے دفتر میں ایک ایسا آدمی داخل ہوا جسے بینرجی زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اجنبی ہونے کے باوجود بینرجی سمجھ گیا کہ وہ ندیم احمد تھا۔

تلاش جستجو کی اس داستان کے باقی واقعات اگلے ماہ ملاحظہ کیجیے

ایک بچے کی محرومیاں ..... جس کی محبت دوست فطرت نے اس کی زندگی بدل ڈالی

حالات کسی بھی نوعیت کے ہوں ..... محبت کے رنگ زندہ و تابندہ رہتے ہیں ..... ایک خاندان کے شب و روز کا احوال جس کا ہر فرد فکرِ معاش سے پریشان تھا ..... وقت کی ستم ظریفی اور تغیرات نے انہیں خود غرض بنا دیا تھا۔

فطرت

آصف ملک

ننھا ماریو ایک سنجیدہ اور خاموش مزاج لڑکا تھا۔ اس کی عمر ابھی سات سال تھی اور وہ اپنے سات بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ اس کا باپ ایک مل میں ملازم تھا۔ وہ بڑی مشکل سے اپنی اتنی بڑی فیملی کو پالتا تھا۔ میکسیکو میں اقتصادی حالات اچھے نہیں ہیں۔ خاص طور سے مزدور پیشہ لوگوں کے لیے زندگی گزارنا آسان نہیں ہوتا ہے۔ سوگوس کا تو خاندان بھی بڑا تھا۔ ایک تنخواہ میں نو افراد کا گزارہ آسان نہیں ہوتا ہے۔ خاص طور سے جب سارے ہی بچے تعلیم حاصل کررہے ہوں۔ ماریو کی سب سے بڑی بہن بیس سال کی تھی اور وہ کالج میں پڑھ رہی تھی۔ ساتھ میں وہ کوئی جاب کرتی تھی لیکن اپنی تنخواہ میں سے ایک ڈالر بھی گھر میں نہیں دیتی تھی۔ الٹا وہ باپ سے اپنی تعلیم کے لیے رقم وصول کرتی تھی۔ اس کے ... دو بھائی بھی ملازمت کرتے تھے۔ مگر وہ بھی اپنی آمدنی باہر ہی خرچ کرکے آتے تھے۔ ان کو ذرا بھی احساس نہیں تھا کہ ان کا باپ کتنی مشکل سے گھر چلا رہا ہے اور ان کو اس کی مدد کرنی چاہیے۔ ان سے چھوٹے ابھی کمانے کے قابل نہیں تھے مگر ساتھ ہی انہیں باپ کا احساس بھی نہیں تھا۔ وہ ہر وقت بس اپنی فرمائشوں کے چکر میں لگے رہتے تھے۔ جیسے ہی سوگوس مل سے آتا، وہ اسے گھیر کر فرمائشیں شروع کردیتے تھے۔

ننھا ماریو یہ سب دیکھتا تھا اور کُڑھتا تھا۔ اسے شدت سے احساس تھا کہ اس کا باپ صبح کا گیا رات کو واپس آتا

ہے۔ اتنی شدید محنت کے بعد بھی وہ دو وقت کا کھانا ہی کھاتے تھے۔ ان کی معمولی سی خواہش بھی بڑی مشکل سے پوری ہوتی تھی۔ ننھا ماریو یہ سب دیکھتا تھا اور اس کی کوشش ہوتی تھی کہ اپنے باپ کو کم سے کم پریشان کرے۔ وہ اس سے انتہائی ضرورت کی چیز بھی بڑی مشکل سے کہتا تھا اور اسے کہتے ہوئے شرمندگی ہوتی تھی۔ حالانکہ سوگوس نے اسے یا اپنے کسی بچے کو کبھی نہیں ڈانٹا تھا۔ وہ اپنے سب بچوں سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ ماریو کی ماں ان کو مارتی اور ڈانٹتی تھی لیکن سوگوس نے کبھی ان کو نہیں مارا تھا اور ڈانٹا بھی کم ہی تھا۔ اسے شاذ ہی غصہ آتا تھا۔

وہ تھکا ہارا شام کو گھر آتا تھا تو بچے اس سے چمٹ جاتے تھے اور اپنی فرمائشیں نوٹ کراتے تھے۔ وہ انہیں تسلی دیتا کہ وہ ان کی چیزیں لا دے گا۔ اگلے روز وہ ان کی چیزیں لا دیتا تھا۔ ماریو کو روزانہ دس پینس جیب خرچ ملتا تھا۔ یہ رقم بہت کم تھی اور اس میں مشکل سے ہی کچھ آتا تھا۔ اس لیے ماریو اپنا جیب خرچ جمع کرتا رہتا تھا اور پھر اس سے اپنی ضرورت کی کوئی چیز خرید لیتا تھا۔ اس سے اسے بہت خوشی ہوتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ اس نے ایسا کر کے اپنے باپ کا کچھ بوجھ کم کر دیا ہے۔

ان کے گھر دو وقت کھانا بنتا تھا۔ اگرچہ وہ پیٹ بھر کر کھاتے تھے لیکن یہ کھانا بہت سادہ ہوتا تھا۔ زیادہ تر وہ سبزیاں کھاتے تھے۔ گوشت مہینے میں دو تین بار ہی نصیب ہوتا تھا۔ ان کے گھر کوئی آ جاتا تھا تو ماریو کے ماں باپ پریشان ہو جاتے تھے۔ اس لیے جب انہیں پتا چلا کہ سوگوس کا ایک کزن امریکا سے ان کے ہاں رکنے کے لیے آ رہا ہے تو وہ پریشان ہو گئے کہ اس کی خاطر تواضع کیسے کی جائے گی۔ کزن سارانو بھی ایک دو دن کے لیے نہیں بلکہ پورے ایک ہفتے کے لیے آ رہا تھا۔

''میرے خدا! اب کیا ہوگا؟'' ماریو کی ماں نے فکرمندی سے کہا اور پھر غصے سے شوہر سے بولی۔ ''کیا تمہارے کزن کو ہماری مالی حالت کا ذرا بھی احساس نہیں ہے کہ ہم کتنی مشکل سے گزارہ کر رہے ہیں اور وہ پورے ایک ہفتے کے لیے رکنے کو آ رہا ہے۔''

''اسے میری مالی حالت کا اندازہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' سوگوس نے تحمل سے کہا۔ ''وہ دس سال پہلے امریکا گیا تھا تو اس وقت میرے صرف تین بچے تھے اور میری مالی حالت اتنی بری بھی نہیں تھی۔''

''پھر بھی تم اسے احساس تو دلا سکتے ہو۔ ممکن ہے اس صورت میں وہ ایک ہفتے کے بجائے ایک دو دن ہی ہمارے ہاں رکے۔ آخر یہاں پر تمہارے اور رشتے دار بھی تو ہیں۔''

''وہ تو ہیں لیکن وہ ایک ہفتے کے لیے نہیں پورے مہینے کے لیے آ رہا ہے اس لیے وہ باری باری سب کے ہاں ایک ایک ہفتہ رکے گا۔''

''دو مہینے کے لیے۔'' ماریو کی ماں کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''کیا اس کے پاس بہت وقت ہے یا اس کی امریکا سے چھٹی ہو گئی ہے؟''

''نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ اس نے مجھے کال کی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ کام کر کر کے تھک گیا ہے اور اب کچھ دن آرام کرنا چاہتا ہے۔''

دس سال پہلے سارانو غیر قانونی طور پر سرحد عبور کر کے امریکا چلا گیا تھا۔ جیسا کہ امریکا جانے والے نوے فی صد میکسیکن باشندے کرتے ہیں۔ کئی سال تو اس کا کچھ اتا پتا نہیں چلا تھا اور سوگوس کو خدشہ ہونے لگا کہ سارانو سرحد عبور کرتے ہوئے امریکن رینجرز کی فائرنگ سے مارا گیا ہے۔ سرحدوں پر تعینات امریکن رینجرز کی فائرنگ سے ہر سال ہزاروں سے زیادہ میکسیکن باشندے مارے جاتے تھے اور ان کی موت کبھی منظرِ عام پر نہیں آتی تھی کیونکہ امریکی میڈیا ان اموات کو چھپاتا ہے۔

مگر چار سال پہلے اچانک ہی ایک رشتے دار سے سوگوس کو پتا چلا کہ سارانو زندہ ہے اور امریکی ریاست فلوریڈا میں کام کر رہا ہے۔ اسے امریکا کی شہریت بھی مل گئی ہے۔ سوگوس کو یہ سن کے خوشی ہوئی کیونکہ وہ اور سارانو بچپن کے دوست بھی تھے۔ مگر سارانو نے اس سے رابطہ نہیں کیا تھا اور سوگوس نے اسے اس کی مجبوری سمجھا تھا۔ اب دس سال بعد سوگوس نے اسے مختصر سا فون کر کے یہ اطلاع دی تھی کہ وہ دو مہینے کے لیے میکسیکو آ رہا ہے اور وہ ایک ہفتے اس کے پاس رکے گا۔

ماریو کی ماں بہت پریشان تھی لیکن سوگوس نے اسے تسلی دی کہ مہمان اپنے نصیب کا کھائے گا اور وہ اس بارے میں زیادہ فکر نہ کرے، وہ کوشش کرے گا کہ اسے مل سے کچھ ایڈوانس مل جائے اور وہ کچھ وقت سارانو کو اچھا کھانا کھلا سکیں۔ مگر سوگوس کی کوشش کے باوجود اسے ایڈوانس نہیں ملا۔ اس دوران میں سارانو کے آنے کا وقت آ گیا تھا۔ مجبور ہو کر سوگوس نے اپنے بچوں سے کہا کہ وہ اس وقت باپ کی مدد کریں لیکن تینوں بڑوں نے باپ کو جھنڈی دکھا دی تھی۔ سوگوس نے بیوی سے کہا۔

''لگ رہا ہے اس بار میرے بچے دو وقت کے کھانے سے بھی جائیں گے اور جب سارانو جائے گا تو باقی مہینا یہ ایک وقت ہی کھانا کھا سکیں گے۔'' سوگوس نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔

اس کی حالت دیکھ کر ننھا ماریو اس کے پاس آیا اور اس سے کہا۔ ''پاپا! آپ فکر نہ کریں ہم ایک وقت کھانا کھا لیں گے۔''

''میرا بیٹا۔'' سوگوس نے اسے سینے سے لگا لیا۔ وہ ماریو سے ویسے بھی بہت پیار کرتا تھا۔ ایک تو وہ سب سے چھوٹا تھا اور دوسرے بچوں میں وہ واحد تھا جو اس کا احساس کرتا تھا اور صرف اس کے خیال سے اپنی بہت ساری ضرورتیں بھی دبا لیتا تھا۔

ان دنوں ماریو کے جوتے بالکل جواب دے گئے تھے۔ موچی سے سلائی کرا کرا کے ان کا چمڑا ختم ہو گیا تھا اور اب یہ سائز میں بھی اسے چھوٹے ہو چکے تھے۔ وہ ان سے کسی نہ کسی طرح کام چلا رہا تھا۔ مگر اب لگتا تھا کہ ان کی حد آ گئی ہے اور اسے شاید دو تین دن بعد ننگے پاؤں ہی اسکول جانا پڑے گا۔ اس نے ایک بار دبے الفاظ میں باپ سے کہا تھا لیکن جواب میں سوگوس نے اسے جن نظروں سے دیکھا تھا، اس کے بعد اس کی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ باپ سے پھر کہتا۔ اب تو کزن آ رہا تھا۔ یعنی کوئی امید تھی تو اب وہ بھی باقی نہیں رہی تھی۔

باقی بچے یہ سن کر غصے میں آ گئے کہ اس مہمان کی وجہ سے انہیں اب ایک وقت کا کھانا ملے گا اور سب سے زیادہ غصہ... بڑے کر رہے تھے۔ جب انہوں نے اس موضوع پر ماں کا زیادہ ہی دماغ کھایا تو اس نے ان سے کہا۔ ''تم لوگوں کو شرم آنی چاہیے۔ تمہاری عمر کے بچے ماں باپ کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ تم لوگ ایک ڈالر گھر میں دیتے نہیں ہو اور اب میرا دماغ کھا رہے ہو۔''

باقی بھی خوش نہیں تھے۔ صرف ایک ماریو تھا جو باپ کو خوش دیکھ کر خوش تھا۔ اس نے باپ سے انکل سارانو کے بارے میں تمام معلومات حاصل کیں اور باپ سے کہا۔ ''آپ فکر نہ کریں، میں انکل سارانو کو کمپنی دوں گا۔ جب آپ فیکٹری چلے جائیں گے۔''

''شکریہ میرے بچے۔'' سوگوس نے کہا۔

ایک شام کو سوگوس گھر میں داخل ہوا تو اس کے ساتھ سارانو تھا۔ ماریو کا خیال تھا کہ سارانو اس کے باپ کی طرح کوئی تھکا ہارا اور عمر رسیدہ نظر آنے والا شخص ہوگا۔ سوگوس انتالیس سال کا ہو چکا تھا اور اپنی عمر سے زیادہ کا نظر آتا تھا جبکہ سارانو عمر میں اس سے ایک سال بڑا تھا اور وہ اب پورے چالیس برس کا ہو چکا تھا۔ مگر سوگوس کے ساتھ جو شخص اندر آیا، وہ بالکل ترو تازہ اور جوان لگ رہا تھا۔ وہ بے حد صحت مند تھا اور اس کی جلد میں نوجوانوں جیسی تازگی تھی۔ وہ اپنی عمر سے پندرہ برس کم لگ رہا تھا۔

''پاپا! یہ انکل سارانو ہیں؟'' ماریو کی بڑی بہن جوسیا نے دلچسپی سے کہا۔ ''یہ تو آپ سے پندرہ سال چھوٹے لگتے ہیں اور آپ کہہ رہے تھے کہ یہ آپ سے ایک سال بڑے ہیں۔''

بیٹی کی بات سن کر سوگوس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات آ گئے تھے اور ماریو کو غصہ آنے لگا، اس نے تڑخ کر کہا۔ ''جی نہیں، پاپا اب اتنے بھی بوڑھے نہیں ہیں۔''

''پاپا کا چمچہ۔'' جوسیا نے آہستہ سے کہا۔

سارانو ہنسنے لگا، اس نے ماریو کو گود میں اٹھا لیا اور بولا۔ ''یہ درست ہے کہ میں آپ کے پاپا سے ایک سال بڑا ہوں۔''

آپ بھی بھرپور طاقت کے مالک بنیے طبی دنیا میں کامیاب اور لاجواب نسخہ

مرد حضرات ہی پڑھیں۔

برسوں سے ہمارے ماہر طب خصوصاً ایسے مریضوں کے لیے جو اپنی نا سمجھی کی بنا پر پیچیدہ امراض میں مبتلا ہو کر طرح طرح کے علاج سے مایوس ہو گئے تھے ان کے لیے اپنے تجربے و تحقیقات انتھک محنت لگن اور کاوشوں سے ایسا نسخہ تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے جس نے کئی ناکارہ بوڑھوں کو بہت کم دنوں میں جوان مرد بنا دیا اور مایوس گئے گزرے کمزور نوجوان ایک ایک نسخہ آزما کر یہ ثابت کر دکھایا کہ یہ جوہر واقعی بے پناہ قوت کا سرچشمہ ہے آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے فخر محسوس کر رہے ہیں کہ اس کے استعمال سے جسم میں نیا اور تازہ خون پیدا ہونے لگتا ہے چہرے پر سرخی ہاتھوں پیروں میں چستی توانائی ظاہر کر کے صحت کو قابل رشک بنا دیتا ہے اور آپ کو وہ تمام خوشیاں میسر ہو جائیں گی جس کے لیے آپ ایک مدت سے محروم رہے ہیں آج ہی ایک خط اپنی مکمل کیفیت لکھ کر جوابی لفافے کے ہمراہ ہمیں روانہ کریں آپ کو یہ نسخہ فوراً روانہ کر دیا جائے گا۔

حکیم اینڈ سنز
پوسٹ بکس نمبر 2159 کراچی 74600 پاکستان

''پھر آپ ان سے چھوٹے کیوں لگتے ہیں؟'' ماریو نے بھی پوچھ لیا۔

''اس لیے کہ تمہارے پاپا کی جوانی تم لوگوں میں تقسیم ہوگئی ہے اور میں نے ابھی تک شادی ہی نہیں کی۔''

''تم نے ابھی تک شادی ہی نہیں کی۔'' سوگوس کی بیوی نے حیرت سے کہا۔ ''پھر اتنے عرصے وہاں کیا کرتے رہے؟''

''میں کام کرتا رہا اور کماتا رہا۔''

وہ ان کے لیے تحفے لایا تھا۔ چھ بچوں کے لیے بہترین قسم کے تحفے تھے۔ وہ سوگوس اور اس کی بیوی کے لیے بھی تحفے لایا تھا۔ لیکن ماریو کے لیے کچھ نہیں تھا، اس نے ماریو سے معذرت کی۔ ''سوری ماریو! مجھے علم ہی نہیں تھا کہ تم بھی اس دنیا میں ہو، مجھے تو یہ معلوم تھا کہ سوگوس کے چھ بچے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں انکل سارانو۔'' ماریو نے متانت سے کہا۔ ''جب آپ اگلی بار آئیں گے تب میرے لیے تحفہ لے آئیے گا۔''

سارانو ان کے لیے بیش قیمت تحفے لایا تھا اور یہ تحفے سچ مچ ان کے لیے کارآمد تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو امریکا سے آتے ہوئے سیل سے اپنے رشتے داروں کے لیے تحفے لے آتے ہیں، چاہے وہ ان کے کام آئیں یا نہ آئیں۔ سوگوس کے لیے وہ ایک شان دار قسم کی لیدر جیکٹ لایا تھا اور اسے اس کی ضرورت بھی تھی کیونکہ جب وہ سردی میں کام کے لیے جاتا تھا تو اس کے پاس سوائے ایک پرانی اور گھس جانے والی جیکٹ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اسی طرح اس کی بیوی کے پاس اچھے سوٹ نہیں تھے۔ سارانو اس کے لیے دو بہت اچھے سوٹ لایا تھا۔ بچوں کے لیے بھی کام کے تحفے تھے۔ سارانو کو اچھی طرح معلوم تھا کہ یہاں کے لوگوں کو کس قسم کی چیزیں درکار ہوتی ہیں۔ البتہ اسے سوگوس کی مالی حالت دیکھ کر افسوس ہوا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی مشکل میں گزارہ کر رہا ہوگا۔

سارانو نے امریکا میں یقیناً اچھی کمائی کی تھی۔ تبھی وہ ان کے لیے اتنے قیمتی تحفے لایا تھا۔ پھر اس کا ذاتی لباس بھی شان دار تھا اور اس نے آتے ہی یہاں ایک کار کرائے پر لے لی تھی۔ جب تک وہ یہاں رہتا، یہ کار اس کے استعمال میں رہتی۔ اس نے بتایا کہ وہ امریکا میں اب تک ایک ریستوران چلا رہا تھا لیکن جب کاروباری حالات خراب ہوئے تو اس نے اپنا ریستوران کرائے پر دے دیا۔ اب اسے ماہانہ کرائے سے مطلب تھا۔ نفع نقصان اس کے ذمے تھا جس نے ریستوران کرائے پر لیا تھا۔

''آج کل ساری دنیا سے زیادہ امریکا کے کاروباری حالات خراب ہو رہے ہیں۔''

''تم اسی وجہ سے وہاں سے آگئے ہو؟''

''ہاں، میں چاہتا تھا کہ کچھ آرام کرلوں اور عزیزوں سے مل لوں۔ اب دیکھ لو، تم سے پورے دس سال بعد مل رہا ہوں جبکہ ایک وقت تھا کہ ایک دوسرے کے بغیر ہمارا کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا۔''

سوگوس ہنسا۔ ''وہ بھی کیا دن تھے...''

دونوں دوست پرانے دنوں کو یاد کرنے لگے۔ باقی بچے اِدھر اُدھر ہوگئے لیکن ماریو ان لوگوں کی باتیں سن رہا تھا۔ پھر سارانو کو خیال آیا۔ اس نے کہا۔ ''سوگی! میرا خیال ہے تم بہت مشکل سے گزارہ کرتے ہو؟''

ماریو کو خیال آیا کہ اس کا باپ ابھی انکل سارانو کو اپنی مشکلات کے بارے میں بتائے گا۔ لیکن اس نے ہنس کر کہا۔ ''نہیں یار، کوئی مشکل نہیں ہے اور گزارہ تو انسان پر ہے۔ بعض لوگوں کا کروڑوں میں بھی گزارہ نہیں ہوتا ہے اور بہت سارے چند نوٹوں میں بھی گزارہ کرلیتے ہیں۔''

''یہ تو ہے۔'' سارانو نے سر ہلایا۔ ''لیکن تمہارے بچے ہیں اور تم کمانے والے ایک ہو۔''

''ان کے لیے ہی تو کماتا ہوں۔''

سارانو سوچتا رہا اور پھر ہچکچا کر بولا۔ ''سوگی! تم بُرا مت ماننا، میں تمہاری مدد کرنا چاہوں تو...''

''تم میرے لیے کیا کرسکو گے؟'' سوگوس نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''تم شاید مجھے چند ہزار ڈالرز دے دو۔ لیکن دوست، اس سے میرے مسئلے حل نہیں ہوں گے۔ میرے مسائل کا حل کچھ رقم نہیں ہے۔ میرے مسائل کا واحد حل یہ ہے کہ میں اپنی اولاد کو پڑھا لکھا دوں اور اس کے بعد وہ خود اپنی منزل بنائیں۔''

سارانو سوچتا رہا۔ پھر اس نے سر ہلایا۔ ''واقعی تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن دوست اگر میری وجہ سے تمہاری کسی مشکل میں عارضی کمی بھی آتی ہے تو مجھے اس سے بہت خوشی ہوگی۔''

''میرے لیے سب سے خوشی کی بات یہ ہے کہ تم نے میرا خیال کیا اور مجھ سے پوچھ لیا۔ میں اس کے لیے تمہارا شکر گزار ہوں۔'' سوگوس نے اپنے دوست سے کہا تو ماریو نے اپنے باپ پر فخر محسوس کیا۔ اس نے اپنی ناداری کے باوجود دوست کا احسان لینا پسند نہیں کیا تھا۔ وہ رات سونے کے لیے بھائیوں والے کمرے میں آیا تو وہ سارانو کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ اس کے سب سے بڑے بھائی جیکوئس نے کہا۔

''انکل سارانو بہت دولت مند آدمی ہے۔''

''ہاں، میں نے خود دیکھا ہے اس کا پرس نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔'' ماریو سے بڑے روزیو نے کہا۔ ''اس میں بہت سارے نوٹ تھے۔ ہرے ہرے نوٹ، امریکن ڈالرز۔'' یہ کہتے ہوئے روزیو کے لہجے میں بے پناہ حسرت آگئی۔

''کاش... وہ پرس مجھے مل جائے۔'' جیکوئس نے سرد آہ بھری۔

''اور مجھے تو اس کا آدھا ہی مل جائے تو میں خوشی سے پاگل ہو جاؤں۔'' روزیو نے بھی خواہش ظاہر کی تو ماریو سے رہا نہیں گیا۔

''دوسروں کی دولت پر نظر رکھنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔'' اس نے کہا تو اس کے بھائی چونک گئے۔ جیکوئس نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

''تم چپ رہو احمق! تمہیں کیا پتا کہ دولت کیا ہوتی ہے۔''

''مجھے پتا ہے دولت کیا ہوتی ہے اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کسی کی دولت پر نظر رکھنا اچھی بات نہیں ہوتی ہے۔ تم سوچو اگر میں تمہارے پرس سے صرف ایک ڈالر نکال لوں تو...؟''

''تو میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔'' جیکوئس نے فوراً کہا۔

ماریو شرارت سے ہنسا۔ ''اپنے ایک ڈالر کے لیے میرا سر توڑ رہے ہو اور خود دوسروں کا پورا پرس حاصل کرنا چاہتے ہو۔''

جیکوئس کھسیا گیا۔ ''وہ تو میں ایسے ہی بات کر رہا تھا۔''

''تو میں کون سا سچ مچ تمہارا ایک ڈالر چرا رہا ہوں۔''

''اسے چھوڑو۔'' روزیو نے بے تابی سے کہا۔ ''یہ بتاؤ کہ تم نے انکل سارانو کے پاس اور کیا دیکھا ہے؟''

''اس کے پاس سونے کی گھڑی ہے۔ اس کی چین خالص سونے کی بنی ہے۔ اس کے ہاتھ میں ہیرے کی انگوٹھی ہے جو پلاٹینیم کی بنی ہے۔ اس کے پاس بے پناہ دولت ہے۔''

''اگر انکل سارانو کے پاس بہت ساری دولت ہے تب بھی اس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔'' ماریو نے پھر مداخلت کی۔

''تم چپ کرو۔'' روزیو نے اسے جھڑک دیا اور بھائی سے بولا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے انکل سارانو کے پرس میں کتنی رقم ہوگی؟''

''میرا اندازہ ہے کم سے کم بھی دس ہزار ڈالرز ہیں۔'' جیکوئس نے یوں کہا جیسے اس کے منہ میں پانی بھر آیا ہو۔ ''میں نے اس کے پرس میں کئی بڑے نوٹ دیکھے ہیں۔''

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

ماہ نومبر 2009ء کی حسین رونقیں

بے وفا کون

زندگی کے اتار چڑھاؤ...... عشق کے گہرے گھاؤ...... انسان کو کسی پل چین نہیں لینے دیتے...... ڈاکٹر ساجد امجد کے قلم سے آخری صفحات پر ایک یادگار تحریر

ہند سے یونان تک

ماضی کے اوراق سے سکندرِ اعظم کی زندگی کے پوشیدہ پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے محی الدین نواب کا تاریخی شاہکار

حضرت اسمٰعیلؑ

حضرت اسمٰعیلؑ کی حیات کا بے مثل اور لازوال قصہ

اور...... رضوانہ ساجد کے قلم سے ابلیس کی فریب کاریوں کا عبرت اثر احوال

دوست دشمن

ایسے موقع پرست دستوں کا ماجرا جو ڈسنے کے لیے آستین میں اپنا مسکن بنالیتے ہیں...... مرزا امجد بیگ کی پریکٹس کا ایک اور ماجرا

اس کے علاوہ

دیوتا، اناڑی، محفل شعر و سخن، آپ کے خط

مزید

نجمہ مودی، محمد اہان فیصل، کاشف زبیر، مرہم کے خان اور احمد صغیر صدیقی کی دلچسپ تحریریں آپ کی منتظر

اور وہ سب جو آپ سسپنس میں دیکھنا چاہتے ہیں! تازہ شمارہ فوری حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 5895313 فیکس: 5802551

''وہ نوٹ ہمارے نہیں ہیں۔'' ماریو نے کہا۔ ''تم لوگوں کو پتا نہیں ہے، انکل سارانو نے پاپا کو کہا ہے کہ وہ ان سے کچھ رقم لے لیں۔''

''سچ۔'' جیکوکس اور روزیو اچھل پڑے۔ ''پھر پاپا نے کیا جواب دیا؟''

''وہ میرے پاپا ہیں۔'' ماریو کے لہجے میں فخر آگیا۔ ''پاپا نے انکل سارانو سے مدد لینے سے انکار کر دیا۔''

''میرے خدا۔'' روزیو کراہا۔ ''یہ پاپا نے کیا کیا؟''

''انہوں نے ٹھیک کیا۔'' ماریو نے باپ کی حمایت کی۔

''یہ تو تمہیں اس وقت پتا چلے گا جب انکل سارانو کے جانے کے بعد ہمارے گھر میں ایک بار کھانا بنا کرے گا۔''

''تو کیا ہوا۔ یہ کچھ دنوں کی بات ہوگی۔ ہم ایک وقت کھالیں گے۔''

''تم کھالینا، میں تو ایک وقت نہیں کھا سکتا۔'' روزیو بولا۔

جیکوکس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس کا بھی ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر وہ اس وقت خاموش تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے روزیو کو بھی اشارے سے بات کرنے سے منع کیا تو وہ بھی یک دم چپ ہوگیا۔ ماریو نے محسوس کیا کہ ان دونوں کے درمیان کوئی راز کی بات تھی جس سے وہ ماریو کو بے خبر رکھنا چاہتے تھے۔ شاید وہ اس کے سونے کے بعد آپس میں اس پر بات کرتے۔ ماریو لیٹ گیا اور کچھ دیر بعد اس نے ایسا ظاہر کیا جیسے اسے نیند آگئی ہو لیکن وہ جاگ رہا تھا۔ جب دونوں بھائیوں کو اس کی نیند کا یقین ہوگیا تو وہ قریب آکر چپکے چپکے بات کرنے لگے۔

''سنو، میں سوچ رہا ہوں کہ انکل سارانو کے پرس سے کچھ رقم نکال لی جائے تو انہیں پتا بھی نہیں چلے گا۔'' جیکوئس نے سرگوشی کی۔

''میں تو کہہ رہا ہوں کہ ہمیں ساری رقم پار کر لینی چاہیے۔'' روزیو بولا۔ ''اس صورت میں ہمارے مزے ہو جائیں گے۔''

''احمق، اس صورت میں ہم فوراً پکڑیں جائیں گے۔'' جیکوئس نے اسے جھڑکا۔ ''تم پاپا کو جانتے ہو نا۔ وہ ہمیں کچھ نہیں کہتے ہیں لیکن اگر انہوں نے ہمیں پکڑ لیا تو سوچ لو ہمارے ساتھ کیا ہوسکتا ہے۔''

روزیو نے سوچا اور جھرجھری لی۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔''

''اس لیے ہمیں زیادہ کا لالچ نہیں کرنا چاہیے اور جو مل رہا ہے اس پر صبر شکر سے قناعت کرنا چاہیے۔''

''اس میں کیا ملے گا؟'' روزیو کے لہجے م... آگئی۔ ''شاید ہم ایک دو ہزار ڈالرز نکال لیں۔''

''اتنی دور کی مت سوچو۔'' جیکوکس نے کہا۔ ''ہ... تین سو ڈالرز نکالنا ہوں گے۔ اس سے زیادہ نکالے ... جائیں گے۔''

''دو تین سو ڈالرز۔'' روزیو نے مرے ہوئے ... کہا۔ ''یعنی ایک کے حصے میں سو یا ڈیڑھ سو ڈالرز آئیں ...

''یہ بھی کم نہیں ہیں کیونکہ امریکن ڈالرز ہیں۔ ... مہینا آرام سے گزار سکتے ہیں۔''

میکسیکن ڈالرز کی قیمت امریکن ڈالرز کے مقا... کم ہے اس لیے واقعی ان کے لیے ڈیڑھ سو ڈالرز فی ک... بہت تھے۔ انہوں نے منصوبہ بنایا تھا کہ موقع پا کر ... سارانو کے پرس سے رقم نکال لیں گے۔ ماریو کو ان ک... سن کر غصہ آرہا تھا اور اس کا دل چاہا کہ انہیں بتا دے ک... کے منصوبے سے واقف ہوگیا ہے۔ لیکن اس صورت ... اس کی مرمت لگاتے اور ظاہر ہے اس منصوبے پر ... کرتے اور بعد میں اس کا غصہ بھی اس پر نکالتے۔ و... مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ اس لیے اس نے سوتے بنے ر... عافیت سمجھی تھی۔ البتہ اسے ان لوگوں پر غصہ آرہا تھا جن... گھر کی عزت کا احساس نہیں تھا۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا ... سارانو اپنی رقم کی چوری سے بے خبر رہتا۔ اس کو فوراً ... جاتا۔ ہاں، یہ ممکن تھا کہ وہ دوست کی عزت کی خا... رہتا۔ لیکن یہ بات تو یقینی ہوتی کہ چوری گھر کے کسی ف... کی ہے اور اس صورت میں انکل سارانو کے دل م... لوگوں کی کیا عزت رہ جاتی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ا... کو کامیاب ہونے نہیں دے گا۔ چاہے اس کے لیے ا... کے ہاتھوں مار کیوں نہ کھانی پڑے۔

اگلے روز سوگوس کام پر گیا تو سارانو سو رہا ت... اس نے خاصے عرصے سے کام چھوڑ دیا تھا اس لیے ا... اٹھنے کی عادت بھی ختم ہوگئی تھی۔ بچے اسکول جانے ک... کر رہے تھے۔ ماریو نے روزیو کو چپکے سے اوپر جاتے ... ان کے گھر میں کُل چار کمرے تھے۔ ایک میں سوگوس ... کی بیوی رہتے تھے۔ دوسرے میں ان کی چار لڑکیا... تیسرے میں ان کے تین بیٹے رہتے تھے۔ جبکہ ... نشست گاہ بھی تھا اور کوئی ان کے گھر آجاتا تھا تو ... کمرے میں ٹھہرتا تھا۔ ماریو کی چھٹی حس نے اسے ... اور وہ بھی تیزی سے سارانو والے کمرے کی طرف ... اس نے دروازے کے پاس کھڑے ہو کر زور سے چلا...

''ماما! میرے موزے کہاں ہیں؟''

فوراً ہی روزیو بدحواسی میں اندر سے نکلا اور اس نے کھا جانے والی نظروں سے ماریو کو دیکھا۔ ''اتنا چلا کیوں رہے ہو؟ تمہیں پتا نہیں ہے انکل سارانو سو رہے ہیں۔''

''مگر انکل سارانو سو رہے ہیں تو تم اندر کیا کر رہے تھے؟'' ماریو نے معصومیت سے پوچھا۔

''میں اپنے جوتے تلاش کر رہا تھا۔'' روزیو نے بوکھلا کر کہا۔

''اور میں اپنے موزے تلاش کر رہا ہوں۔''

''لیکن موزے تو تم نے پہنے ہوئے ہیں۔'' روزیو نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

ماریو نے اپنے پاؤں دیکھے اور ہنسا۔ ''مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ میں موزے پہنے ہوئے ہوں۔''

روزیو اس کی وضاحت سے مطمئن نہیں تھا، اس نے ماریو کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''سنو، رات تم نے ہماری باتیں تو نہیں سنی تھیں؟''

''کون سی باتیں؟'' ماریو نے مزید معصومانہ لہجہ بنایا۔

روزیو اسے بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے آیا اور دانت پیس کر بولا۔ ''اگر تم نے ہماری باتیں سن لی ہیں تو تمہارے لیے بہتر ہے کہ انہیں بھول جاؤ۔''

''جب میں نے کچھ سنا ہی نہیں تو بھول کیا جاؤں؟''

ماریو ڈر گیا کیونکہ روزیو بڑی بے دردی سے اس کی پٹائی لگاتا تھا اور اتنی چالاکی سے لگاتا تھا کہ اس کے جسم پر کوئی نشان بھی نہیں آتا تھا۔ اس وجہ سے وہ ماں باپ سے روزیو کی شکایت بھی کرتا تو اس کا اتنا اثر نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت بھی وہ ڈر رہا تھا کہ روزیو اسے مارے گا لیکن اس نے صرف دھمکی دے کر اسے چھوڑ دیا۔

اس اثنا میں سارانو کمرے سے نکل آیا اور وہ تیار تھا۔ ماریو نے چور نظروں سے اس کی پتلون کی جیب کی طرف دیکھا اور اس میں پرس کا ابھار پا کر اس نے سکون کا سانس لیا۔ اب فوری طور پر روزیو اور جیکوکس کے لیے انکل سارانو کے پرس سے رقم نکالنا ممکن نہیں تھا۔ ماں ناشتے کی میز پر بلا رہی تھی۔ ناشتا کرکے ان کو اسکول کے لیے روانہ ہو جانا تھا۔ اس روز ماریو بڑی مشکل میں رہا تھا اور اس نے جوتے کی وجہ سے آدھی چھٹی میں کلاس سے باہر جانے سے گریز کیا تھا۔ اسے خوف تھا کہ اس کے جوتے ٹوٹ نہ جائیں۔ واپسی پر بھی وہ مشکل سے آیا تھا۔ راستے میں ایک جوتوں کی دکان نظر آئی تو وہ وہاں رک گیا۔ اس نے دکان دار سے کہا۔

''میرے سائز کا سب سے سستا جوتا کتنے کا ہوگا؟''

دکان والے نے اس کے جوتے کا سائز دیکھا اور اپنے پاس موجود سب سے سستا جوتا نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ یہ مصنوعی چمڑے کا عام سا جوتا تھا۔ ''اس کی قیمت بیس ڈالرز ہے۔'' دکان دار نے اسے بتایا۔

''اچھا، کیا اس سے کم قیمت نہیں ہے؟'' ماریو نے مایوسی سے کہا۔

''نہیں، یہی سب سے کم قیمت ہے۔'' دکان دار نے رکھائی سے کہہ کر جوتا واپس رکھ دیا۔ ماریو آگے چل پڑا۔ اسے معلوم تھا کہ اس مہینے تو اس کے باپ کے لیے ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ اسے یہ جوتے دلا سکتا۔ ابھی اگلے مہینے کی تنخواہ ملنے میں پورے بیس دن تھے۔ اگر وہ اپنے روز کے دس پینس بچاتا تب بھی بیس ڈالرز جمع کرنے کے لیے پورے دو سو دن درکار تھے اور اس کا جوتا تو چند دن کا مہمان تھا۔ دو سو دن تو نہیں لیکن اسے بیس دن تو کسی نہ کسی طرح گزارنے تھے۔ اس کے بعد اس کا باپ اسے جوتے دلا ہی دیتا۔ اس دوران میں وہ کسی طرح نہ طرح انہیں چلا ہی لیتا۔ اس کے پاس ایک خاص گلیو تھا جو اسے اس کے باپ نے لا کر دیا تھا۔ اسکول سے آنے کے بعد اس نے اس گلیو کی مدد سے جوتے کے نکل جانے والے حصے چپکائے اور اسے احتیاط سے رکھ دیا۔ جب وہ اس کام سے فارغ ہوا تو انکل سارانو کو اپنی طرف متوجہ پا کر جھینپ گیا۔ اسے احساس ہوا کہ انہوں نے ماریو کو اپنے جوتے کی مرمت کرتے دیکھ لیا تھا۔

''میرا خیال ہے تمہارا جوتا بہت پرانا ہوگیا ہے۔''

''نہیں، اتنا بھی پرانا نہیں ہے۔'' ماریو نے دفاعی انداز میں کہا۔ ''ابھی چھ مہینے پہلے ہی تو لیا تھا۔''

''اوہ اچھا۔'' سارانو نے اتنا ہی کہا۔ اس کے بعد وہ چپ ہوگیا تو ماریو نے بھی سکون کا سانس لیا۔ کچھ دیر بعد انہوں نے دوپہر کا کھانا کھایا۔ اس میں چکن کری تھی۔ بہت دن بعد بچوں نے چکن کا ذائقہ محسوس کیا تھا۔ اس لیے وہ کھانے پر ٹوٹے پڑ رہے تھے اور ان کو یہ احساس بھی نہیں تھا کہ انکل سارانو کو اتنا نہیں مل رہا ہے۔ مگر سارانو نے اپنے رویے سے اس بات کو محسوس ہونے نہیں دیا تھا۔ وہ شگفتہ انداز میں ان کو اپنے امریکا کے قصے سناتا رہا۔

ماریو نے محسوس کیا کہ جیکوئس اور روزیو کھانے کے دوران میں آنکھوں آنکھوں میں اشارے کر رہے تھے۔ اس نے انجان بن کر ٹوہ لینے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اسے اندازہ نہیں ہوا کہ وہ دونوں کس چکر میں تھے۔ کھانے کے

بعد سارانو نے انگڑائی لی اور بولا۔ ''اچھا، اب میں کچھ آرام کروں گا۔ نہ جانے کیا بات ہے، وطن آنے کے بعد مجھے دوپہر میں نیند آنے لگی ہے۔''

میکسیکن لوگ قیلولہ کرنے کے عادی ہوتے ہیں اور دوپہر کو وہاں پر سونے کا رواج ہے۔ سارانو امریکا جا کر یہ عادت بھول گیا تھا کیونکہ امریکا کمانے والا ملک ہے اور وہاں دن کمانے کے لیے ہوتا ہے اس لیے سارانو وہاں جاگتا تھا۔ لیکن وطن واپس آنے کے بعد اسے پھر سے دوپہر میں سونے کی عادت لگ گئی۔ ماریو کو فکر لگ گئی۔ اگر انکل سارانو سونے کے لیے گیا تو لازمی بات ہے وہ اپنا پرس جیب سے نکال کر سوتا۔ اس لیے روزیو اور جیکوئس پھر کوشش کر سکتے تھے۔ اس نے سارانو سے کہا۔

''انکل! کیا آپ سونے کے بجائے مجھے امریکا کی باتیں نہیں بتا سکتے؟ مجھے بہت شوق ہے وہاں کے بارے میں جاننے کا۔''

''تب تم ایسا کرو میرے ساتھ آجاؤ۔ ہم باتیں بھی کرتے جائیں گے اور جب نیند آئے گی تو سو جائیں گے۔''

''یہ ٹھیک رہے گا۔'' اس نے خوش ہو کر سوچا۔ اس طرح وہ انکل سارانو کو جگائے رکھتا اور روزیو اور جیکوئس کو موقع نہیں ملتا کہ وہ اس کے پرس سے کچھ چرا سکیں۔ شاید روزیو اور جیکوئس بھی اس کی اسکیم سمجھ گئے تھے اور وہ دونوں اس بات پر چراغ پا تھے۔ وہ اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

ان کو نظر انداز کر کے ماریو انکل سارانو کے ساتھ ان کے کمرے میں آگیا۔ انکل سارانو کے پاس ایک بڑا سا سوٹ کیس تھا جس میں اس کے کوئی درجن بھر سوٹ تھے جبکہ ماریو کے باپ کے پاس صرف تین سوٹ تھے اور وہ بھی بہت پرانے اور بوسیدہ ہو گئے تھے۔ سوگوس نے آخری سوٹ آج سے چار سال پہلے لیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس عام استعمال کے چند کپڑے تھے۔ ماریو نے حسرت سے سوچا کہ کاش اس کے باپ کے پاس بھی ایسے کپڑے ہوتے۔ لیکن اس کا تو ایک سوٹ بھی اچھا نہیں تھا۔

سارانو اسے امریکا کی باتیں بتانے لگا، وہ کچھ توجہ سے سن رہا تھا اور کبھی اس کا ذہن غیر حاضر ہو جاتا تھا۔ سارانو نے اسے بتایا۔ ''امریکا میں کام کے بہت مواقع ہیں۔''

''اچھا، کیا وہاں آدمی کو بہت اچھی تنخواہ ملتی ہے؟''

''یہاں کی نسبت بہت اچھی ملتی ہے۔'' سارانو نے سر ہلایا۔ ''بھی آپ کے پاس بہت سارے ڈالرز ہیں۔'' اس نے بے ساختہ کہا۔ سارانو چونک گیا۔

''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

وہ گھبرا گیا کیونکہ اس نے تو نہیں دیکھا تھا۔ اس نے روزیو اور جیکوئس سے سنا تھا۔ ''وہ میں نے... دیکھا... تھا۔'' اس نے اٹک اٹک کر کہا۔

''کب، کہاں دیکھا؟'' سارانو نے شرارت سے کہا۔

وہ چپ ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے۔ سارانو ہنسا تو اس کی جان میں جان آئی۔ ورنہ وہ سمجھ رہا تھا کہ ابھی اسے پتا نہیں کیا سننے کو ملے کہ وہ اس کے پرس میں کیوں دلچسپی لے رہا ہے۔ سارانو نے اس سے پوچھا۔ ''اچھا یہ بتاؤ کہ اگر تمہیں امریکا جا کر پڑھنے کا موقع ملے تو تم جاؤ گے؟''

''کیا امریکا جا کر میں اپنے پاپا کی مدد کر سکوں گا؟''

''اس کے لیے پہلے تمہیں تعلیم حاصل کرنا ہوگی اور پھر تم کوئی جاب کرو گے تب ہی اپنے پاپا کی مدد کر سکو گے۔''

''اچھا۔'' اس نے مایوسی سے کہا۔ ''اس میں تو بہت عرصہ لگ جائے گا۔''

''ہاں تمہیں کم سے کم دس سال پڑھنا پڑے گا اس کے بعد جا کر تم ہائی اسکول پاس کرو گے اور اس کے بعد تین سال کالج کی پڑھائی ہے۔''

''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں وہاں جا کر پڑھنے کے بجائے کوئی کام کر لوں؟''

''تم بہت چھوٹے ہو، تم بھلا کیا کر سکو گے؟'' سارانو نے حیرت سے کہا۔ ''وہاں پندرہ سال سے کم عمر لڑکے یا لڑکی کو کام کرنے کی اجازت نہیں ہے۔''

''میں تو ابھی صرف سات سال کا ہوں۔'' وہ بہت مایوس ہوا تھا۔

''ہاں البتہ جیکوئس جا کر وہاں کام کر سکتا ہے۔''

''وہ تو یہاں بھی کام کر رہا ہے۔'' ماریو نے کہا۔ ''لیکن وہ پاپا کی مدد نہیں کرتا ہے۔ اگر وہ امریکا چلا بھی گیا وہ ہمیں بھول جائے گا۔''

سارانو نے حیرت سے ماریو کو دیکھا۔ ''تم تو اتنی سی میں بہت سمجھ دار ہو۔''

''شکریہ۔'' وہ شرما گیا۔

ماریو کو نیند آرہی تھی۔ وہ کب سارانو سے باتیں کرتے کرتے سو گیا، اسے اندازہ نہیں ہوا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو سارانو بھی سو رہا تھا۔ اس نے تعجب سے سوچا۔ میں سویا تھا؟ اچانک اسے خیال آیا اور اس نے جلدی سے اٹھ کر سارانو کا جائزہ لیا۔ وہ اپنا پرس بستر کے سرہانے میز پر رکھ

سویا تھا۔ ماریو نے دروازے کی طرف دیکھا، وہ کھلا ہوا تھا اور پرس بھی صحیح سے نہیں رکھا تھا۔

'کیا روزیو اور جیکوئس نے اپنا کام دکھا دیا تھا؟' اس نے سوچا۔ پھر اس نے ڈرتے ڈرتے سارانو کا پرس اٹھایا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس میں سے رقم نکلی ہے یا نہیں۔ حالانکہ اسے پتا ہی نہیں تھا کہ پرس میں کتنی رقم تھی اس لیے وہ کس طرح جان سکتا تھا کہ اس میں سے رقم نکلی ہے یا نہیں۔ مگر وہ کتنا ہی ہوشیار سہی، تھا تو بچہ... اس لیے یہ حرکت کر گیا۔ ابھی پرس اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ رقم دیکھے کہ اچانک ہی دروازے سے روزیو اندر آیا اور اس نے ماریو کے ہاتھ میں پرس دیکھ کر کہا۔

''یہ کیا کر رہے ہو، تم نے انکل سارانو کا پرس کیوں اٹھا رکھا ہے؟''

ماریو کا دم خشک ہو گیا۔ اس نے گھبرا کر پرس واپس رکھ دیا اور ہکلا کر بولا۔ ''وہ میں... دیکھ رہا... تھا۔''

روزیو نے اسے گھورا اور زور سے بولا۔ ''تم پرس سے رقم چرا رہے تھے؟''

اس الزام پر ماریو کو غصہ آگیا۔ ''یہ غلط ہے۔'' اس نے احتجاج کیا۔ ''میں صرف یہ دیکھ رہا تھا کہ کسی نے پرس سے رقم تو نہیں نکالی ہے۔''

''جھوٹ مت بولو، میں نے خود تمہیں پرس سے رقم نکالتے دیکھا ہے اور شاید تم نے پہلے بھی رقم نکالی ہے۔''

ماریو نے انکار کیا اور دونوں میں تکرار ہونے لگی۔ اس شور سے سارانو کی آنکھ کھل گئی۔ ''کیا بات ہے، تم کیوں لڑ رہے ہو؟''

''انکل! اس نے آپ کے پرس سے رقم نکالی ہے۔'' روزیو نے براہ راست اس پر الزام لگا دیا۔

''یہ غلط ہے۔'' ماریو بولا۔

''اچھا، کیا یہ بھی جھوٹ ہے کہ تمہارے ہاتھ میں انکل کا پرس نہیں تھا؟'' روزیو نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''ہاں، میں نے اٹھایا تھا۔'' اس نے اعتراف کیا۔ ''لیکن میں نے دیکھا تھا کہ کسی نے اس میں سے رقم تو نہیں نکالی ہے۔''

''اگر اس میں کوئی رقم غائب ہوئی ہے تو وہ تم نے نکالی ہوگی۔'' روزیو زور دے کر بولا۔ ''کیونکہ پرس تمہارے ہاتھ میں تھا۔''

ماریو نے اس کی طرف دیکھا اور اچانک اس کی سمجھ میں آگیا۔ روزیو اور جیکوئس پہلے ہی پرس سے رقم غائب کر چکے تھے اور اب سازش کے تحت اس پر الزام لگا رہے تھے۔

اس دوران میں سارانو اپنے پرس کا معائنہ کر رہا تھا جس میں سے رقم غائب تھی۔ ماریو کا دل چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ اسے معلوم تھا کہ ابھی انکل سارانو بتائے گا کہ پرس سے رقم غائب ہے اور پھر بات اس کے باپ تک جائے گی۔ اسے سزا کا خوف نہیں تھا۔ لیکن اس کا باپ اس پر جو بھروسا اور اعتماد کرتا تھا، وہ ٹوٹ جائے گا اور اسے اپنے دوست کے سامنے جو شرمندگی ہوگی، یہ سوچ کر ہی ماریو کا دل رکنے لگا تھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے دھندلا رہی تھیں۔ وہ اپنی سسکیاں روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

روزیو فاتحانہ انداز میں کھڑا تھا۔ اس نے کتنی چالاکی سے ماریو کو ناکام بنا دیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے اسے مجرم بھی بنا دیا تھا۔ وہ بے چارہ انکل سارانو کی رقم اور اپنے باپ کی عزت بچانے کے چکر میں مارا گیا تھا۔ اب رقم کی چوری کا الزام اس پر آئے گا اور وہ ساری عمر کسی سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکے گا۔ اس نے انکل سارانو کی طرف دیکھنا چاہا مگر مارے شرمندگی کے اس کی نظریں نہیں اٹھ رہی تھیں۔

سارانو نے پرس میں رقم دیکھی اور پھر ماریو کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ دیر اسے غور سے دیکھتا رہا۔ اس نے نظریں جما کر روزیو کو دیکھا تو وہ گڑبڑا گیا۔ سارانو نے اس سے کہا۔ ''تم ماریو پر غلط الزام لگا رہے ہو۔ اس میں ساری رقم موجود ہے۔ ایک ڈالر بھی کم نہیں ہے۔''

''انکل!'' روزیو کا منہ کھلا رہ گیا۔

ماریو کو شبہ ہوا کہ اس کے کان نے غلط سنا ہے۔ اس نے جلدی سے آنسو صاف کیے۔ ''سچ انکل سارانو؟'' اس نے پوچھا۔

سارانو مسکرایا۔ ''ہاں... میرے پرس میں پوری رقم ہے اور روزیو، تم نے اپنے بھائی پر اتنا غلط الزام لگایا۔ اس سے معافی مانگو۔''

روزیو کا حیرت سے بُرا حال تھا لیکن اس نے جلدی سے ماریو سے سوری کر لی اور وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ماریو نے ایک بار پھر صفائی پیش کی۔ ''انکل! میں آپ کا پرس دیکھ رہا تھا کہ کسی نے اسے چھیڑا تو نہیں ہے۔''

سارانو نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''میرے دوست تم فکر مت کرو۔ مجھے آدمی کی پہچان ہے اور مجھے یقین ہے تم نے میرے پرس کو کسی غلط نیت سے ہاتھ نہیں لگایا ہوگا۔''

''شکریہ انکل۔'' اس نے بہ مشکل کہا۔ اسے لگا کہ انکل سارانو اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ روزیو اور جیکوئس کو پرس سے رقم نکالنے کا موقع نہیں ملا

تھا اور روزیو اس وقت کام دکھانے آیا تھا۔ مگر اس کے ہاتھ میں پرس دیکھ کر اس نے اسی پر الزام لگا دیا۔ ماریو نے سکون کا لمبا سانس لیا۔ وہ کتنی بڑی شرمندگی سے بچ گیا تھا۔ اس شام کو اس کا باپ آیا تو اس نے ماریو سے پوچھا۔

''آج کا دن کیسا گزرا... تم نے انکل سارانو کو کمپنی دی؟''

''جی پاپا۔'' اس نے کہا۔ پہلے اسے خیال آیا کہ باپ کو اس واقعے کے بارے میں بتا دے لیکن پھر اس نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ اگرچہ ہوا کچھ نہیں تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ اس کا ایمان دار باپ اس پر بھی دوست کے سامنے شرمندگی محسوس کرے گا۔ سوگوس بہت تھکا ہوا لیکن خوش تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ ''مجھے ایڈوانس مل گیا ہے۔ اب ہم اچھی طرح سارانو کی میزبانی کر سکیں گے۔''

ماریو بھی یہ بات سن کر خوش ہو گیا کہ اب اس کے باپ کا سر دوست کے سامنے نیچا نہیں ہوگا۔ اس نے اپنے جوتوں کا معائنہ کیا۔ اسے محسوس ہوا کہ تین چار دن تک جوتے پھر سے مسئلہ نہیں کریں گے۔ اسے پتا نہیں چلا تھا کہ سوگوس نے اسے جوتوں کا معائنہ کرتے دیکھ لیا ہے۔ اس نے ماریو کو پاس بلایا۔

''تمہارے جوتے اتنے خراب ہو گئے ہیں، تم نے بتایا نہیں؟''

''جی پاپا۔'' اس نے شرمندگی سے کہا۔ ''آپ پہلے ہی پریشان تھے اس لیے میں نے نہیں کہا۔''

سوگوس نے بیٹے کو دیکھا اور کھینچ کر اسے سینے سے لگا لیا۔ پھر اس نے ماریو کی پیشانی چومی۔ ''جیسے ہی مجھے اگلے مہینے کی تنخواہ ملے گی، میں تمہیں نئے جوتے لا دوں گا۔''

''شکریہ پاپا۔'' وہ خوش ہو گیا۔

''لیکن تب تک یہ جوتے چل جائیں گے؟'' سوگوس فکرمند ہو گیا۔

''جی پاپا! آپ نے مجھے ایک گلیو لا کر دیا تھا، میں نے اس سے جوتے جوڑ لیے ہیں۔'' اس نے فخر سے بتایا۔ سوگوس کو ایک بار پھر اس پر پیار آ گیا۔ اس دوران میں سارانو بھی وہاں آ گیا تھا۔

''کیا بات ہے، بیٹے سے کیا بات ہو رہی ہے؟''

''میرا بیٹا بہت اچھا ہے۔'' سوگوس نے کہا۔

''اس میں تو کوئی شک نہیں ہے۔'' سارانو نے کسی قدر عجیب سے لہجے میں کہا تو ماریو چونک گیا۔ اسے خیال آیا کہ کیا انکل سارانو کو اس پر شک تھا۔ تبھی وہ اس کے بارے میں اس طرح بات کر رہے تھے۔ اسے ڈر لگا کہ ابھی وہ اس کے باپ کو دوپہر والا واقعہ نہ سنا دیں۔ لیکن یہ بات کہہ کر سارانو سوگوس سے اپنی بات کرنے لگا۔ ماریو چپکے سے وہاں سے اٹھ گیا۔

اگلے روز وہ اسکول جانے کے لیے نکلا تو راستے میں روزیو نے اسے روک لیا اور ایک چھوٹی سی گلی میں کھینچ کر لے گیا۔ ''چھوڑ دو مجھے۔'' ماریو نے مزاحمت کی لیکن روزیو اس سے پورے سات سال بڑا تھا اور اسی لحاظ سے طاقت ور بھی تھا۔ ماریو سمجھ گیا کہ اب وہ اس سے کل والی ناکامی کا بدلہ لے گا۔ روزیو نے اسے دیوار کے ساتھ لگایا اور دانت پیس کر بولا۔

''دیکھ لیا اپنی حرکت کا انجام۔''

''میں نے کیا کیا ہے، تم نے مجھ پر غلط الزام لگایا ہے۔''

''انکل سارانو نے جھوٹ کہا تھا۔ ان کے پرس سے رقم غائب ہوئی ہے اور وہ صرف تمہیں بچانے کے لیے جھوٹ کہہ رہے تھے۔''

ماریو دنگ رہ گیا تھا۔ ''پرس سے رقم تم نے نکالی تھی؟''

''نہیں، جیکوئس نے نکالی تھی اور اس نے مجھے کچھ نہیں دیا۔ اس لیے اپنے لیے میں خود نکالنے آیا تھا مگر تم پہلے ہی پرس لیے بیٹھے تھے۔''

''جیکوئس نے رقم نکال لی تھی۔'' ماریو پھر دنگ رہ گیا۔

''پھر انکل سارانو نے کہا کیوں نہیں؟''

روزیو اسے زہریلی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ''تمہیں بچانے کے لیے۔ ورنہ انہیں بھی پتا چل گیا تھا کہ رقم غائب ہے۔''

''اس میں میرا کیا قصور ہے؟''

''مجھے کچھ نہیں ملا۔ یہ تمہارا قصور ہے۔'' روزیو نے کہا اور اسے مارنے لگا۔ ماریو نے واجبی سی مزاحمت کی اور پھر بے بسی سے آنسو بہانے لگا۔ وہ روزیو کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ جب روزیو کا دل بھر گیا تو اس نے ہاتھ جھاڑے اور بولا۔

''اب دفع ہو جاؤ اور اس بارے میں کسی سے ایک لفظ بھی کہا تو اگلی بار تمہاری اور زیادہ مار لگاؤں گا۔''

''تم کمینے ہو۔'' ماریو نے روتے ہوئے کہا۔ اس کا جسم دکھ رہا تھا۔ ''میں پاپا سے شکایت کروں گا۔''

''کر دینا پھر میں بھی پاپا کو پرس والا واقعہ سنا دوں گا اور یہ بھی کہوں گا کہ انکل سارانو نے تمہیں بچانے کے لیے رقم چوری ہونے کا شور نہیں کیا بلکہ اس بات کو چھپا گئے۔''

''میں پاپا سے کچھ نہیں کہوں گا۔'' ماریو خوف زدہ ہو گیا۔

''اب تم اچھے بچے بنے ہو۔'' یہ کہتے ہوئے روزیو نے اس کے دائیں پاؤں کے جوتے پر زور سے ٹھوکر لگائی تو اس کا سامنے والا حصہ اُدھڑ گیا۔ یہی سلوک ماریو نے اس کے بائیں پاؤں کے جوتے کے ساتھ بھی کیا تھا۔ اس کے

جوتے پھٹ گئے تھے اور اب وہ ننگے پاؤں ہی اسکول جا سکتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اس طرح اسکول گیا تو اسے سزا ملے گی اور گھر واپس گیا تو ماں مارے گی۔ وہ ان کی تعلیم کے معاملے میں بہت سخت تھی۔ اس لیے بہتر یہی تھا کہ وہ اسکول سے واپسی تک کا وقت گھر سے باہر گزارے۔ اس نے جوتے اتار کر بیگ میں رکھے۔ اسے ابھی گھر جا کر ان کو پھر سے جوڑنا تھا۔

گھومتے ہوئے وہ ایک پارک میں آ گیا اور دیوار کے ساتھ آ بیٹھا۔ اس کے عقب میں کھانے پینے کی چیزوں کے اسٹالز لگے تھے۔ جن سے انواع واقسام کی خوشبوئیں آ رہی تھیں۔ اس کے منہ میں پانی آ گیا۔ لیکن اسے معلوم تھا، ان اسٹالز پر کوئی چیز ایسی نہیں تھی جو صرف دس پینس میں آ سکے اس لیے وہ صبر کر کے بیٹھا رہا۔ ابھی اس کے اسکول کی چھٹی ہونے میں پورے تین گھنٹے تھے اور یہ وقت اسے یہیں گزارنا تھا۔ اچانک کوئی اس کے پاس بنچ پر آ بیٹھا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ یہ انکل سارانو تھے۔

''تم اسکول نہیں گئے؟''

ماریو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے دکھی لہجے میں کہا۔ ''میرے جوتے ٹوٹ گئے ہیں اور میں ننگے پاؤں اسکول گیا تو مجھے سزا ملے گی اس لیے آج میں اسکول نہیں گیا۔''

سارانو نے اس سے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''تمہارے پاس رقم نہیں ہے جس سے تم نئے جوتے لے سکو؟''

''نہیں، مجھے روز دس پینس ملتے ہیں۔ اس میں میں جوتے نہیں لے سکتا۔'' اس نے سادگی سے کہا۔

''میں تمہارے جیب خرچ کی بات نہیں کر رہا۔'' سارانو نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں تو اس رقم کی بات کر رہا ہوں جو تم نے...''

سارانو کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ دیوار کے عقب سے ایک جانی پہچانی آواز آئی تھی۔ ''دو چیز برگر، دو فنگر فرائی اور دو کولڈ ڈرنک دینا۔''

''جیکی! تمہارے پاس اتنی رقم کہاں سے آئی؟'' کسی لڑکی نے کہا۔

''بس آ گئی۔'' جیکوئس نے جواب دیا۔ وہ لوگ دیوار کے دوسری طرف کسی اسٹال پر تھے اور ان کی آوازیں صاف آ رہی تھیں۔

''پھر بھی... ابھی کل تک تو تمہارے پاس دس ڈالرز نہیں تھے اور اب اچانک تمہارے پاس دو سو ڈالرز آ گئے۔'' لڑکی نے اصرار کیا۔

''بس ڈارلنگ، آج کل ہمارے ہاں ایک انکل آئے ہوئے ہیں۔'' جیکوئس کا لہجہ تمسخرانہ ہو گیا۔ ''یہ اس کی ہی مہربانی ہے۔''

''اچھا، تمہارے انکل اتنے فراخ دل ہیں تو مجھے بھی ملواؤ نا۔'' لڑکی نے شوخی سے کہا۔

''تمہیں مزہ نہیں آئے گا، میرے پاپا سے بڑے ہیں۔''

''اوہ اولڈ مین۔'' لڑکی مایوس ہو گئی۔

ماریو اور سارانو سب سن رہے تھے۔ ماریو کا شرمندگی سے بُرا حال تھا۔ اس کی نظریں جھک گئی تھیں۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ جیکوئس نے انکل سارانو کے پرس سے رقم چوری کی ہے۔ لیکن اس کا بھانڈا اس طرح پھوٹ جائے گا، اسے اندازہ نہیں تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

''انکل! مجھے افسوس ہے۔''

''افسوس تو مجھے ہے۔'' سارانو نے سرد آہ بھری۔

ماریو نے تعجب سے اسے دیکھا تو اسے انکل سارانو اتنا ہی شرمندہ نظر آیا جتنا کہ وہ خود تھا۔ ''آپ کو کیوں افسوس ہے؟''

''میں تم پر شک کر رہا تھا۔'' سارانو نے اعتراف کیا۔ ''ماریو! میں سچ مچ شرمندہ ہوں۔''

اچانک ماریو کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ یہاں کیسے آیا تھا۔ اس نے دکھی لہجے میں کہا۔ ''آپ میرا پیچھا کر رہے تھے؟''

سارانو نے سر ہلایا۔ ''ہاں، میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تم رقم کا کیا کرتے ہو۔ میں پھر سوری کرتا ہوں کہ میں نے تم پر شک کیا۔''

مگر اب ماریو کو ایک اور طرح کی شرمندگی نے گھیر لیا تھا۔ بے شک اس کا دامن تو صاف ہو گیا تھا لیکن چوری اس کے گھر کے ایک فرد نے کی تھی جو اس کا بڑا بھائی تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ معاملہ اب پاپا کے سامنے جائے گا اور وہ کتنے دکھی ہو جائیں گے۔ ان کی اپنے کزن اور بچپن کے دوست کے سامنے ہمیشہ کے لیے نظر جھک جائے گی۔ اسے شدت سے جیکوئس پر غصہ آنے لگا جس نے یہ حرکت کی تھی۔ اس نے سارانو سے کہا۔

''آپ پاپا سے شکایت کریں۔ وہ جیکوئس کو سزا دیں گے اور آپ کا نقصان بھی پورا کریں گے۔''

سارانو نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میرا صرف دو سو ڈالرز کا نقصان ہوا ہے۔ لیکن سوگوس سے دوستی بہت قیمتی ہے۔ یہ انمول ہے اور میں کسی قیمت پر اسے کھونا نہیں چاہوں گا۔''

ماریو نے خوشی سے کہا۔ ''آپ پاپا کو نہیں بتائیں گے؟''
''نہیں، اور نہ ہی تم کبھی بتانا۔ سوگی بہت پیارا آدمی ہے اور یہ اس کا قصور نہیں ہے کہ اس کے کچھ بچے خراب نکلے ہیں۔ مجھے یقین ہے تم اپنے باپ کی طرح بنو گے۔''
''شکریہ انکل! آپ بہت اچھے ہیں۔'' ماریو نے اٹھ کر اس کے رخسار پر پیار کیا۔ ''میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔''
سارانو مسکرایا۔ ''احسان کیسا... میں نے تو اپنا دوست کھونے سے بچایا ہے۔'' وہ کھڑا ہو گیا۔ ''میرے ساتھ چلو۔''
''گھر؟'' وہ خوف زدہ ہو گیا۔ ''مام بہت ماریں گی۔''
''نہیں ماریں گی، میں ان سے کہہ دوں گا کہ میں تمہیں ساتھ لے گیا تھا۔'' سارانو نے کہا۔
''انکل! مام مجھ پر اعتماد کرتی ہیں کہ میں کبھی اسکول سے چھٹی نہیں کرتا ہوں۔ اگر ایک بار ان کو پتا چل گیا تو وہ کبھی مجھ پر اعتماد نہیں کریں گی۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا تو سارانو کو تعجب ہوا کہ وہ اتنی سی عمر میں کتنا عقل مند تھا۔ اس نے سر ہلایا۔
''ٹھیک ہے لیکن تم میرے ساتھ چلو۔ ہم کہیں اور جائیں گے۔''
اس بار ماریو راضی ہو گیا۔ وہ پارک سے نکلے اور سارانو اسے جوتے کی اسی دکان پر لے کر آیا جہاں سے ماریو نے سب سے سستا جوتا پوچھا تھا۔ ماریو اندر جانے کے بجائے رک گیا۔ سارانو نے اس کی طرف دیکھا۔ ''آؤ، رک کیوں گئے؟''
''انکل سارانو! آپ مجھے یہاں کیوں لائے ہیں؟''
''بیٹا میں تمہیں اچھے سے جوتے دلانا چاہتا ہوں۔''
ماریو کے بیگ میں اس کے پھٹے ہوئے جوتے موجود تھے اور اسے جوتے کی اشد ضرورت تھی۔ اس نے سوچا بھی کہ انکل سارانو اس کے لیے کوئی تحفہ نہیں لائے تھے اس لیے اگر وہ اسے جوتے دلا دیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہو گا مگر پھر اس نے جوتے نہ لینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے سارانو سے کہا۔
''انکل! میں نے پاپا سے جوتے لینے کے لیے کہہ دیا ہے اور وہ مجھے اگلے مہینے جوتے دلا دیں گے۔ تب تک میں اس سے ہی گزارہ کرلوں گا۔''
''تمہارا جوتا بالکل ختم ہو چکا ہے۔'' سارانو نے اسے یاد دلایا۔
''ہاں لیکن میں نے آپ سے جوتے لے لیے تو شاید پاپا کو اچھا نہیں لگے۔ وہ سمجھیں گے کہ مجھے ان پر اعتماد نہیں ہے۔''

''ماریو! تم کیا چیز ہو؟'' سارانو کچھ دیر بعد ہنس کر بولا۔ ''یقیناً سوگی مجھ سے زیادہ خوش قسمت ہے۔ میں نے... صرف ڈالرز کمائے ہیں لیکن اس نے تمہارے جیسا بیٹا کمالیا ہے۔ اوکے... میں تمہیں جوتے نہیں دلا رہا، لیکن تمہیں میری ایک بات ماننا پڑے گی۔''
''وہ کیا؟''
''میں کسی اچھے موچی سے تمہارے جوتے مرمت کرا دیتا ہوں تاکہ یہ اگلے مہینے تک چل سکے۔ اس میں تو کوئی حرج نہیں ہے؟''
ماریو نے سوچا اور سر ہلا دیا۔ وہ جوتے کی دکان میں جانے کے بجائے موچی کے پاس چلے گئے۔ جب اسکول سے آنے کا وقت ہوا تو ماریو گھر آ گیا۔ احتیاطاً وہ اور سارانو الگ الگ آئے تھے۔ کسی کو نہیں معلوم ہوا کہ اس روز گھر سے باہر انہوں نے بہت سارا وقت ایک ساتھ گزارا تھا۔ دو دن بعد سارانو نے جانے کا اعلان کر دیا۔ سوگوس حیران ہوا۔
''اتنی جلدی... ابھی تو تمہیں دو دن اور میرے پاس رہنا ہے۔''
''ہاں دوست لیکن میں کہیں اور نہیں امریکا واپس جا رہا ہوں۔ مجھے وہاں بہت ضروری کام ہے۔''
''وہ کیا دوست؟''
''میں اپنا ریستوران واپس لے کر اسے خود چلاؤں گا۔'' سارانو نے کہا اور وہ سوگوس کے روکنے کے باوجود چلا گیا۔ ماریو بہت خوش تھا کہ اس کا باپ ایک مسئلے سے بچ گیا اور سارا معاملہ خوش اسلوبی سے طے ہو گیا۔ سارانو کے جانے کے کوئی تین مہینے بعد کوریئر سے ایک لفافہ ملا۔ اس میں سوگوس اور اس کی فیملی کے لیے ورک ویزا تھا۔ سوگوس اپنے بارہ سال سے کم عمر بچوں کو بھی ساتھ لے جا سکتا تھا۔ سوگوس بے حد خوش تھا اگرچہ اس نے دوست سے اس کی بھی فرمائش نہیں کی تھی لیکن اس نے ویزا بھیج کر اس کی بہت بڑی مدد کر دی تھی۔ یہی نہیں بلکہ اس نے سوگوس کو لکھا تھا کہ وہ اس کے ساتھ ریستوران میں کام کرے گا اور ماریو اور اس کی دو چھوٹی بیٹیاں جو اس کے ساتھ آ سکتی ہیں، وہ اسکول میں پڑھیں گی۔ سوگوس کی مشکلات کے دن ختم ہو گئے تھے۔ اس کے چار بڑے بچے اب اتنے بڑے ہو گئے تھے کہ اکیلے رہ سکتے تھے۔ اس لیے وہ بے فکری سے بیوی اور بچوں کو لے کر امریکا روانہ ہو گیا جہاں ایک اچھا مستقبل اس کا اور اس کے بچوں کا انتظار کر رہا تھا۔

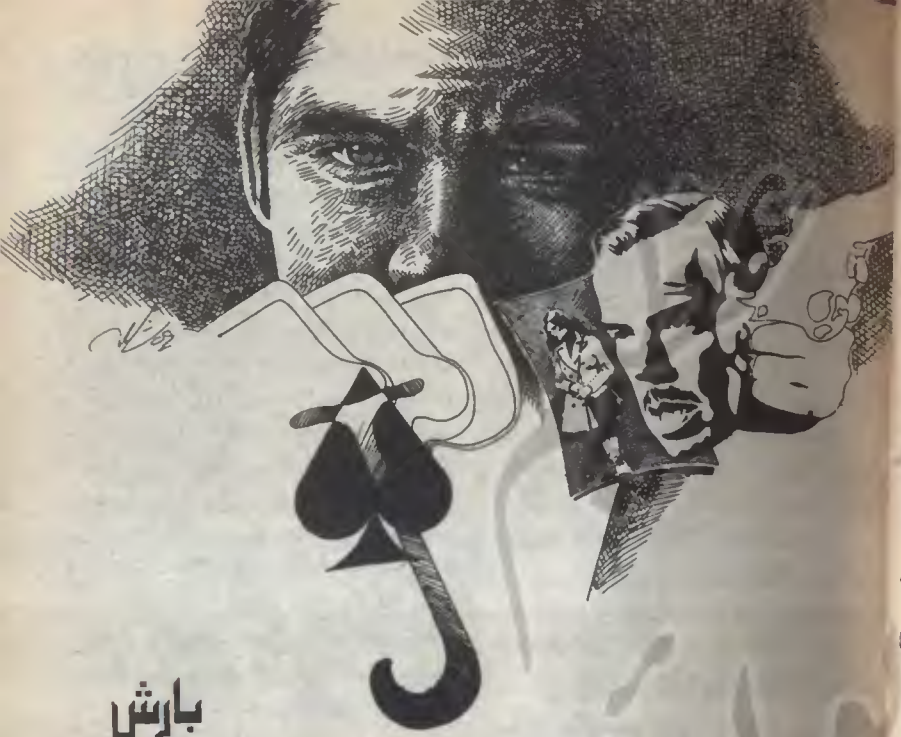

بارش

ڈاکٹر سلیم عادل

موسم کوئی بھی ہو ...... کاروبارِ حیات جاری و ساری رہتا ہے ...... کچھ لوگ سہانے موسم میں تفریح کو مدِ نظر رکھتے ہیں ...... اور کچھ لوگ اپنی فطرت سے مجبور مجرمانہ سرگرمیوں سے کسی طور دور نہیں رہ سکتے ...... مسلسل برستی بارش اور کہر میں لپٹی صبح کو پیش آنے والی صورتِ حال:

ایک خوبصورت دوشیزہ کے غیاب اور قتل کے پسِ منظر میں مخفی راز کی سنسنی خیز داستان

بجلی زور سے کڑکی اور اس کی چمک نے چند لمحوں کے لیے میرے نیم تاریک آفس کو روشن کر دیا۔ میری توجہ چند لمحوں کے لیے کھڑکی سے باہر عمارتوں کے وسیع جنگل کی طرف ہوئی اور میں نے کچھ دور اونچائی پر لگے ہوئے بل بورڈ کی طرف دیکھا۔ اس پر بنے ہوئے صحرا کے پس منظر پر سرخ برقی قمقموں سے ''جاؤ'' کا لفظ لکھا ہوا جگمگا رہا تھا۔
''ہیلو... ہیلو۔'' کی تکرار نے میری توجہ اس فون کی طرف مبذول کی جس کا ریسیور میرے کان سے لگا ہوا تھا۔ میں نے سراپا انکسار بن کر کہا۔ ''گھبرائیے نہیں۔ آپ نے بالکل صحیح جگہ فون کیا ہے۔ ہم اپنے ہر کلائنٹ کو خصوصی اور انفرادی توجہ دیتے ہیں۔ میں اپنے بقیہ کام اپنی سیکریٹری کے حوالے کر کے ابھی آپ کے پاس آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے فون رکھ دیا اور سوچنے لگا کہ میں روزانہ کتنے جھوٹ بولتا ہوں!
میرے پیشے میں جھوٹ بہت زیادہ ہے... اور سچ بہت کم۔ میری کوئی سیکریٹری نہیں ہے بلکہ میرے سوا اس آفس میں اور کوئی بھی نہیں ہے۔ میں اکیلا ہی اس آفس کا مالک، گیٹ کیپر، سیکریٹری، خاکروب... غرضیکہ سبھی کچھ ہوں۔ میرا نام ونسنٹ ڈریسلر ہے اور میں ایک پرائیویٹ

سراغ رساں ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ مجھے سراغ رسانی کا موقع کم ہی ملتا ہے۔

باہر جانے سے پہلے میں نے سگریٹ کی ڈبیا اور ماچس جیب میں ڈالی۔ اس کے بعد میں نے آفس ٹیبل کے پاس پڑی ہوئی چھوٹی میز کی طرف دیکھا جہاں سے میں نے کچھ دیر پہلے یہ ماچس اٹھائی تھی۔ اس میز پر رنگ برنگی ماچسوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ اس طرح کی ماچسیں جمع کرنا میرا واحد مشغلہ ہے اور اس ہابی کو اپنانے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ وہ واحد شوق ہے جسے میں افورڈ کر سکتا ہوں۔ یہ عام بازاری ماچسیں نہیں بلکہ مختلف بڑے ہوٹلوں اور کمپنیوں کی جاری کردہ کمرشل ماچسیں ہیں۔ یہ کمرشل ماچس عام ماچس کے برعکس ایک ڈبیا کے بجائے چمک دار، خوش نما اور رنگ دار گتے کے فولڈ کیے ہوئے ٹکڑے پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس کی تیلیاں بھی لکڑی کے بجائے گتے کی بنی ہوتی ہیں۔ تیلیوں کے ایک طرف مسالے کی کوٹنگ ہوتی ہے اور دوسرے سرے سے یہ ماچس کے اندر جڑی ہوتی ہیں۔ ماچس کے باہر، جاری کرنے والے ہوٹل یا کمپنی کا نام اور مونوگرام چھپا ہوتا ہے اور ساتھ ہی آتش گیر مسالے کی پٹی چپکی ہوتی ہے۔ اس ماچس کو میچ باکس کے بجائے میچ بک کہا جاتا ہے۔ اس قسم کی ماچسیں بڑے بڑے ہوٹلز اور کمپنیاں تشہیر کے لیے اپنے گاہکوں اور جان پہچان کے لوگوں میں مفت تقسیم کرتی ہیں۔

آفس بند کرنے کے بعد سیڑھیاں اتر کر جب میں نیچے پہنچا تو موسلا دھار بارش شروع ہو چکی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے آسمان نے آج اپنا سارا پانی برسانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بارش صبح صبح ہی شروع ہو گئی تھی۔

میرے خدا! مجھے بارش سے نفرت ہے۔ میں نے ساری زندگی بارش کو برستے دیکھا ہے لیکن اس کے باوجود اس شہر کی گندگی صاف نہیں ہوسکی۔ گلیوں میں جابجا کاغذ کے پوسٹر لگے ہوئے تھے جن میں سے کچھ پر لکھا تھا۔ ''کارٹرز کو ووٹ دیں'' اور کچھ پر لکھا تھا ''شہر کے منتخب میئر کارٹرز کو مبارک باد۔'' بارش اور طوفان میں یہ پوسٹرز بھی اڑتے پھر رہے تھے۔ ایک کونے میں شیڈ کے نیچے کھڑے ہو کر میں نے جیب سے ماچس نکالی۔ اپنی کلائنٹ مونا فنالی کا پتا میں نے اس پر ہی نوٹ کیا تھا۔ بعض اوقات یہ ماچسیں ایک منی ڈائری کا کام بھی دیتی ہیں۔ پتا تھا 204، نارتھ مین۔ پینٹ ہاؤس، میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ جس علاقے کا یہ پتا تھا، وہاں صرف کروڑ پتی لوگ ہی رہنے کا تصور کر سکتے تھے۔ پینٹ ہاؤس یعنی عمارت کے ٹاپ فلور کے اوپر بنی ہوئی بالکل الگ تھلگ رہائش گاہ کا مطلب تھا کہ میری کلائنٹ کر... ہونے کے ساتھ ساتھ آدم بے زار بھی تھی۔ اس قسم کے... اور اس قسم کی جگہوں سے مجھے نفرت ہے۔ میں بھی... لوگوں میں فٹ نہیں ہوسکا۔ خیر، کیا کیا جائے! آفس کا... خرچ تو چلانا ہی ہوتا ہے نا۔ ویسے تو اس طرح کے... میرے جیسے لوگوں کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے... چنانچہ جب اس قسم کے لوگ رابطہ کرتے ہیں تو اس کا... مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ کسی مسئلے میں بُری طرح پھنسے ہوئے ہیں۔ اس صورتِ حال میں ان سے موٹی فیس کی... کی جاسکتی ہے۔

جب میں اس عظیم الشان بلڈنگ کی لفٹ میں... ہوا تو لفٹ مین نے میرے گھسے ہوئے کوٹ کی طرف غور... دیکھا۔ شاید میری ''کلاس'' کے کسی فرد کو اس نے اس بلڈنگ میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ ''ٹاپ فلور۔'' میں نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے قدرے اونچی آواز میں کہا۔

عمارت کی چھت پر یہ واحد قیام گاہ تھی۔ میں... دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور پکارا۔ ''مسز فنالی! او نسٹ ڈریسلر حاضر ہے۔''

میں نے مسز کا لفظ انداز اً کہا تھا ورنہ مجھے علم نہیں تھا... میری کلائنٹ کس ہے یا مسز۔

دروازہ کھلا اور ساتھ ہی تازہ ہوا کا ایک جھونکا آ... دروازے میں مبہوت کر دینے والی ایک جواں سال عور... چہرے پر دل موہ لینے والی مسکراہٹ لیے کھڑی تھی۔ اس... عمر کا اندازہ میں نے تیس اور پینتیس سال کے درمیان لگا... چھ سات سال کا ایک گول مٹول سا بچہ بھی اس کے ساتھ... کھڑا تھا۔ ''مسٹر ونسنٹ ڈریسلر!'' وہ مسکرا کے بولی۔ ''... آپ کی منتظر ہوں کہ آپ میرے بلانے پر آگئے۔ میں... میرا بیٹا یہاں بالکل اکیلے رہتے ہیں اور کبھی بھی کسی بھی... کے لیے یہاں سے باہر نہیں جاتے۔ اس لیے میں خود... کے پاس نہیں آئی۔''

''کوئی بات نہیں۔ میں جو آپ کے پاس... ہوں۔'' میں نے چہرے پر پیشہ ورانہ مسکراہٹ لاتے ہو... کہا۔ ''آپ کے شوہر کہاں ہوتے ہیں؟'' لیکن مونا فنالی... میرے اس سوال کو نظر انداز کر دیا اور مجھے اندر لے گئی۔ پینٹ ہاؤس کی آرائش دیکھ کر میں پلک جھپکانا بھول گیا۔ مونا نے مجھے ایک طرف بنی ہوئی نشست گاہ کی طرف لے گئی جس... ساتھ ایک چھوٹا سا بار بھی بنا ہوا تھا۔

''مسٹر ڈریسلر! آپ کیا پینا پسند کریں گے؟'' یہ کہہ کر وہ خود ہی وہسکی کی ایک بوتل کھولنے لگی۔ کچھ دیر کے بعد جب ہم آرام دہ صوفوں پر بیٹھ گئے تو اس نے کہا۔ ''میرے خیال میں اب میں آپ کو تفصیلاً اپنا مسئلہ بتا دوں۔ میری کزن ریسین براؤن ہے۔ اس کا نام ریسین براؤن ہے۔ وہ دراصل خود گھر سے بھاگ گئی ہے۔ میں اس کے بارے میں بہت فکرمند ہوں۔ اس کے والدین کا پچھلے ماہ ایک حادثے میں انتقال ہو گیا تھا۔ اس کا دنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔ چنانچہ میں اسے یہاں اپنے پاس لے آئی۔ وہ بہت اپ سیٹ تھی۔ ریسین ابھی صرف انیس سال کی ہے اور.... جب مجھے یہ خیال آتا ہے کہ وہ اس گندے شہر، ان گندی گلیوں میں کہیں تنہا ہے تو میرا کلیجا منہ کو آنے لگتا ہے۔'' تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد فنالی پھر بولی۔ ''اس کی ایک سہیلی ہے جس کا نام ہے ہوپ لفل۔ مجھے اس کے گھر کا علم نہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ ریسین اسی لڑکی کے پاس گئی ہو گی۔ پلیز! آپ اسے ڈھونڈ نکالیے۔'' اس کے ساتھ ہی مونا باقاعدہ سسکیوں کے ساتھ رونے لگی۔ میں نے اسے تسلی دی۔

''گھبراؤ نہیں۔ میں تمہاری کزن کو ڈھونڈ نکالوں گا۔ بشرطیکہ اس کی بھی خواہش ہو کہ وہ تمہیں ملے۔''

یہ کہہ کر میں اٹھا تو میں نے مونا فنالی کے بیٹے کو رہائش گاہ کے ایک نیم وا دروازے کی طرف گھورتے پایا۔ غیر ارادی طور پر میں نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا تو مجھے اس دروازے میں ایک نیم برہنہ لڑکی کی جھلک دکھائی دی لیکن یہ ایک لمحے کے لیے ہوا۔ اس کے بعد وہ غائب ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی میری نظر سامنے رکھی ہوئی میز کی طرف گئی تو وہاں ''کارٹرز کو ووٹ دیں'' اور ''میئر کارٹرز کو مبارک باد'' کے چند پوسٹرز پڑے نظر آئے۔ اتنے میں مونا نے اپنا پرس کھول کر ایک پرانی تصویر مجھے تھما دی۔

میں سوچتا ہوا باہر آیا اور لفٹ کے ذریعے نیچے پہنچا۔ ایک مرتبہ پھر میں کیچڑ سے بھری گلیوں میں گھوم رہا تھا اور اپنے اس کیس کے بارے میں ذہن لڑا رہا تھا۔

گھر سے بھاگی ہوئی ایک انیس سالہ لڑکی...

ایک سنگل کلائنٹ جو کبھی اپنے گھر سے باہر نہیں نکلتی۔

ایک سہیلی کا نام۔

اور گم شدہ کی ایک پرانی تصویر۔

مونا فنالی کی شخصیت میں کچھ ایسا بے نام سا تاثر تھا جو اس کی جذباتیت اور اس کے آنسوؤں کی نفی کر رہا تھا۔ اس تاثر کو میں کوئی نام نہیں دے پایا تھا۔ شاید یہ میری چھٹی حس کا کمال تھا۔ راستے میں بارش کے باوجود ایک جلوس بڑے جوش و خروش سے جا رہا تھا جس کی وجہ سے مجھے رکنا پڑا۔ یہ جلوس ''منتخب میئر'' کارٹرز کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے نکلا تھا۔ جلوس کے شرکا نے وہی پوسٹرز اٹھا رکھے تھے۔ یعنی ''منتخب میئر کارٹرز کو مبارک باد!'' میں زیرِلب مسکرایا۔ ہونہہ... منتخب میئر۔ یہ اس شخص کو منتخب میئر کہہ رہے ہیں جبکہ یہاں پر کوئی انتخاب (الیکشن) تو ہوا ہی نہیں۔ پاگل خانے جیسے اس شہر کے باسیوں سے یہی توقع کی جاسکتی ہے۔

اپنے کام کا آغاز میں نے ایک فون بوتھ سے کیا۔ ٹیلی فون انکوائری والوں نے نہ صرف یہ تصدیق کی کہ ہوپ لفل نامی خاتون وجود رکھتی ہے (یا تھی) بلکہ اس کا پتا بھی دے دیا۔ یہ ایڈریس ایک بوسیدہ سی اپارٹمنٹ بلڈنگ کا تھا۔

جب میں اس عمارت کے مطلوبہ فلیٹ پر پہنچا تو وہ خالی تھا۔ میں اس عمارت کی ناظمہ کے پاس پہنچا، اسے ریسین براؤن کی تصویر دکھائی اور دونوں لڑکیوں کے بارے میں پوچھا۔ ناظمہ نے یہ تصدیق تو کر دی کہ اس فلیٹ میں ہوپ لفل نامی لڑکی رہتی تھی اور پھر یہ تصویر والی لڑکی اس کے پاس کچھ دن رہی لیکن پھر یہ دونوں لڑکیاں اکٹھی یہاں سے چلی گئیں، پتا نہیں کہاں؟

عمارت سے باہر نکل کر میں نے اِدھر اُدھر کچھ پوچھ تاچھ کی۔ کسی کو بھی ان لڑکیوں کے موجودہ ٹھکانے کے بارے میں علم نہیں تھا۔ اتنے میں دوپہر کے کھانے کا وقت ہوگیا۔ مجھے سامنے ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ نظر آیا تو میں اس میں گھس گیا۔ کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے ہوئے ایک خوش مزاج موٹے شخص نے میرا استقبال کیا۔ یہ موٹا غالباً اس ریسٹورنٹ کا مالک، منیجر، بیرا، سبھی کچھ تھا۔ میں نے وہیں کھانا کھایا اور بل دیتے وقت ریسین کی تصویر نکال کر موٹے کو دکھائی۔ ''کیا تم نے اس لڑکی کو کہیں دیکھا ہے؟ اس کا نام ریسین ہے اور یہ کچھ دن پہلے تک نزدیک ہی ایک فلیٹ میں رہتی تھی۔''

''آں... ہاں۔'' موٹے نے آنکھیں سکیڑ کر تصویر کو دیکھا۔ ''ریسین اور اس کے ساتھ دوسری لڑکی جس کا نام ہوپ ہے، یہ دونوں لڑکیاں اکثر یہاں آیا کرتی تھیں۔ اس علاقے کی لڑکیاں میرا مکئی کے دانوں والا بھنا ہوا گوشت بڑے شوق سے کھاتی ہیں۔ چند روز سے یہ لڑکیاں نظر نہیں آرہیں۔ ویسے یہ دونوں لڑکیاں ہاٹ اسپاٹ نامی کلب میں بطور ڈانسر کام کرتی ہیں۔ یہ کلب ریڈ سیکٹر میں واقع ہے۔''

جب میں ریڈ سیکٹر پہنچا تو شام ہورہی تھی۔ اس جگہ کو ریڈ یعنی سرخ سیکٹر کہا جاتا تھا جبکہ یہ باقی سارے شہر کی طرح سیاہ اور غلیظ تھا۔ ہاٹ اسپاٹ نامی کلب کو ڈھونڈنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ یہ کلب دراصل اسٹرپ ٹیز یعنی برہنہ بار تھا جس میں مشروبات کی فراہمی کے ساتھ ساتھ حسین اور نوجوان لڑکیاں فطری لباس میں گاہکوں کا دل لبھانے کے لیے رقص پیش کرتی تھیں۔ مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ میں ایک ''بھولی بھالی مظلوم و معصوم'' لڑکی کو تلاش کرتے ہوئے اس قسم کی جگہ پہنچ جاؤں گا۔ کاؤنٹر پر پہنچ کر میں نے بار ٹینڈر کو ریسین کی تصویر دکھائی۔ اس نے ایک آنکھ والی عینک میں سے آنکھ سکیڑ کر تصویر کو دیکھا اور جھٹ سے بولا۔ ''یہ تو ریسین براؤن ہے۔ اس نے کچھ دن یہاں کام کیا تھا لیکن پھر چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ شاید ہوپ لٹل کو پتا ہو۔''

''اور ہوپ لٹل کہاں ملے گی؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''ہوپ لٹل؟'' بار ٹینڈر نے بے شرمی سے مسکراتے ہوئے مجھے آنکھ ماری اور بولا۔ ''اسٹیج پر دیکھو۔'' اسٹیج بار کاؤنٹر سے پیچھے تھا۔ وہاں مجھے سنگِ مرمر سے تراشا ہوا سا ایک خوب صورت برہنہ جسم تھرکتا ہوا نظر آیا۔ میں وہیں ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور شو ختم ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ شو ختم ہوا تو میں اسٹیج کے پیچھے ہوپ لٹل کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے اس سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ وہ نہ جانے کیا سمجھی لیکن پھر کچھ سوچ کے مجھے اپنے چھوٹے سے کمرے میں لے گئی۔ کمرے میں پہنچتے ہی اس نے سگریٹ منہ میں لی اور مجھے اسے سلگانے کے لیے کہا۔

میں نے ماچس نکالی لیکن میرا اور اس کا فاصلہ اتنا کم نہیں تھا کہ میں اس کے ہونٹوں میں دبا ہوا سگریٹ سلگا سکتا۔ چنانچہ میں نے پوری ماچس اس کی طرف اچھال دی جو اس نے مہارت سے کیچ کرلی۔ اس اثنا میں اس نے اپنا لباس بڑی بے باکی سے میرے سامنے ہی تبدیل کرنا شروع کردیا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنی نظریں دوسری طرف پھیرلیں۔ گوکہ ایسا کرنے کے لیے مجھے اپنے دل پر جبر کرنا پڑا تھا۔ ''میرا نام ونسنٹ ڈریسلر ہے۔'' میں نے کھنکھار کر گفتگو کا آغاز کیا۔ ''میں ایک پرائیویٹ سراغ رساں ہوں۔ مونا فنالی نے اپنی کزن ریسین براؤن کو تلاش کرنے کے لیے میری خدمات حاصل کی ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے میری نظریں ہوپ لٹل کی طرف گھوم گئیں۔ اس وقت اس کے دونوں ہاتھ اس کی پشت پر تھے۔ وہ غالباً اپنے زیر جامے کا ہک بند کررہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک تمسخرانہ مسکراہٹ تھی۔

''بہت خوب... مونا فنالی کی کزن! اس کا مطلب ہے کہ آپ ایک ماہر سراغ رساں نہیں ہیں مسٹر ونسنٹ۔ ریسینا براؤن کا مونا فنالی سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ مونا کو آپ شاید نہیں جانتے۔ وہ ایک ہائی کلاس نائکا ہے بلکہ ٹاپ کلاس... اور اس کا پینٹ ہاؤس درحقیقت ایک اعلیٰ درجے کا قحبہ خانہ ہے جہاں سے اس شہر کے ٹاپ کے اُمرا اور سیاست دانوں کو حسین لڑکیاں اور عیاشی کا سامان سپلائی کیا جاتا ہے۔ ریسین انہی حسین لڑکیوں میں سے ایک تھی۔ ان کا آپس میں رشتہ صرف اس کاروبار کی حد تک تھا۔''

میں اس کی بات حیران ہوکر سن رہا تھا۔ وہ پھر بولی۔ ''مسٹر ڈریسلر! لگتا ہے آپ بالکل اندھیرے میں رہے ہیں۔ ریسین، مونا کی بہترین لڑکیوں میں سے تھی اسی لیے اسے اس کی اتنی فکر ہے کہ اس نے بھاری فیس خرچ کرکے آپ کو اسے واپس لانے کے لیے بھیجا ہے۔'' اس کے بعد وہ میرے قریب آئی اور مجھ پر سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے بولی۔ ''کیا آپ بھی کچھ 'شوق' رکھتے ہیں؟''

اس وقت ہوپ عملی طور پر میری بانہوں میں تھی۔ میں نے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا اور اسے آہستگی سے اپنے سے دور کردیا۔ ''سنو لڑکی! تم مجھے دقیانوسی سمجھ لو لیکن میرا اصول ہے کہ میں اپنے کلائنٹ پر اور اس کی کہی ہوئی بات پر اعتبار کرتا ہوں۔ ہاں اگر ریسین مجھے خود ملے اور یہ سب بتائے تو میں اعتبار کرلوں گا۔''

ہوپ کچھ دیر مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر خود مجھ سے دور ہٹ گئی اور بولی۔ ''کاش! میں آپ کی کچھ مدد کرسکتی۔ ریسین نے مونا کا ٹھکانا چھوڑا تو وہ درحقیقت بھاگ رہی تھی اور جب میں نے اسے آخری مرتبہ دیکھا تو وہ تب بھی بھاگ رہی تھی۔''

''وہ کس سے بھاگ رہی تھی؟'' میں نے پوچھا۔ ''کیا مونا سے؟''

ہوپ بولی۔ ''ریسین ان لوگوں میں سے نہیں جو پیسے سے بھاگتے ہیں۔ وہ کسی چیز سے خوف زدہ ہوکر بھاگ رہی تھی اور وہ بہت زیادہ خوف زدہ تھی۔ میں آپ کو نہیں بتاسکتی کہ ریسین کہاں ہے۔ مجھے افسوس ہے... اور اب مسٹر ڈریسلر، مجھے اجازت دیں۔ میں اس وقت کام پر ہوں اور ہاں، آپ کی ماچس کا شکریہ۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ماچس میری طرف اچھال دی۔

نہ جانے اس کی باتیں سچ تھیں یا جھوٹ! کیا میں اس لڑکی کی بات پر اعتبار کرسکتا ہوں؟ کیا اس نے جو بات مونا کے بارے میں کہی ہے، وہ سچ ہے؟ انہی سوچوں میں غلطاں میں ہاٹ اسپاٹ سے باہر آگیا۔ اتنے میں مجھے سگریٹ کی طلب ہوئی۔ سگریٹ منہ میں دبا کر میں نے ماچس نکالی تو میں چونکا۔ یہ میری ماچس نہیں تھی۔ میں نے اس ماچس کو کھول کر دیکھا تو اس پر چند الفاظ لکھے نظر آئے۔ ''ہوپر ڈائنر پر ملو۔ 11 بجے رات۔'' اس کے نیچے حرف ایچ (H) دستخط کے انداز میں لکھا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ ہوپ نے مجھ سے سگریٹ سلگانے کے لیے ماچس لی تھی اور اس کے ساتھ ہی وہ لباس تبدیل کرنے لگی تھی۔ چند منٹوں کے لیے میں اسے نہیں دیکھ پایا تھا۔ یقیناً اسی وقفے کے دوران میں اس نے میری ماچس چھپا کر اپنی ماچس پر یہ پیغام لکھ دیا ہوگا اور جب میں واپس جانے لگا تو اس نے میری ماچس کے بجائے یہ ماچس مجھے دے دی۔ ماچس تبدیل کرنے کی وجہ یہ رہی ہوگی کہ استعمال کے وقت میں ایک مختلف ماچس دیکھ کر چونک جاؤں اور اسے غور سے دیکھوں تاکہ پیغام مجھ سے پوشیدہ نہ رہے۔ ابھی گیارہ بجنے میں وقت تھا۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ ایک مرتبہ پھر مونا سے ملاقات کرلی جائے۔ میں تو ہوپ لٹل کے پاس جوابات لینے گیا تھا لیکن وہاں مجھے مزید سوالات مل گئے۔ ٹیکسی نے مجھے چند منٹوں میں نارتھ مین کے علاقے میں پہنچا دیا۔

''کیا یہ سچ ہے؟'' میں نے مونا سے پوچھا۔ وہ کچھ دیر نظریں جھکائے بیٹھی رہی پھر دھیرے سے بولی۔

''ونسنٹ! کیا اس سے تمہیں کچھ فرق پڑتا ہے کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں؟ تمہیں اندازہ تو ہو ہی چکا ہے۔ کیا میرے بتادینے سے تمہیں زیادہ یقین ہوجائے گا؟ اگر میں چاہوں تو جھوٹ بول کر بھی تمہیں مطمئن کرسکتی ہوں لیکن میں ایسا نہیں کروں گی۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھی اور میرے نزدیک آئی۔ ''ونسنٹ! سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ میں کیا ہوں، اس وقت ہمارے لیے اہمیت ریسین کی ہے۔ کوئی اس کے پیچھے ہے۔'' مونا کچھ دیر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی رہی۔ اچانک اس نے میرا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لیا اور اپنے ہونٹ میرے چہرے پر ثبت کردیے۔ ''ونسنٹ! تم اوروں سے بہت مختلف ہو۔ میں جانتی ہوں کہ تم یہ کام فیس کے لالچ میں نہیں کررہے۔ ریسین مصیبت میں ہے۔ مجھے نہیں پتا کہ کون اس کے پیچھے ہے اور کیوں؟ اسے ڈھونڈو ونسنٹ... اسے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

جب میں نیچے گلی میں پہنچا تو میرے چہرے پر اس کے لبوں کے لمس کی نرم ٹھنڈک موجود تھی۔ اس خمار کی بدولت میں اپنے آس پاس سے بے خبر ہوگیا تھا۔

سر پر پڑنے والی ضرب اتنی شدید تھی کہ میں اسی لمحے منہ کے بل فٹ پاتھ پر گر پڑا اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ ہوش میں آنے پر میں نے خود کو ایک کرسی سے بندھا پایا۔ سامنے تیز روشنی کے پس منظر میں ایک شخص نظر آیا بلکہ یوں کہیے کہ ایک شخص کی پرچھائیں نظر آئی کیونکہ اس کے پیچھے تیز روشنی والے خاص بلب کی وجہ سے اس کی شکل نظر نہیں آرہی تھی لیکن اس کے سر پر رکھی ہوئی پولیس والوں کی ٹوپی کافی واضح تھی۔ مجھے اسی وقت اندازہ ہوگیا کہ یہ ہمارے شہر کی ''خصوصی'' فورس ہے۔ یہ فورس اس شہر کی غلیظ گلیوں کی ہر چیز کو اپنی مرضی کے مطابق چلاتی اور کنٹرول کرتی ہے۔ انہیں بلز کہا جاتا ہے۔ یہ فورس یعنی بلز اس شہر کی پولیس اور خطرناک غنڈوں کی مشترکہ ''فورس'' ہے۔ بڑے سے بڑا جرم مثلاً کسی کو بھی غائب کرنا، کسی کو بھی صفحۂ ہستی سے مٹا دینا ان کے لیے ایسا ہی ہے جیسے آپ کے لیے کسی کاکروچ پر پاؤں رکھ دینا۔

میئر کارٹر نے عہدہ سنبھالتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ وہ اس شہر کو بلز سے پاک کردے گا لیکن یہ تو پہلے سے بھی زیادہ شد و مد سے مصروفِ عمل نظر آرہے تھے۔ ابھی میں ساکت بیٹھا یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ سامنے والا شخص جو غالباً بلز کے اسی

گروپ کا لیڈر تھا، مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''جاگو پیارے! اور میری بات غور سے سنو۔ ہم اچھی اچھی باتیں کریں گے لیکن ان باتوں کے تین اصول ہوں گے۔ سب سے پہلا اصول ہم تم سے سوال کریں گے۔ دوسرا اصول تم ان سوالوں کے جواب دو گے۔ ان دو اصولوں پر عمل کرو گے تو ہم تیسرے اصول سے بچ سکتے ہیں جو میں افسوس سے کہتا ہوں کہ شدید تکلیف پر مبنی ہوگا۔''

یہ کہہ کر اس نے ایک ڈرامائی وقفہ دیا اور پھر گویا ہوا۔ ''اب تم مجھے بتاؤ گے کہ لڑکی کہاں ہے؟''

میں نے کچھ دیر اس کے چہرے کو دیکھنے کی کوشش کی اور پھر آہستگی سے کہا۔ ''مجھے یقین نہیں آرہا کہ تم نے یہ سب تکلیف صرف ایک 'ڈیٹ' کو ڈھونڈنے کے لیے اٹھائی ہے۔''

چند لمحوں تک سامنے والا (غالباً) مجھے گھورتا رہا۔ پھر اس کی آواز آئی۔ ''اس شہر میں ایک سے بڑھ کر ایک ذلیل ہے۔ ہمارے لیے یہی مسخرہ رہ گیا تھا۔ لڑکو! سنبھالو اسے۔'' اس کے حکم پر ان کے تیسرے اصول پر عمل شروع ہو گیا جو واقعی تکلیف پر مبنی تھا۔

چند منٹوں میں میرا سارا چہرہ لہولہان ہو کر سوج چکا تھا۔ سامنے والے کے اگلے اشارے پر ساری ''فورس'' نے اپنا ہاتھ روکا۔ وہ پھر بولا۔ ''ونسنٹ ڈریسلر! میں تمہیں یاد دہانی کروانا چاہوں گا کہ یہ شہر ایک پولیس اسٹیٹ ہے اور ہم لوگوں کے پاس تمہاری ذات سے زیادہ اہم کام ہیں۔''

میں نے جواب دیا۔ ''کون سے اہم کام؟ راہ گیروں کی پٹائی کرنا یا بوڑھی عورتوں سے پرس چھین کر بھاگنا۔''

سامنے والے نے اس مرتبہ غالباً ضبط سے کام لیا اور دھیرے سے بولا۔ ''اپنی اوقات میں رہو... کسی سراغ رساں کی ناجائز اولاد۔ تم اس مسئلے میں گردن تک دھنس چکے ہو۔ یہ سارا مسئلہ تمہاری حیثیت، برداشت اور اوقات سے بہت زیادہ ہے۔ اس لڑکی کا پیچھا چھوڑ دو اور اس مسئلے سے فوراً علیحدہ ہو جاؤ۔ تمہیں یہ پہلی اور آخری وارننگ دی جارہی ہے۔'' اس کے بعد اس کے کارندوں نے مجھے اٹھا کر بوری کی طرح ایک کار کی پچھلی سیٹ پر پٹخا۔

کچھ دیر گاڑی سڑکوں پر بھاگتی رہی پھر اچانک بریک لگے۔ گاڑی کا دروازہ کھلا اور دو مسٹنڈوں نے مجھے اٹھا کر گاڑی سے باہر پھینک دیا۔ اس کے بعد گاڑی مجھ پر کیچڑ اچھالتی ہوئی وہاں سے غائب ہو گئی۔ میں اس گاڑی کے پچھلے حصے کی ایک جھلک ہی دیکھ سکا تھا۔ یہ ایک پرانی بیوک تھی، بغیر کسی نمبر پلیٹ کے!

میں نے اٹھ کر دائیں بائیں دیکھا۔ سڑک بالکل سنسان تھی۔ بارش کی وجہ سے لوگ غالباً گھروں میں دبکے ہوئے تھے۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں تو اپنی ہی گلی میں کھڑا ہوں۔ ان گرگوں نے یہ مہربانی کی تھی کہ مجھے میرے آفس کے پاس ہی پھینکا تھا۔ دیواروں پر ہر طرف کارٹرز کے نام والے وہی پوسٹرز لگے ہوئے تھے۔ کارٹرز جب میئر بنا تھا تو اس نے اعلان کیا تھا کہ شہر کو بلڈز سے پاک کر دے گا۔ شاید یہ والے بلڈز اس کے مشاہدے میں آنے سے رہ گئے ہوں گے۔

اتنے میں میری نظر سامنے لگے ہوئے بل بورڈ پر پڑی جس پر اس وقت ''آؤ'' کا لفظ جگمگا رہا تھا۔ اس سنگین صورتِ حال میں بھی میرے سوجے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ ''آؤ... بہت خوب! ایسے موقعے پر تو انسان کا جی چاہتا ہے کہ اس جگہ کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر بھاگ جائے۔ یہ خواہش دل میں مچلتی ہے کہ اپنا سامان پیک کرو، اس شہر سے، اس بارش سے، اس گندگی سے جو اسی شہر میں ایک سے دوسری جگہ تیرتی پھرتی ہے، دور کہیں نکل جاؤ۔ یہ خیال دل میں اکثر آتا ہے لیکن... جاؤ کوئی نہیں پاتا۔''

میں اپنے آفس میں داخل ہوا۔ وھسکی کا ایک پیگ پیا۔ کوٹ تبدیل کیا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ مجھے مسلح ہونا چاہیے۔ میں نے اپنی میز کی سب سے نچلی دراز کا تالا کھولا اور اس میں ہاتھ ڈال کر اپنی گن باہر نکالی۔ میں چند لمحے اسے محبت سے دیکھتا رہا۔ اسمتھ اینڈ ولسن آٹو میٹک پستول ہاتھ میں آتے ہی میں نے اپنے جسم میں طاقت کا چشمہ پھوٹتا محسوس کیا۔ یہ گن میری سب سے قیمتی بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ میری واحد قیمتی چیز ہے۔ کچھ عرصہ قبل میرے ایک کلائنٹ نے یہ گن خوش ہو کر مجھے تحفتاً بخش دی تھی۔ نو ملی میٹر کی اس پستول کا شمار دنیا کی سب سے بڑی پستولوں میں ہوتا ہے اور یہ اپنے ہدف کے جسم میں روشن دان بنا دیتی ہے۔ اس کا کاٹا واقعی پانی نہیں مانگتا۔

چمڑے کا ہولسٹر پہن کر میں نے گن احتیاط سے اس میں ڈال دی۔ اس کے بعد میں نے اتارے ہوئے کوٹ میں سے ریسین کی تصویر نکالی جو گیلی ہو کر مڑ تڑ گئی تھی لیکن اس کے باوجود ریسین کا مسکراتا ہوا حسین چہرہ صاف نظر آتا تھا۔ اس کے بعد میں نے ہوپ لٹل کی دی ہوئی ماچس نکالی اور اس پر لکھی ہوئی تحریر کو پھر سے دیکھا۔ ''ہوپرز ڈائنر پر ملو، 11 بجے رات۔'' یہ ریستوران میرے آفس سے زیادہ دور نہیں تھا۔

جب میں ہوپرز ڈائنر نامی ریستوران پہنچا تو رات کے 11 بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔ میں نے ایک ایسی کرسی کا انتخاب کیا جہاں سے داخلی دروازہ نظر آتا تھا۔ اب یہ کیس میرے لیے کیس نہیں بلکہ جنگ بن چکا تھا۔

ٹھیک 11 بجے وہ دروازے سے اندر داخل ہوئی مگر وہ ہوپ لٹل نہیں تھی۔ وہ ریسین براؤن تھی۔ خاموشی سے، بغیر کچھ کہے میرے سامنے بیٹھ کر اس نے ہونٹوں میں ایک سگریٹ دبائی اور میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے ہوپ لٹل کی ماچس نکالی اور اس میں سے ایک تیلی اکھاڑ کر اس کی سگریٹ سلگائی۔ اس دوران میں وہ بہ غور ماچس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ہوپ لٹل کی تحریر دیکھ کر اسے اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ ٹھیک بندے کے پاس پہنچ گئی ہے۔

''مسٹر ونسنٹ! کیا کوئی ایسی جگہ ہے جہاں ہم اکیلے بیٹھ سکیں؟''

میں اسے اپنے آفس لے گیا کیونکہ میرا خیال تھا کہ ہم یہاں محفوظ ہیں۔ میرے آفس میں ریسین نے میری ماجسوں کے کلیکشن کو دلچسپی سے دیکھا۔ وہ ملنسار اور خوش مزاج لڑکی نظر آتی تھی لیکن اس مسئلے نے اسے بہت خوف زدہ کر دیا تھا۔ میں نے اسے ڈرنک آفر کی۔ کچھ دیر بعد غالباً اسے یقین ہو گیا کہ وہ یہاں محفوظ ہے۔ چند ثانیے وہ غالباً الفاظ تلاش کرتی رہی پھر بولی۔ ''دراصل میرے پیشے میں بہت کچھ دیکھنے کو ملتا ہے۔''

میں نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ ''میرے پیشے میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔''

ریسین پھر بولی۔ ''بہت سے لوگ ملتے ہیں۔ بڑے بڑے بزنس مین، بڑے بڑے پولیس افسر اور سیاست دان...! میں نے مونا کے ساتھ بہت عرصہ کام کیا ہے۔ میں بہت سی باتیں جانتی ہوں۔ خوفناک راز جانتی ہوں۔ یہ راز خوفناک بھی ہیں اور خطرناک بھی۔''

شانے کہا۔ ''اب وقت آگیا ہے کہ تم یہ راز کسی کے ساتھ شیئر کرو اور میرا خیال ہے کہ تم میرے ساتھ اسی لیے آئی ہو۔'' یہ کہتا ہوا میں آفس کے واش روم چلا گیا تاکہ آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر اپنے چہرے اور کپڑوں کا جائزہ لے سکوں۔ دو منٹ میں چاور رہا تھا کہ چند لمحے یہ لڑکی تنہائی میں اپنے خیالوں کو مجتمع کر سکے۔ مجھے ریسین کی آواز آئی۔

''کچھ لوگ مجھے مردہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ میں ان کے راز جانتی ہوں۔ لیکن میں نے بھی بعض احتیاطی تدابیر کر رکھی ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ...'' اس کی گفتگو میں اچانک اور غیر فطری وقفہ آیا تو میں چونکا۔ اچانک مجھے اس کی چیخ سنائی دی۔ ''نہیں! خدا کے لیے نہیں۔'' ساتھ ہی گولی چلنے کی آواز سے میرا سارا آفس گونج اٹھا۔

''ریسین!'' میں چلایا اور ساتھ ہی میں واش روم کے دروازے تک آیا۔ مجھے ایک ریوالور کی نال اپنی طرف اٹھی نظر آئی۔ میں فوراً پیچھے ہٹ کر دوبارہ واش روم میں گھس گیا اور میری یہی حرکت میری جان بچانے کا باعث بن گئی۔ جو گولی میرے دل میں لگتی، وہ میرے بائیں شانے میں لگی۔ میرے سارے بازو میں جیسے آگ سی اتر گئی۔ میں نے بغلی ہولسٹر سے اپنا اسمتھ اینڈ ولسن نکالا اور تمام احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر ایک بار پھر واش روم کے دروازے پر آگیا۔

آنے والا شخص اپنی دانست میں مجھے ''فارغ'' کر چکا تھا اور ایک بار پھر ریسین کی طرف متوجہ تھا۔ چنانچہ وہ میری طرف سے غافل تھا۔ میں نے پستول سیدھا کیا اور ٹریگر دبا تا چلا گیا۔ گولیوں کا دھکا اس قدر شدید تھا کہ وہ شخص اچھل کر آفس کے دروازے سے باہر گر پڑا۔ میں نے دروازے سے باہر جا کر دیکھا۔ وہ سیڑھیوں سے نیچے جا پڑا تھا۔ اس کے اردگرد خون ہی خون تھا۔ میری گن کی 3 گولیوں نے اس کے جسم میں تین ایسے سوراخ بنائے تھے کہ ان کے آر پار دیکھا جا سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ابھی تک فرانسیسی ساخت کا 32 بور کا روبی ریوالور دبا ہوا تھا۔ اچانک مجھے ریسین کا خیال آیا۔ میں اسے پکارتا ہوا آفس میں داخل ہوا۔ ریسین فرش پر اوندھے منہ پڑی تھی۔ قاتل کی ایک ہی گولی کام کر چکی تھی۔ وہ واقعی ایک ''پروفیشنل'' تھا جو اپنی ڈیوٹی پوری کرتے ہوئے قربان ہو گیا تھا۔ اچانک میرا دھیان ریسین کے بائیں ہاتھ کی طرف گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی چابی تھی جو ہار کی طرح کی ایک زنجیر میں پروئی ہوئی تھی۔ میرے مرتے مرتے غالباً وہ میری توجہ اس چابی کی طرف دلانا چاہتی تھی۔ میرے چھوٹے سے اور بند آفس میں گولیوں کے دھماکے کسی توپ کی آواز سے کم نہ تھے۔ چہرے اور سر کے زخم پہلے ہی مجھے نچوڑ چکے تھے۔ شانے پر گولی کھا کر میرے لیے کھڑے ہونا مشکل ہو گیا تھا۔ سر میں جیسے سائرن سے گونج رہے تھے۔ میں نے سر کو جھٹکا لیکن سائرن کی آواز مسلسل آتی رہی۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ سائرن کی آواز میرے سر میں نہیں بلکہ باہر گلی میں گونج رہی ہے۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ پولیس کی ایک گاڑی گلی میں رک چکی تھی اور شاٹ گنز اور ٹامی گنز سے مسلح پولیس والے اس میں سے چھلانگیں مار کر اتر رہے تھے۔ میں چند لمحے حیران ہو کر دیکھتا رہا۔

اچانک میں اپنے خیالات سے چونکا، یہ وقت حیران ہونے کا نہیں تھا۔ ان بلز کا اتنی جلدی اور فوراً یہاں پہنچ جانے کا ایک ہی مطلب تھا۔

میرے ہاتھ میں گن تھی جو ابھی تک دھواں دے رہی تھی اور میرے آفس کے اندر اور باہر دو لاشیں! کسی نے مجھے پھانسنے کے لیے بڑی زبردست پلاننگ کی تھی۔ میں نے ریسین کی لاش کے ہاتھ سے چابی نکال کر اپنی جیب میں ڈال لی۔ یہ چابی میرے پاس وہ واحد چیز تھی جو اس گتھی کو سلجھا سکتی تھی۔ اس چابی کو مجھ تک پہنچانے کے لیے اس لڑکی نے اپنی جان دے دی تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ یہ چابی کس دروازے کو کھولتی ہے اور اس دروازے کے پیچھے کون یا کیا چیز گھات لگائے بیٹھی تھی۔ میں عمارت کے پچھلے دروازے سے بلز کو جل دے کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

دو تین گلیوں میں پیدل گھومنے کے بعد ایک ٹیکسی ملی تو میں اس میں بیٹھ کر دوبارہ ریڈ سیکٹر پہنچ گیا۔ ہاٹ اسپاٹ کلب کے سامنے میں ایک متروک عمارت کے ستون کے پیچھے چھپ گیا۔ یہاں سے ہاٹ اسپاٹ کا دروازہ نظر آتا تھا۔ میں یہیں بیٹھ کر ہوپ لٹل کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔

گولی کے زخم سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ میں نے اپنی ایک جراب اتار کر اس کا گولا سا بنایا اور زخم پر مضبوطی سے جما دیا۔ گولی زخم کے اندر ہی تھی لیکن غالباً زیادہ گہرائی تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ بارش پھر تیز ہو گئی تھی اور ساتھ میں بجلی بھی کڑک رہی تھی۔ میں نے ہوپ لٹل کو باہر نکلتے دیکھا۔ کچھ لمحے صبر کیا۔ جب وہ میرے نزدیک سے گزری تو میں نے اس کا بازو پکڑ کر اسے ستون کے پیچھے کھینچ لیا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی لیکن پھر وہ مجھے پہچان کر قدرے پُرسکون ہو گئی۔ میں نے بلا کسی تمہید کے کہا۔

''سنو لڑکی! میں تم سے صاف اور سچے جواب کی توقع کرتا ہوں۔ ہمارے پاس وقت بالکل نہیں ہے۔ تم نے ماچس پر پیغام لکھ کر کافی ہوشیاری کا ثبوت دیا تھا لیکن دشمن ہم سے زیادہ چالاک ثابت ہوا۔ تمہارا طریقہ ناکام ہو گیا۔ ہمارا پیچھا کیا گیا اور... اور ریسین مر چکی ہے۔''

''کک... کیا؟'' ہوپ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ہذیانی کیفیت میں وہ چند قدم پیچھے ہٹی۔ اس کو سنبھالنے کی کوشش میں، میں بھی اس کے پاس سڑک کے درمیان پہنچ گیا۔ میں نے اسے پھر سے جھنجوڑا۔

''سنو، یہ چابی اس کے پاس تھی۔ یہ کس تالے کی ہے؟'' اس وقت گلی میں اندھیرا تھا۔ ہوپ مجھے ایک سا[...] کی طرح نظر آ رہی تھی۔ اتنے میں نزدیکی گلی سے ایک کا[ر] نے ہماری طرف موڑ کاٹا۔ اس کی ہیڈ لائٹس سے گلی جگ[مگا] اٹھی۔ ہوپ کے چہرے پر دہشت تھی اور آنکھوں میں آنسو[...]

''چابی؟'' ہوپ جیسے خواب سے بیدار ہوئی۔ ''ہا[ں] وہ چابی ایک سیفٹی ڈپازٹ باکس کی ہے۔ یہ باکس بلیو[...] میں واقع فرسٹ سٹی بینک میں ہے۔ وہ اس چابی کو ہمیشہ ا[پنے] گلے میں پہنے رہتی تھی۔'' یہ کہہ کر ہوپ اونچی آواز میں رو[نے] لگی۔ میں نے اسے پکارا۔

''ہوپ... ہوپ! بتاؤ، اس باکس میں کیا ہے؟''

وہ کچھ سنبھل گئی۔ ''بے چاری شاید یہ سمجھ رہی تھی کہ [...] میرے ساتھ محفوظ ہے۔'' وہ بولی۔ ''اس باکس میں انفار[میشن] ہے۔ راز ہیں... کسی ایسے شخص کے جو اسے مونا کے اڈے [پر] ملا تھا۔ یہ چکر بلیک میلنگ کا تھا۔ وہ اپنی جان بچانے کے [لیے] فرار ہوئی تھی۔ مجھے علم نہیں۔ اس نے مجھے اصل بات نہ[یں] بتائی... نہ اس نے یہ بتایا کہ وہ شخص کون تھا۔ وہ بہت خوف زدہ تھی۔ اتنی خوف زدہ تھی کہ...''

ہوپ کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔ موڑ مڑ کر آنے والی کار کافی نزدیک آ گئی تھی۔ یہ خاصی بڑی کار تھی، اس کے انج[ن] کے شور میں ہوپ کی آواز دب گئی تھی۔ اچانک مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ یہ کار سیدھی گزرنے کے بجائے مڑ کر پوری رفتار سے ہماری طرف آ رہی تھی۔ اس کی تیز روشنیوں کی وجہ سے اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ جبلی طور پر میں دو قدم پیچھے ہٹ[ا] اس کے باوجود طوفان خیز رفتار سے آنے والی کار کے اگلے حصے کا کونا میرے جسم سے مس ہو گیا۔ میں اڑ کر کئی فٹ پیچھے کیچڑ میں جا گرا۔ گرتے گرتے مجھے کار کا پچھلا حصہ نظر آیا۔ [...] بھاری بھرکم کیڈی لاک بھی 'بلز' کی تھی۔ میں فٹ پاتھ کا سہارا لے کر کھڑا ہوا۔ ''ہوپ! تم ٹھیک تو ہو؟'' کوئی جواب نہ [...] میں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ اتنے میں بجلی چمکی اور مجھے چند فٹ کے فاصلے پر ہوپ سڑک پر آڑی ترچھی پڑی نظر آئی۔ میں بھاگ کر اس کے نزدیک پہنچا۔ اس کی آنکھیں آسمان کی طرف دیکھ رہی تھیں اور ان میں زندگی کی کوئی رمق نہیں تھی۔

میں کچھ دیر خاموش کھڑا ہوپ کی لاش کو تکتا رہا۔ [...] لمحے پہلے زندگی سے بھرپور اور لاتعداد دلوں کی دھڑکن ہوپ ایک مٹی کے ڈھیر کی صورت میں میرے سامنے پڑی تھی۔ [...] شخص بھی اس سارے چکر کے پیچھے تھا، بہت بڑا تھا اور بہت ہی غلیظ۔ بڑا اس طرح کہ اس شہر کے سارے بلز کو ا[پنی] انگلیوں پر نچا رہا تھا، غلیظ اس طرح کے چند رازوں کے لیے میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے دو بے گناہ و معصوم لڑکیوں کو بے دردی سے ہلاک کر دیا۔ بڑا اور غلیظ... بالکل اس شہر، اس گوتھم سٹی کی طرح!

صبح ہوتے ہی میں بینک پہنچ گیا۔ بینک کے دروازے پر بھی 'میئر کارٹرز' کو مبارک باد دینے والا پوسٹر لگا تھا۔ مجھے ان پوسٹروں سے چڑ بلکہ نفرت ہو گئی تھی۔

بینک کھلا تو میں فوراً اندر داخل ہو کر سیفٹی ڈپازٹ باکس کے شعبے میں پہنچ گیا۔ ان سیفٹی ڈپازٹ باکسز میں اور عام لاکروں میں یہ فرق ہے کہ انہیں کوئی بھی مرد یا عورت آپریٹ کر سکتا ہے بشرطیکہ اس کے پاس چابی ہو۔ آخر کار میں نے ریسین کے سیفٹی ڈپازٹ باکس کو کھولا۔ سرخ رنگ کی ایک فائل، چند کارڈز اور کارٹنوں کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ میں نے بے صبری سے اس فائل کو کھولا۔ سب سے اوپر اخبار کا ایک تراشہ تھا۔ سرخی تھی: ''شہر کا میئر قتل۔ کارٹرز شہر کا نیا میئر منتخب!'' اس اخبار کے تراشے کے نیچے پولیس رپورٹوں، تصویروں اور اخبار کے تراشوں کا ایک ذخیرہ تھا۔ یہ سب کاغذات اور تصویریں ایک بات کو بغیر کسی شک و شبے کے ثابت کرتے تھے کہ ہمارے اس شہر کے ''میئر'' کارٹرز صاحب اس کرسی پر پرانے میئر کو قتل کر کے پہنچے تھے۔ نہ جانے کیسے اس لڑکی نے یہ ساری فائل، سارا پلندا تیار کر لیا تھا۔ بہرحال، اس سوال کا جواب تو مجھے مل گیا تھا کہ ریسین کی جان کیوں خطرے میں تھی۔ بہرحال، اب میرے علم میں آ جانے.... سے ریسین کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔

میں نے پوری فائل بغل میں دبائی اور بینک سے باہر نکل آیا۔ کچھ دیر بعد میں مونا کے خوب صورت پینٹ ہاؤس میں اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ میں کچھ دیر خاموش بیٹھا الفاظ مجتمع کرتا رہا پھر بولا۔ ''مونا! اس شہر کا پچھلا میئر قتل ہوا تھا۔ قتل کرنے والے یہاں کے ''بلز'' تھے اور قتل کروانے والا یہاں کا موجودہ میئر کارٹرز تھا۔ یہ تمام کاغذات یہ ثابت کرتے ہیں۔ ریسین نے یہ سب تمہارے پاس ملازمت کرتے ہوئے معلوم کیا ہو گا۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو موجودہ میئر کارٹرز تمہارا گاہک رہا ہو گا اور ریسین اس کی پسندیدہ رہی ہو گی۔ شراب اور شباب کے نشے میں کارٹرز نے اپنے کارنامے اس کے سامنے اگل دیے ہوں گے اور ایک دفعہ جب ریسین کو حقیقت کا علم ہوا ہو گا تو اس کے بعد اس نے اپنے دوسرے بڑے اور متعلقہ گاہکوں سے اسی ماحول میں یعنی شراب و شباب کا جادو جگا کر ثبوت حاصل کر لیے ہوں گے۔'' میں سانس لینے کو رکا۔ ''اور یقیناً ریسین نے ذاتی طور پر کافی کوشش کی ہو گی۔ بہرحال، اس نے ثبوت حاصل کر لیے جو بالآخر اس کی موت پر منتج ہوئے۔ تم کیا کہتی ہو مونا؟''

مونا خاموش کھڑی مجھے دیکھتی رہی۔ پھر بالکل غیر متوقع اور بے محل طور پر اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ آ گئی۔ سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے اس نے مجھے جواب دیا۔ ''مجھے نہیں معلوم کہ مجھے کیا کہنا چاہیے؟''

''مجھے معلوم ہے۔'' دروازے کی طرف سے ایک بھاری مردانہ آواز آئی۔ میں نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ نہایت نفیس اور قیمتی سفید سوٹ میں ملبوس ایک جواں سال شخص اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ہوانا کا سگار اور دوسرے ہاتھ میں وہسکی کا بھرا ہوا جام تھا۔ اس کے دائیں بائیں ذرا پیچھے ایک جیسی سیاہ وردی میں ملبوس دو افراد خاموش لیکن الرٹ کھڑے ہوئے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں گول میگزین والی ٹامی گنز تھیں جن کی مہیب نالیں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔ دونوں وردی پوشوں کی انگلیاں ٹریگرز پر تھیں۔ سفید سوٹ والا ذرا اور آگے آیا اور مصنوعی ادب سے مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''مسٹر ونسنٹ! مجھے اجازت دیجیے کہ میں اپنا تعارف کرواؤں۔ میں گوتھم سٹی کا میئر کیلون کارٹرز ہوں۔'' وہ ذرا رکا پھر اس نے مسکرا کر دھیرے سے اپنے دائیں بائیں منکر نکیر کی طرح کھڑے ہوئے سیاہ پوشوں کی طرف باری باری دیکھا اور گویا ہوا۔ ''ان دونوں صاحبان کے نام غیر ضروری ہیں لیکن ان کی یہاں موجودگی کا مقصد میرا خیال ہے کہ آپ پر کافی واضح ہے۔''

''اصولی طور پر مجھے تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہیے ونسنٹ! تم نے بہت مدد کی میری اور میری بہن مونا فنالی کی۔ دراصل اس شان دار مرکزِ میزبانی کا مالک میں ہوں۔ میری پیاری بہن مونا تو صرف یہاں کی منتظم ہے۔ میں ایک بار پھر آپ کا شکریہ ادا کروں گا کہ آپ نے ہماری بھگوڑی کو تلاش کر لیا۔'' اس کے بعد کارٹرز نے چہرے پر ایک مضحکہ خیز اور مصنوعی غم کا تاثر لاتے ہوئے کہا۔ ''چچ... چچ... بے چاری ریسین... اچھی کھلاڑی ثابت نہیں ہوئی بلکہ وہ تو ایک اچھی بلیک میلر بھی نہیں تھی۔'' اس کے بعد کارٹرز نے مڑ کر مونا کی طرف دیکھا اور اسے اپنی آغوش میں لے کر اس کی گردن اور برہنہ شانوں کے لاتعداد بوسے لے لیے۔ اس کے بعد پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''ونسنٹ ڈریسلر! عام لوگوں کو سیاست اور سیاست دانوں کے معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیے۔''

اس کے بعد بھی کارٹرز بہت کچھ بولتا رہا مگر اب میں اس کی کوئی بات نہیں سن رہا تھا۔ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا، وہ حقیقت جاننے کے لیے کافی سے زیادہ تھا۔ میں بہت زیادہ سمجھ دار آدمی تو نہیں تھا لیکن اس طرح بے وقوف بننے اور اس طرح استعمال ہونے کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ مجھے ایک باجے کی طرح بجایا گیا اور اس سے بھی زیادہ احساس مجھے اس چیز کا ہوا کہ میں حقیقت کو نہ جانتے ہوئے باجے کی طرح بالکل ان کی مرضی کے مطابق بجتا رہا ہوں۔ میں نے ریسین کو تمام ثبوتوں سمیت پلیٹ میں رکھ کر شیطانوں کے اس ٹولے کے حوالے کر دیا تھا۔ مجھے علم تھا کہ وہ اب مجھے بھی قتل کر دیں گے۔ کارٹرز کے ان دو باڈی گارڈز نما قاتلوں کا یہاں آنے کا مقصد بھی یہی تھا۔ اس کے بعد یہ شہر پہلے سے بھی زیادہ غلیظ ہو جائے گا۔ اندر سے بھی اور باہر سے بھی۔ یہ شہر اور اس کے لوگ ایسے شخص کے رحم و کرم پر ہیں جو انسان سے زیادہ شیطان ہے۔ جس کے نزدیک انسانی جان کی کوئی اہمیت نہیں۔ جس کے نزدیک بہن بھائی جیسے مقدس رشتے کا بھی کوئی احترام نہیں۔ میری توجہ دوبارہ کارٹرز اور مونا فنالی کی طرف ہوئی۔ دونوں ایک دوسرے میں گم تھے اور ساتھ ہی بلند آواز میں قہقہے لگا رہے تھے۔ کارٹرز کے ساتھ آئے دونوں گن مین بھی مسکرا کر اس نظارے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ان سب کی توجہ مجھ سے ہٹی ہوئی تھی۔ یوں بھی مجھ جیسے احمق کی ان کے سامنے اوقات ہی کیا تھی کہ وہ مجھ سے خوف کھاتے یا میری طرف سے احتیاط برتتے۔

مجھے احساس ہی نہیں ہوا اور میرا دایاں ہاتھ آہستگی سے میرے بغلی ہولسٹر میں رکھے ہوئے اسمتھ اینڈ وسن پر پہنچ گیا۔ پستول کے دستے پر میری گرفت مضبوط ہوتی چلی گئی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے احساس ہوا کہ میرا یہ بے جان دوست ان سامنے کھڑے ہوئے انسانوں سے بہت بہتر ہے۔ جس کہانی کا ہیرو مجھ جیسا ہو، اس کہانی کا انجام اچھا نہیں ہو سکتا۔ اس کہانی کا انجام ایسے پر ہوتا ہے۔ جیسا کہ ابھی ہونے والا تھا۔

میرا ہاتھ پستول سمیت ہولسٹر سے باہر نکلا۔ پھر اس پینٹ ہاؤس کی بند دیواروں میں دو کان پھاڑ دینے والے دھماکے گونجے۔ میرے بے جان لیکن وفادار دوست نے موت بانٹنے والی دو گولیاں اگلیں۔ پہلی گولی مونا فنالی کی پیشانی پر لگی اور اس کا بھیجا اس کے سر کے پیچھے سے نکل کر دیوار پر لگی ہوئی ایک بیش قیمت پینٹنگ پر پھیل گیا۔ دوسری گولی مسٹر کارٹرز کے قہقہہ لگاتے ہوئے کھلے منہ میں داخل ہوئی اور اس کی گدی سے باہر نکل کر پیچھے کھڑکی کا شیشہ توڑتی ہوئی باہر کہیں گم ہو گئی۔ دونوں گولیاں ایک سیکنڈ سے بھی کم وقفے سے چلی تھیں اور اتنی مؤثر ثابت ہوئیں کہ مونا اور کارٹرز دونوں کو آواز نکالنے اور دوسرا سانس لینے کی بھی مہلت نہیں ملی۔ ان دونوں کے خون میں لت پت جسم ایک دوسرے پر آڑے ترچھے پڑے تھے اور ان کی کھلی ہوئی بے نور آنکھوں میں حیرت منجمد تھی۔

اتنے میں مونا فنالی کے کمسن بیٹے کی ہذیانی آواز گونجی۔ ”ممی... ڈیڈی!“ اور ساتھ ہی وہ ان دونوں کی لاشوں کی طرف لپکا۔ یعنی یہ حرام کا پلا بہن بھائی کے اختلاط سے وجود میں آیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک غراتی ہوئی آواز آئی۔ ”تُو نہیں بچے گا۔ اب تیری باری ہے۔“ کارٹرز کے دونوں باڈی گارڈوں نے مشینی انداز میں اپنی ٹامی گنز کا رخ میری طرف کیا۔ وہ حکم کے غلام تھے۔ ان کے ذہن شاید ابھی اس حقیقت کو تسلیم نہیں کر پائے تھے کہ ان کا حاکم اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ ایک مرتبہ پھر پینٹ ہاؤس گولیوں کے دھماکوں سے گونجا لیکن اس مرتبہ یہ دھماکے ایک تڑتڑاہٹ کی شکل میں تھے اور یہ وہ آخری آواز تھی جو میں نے روئے زمین پر سنی۔ میرے جسم کو لاتعداد جھٹکے لگے اور میں اڑ کر پیچھے کھڑکی پر جا پڑا۔ کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا اور میں اس سے باہر بلندی سے نیچے گرتا چلا گیا۔ حیرت کی بات ہے کہ جب میرے جسم نے زمین کو چھوا تو میں ہوش میں تھا اور اب میں زمین پر خون میں لت پت دیوار کے سہارے نیم دراز ہوں۔ سانس لینے سے تکلیف ہوتی ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ تکلیف زیادہ دیر کی نہیں۔

میں نے آخری مرتبہ اوپر کی طرف دیکھا اور پھر میں بل بورڈ کی طرف دیکھتا ہوں جس پر لفظ ”فرار“ جگمگا رہا ہے۔ آج یہ مجھے بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔ ایسی خوب صورت چیز میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ اس کے رنگ میری آنکھوں کو ٹھنڈک بخش رہے ہیں اور میں جانا چاہ رہا ہوں۔ میں اس شہر کو چھوڑنا چاہتا ہوں۔ میں اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ لیکن وہ خوش نما رنگ مجھے پھر بھی نظر آ رہے ہیں اور بالآخر میں جان جاتا ہوں کہ اس شہر سے فرار ہونے کا کیا طریقہ ہے۔ ہاں، اس شہر سے فرار کا، اس شہر کو چھوڑنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ وہ طریقہ ہے، ہمیشہ کے لیے اندھیرے میں مدغم ہو جاؤ۔

یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے
سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم

⌘

اردگرد کے ماحول کو پراسرار بنا دینے والی غیر متوقع انجام کی کہانی

کبھی کبھی اچانک وہ کچھ رونما ہو جاتا ہے ... جس کا کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوتا ... ایسے ہی ان گنت واقعات میں سے ایک تحیر انگیز واقعہ ... جس نے وہاں کے مکینوں کی زندگی سے اطمینان کا خاتمہ کر دیا تھا ... خوف و ہراس اور دہشت سے ان کی نیندیں اڑ چکی تھیں

خون آشام

ثمرعباس

وہ میز پر اس طرح بندھا ہوا تھا کہ اس کے چاروں ہاتھ پیر الگ الگ سمتوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس پر بھی کمرے میں موجود سب ہی افراد اس سے سہمے ہوئے لگ رہے تھے۔ رومانیہ کا یہ چھوٹا سا گاؤں ملک کے باقی حصوں سے الگ تھلگ اور نہایت دشوار گزار علاقے میں تھا۔ گھنے جنگلات سے گھرے اس گاؤں سے نزدیک ترین گاؤں بھی ایک دن کی مسافت پر تھا۔ گاؤں میں مشکل سے دو سو گھر تھے اور آبادی ہزار نفوس بھی نہیں تھی۔

سترھویں صدی میں رومانیہ ایک اجاڑ اور پسماندہ ملک تھا۔ اس وقت سلطنتِ عثمانیہ اپنے عروج پر تھی اور ملک کے بہت سارے حصوں پر اس کا قبضہ تھا۔ باقی رومانیہ ریاستوں میں بٹا ہوا تھا لیکن بوزگر نامی اس گاؤں پر ملک کے سیاسی حالات کا خاص اثر نہیں ہوا تھا۔ ایک تو یہ گاؤں ویسے ہی ملک سے کٹا ہوا تھا اور دوسرے اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس لیے کسی طاقت کو اس پر قبضے میں دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے باوجود یہاں کے باشندے برائے نام ہی کاؤنٹ ایڈن روز کے وفادار تھے۔ کاؤنٹ کے کارندے سال میں ایک بار یہاں کا چکر لگا کر محاصل وصول کر لیا کرتے تھے۔ اس سے زیادہ وہ اس گاؤں سے کوئی غرض نہیں رکھتے تھے۔ ویسے گاؤں والوں کو کوئی مسئلہ بھی نہیں تھا بلکہ وہ اپنی

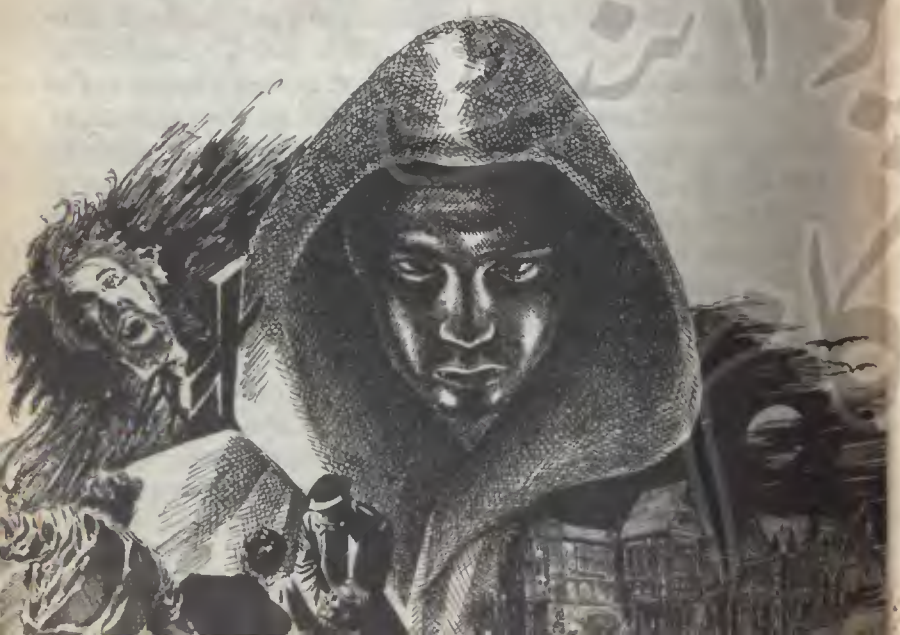

اس تنہائی سے خوش تھے... کیونکہ ملک کے باقی حصوں کے بارے میں جو اڑتی اڑتی خبریں ان تک آتی تھیں، انہیں سن کر لگتا تھا کہ ملک میں استحکام نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ ہر گاؤں اور ہر شہر جنگ کے ہاتھوں تباہ تھا۔ ابھی کسی گاؤں یا شہر کے لوگ ایک فاتح سے فارغ بھی نہیں ہوتے تھے کہ کوئی دوسرا ان کو فتح کرنے آجاتا تھا۔ اس لحاظ سے بوزگر کے باشندے خوش قسمت تھے کہ انہیں کسی نے فتح کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور سترھویں صدی کے آخری عشرے تک وہ بہت سکون سے رہتے آئے تھے۔

لیکن انہی دنوں ان پر ایک آفت ٹوٹ پڑی جس کے بارے میں انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اس کا آغاز ایک کسان نیفٹی راس سے ہوا۔ وہ کسی کام سے اپنے گھر سے گاؤں جانے کے لیے نکلا تھا اور رات گئے تک واپس نہیں آیا تھا۔ اگلے دن اس کے گھر والے گاؤں آئے تو یہ انکشاف ہوا کہ راس تو گاؤں آیا ہی نہیں تھا اور نہ ہی کسی نے اسے دیکھا تھا۔ راس کا گھر گاؤں سے کوئی نصف میل کے فاصلے پر تھا... کیونکہ وہ اپنی زمین پر رہنا پسند کرتا تھا اس لیے اس نے وہیں گھر بنا لیا تھا۔ راس کی گمشدگی کا پتا چلتے ہی شدید سردی کے باوجود گاؤں والوں نے اس کی تلاش شروع کردی تھی۔

یہاں سردی کا موسم طویل اور سخت ہوتا تھا۔ اکتوبر کے وسط سے لے کر اپریل کے آخر تک پورا گاؤں برف سے ڈھکا رہتا تھا اور کوئی بہت ہی خوش قسمت دن ہوتا تھا جب سورج نکلتا تھا ورنہ ہمہ وقت بادل چھائے رہتے تھے۔ موسم سرما، گاؤں کے باشندے گھروں میں دبک کر گزارتے تھے اور صرف اشد ضرورت کے تحت باہر نکلتے تھے۔ سرما کے آغاز سے پہلے وہ راشن اور گھریلو استعمال کے لیے جلانے کی لکڑی جمع کر کے گھروں کی مرمت کر لیتے تھے تاکہ وہ آنے والے برفانی طوفانوں کو سہار سکیں کیونکہ برف باری کے وقت کسی قسم کا کام کرنا ممکن نہیں تھا۔

اب کسی کو نہیں معلوم کہ راس گھر سے کیوں نکلا تھا۔ اس نے گھر والوں سے یہی کہا تھا کہ وہ ایک ضروری کام سے گاؤں جا رہا ہے۔ اس کے بعد وہ یوں غائب ہو گیا جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ وہ پیدل ہی روانہ ہوا تھا اور اس وقت ہلکی برف باری جاری تھی اس لیے اس کے پیروں کے نشانات بھی نہیں ملے تھے۔ گاؤں والوں نے سارا جنگل چھان مارا تھا لیکن انہیں راس کا نام و نشان نہیں ملا تھا۔

ایسا لگ رہا تھا کہ راس وہاں سے کہیں اور چلا گیا تھا لیکن یہ ممکن نہیں تھا کیونکہ وہ خالی ہاتھ گھر سے نکلا تھا اور اس کے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ وہ اپنا گھوڑا بھی نہیں لے گیا تھا۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ اسے کوئی بھیڑیا مار کر کھا گیا ہو گا۔ اول تو سردیوں میں اس علاقے میں بھیڑیے نہیں ملتے تھے۔ وہ جنوب میں چلے جاتے تھے۔ دوسرے بھیڑیے اسے سموچا نہیں نگل سکتے تھے، اس کا کوئی نہ کوئی نشان باقی رہ جاتا۔ جبکہ اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم ہوا تھا۔ دو دن کی تلاش کے بعد گاؤں والوں اور راس کے گھر والوں نے ہار مان لی۔ اس سردی میں کوئی دو دن سے زیادہ گھر سے باہر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ بلکہ ایک ہی دن زندہ رہنا مشکل تھا۔

کوئی دو ہفتے بعد کی بات ہے۔ گاؤں کے لوہار آئیوان کے گھر رات گئے کسی نے دستک دی۔ آئیوان کا گھر گاؤں کے بالکل سرے پر تھا۔ اس نے دروازہ کھولے بغیر پوچھا۔

''کون ہے؟''

''آئیوان! دروازہ کھولو... یہ میں ہوں۔'' باہر سے کسی نے کہا۔

آئیوان اور اس کی بیوی دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا کیونکہ وہ آواز راس کی تھی۔ گھر میں وہ دونوں اور ان کا دو سالہ بیٹا تھا۔ وہ سو رہا تھا۔ آئیوان کی بیوی نے آہستہ سے کہا۔ ''پہلے اچھی طرح اطمینان کر لو... راس تو غائب ہو گیا تھا۔''

آئیوان نے کھڑکی کھول کر باہر دیکھا تو اسے تاریکی میں ایک ہیولا سا نظر آیا۔ اس کے خدوخال واضح نہیں تھے۔ آئیوان نے موم بتی سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ''سامنے آؤ... میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔''

وہ سامنے آیا تو آئیوان حیران رہ گیا، وہ واقعی راس تھا۔ اس نے مضطرب انداز میں موم بتی بیوی کو پکڑا دی۔ ''یہ تو واقعی راس ہے۔ میں باہر جا رہا ہوں۔ تم دروازہ اندر سے بند کر لینا اور جب تک میں آواز نہ دوں، دروازہ مت کھولنا۔''

''اگر کوئی خطرہ ہے تو تم باہر مت جاؤ۔'' آئیوان کی بیوی پریشان ہو گئی تھی۔

''تم فکر مت کرو۔'' آئیوان نے اپنا لمبا سا خنجر ساتھ لے لیا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا تو بیوی نے اس کی ہدایت کے مطابق دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اس نے آئیوان کو کہتے سنا تھا۔ ''راس! تم کہاں چلے گئے تھے؟ تمہارے گھر والے...'' اس سے آگے وہ کچھ نہیں سن سکی۔ اسے لگا کہ آئیوان بولتے بولتے اچانک چپ ہو گیا تھا۔ اس نے کچھ دیر بعد اسے پکارا مگر آئیوان کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا اور اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اتنی تاریکی میں باہر نکلتی۔ اس لیے بیٹے کو سینے سے لگائے بیٹھی رہی۔ جب صبح نمودار ہوئی اور روشنی ہوئی تو ہمت کر کے وہ گھر سے باہر نکلی اور روتی ہوئی سب سے نزدیکی ہمسائے کے گھر کی طرف بھاگی۔ اس نے زور سے دروازہ بجایا اور ہمسائے کے باہر آنے پر اس نے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں اسے رات کا قصہ سنایا۔ ہمسایہ تو یہ سن کر ہی حیران رہ گیا تھا کہ رات کو راس ان کے گھر آیا تھا اور وہ آئیوان کو ساتھ لے گیا۔ اس کے بعد سے آئیوان واپس نہیں آیا تھا۔ ایک گھنٹے بعد آئیوان کی بیوی گاؤں کے چرچ میں جمع معززین کے سامنے ساری بات دہرا رہی تھی۔ سب ہی بے یقینی سے اس کی بات سن رہے تھے۔

''تمہیں یقین ہے کہ وہ راس ہی تھا؟'' گاؤں کے سربراہ بورس نے پوچھا۔

''مجھے آئیوان نے بتایا تھا کہ باہر راس ہے۔ میں نے اس کی آواز سنی تھی۔'' آئیوان کی بیوی نے جواب دیا۔

''کیا تمہیں وہ آواز راس کی لگی تھی؟''

''ہاں، وہ راس کی آواز ہی لگ رہی تھی اور پھر آئیوان نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ راس ہی ہے۔''

''آئیوان کو کیسے پتا چلا کہ وہ راس ہے؟''

''اس نے موم بتی کی روشنی میں کھڑکی سے دیکھا تھا۔''

''تم نے اسے نہیں دیکھا تھا؟''

''نہیں، کھڑکی چھوٹی ہے اور اس سے صرف ایک ہی آدمی جھانک سکتا ہے۔''

''تم نے آئیوان کے جانے کے بعد باہر نہیں دیکھا؟''

''مجھے ڈر لگ رہا تھا اور پھر آئیوان نے مجھے منع کیا تھا کہ میں نہ تو باہر نکلوں اور نہ ہی باہر جھانکوں... جب تک مجھے اس کی آواز نہ سنائی دے۔''

''پھر تمہیں اس کی آواز نہیں سنائی دی؟''

''نہیں... نہیں۔'' آئیوان کی بیوی یک دم رونے لگی۔ ''خدا کے لیے میرے شوہر کو تلاش کرو۔ نہ جانے وہ کہاں ہے۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے... ہم اسے تلاش کرتے ہیں، تم پریشان مت ہو۔'' وہاں موجود مردوں سے جوان اور دلکش عورت کے آنسو برداشت نہیں ہو رہے تھے۔ انہوں نے اسی وقت پارٹیاں تشکیل دیں اور وہ آئیوان کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ یہ دوسری پُراسرار گمشدگی تھی اس لیے گاؤں والے زیادہ تن دہی سے تلاش کا کام کر رہے تھے اور انہیں تشویش بھی پہلے کے مقابلے میں زیادہ تھی۔ انہوں نے چاروں سمت میں پارٹیاں روانہ کیں اور جو پارٹی شمال کی طرف گئی تھی، اسے آئیوان کی سربریدہ لاش جنگل میں ایک درخت سے اٹکی مل گئی تھی۔ اس کا سر بھی کچھ فاصلے پر مل گیا تھا۔ لاش دیکھ کر پہلے تو وہ بدحواس ہو گئے تھے۔ کسی نے آئیوان کے چھرے سے اس کا سر کاٹ دیا تھا۔ اس کے بعد وہ عجلت میں لاش کے دونوں حصے لے کر گاؤں واپس آگئے۔ لاش انہوں نے چرچ میں لے جا کر رکھی تھی۔ آئیوان کی بیوی بھی وہیں تھی۔ اس نے جب اپنے شوہر کی سربریدہ لاش دیکھی تو وہ غش کھا کر گر پڑی۔

گاؤں والے بھی دہشت زدہ تھے۔ سب کے ذہن میں ایک ہی خیال تھا کہ ان کے گاؤں میں کوئی قاتل آگیا ہے۔ اس نے پہلے راس کو غائب کیا تھا اور پھر آئیوان کو قتل کر دیا۔ امکان یہ تھا کہ اس نے راس کو بھی مار دیا تھا اور اس کی لاش کہیں چھپا دی تھی مگر آئیوان کی بیوی کا اصرار تھا کہ آئیوان کو لے جانے والا راس ہی تھا۔

''میرے شوہر کی نگاہیں بہت تیز تھیں اور وہ راس کا دوست بھی تھا اس لیے وہ اسے پہچاننے میں غلطی نہیں کر سکتا۔''

مگر سوال یہ تھا کہ اگر آئیوان کو لے جانے والا راس ہی تھا تو اس نے اپنے گہرے دوست کو قتل کیوں کیا؟ اور وہ بھی اتنی بے دردی سے... جونکہ آئیوان کی لاش مل گئی تھی اس

''یتیم''

یتیم لڑکے کے دودھ جیسے اجلے کپڑوں کی طرف دھیان سے دیکھتے ہوئے جگو نے پوچھا۔

''تو اسکول جاتا ہے؟''

''ہاں! یتیم خانے کے سارے بچے جاتے ہیں۔''

''بڑا قسمت والا ہے تو!'' جگو نے اسے حسرت سے دیکھا۔

''یتیم کے ساتھ مذاق نہیں کرتے۔'' لڑکا دکھ سے بولا۔

''تو قسمت والا ہے پیارے! میرے پاس نہ تیرے جیسے کپڑے ہیں نہ میں اسکول جا سکتا ہوں۔'' جگو کی آنکھیں بھر آئیں۔

''تو اسکول نہیں جاتا؟ پھر سارا دن کیا کرتا ہے؟'' یتیم لڑکے نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہوٹل میں برتن مانجھتا ہوں۔''

''تو... تو یتیم خانے میں کیوں نہیں آجاتا؟''

''جی تو بہت چاہتا ہے لیکن وہ لوگ مجھے رکھتے نہیں۔''

''کیوں...؟'' یتیم حیران تھا۔

''میرے ماں، باپ جو زندہ ہیں۔''

(ہندی پنجابی ادب۔ شیام سندر اگروال)

(انتخاب: محمد الیاس چوہان، کراچی)

لیے اس کی تدفین کی تیاری کی جانے لگی۔ گاؤں میں لاشیں تدفین کے لیے تیار کرنے کا کام ایورڈی کے سپرد تھا۔ اس نے جب آئیوان کی لاش دیکھی تو اسے کچھ عجیب سا لگا۔ پھر اس نے گاؤں کے سربراہ بورس اور چرچ کے پادری جان پال کو بلایا اور انہیں لاش دکھائی۔ ایورڈی نے ان سے کہا۔

"جناب! اس لاش میں ایک عجیب بات ہے۔ اس کا خون غائب ہے۔"

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟" جان پال چونکا۔

"آپ خود دیکھ لیں جناب۔" ایورڈی نے ان سے کہا۔ "جب لاش ملی تھی، تب بھی یہ اسی طرح صاف ستھری تھی۔ ورنہ آپ بھی جانتے ہیں کہ کسی کا سر کاٹا جائے تو کتنا خون نکلتا ہے۔"

"لاش اور اس کا لباس بالکل صاف ستھرا تھا۔" بورس نے یاد کر کے کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ اس کا سارا خون مرنے سے پہلے نکال لیا گیا تھا۔"

"ممکن ہے اس کے مرنے کے بعد سر کاٹا گیا ہو۔" جان پال نے خیال پیش کیا۔ "اس صورت میں بھی خون نہیں نکلتا ہے۔"

"ایسا ہی ہوا ہے جناب! لیکن لاش میں خون اب بھی نہیں ہے۔ میں نے گردن کی کٹی رگوں کا معائنہ کیا ہے۔ وہ خون سے بالکل خالی ہیں۔"

بورس اور جان پال نے دیکھا۔ واقعی آئیوان کی گردن کی کٹی رگیں خون سے بالکل عاری اور صاف تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے جسم سے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لیا گیا تھا۔ اس وقت ان تینوں کے ذہن میں ایک ہی خیال آیا تھا کہ کیا ان کے گاؤں میں کوئی خون آشام آ گیا تھا؟ رومانیہ کی تاریخ خون آشاموں کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ لفظ ڈریکولا اصل میں رومانوی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی شیطان کا بیٹا ہیں۔ یہ خطاب پندرھویں صدی کے ایک بہت ظالم اور سفاک نواب کو دیا گیا تھا۔ اس کے بارے میں مشہور ہو گیا تھا کہ وہ لوگوں کو مار کر ان کا خون پی جاتا تھا۔ خدا جانے اس داستان میں کتنی حقیقت ہے لیکن یہ سچ ہے کہ مشتعل لوگوں نے کاؤنٹ ڈیکولا کو زندہ جلا دیا تھا۔ اس کا اصل نام یہی تھا لیکن جب اس داستان کا انگریزی میں ترجمہ ہوا تو لفظ ڈیکولا... ڈریکولا میں بدل گیا اور آج لفظ ڈریکولا ہی استعمال کیا جاتا ہے۔

"کیا ہمارے گاؤں میں کوئی ڈریکولا آ گیا ہے؟" جان پال نے کہا تو بورس کو اپنے جسم میں جھرجھری سی محسوس ہو...

"خدا کے لیے ایسی باتیں مت کرو ورنہ لوگو... ہراس پھیل جائے گا۔" بورس گھبرا کر بولا۔ وہ خود بھی... لگ رہا تھا۔

انہوں نے طے کیا کہ یہ بات عام لوگوں سے پر... ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے لوگوں کو خبردار کر دیا... بھی رات کو گھر سے باہر نہ نکلے اور اگر کسی نے جنگل میں... ہو تو مسلح ہو کر اور کسی کو ساتھ لے کر جائے۔ اکیلے کوئی... جائے گا۔ فادر جان پال نے ایورڈی کے ساتھ مل کر... سے ایک کام کیا تھا۔ اس نے باریک لکڑی کی سلاخ آئی... کے مردہ جسم میں عین دل کے مقام پر اتار دی تھی اور... وقت ایورڈی نے یہ کام کیا، اس نے اور فادر جان نے... طور پر محسوس کیا کہ آئیوان کا مردہ جسم لرزا تھا۔ فادر جان... ایورڈی سے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ راس کسی خون آشام کا شکا... ہے اور وہ بھی خون آشام بن چکا ہے۔"

"اسے تلاش کر کے موت کے گھاٹ اتارنا ضرو... ہے ورنہ وہ اور لوگوں کو بھی نشانہ بنائے گا۔" ایورڈی نے کہ...

"مگر اسے کہاں تلاش کیا جائے؟" فادر جان... سوال کیا۔

راس کو کہاں تلاش کیا جائے، اس کا ان دونوں... اندازہ نہیں تھا۔ آئیوان کی تدفین کے بعد گاؤں کے سر... بورس نے سارے گاؤں والوں کو ایک بار پھر خبردار کیا تھا... ان میں سے کوئی سورج غروب ہونے کے بعد کسی صورت... باہر نہ نکلے۔ گاؤں والے ویسے ہی سہمے ہوئے تھے اور انہو... نے بورس کے اس حکم کو مان لیا تھا۔ آنے والے ایک مہینے تک... گاؤں کے لوگ سختی سے اس حکم پر عمل کرتے رہے۔ کوئی... سے باہر نہیں جاتا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا تھا کہ ایک آدمی کے گ... پر رات گئے کسی نے دستک دی تھی اور اس نے ڈر کے مار... نہ تو دروازہ کھولا اور نہ ہی پوچھا کہ باہر کون ہے۔ دستک... دینے والا کئی گھنٹے تک وقفے وقفے سے دستک دیتا رہا تھا۔

جب ایک مہینے تک مزید کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تو لوگ مطمئن ہو گئے۔ اس کے بعد وہ کچھ بے پروا ہو گئے۔... کے باوجود رات کو کوئی باہر نہیں جاتا تھا۔ لیکن ایک دن ایک... شخص پوشین کی بیوی کی طبیعت خراب ہو گئی اور مجبوراً اسے... گاؤں کے واحد طبیب کو بلانے کے لیے گھر سے باہر... پڑا۔ پوشین کے نوجوان بیٹے نے اس سے کہا کہ وہ بھی اس... کے ساتھ چلے گا مگر پوشین نے اسے منع کر دیا۔

"نہیں، تم گھر میں اپنی ماں کے پاس رہو اور جب تک میں نہ کہوں، دروازہ مت کھولنا۔"

پوشین تیار ہو کر نکلا۔ اس رات بھی شدید برف باری ہو رہی تھی۔ پوشین تاریکی میں غائب ہو گیا اور ایسا غائب ہوا کہ پھر اس کا بھی کوئی نشان نہیں ملا۔ صبح جب روشنی ہوئی تو اس کے بیٹے میوشین نے جا کر بورس کو اپنے باپ کی گمشدگی کی اطلاع دی۔ اس بات نے گاؤں میں سنسنی پھیلا دی۔ برف باری کے باوجود سارا گاؤں باہر نکل آیا تھا اور رات ہونے تک پوشین کی تلاش جاری رہی تھی مگر اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ شام کو چرچ میں بورس، فادر جان اور ایورڈی کی میٹنگ ہوئی۔ وہ بہت پریشان تھے۔ فادر جان نے کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ یہ بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔"

ایورڈی نے فادر کی تائید کی۔ "اور مجھے لگ رہا ہے کہ اب ہمیں زیادہ خون آشاموں کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

بورس چونکا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ پوشین بھی..."

"جی جناب... اگر وہ خون آشام کا شکار ہوا ہے اور اس کی لاش نہیں ملی ہے تو اس کا امکان ہے کہ وہ بھی خون آشام بن چکا ہے۔"

یہ ان سب کے لیے حد درجے پریشانی کی بات تھی کیونکہ وہ دنیا سے کٹے ہوئے ایک چھوٹے سے گاؤں میں محصور تھے اور یہاں کوئی مافوق الفطرت مخلوق انہیں اپنا نشانہ بنا رہی تھی تو وہ اس کے خلاف کہیں سے مدد بھی نہیں لے سکتے تھے۔ وہ سب عام سے لوگ تھے۔ ان کو لڑنا بھڑنا بھی نہیں آتا تھا اور گاؤں میں کوئی تربیت یافتہ سپاہی بھی نہیں تھا۔ وہ اس آفت کا کوئی حل سوچ رہے تھے۔

"ہمیں ریاست سے مدد طلب کرنی چاہیے۔" بورس نے تجویز دی۔

"ہم کیا کہیں گے اور کون ہماری بات پر یقین کرے گا؟" ایورڈی نے کہا۔

"اس مسئلے کا کوئی حل ریاست کے پاس ہوگا بھی نہیں۔" فادر جان نے ایورڈی کی تائید کی۔

"پھر اس کا کیا حل ہوسکتا ہے؟" بورس نے کہا۔ وہ ستر سال کا بوڑھا آدمی تھا جو تیس برس سے گاؤں کا سربراہ چلا آ رہا تھا۔ اس کے باوجود کوئی بھی معمولی سی بات اسے پریشان کر دیتی تھی۔ یہ تو خاصا خوف ناک مسئلہ تھا اس لیے اس کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ فادر جان نے کہا۔

"سب سے پہلے تو ہمیں لوگوں کو خبردار کر دینا چاہیے تاکہ اب کوئی بے خبری میں شکار نہ ہو۔"

کون کہتا ہے کہ؟

اولاد نہیں ہو سکتی

آج بھی لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ انشاء اللہ اولاد ہوگی۔ خاتون میں کوئی اندرونی پرابلم ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے۔ جو آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا ہے۔ آپکے گھر میں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہو سکتا ہے۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر تمام حالات سے آگاہ کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوائیں۔

المُسلم دارالحکمت رجسٹرڈ (دواخانہ)

ضلع وشہر حافظ آباد۔ پاکستان

0300-6526061

0547-521787

فون اوقات

صبح 9 بجے سے رات 11 بجے تک

آپ ہمیں صرف فون کریں

دوائی آپ تک ہم پہنچائیں گے

''اس سے خوف پھیلے گا۔'' بورس نے اعتراض کیا۔
''مزید لوگوں کے غائب ہونے سے بہتر ہے کہ وہ ڈر جائیں اور اپنی حفاظت کریں۔'' فادر نے کہا۔

کسی قدر بحث کے بعد وہ سب اس تجویز پر راضی ہو گئے۔ طے ہوا کہ اگلے روز سب کو چرچ میں جمع کیا جائے گا اور فادر جان انہیں خون آشام کے خطرے سے آگاہ کرے گا۔ اتوار کے علاوہ کسی دن، کسی وقت اگر چرچ کا گھنٹا بجایا جاتا تھا تو اس کا مطلب ہوتا تھا کہ سب گاؤں والے چرچ میں جمع ہو جائیں۔ کوئی اہم بات یا ہنگامی مسئلہ ہے۔ اس صبح بھی جب چرچ کا گھنٹا بجا تو سارے گاؤں والے چرچ کی طرف چل پڑے۔ جب سارے گاؤں والے آگئے تو فادر جان نے انہیں اپنے خدشات کے بارے میں بتایا۔

''امکان ہے کہ ہمارے گاؤں میں کوئی خون آشام آ گیا ہے جس نے ہمارے تین لوگوں کو اپنا نشانہ بنالیا ہے اور ان میں سے صرف ایک کی لاش ملی ہے۔''

''فادر! آپ کا مطلب ہے کہ غائب ہونے والے باقی دو افراد بھی خون آشام بن گئے ہیں؟'' ایک شخص نے بے یقینی سے کہا۔

''بہت حد تک امکان ہے۔'' فادر جان نے کہا۔ ''میں نے احتیاط کے طور پر آئیوان کے دل میں لکڑی کی سلاخ اتاری تھی تو اس کا جسم واضح طور پر لرزا تھا۔ سب جانتے ہیں کہ خون آشام کے دل میں لکڑی اتار دو تو وہ مر جاتا ہے۔''

یہ سن کر آئیوان کی بیوہ سسکیاں لے کر رونے لگی۔ فادر جان کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ ''گاؤں کے دو افراد غائب ہیں اور امکان ہے کہ وہ خون آشام بن چکے ہیں اور اس سے پہلے کہ وہ مزید لوگوں پر حملے کریں، ہمیں ان کو ختم کرنا ہوگا۔''

گاؤں والے چپ ہو گئے۔ پھر ایک شخص نے ہمت کر کے کہا۔ ''ہم ان خون آشاموں کو کیسے ختم کر سکتے ہیں؟''

''سب سے پہلے ہمیں اپنی حفاظت کا بندوبست کرنا ہو گا۔'' فادر جان نے کہا۔ ''اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی سورج غروب ہونے کے بعد گھر سے باہر قدم نہ رکھے اور نہ ہی کسی کے دستک دینے پر دروازہ کھولے۔ اپنے دروازے مضبوط کر دو اور کسی کا دروازہ کمزور ہے تو وہ آج ہی اسے ٹھیک کر لے۔ سب اپنے گھروں کے دروازوں پر صلیب لگائیں اور اپنے گلوں میں بھی صلیب لٹکائیں۔''

''اس کے باوجود خون آشام کسی کے گھر میں گھسنے کی کوشش کرے تو ہم کیا کریں؟'' آئیوان کی بیوہ نے کہا۔ وہ اب اکیلی رہتی تھی اس لیے اس کا خوف زدہ ہونا فطری بات تھی۔

''ایسے گھر جن میں زیادہ لوگ نہیں ہیں، وہ اپنے ... میں کوئی خبردار کرنے والی چیز رکھیں۔ جیسے کوئی سیٹی!''

''میں ایسی سیٹی بنا سکتا ہوں جس کی آواز ایک ... دور تک سنی جا سکتی ہے۔'' گاؤں کے بڑھئی جیکب نے کہا۔

جیسا کہ پہلے بھی بتایا گیا ہے، رومانیہ میں کوئی ... خون آشاموں کو غیر سنجیدگی سے نہیں لیتا۔ اس وقت تو وہ ... بحران کا شکار تھے۔ ان کے تین آدمی مارے جا چکے تھے ... پھر فادر جان پال اور بورس جو گاؤں کے بڑے تھے ... معاملے میں پُریقین تھے اس لیے لوگوں کے شک کرنے ... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سب خوف کے عالم میں ... سے نکلے۔ ابھی دن تھا، اس کے باوجود لوگ اپنے ... سے بھی بھڑک رہے تھے۔ جن کے گھروں کے دروازے ... کمزور تھے یا ان کے گھر کا کوئی گوشہ کمزور تھا، وہ اسے ... کرنے میں لگ گئے۔ جو اکیلے تھے، وہ جیکب کے پاس ... گئے کہ وہ ان کو سیٹیاں بنا کر دے۔ جو گاؤں سے ذرا ... رہتے تھے، انہوں نے رات اپنے کسی رشتے دار کے ... گزارنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اس دوران میں چرچ میں گاؤں کے بڑوں کا اجلاس ... جاری تھا۔ وہ اس مسئلے کا کوئی مستقل حل تلاش کرنے کی کوشش ... کر رہے تھے۔ فادر جان کہہ رہا تھا۔ ''ابھی خون آشاموں کی ... تعداد کم ہے، شاید تین ہی ہے... اور ہم کوشش کریں تو ... سے نمٹ سکتے ہیں۔''

''لیکن ہم انہیں تلاش کیسے کریں گے؟'' بورس ... دریافت کیا۔

''میرا خیال ہے کہ وہ کسی ایسی جگہ چھپے ہیں جہاں ... میں انہیں کوئی تلاش نہ کر سکے اور رات ہوتے ہی وہ شکار کی ... تلاش میں باہر نکل آتے ہیں۔'' فادر جان نے کہا۔

''ایسی کون سی جگہ ہو سکتی ہے؟'' ایک بوڑھے ... نے سوال کیا۔

''وہ جگہ ہمیں تلاش کرنی پڑے گی، تب ہی ہم ... آشاموں کا صفایا کر سکیں گے۔''

اب سوال یہ تھا کہ بھلا خون آشاموں کا ٹھکانا ... تلاش کرے؟ گاؤں والے تو ویسے ہی خوف زدہ تھے اور ... الحال وہ اپنے بچاؤ کی فکر میں تھے۔ بورس نے کہا۔ ''مجھے ... یقین ہے کہ ابھی کوئی بھی ان خون آشاموں کے ٹھکانے ... تلاش میں نکلنے کی جرأت نہیں کرے گا۔''

یہ بات سب کے ذہن میں تھی اس لیے فی الحال ... نے اس پر زور بھی نہیں دیا۔ انہوں نے گاؤں کا دورہ کر کے گھروں کے حفاظتی انتظامات کا جائزہ لیا۔ جہاں انہیں کوئی کمی نظر آئی، اسے درست کرایا۔ شام سے پہلے جو لوگ بھی گاؤں سے ہٹ کر رہتے تھے، وہ گاؤں میں آگئے تھے۔ فادر جان نے اعلان کرا دیا تھا کہ اگر کسی کے پاس رات گزارنے کے لیے جگہ نہیں ہے تو وہ چرچ میں رات گزار سکتا ہے۔ اس پر کئی درجن افراد چرچ میں آ گئے تھے۔ سورج غروب ہونے سے پہلے گاؤں میں مکمل سناٹا چھا گیا تھا۔ لوگوں نے اپنے گھروں کے دروازے مضبوطی سے بند کر لیے تھے۔

پھر جیسے ہی سورج غروب ہوا، جنگل کی طرف سے ایک بھیانک چیخ بلند ہوئی۔ گاؤں والے اور بھی سہم گئے۔ اس کے بعد رات بھر مختلف گھروں کے دروازوں پر کوئی دستک دیتا رہا اور کہیں کسی نے دروازہ توڑنے کی کوشش کی۔ لیکن جب گھر کے مکین سیٹی بجاتے تو وہ چلا جاتا تھا۔ صبح نمودار ہونے تک گاؤں کے سارے ہی لوگ جاگتے رہے۔ خوف کے اس عالم میں نیند آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جیسے ہی سورج کی روشنی نمودار ہوئی، سارا گاؤں چرچ کے سامنے جمع ہو گیا۔ لوگ چیخ چیخ کر مطالبہ کر رہے تھے کہ انہیں اس آفت سے بچایا جائے۔ مگر فادر جان اور بورس کے پاس اس مسئلے کا کوئی حل نہیں تھا۔ بورس نے لوگوں سے کہا۔

''میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا۔''

''تب تم گاؤں کے سربراہ کیوں بنے ہو؟'' ایک نوجوان نے جارحانہ انداز میں کہا۔

''چلو... تم اس مشکل کا کوئی حل نکال لو۔'' بورس نے نوجوان پر طنز کیا۔

فادر جان نے صورت حال کو سنبھالا۔ اس نے گاؤں والوں سے کہا۔ ''اس مسئلے کا ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ خون آشاموں کا ٹھکانا تلاش کر کے انہیں دن میں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔''

یہ حل سن کر لوگوں کے چہرے سفید پڑ گئے۔ بھلا کس میں اتنی جرأت تھی کہ گاؤں سے نکل کر خون آشاموں کو تلاش کرتا... اور یہی نہیں بلکہ ان کو ٹھکانے بھی لگاتا۔ یہ سنتے ہی لوگوں کے جذبات ٹھنڈے پڑ گئے۔ بورس نے ان پر طنز کیا۔ ''بس، اتنی ہمت ہے؟ ابھی تو اتنا شور کر رہے تھے۔''

''ہم خون آشاموں سے نہیں لڑ سکتے۔'' ایک شخص نے کہا۔

''تو تمہارے خیال میں ہم ان سے لڑ سکتے ہیں؟'' بورس زور سے بولا۔ فادر جان نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''بورس! یہ ہمارے لوگ ہیں اور انہیں کوئی مشکل ہو گی تو یہ ہم سے ہی کہیں گے۔''

گاؤں والے خوف زدہ ہو گئے تھے کہ ان سے خون آشاموں کو تلاش کر کے مارنے کو کہا جا رہا تھا۔ اس لیے سب خاموشی سے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔ لیکن ساتھ ہی انہیں احساس تھا کہ اس طرح سے ہاتھ چھوڑ کر بیٹھ جانا مسئلے کا حل نہیں تھا۔ انہیں کچھ نہ کچھ کرنا ہی تھا... ورنہ جو خون آشام رات کو ان کے گھروں پر دستک دے رہے تھے، وہ گھروں میں بھی گھس سکتے تھے۔ اس رات بھی یہی تماشا رہا۔ ساری رات گھروں کے دروازے بجتے رہے اور کوئی کھڑکیوں کو جھنجھوڑتا رہا۔ ایک گھر میں ایک بوڑھی عورت نے ایک چھوٹی سی کھڑکی کی جھری سے دیکھا تو اسے ایک آدمی نظر آیا۔ اس نے بعد میں قسم کھا کر بتایا کہ وہ آدمی بالکل پیوشین جیسا تھا۔

دو دن تک متواتر رات کو یہی ہوتا رہا تو گاؤں والے ایک بار پھر چرچ کے سامنے جمع ہو گئے۔ انہوں نے فادر جان سے مطالبہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں کچھ کریں کیونکہ ان دو راتوں میں سوائے چرچ کے ہر عمارت کا دروازہ بجایا گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ خون آشام چرچ کا رخ کرنے سے گریز کر رہے تھے۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ چرچ کی عمارت زیادہ بڑی نہیں تھی۔ اس میں مشکل سے تین سو آدمی ٹھہر سکتے تھے اور وہ بھی کھڑے ہو کر... جبکہ گاؤں کی آبادی ایک ہزار کے قریب تھی۔ اتنے افراد کا چرچ میں آنا ناممکن تھا۔ بورس اب اس معاملے میں بالکل پیچھے ہو گیا تھا اس لیے فادر جان کو ہی آگے آنا پڑا۔ اس نے لوگوں سے کہا۔

''میں نے تمہارے سامنے ایک حل رکھا تھا۔ اس بارے میں اب تم کیا کہتے ہو؟''

''فادر! کیا اس کے سوا اور کوئی حل نہیں ہے؟'' ایک آدمی نے پوچھا۔

''نہیں، میری سمجھ میں تو اس کے سوا کوئی حل نہیں آ رہا ہے۔ میرے بچو...! ہمیں ہمت سے کام لینا ہی ہوگا۔ ورنہ یہ آفت شاید ہمارے گھروں میں گھس آئے گی۔''

گاؤں کے بڑھئی جیکب نے فادر جان کی تائید کی۔ ''دوستو...! ہمیں ہمت کرنا ہو گی۔ ورنہ اور کوئی راستہ نہیں ہے اس مصیبت سے بچنے کا۔''

گاؤں میں طاقت ور اور جوان مردوں کی تعداد ڈھائی سو کے قریب تھی۔ ان کے پاس اسلحہ بھی تھا۔ وہ تلواریں اور تیر کمان رکھتے تھے۔ فادر جان نے ان سے کہا۔ ''اگر تم لوگ ٹولیاں بنا کر نکلو تو ممکن ہے ان لوگوں کا ٹھکانا تلاش کر لو۔''

''فادر! کیا تیر کمان ان کے خلاف مؤثر ہو سکتا ہے؟''

جیکب نے پوچھا۔

''ہاں بشرطیکہ تیر کی نوک لکڑی کی ہو۔''

یہ سن کر جیکب پُرجوش ہوگیا تھا۔ اس نے گاؤں والوں سے کہا۔ ''اب ہم ان خون آشاموں کو آسانی سے ٹھکانے لگا سکتے ہیں۔ فادر نے بتایا ہے کہ ان کو دل میں لکڑی چبھو کر ہمیشہ کے لیے مارا جاسکتا ہے۔ اگر یہی کام ہم تیر سے لیں تو ہم انہیں قریب جائے بغیر بھی مار سکتے ہیں۔''

''مگر اتنے تیر کمان کہاں سے آئیں گے؟'' ایک آدمی نے اعتراض کیا۔

''کچھ ہمارے پاس ہیں اور کچھ ہم بنا سکتے ہیں۔'' جیکب نے جواب دیا۔ ''تیر میں بنا سکتا ہوں۔''

''اور میں کمان بنا سکتا ہوں۔'' ایک اور آدمی نے کہا۔

ان کے گاؤں میں مشکل سے ایک درجن افراد اچھے تیر انداز تھے۔ اس لیے باقی افراد نے تیر اندازی کی مشق شروع کردی۔ جیکب تیر بنانے لگا اور دوسرا آدمی کمانیں بنا رہا تھا۔ شام تک اچھے خاصے تیر اور کوئی مزید ایک درجن کمانیں بن چکی تھیں۔ طے پایا کہ رات کو چار چار افراد مل کر گاؤں کے اطراف میں گشت کریں گے اور اگر انہیں کوئی خون آشام نظر آیا تو وہ اسے مارنے کی کوشش کریں گے۔ اصل میں لوگوں نے بھی محسوس کرلیا تھا کہ راتوں کو دروازوں پر دستک دینے والے خون آشاموں کا صبر اب ختم ہورہا تھا اور ممکن تھا کہ آنے والی رات وہ گھروں میں گھسنے کی کوشش کرتے۔

رات کو چار چار افراد کی ٹولیاں گاؤں کے چاروں طرف گشت کررہی تھیں اور انہوں نے جابہ جا مشعلیں جلا کر روشنی کرلی تھی۔ جنوب کی طرف گشت کرنے والی ٹولی کو جنگل کی طرف سے ایک آدمی آتا دکھائی دیا تھا۔ ان لوگوں کو دیکھ کر وہ خوف ناک انداز میں ان کی طرف لپکا تھا کہ انہوں نے اس پر تیروں کی بوچھاڑ کردی۔ اسے تیر لگے تو وہ اسی طرح واپس پلٹ کر جنگل میں گھس گیا تھا۔ ان میں سے کسی کی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ وہ اس کے پیچھے جاتے۔ اس واقعے کے علاوہ اس رات امن رہا تھا اور کسی نے لوگوں کے دروازے نہیں بجائے تھے۔

اگلے روز بھی تیر کمانوں کی تیاری کا کام زور و شور سے جاری رہا۔ وہ اتنے تیر اور کمان بنانا چاہتے تھے جو سو افراد کے لیے کافی ہوں۔ آنے والی رات بھی سکون رہا اور گشت کرنے والوں کو بھی کوئی نہیں ملا۔ تیسرے دن صبح سویرے بیس بیس افراد پر مشتمل پانچ ٹولیاں گاؤں سے نکلیں اور جنگل میں گھس گئیں۔ انہیں خون آشاموں کے ٹھکانے کی تلاش تھی۔ فادر جان نے ان کو حکم دیا تھا کہ اگر انہیں خون آشاموں کا ٹھکانا مل جائے تو وہ ان کے دل میں لکڑی کی کیل ٹھونک کر انہیں ہلاک کریں کیونکہ خون آشام عام طریقے سے نہیں مرتے۔ ان کا عام زخم کتنا ہی گہرا اور جان لیوا کیوں نہ ہو، وہ بچ جاتے ہیں۔ صرف سورج کی روشنی اور دل میں اترنے والی لکڑی کی کیل ہی انہیں ہلاک کرسکتی ہے۔

مگر سارا دن کی تلاش کے بعد بھی ان ٹولیوں کو جنگل میں کوئی ایسی جگہ نہیں ملی جہاں خون آشام اپنا ٹھکانا بنا سکتے۔ یہ سارا میدانی علاقہ تھا جہاں غار بھی نہیں تھے۔ آس پاس کوئی ویران عمارت بھی نہیں تھی جس میں خون آشام دن گزار سکتے۔ اگلے دن پھر ٹولیاں تلاش میں نکلیں مگر اس بار بھی ناکام لوٹ آئیں۔ ایک ہفتے تک یہی ہوتا رہا تو لوگ بیزار ہو گئے۔ پھر رات کا پہرا بھی جاری تھا اس لیے گاؤں والوں نے فادر جان سے کہا۔

''اب جنگل میں تلاش کرنا بے کار ہے۔''

''خون آشام جنگل میں ہی کہیں ہوتے ہیں۔'' فادر جان نے یقین سے کہا۔

''ہمیں تو نظر نہیں آئے۔'' ایک آدمی نے مایوسی سے کہا۔ ''اس دوران میں ہم نے جنگل کا کونا کونا چھان مارا ہے۔''

''خون آشام درختوں پر تو دن نہیں گزار سکتے انہیں لازمی ٹھکانا چاہیے۔ پھر وہ کہاں ہوتے ہیں؟'' فادر جان نے سوال کیا۔

''ممکن ہے مسلسل ناکامی کے بعد وہ اس جگہ سے چلے گئے ہوں۔'' بورس نے خیال پیش کیا۔

گاؤں والوں کو یہ خیال درست لگا کہ انہیں درپیش خطرہ کہیں اور جاچکا تھا اور اب وہ محفوظ تھے۔ ویسے بھی ایک ہفتے کے دوران امن رہا تھا۔ سوائے اس واقعے کے جس میں ایک مشکوک آدمی پر تیر برسائے گئے تھے۔ بورس کا خیال تھا کہ وہ اسی وجہ سے یہاں سے چلے گئے تھے کیونکہ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ لوگ ان کے مقابلے پر اتر آئے ہیں اور وہ اتنی سی تعداد میں گاؤں والوں کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔

لیکن فادر جان کا خیال مختلف تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ خون آشام یہیں تھے اور انتظار کررہے تھے کہ کب گاؤں والے غافل ہوتے ہیں اور وہ دوبارہ حملہ کرتے ہیں۔ ایک بار ان کی تعداد بڑھ گئی تو وہ دلیر ہوجائیں گے اور پھر ان پر قابو پانا ناممکن ہوجائے گا۔ اس لیے ان کی تلاش اور حفاظتی اقدامات جاری رکھے جائیں۔ گاؤں والے راتوں کے گشت پر تو تیار تھے لیکن وہ اب جنگل میں جانے کے لیے تیار نہیں تھے۔

ایک رات ایک ٹولی گاؤں میں گشت کررہی تھی کہ ٹولی کے ایک فرد کو حاجت محسوس ہوئی۔ وہ اپنے ساتھیوں سے کہہ کے واپسی نہیں ہوئی تو اس کے ساتھیوں نے درخت کے پیچھے جا کر دیکھا۔ وہ وہاں سے غائب تھا۔ انہوں نے فوری طور پر اس کی تلاش شروع کردی۔ سیٹیاں بجا کر دوسروں کو خبردار کیا کہ ایک آدمی غائب ہوگیا ہے۔ سیٹیوں کی آواز سن کر دوسرے پہرے دار اور گھروں میں موجود لوگ بھی باہر نکل آئے تھے۔ انہوں نے بھی اس شخص کو تلاش کیا مگر وہ پورے گاؤں میں کہیں نہیں تھا۔ ساری رات اسی طرح گزر گئی۔ وہ گاؤں کے عین وسط میں گشت کررہے تھے اور وہ شخص جس درخت کے پیچھے گیا تھا، وہ بھی مکانات سے گھرا تھا۔ اس کے باوجود وہ غائب ہوگیا تھا۔ اس واردات نے ایک بار پھر سے سب کو ہلا دیا تھا اور گاؤں کے لوگ جو کسی قدر مطمئن ہوگئے تھے پھر سے سہم گئے۔

فوری طور پر چرچ میں اجلاس ہوا اور فادر جان نے پھر کہا کہ انہیں خون آشاموں کا ٹھکانا تلاش کرنا چاہیے۔ ''اس طرح راتوں کو گشت کرنا مسئلے کا حل نہیں ہے کیونکہ وہ آزاد ہیں اور موقع پا کر ہمیں نشانہ بنا سکتے ہیں... جیسا کہ انہوں نے کیا ہے۔''

ابھی اجلاس جاری تھا کہ ایک اور خبر آئی کہ رات کو ایک نہیں بلکہ دو آدمی غائب ہوئے تھے۔ سیٹیوں کی آواز سن کر ایک کسان بھی گھر سے نکلا تھا اور واپس نہیں آیا۔ اس کے گھر والے یہ سوچ کر مطمئن رہے کہ وہ دوسرے گاؤں والوں کے ساتھ ہے اور خطرے کی بات نہیں ہے۔ مگر جب وہ صبح بھی گھر نہیں پہنچا تو اس کی تلاش شروع ہوئی اور یہ انکشاف ہوا کہ رات بھی کسی نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ شاید وہ گھر سے نکلتے ہی خون آشام کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ یہ انکشاف اور بھی خوف ناک تھا کہ خون آشاموں کی تعداد اس طرح بڑھ رہی تھی اور اب وہ کم سے کم بھی پانچ ہوگئے تھے۔

''پانچ خون آشام اگر کسی ٹولی پر حملہ کردیں تو وہ سب کو ختم کردیں گے۔'' فادر جان نے کہا۔

''پھر ہم کیا کریں؟'' ایک نوجوان بولا۔ وہ بھی خون آشاموں کو تلاش کرکے ٹھکانے لگانے کا حامی تھا۔

''ان کے ٹھکانے کی تلاش!'' فادر جان نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''ممکن ہے وہ گاؤں میں ہی روپوش ہوں اور ہم انہیں جنگل میں تلاش کررہے ہوں۔'' بورس نے کہا تو سب چونک گئے۔ یہ خیال تو کسی کے ذہن میں آیا ہی نہیں تھا۔

''گاؤں میں... لیکن کہاں؟'' فادر جان نے کہا۔

''ممکن ہے قبرستان کے اندر موجود پرانے چرچ میں!'' بورس نے کہا۔ یہ چرچ آج سے کوئی ایک صدی پہلے آنے والے ایک زلزلے میں تباہ ہوگیا تھا اور اس کی جگہ یہ چرچ تعمیر کیا گیا تھا۔ اس وقت قبرستان وہیں تک تھا۔ بعد میں قبرستان کی توسیع ہوئی تو یہ چرچ بھی قبرستان کے اندر آگیا تھا اور اب اس کے کھنڈرات باقی رہ گئے تھے۔

''میرا خیال ہے کہ ابھی چل کر دیکھ لیا جائے۔'' فادر جان نے بورس کی حمایت کی۔ ''واقعی، اس طرف تو کسی کا دھیان نہیں گیا تھا۔''

وہ دس بارہ لوگ اور ان کے ساتھ مسلح افراد کا ایک دستہ پرانے چرچ کی طرف روانہ ہوا۔ چرچ کی عمارت کھنڈر ہوگئی تھی لیکن اس کی دیواریں اور چھت تا حال برقرار تھی۔ اس کا دروازہ بند تھا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ مرکزی ہال خالی تھا اور وہاں کسی خون آشام کی موجودگی ممکن بھی نہیں تھی کیونکہ چاروں طرف ٹوٹی کھڑکیوں سے دھوپ بلا کسی رکاوٹ کے اندر آرہی تھی۔ بورس نے مایوسی سے کہا۔

''یہاں تو کوئی نہیں ہے۔''

''یہاں نہیں ہے لیکن تہ خانے میں ہوسکتے ہیں۔'' فادر جان نے کہا۔ ''تہ خانہ پیچھے کی طرف ہے۔''

تہ خانے کا سُن کر سب محتاط ہوگئے تھے۔ وہ سب ہی تہ خانے میں جانے کے خیال سے ہچکچا رہے تھے مگر جانا تو تھا۔ طے ہوا کہ فادر جان آگے جائے گا اور باقی سب اس کے پیچھے ہوں گے۔ سیڑھیاں مخدوش تھیں لیکن اترنے کے قابل تھیں۔ اندر تاریکی تھی اور فادر جان ایک ہاتھ میں صلیب اور دوسرے ہاتھ میں مشعل لے کر نیچے اترنے لگا۔ اچانک اس کا پاؤں پھسلا اور وہ لڑھکتا ہوا نیچے تک چلا گیا۔ دوسرے لوگ تیزی سے نیچے اترے تو انہوں نے ایک سائے کو بھاگتے دیکھا۔ فادر جان فرش سے اٹھ رہا تھا۔ اس نے اپنا لباس درست کیا۔ بورس نے پوچھا۔

''فادر! تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟''

''شکر ہے مجھے چوٹ نہیں آئی۔'' اس نے لوگوں کو یقین دلایا۔

''یہاں کوئی ہے۔'' ایک شخص وحشت زدہ لہجے میں بولا۔

بیک وقت درجن بھر سے بھی زیادہ مشعلیں جلنے سے تہ خانہ روشن ہوگیا تھا اور تب انہوں نے فرش پر پڑی پانچ عدد

لاشیں دیکھیں۔ لیکن یہ لاشیں نہیں تھیں بلکہ یہ خون آشام تھے جو دن کے وقت سو جاتے ہیں اور رات کو شکار کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ وہ سب ہوشیار ہو گئے اور انہوں نے لکڑی کی کیلیں اور ہتھوڑے سنبھال لیے۔ ان میں سے ایک ان کے لیے اجنبی تھا اور باقی سب گاؤں کے غائب ہونے والے لوگ تھے جو اب خون آشام بن چکے تھے۔ جو اجنبی تھا، وہی باہر سے یہاں آیا تھا اور اس نے ہی گاؤں کے باقی چار افراد کو خون آشام بنالیا تھا۔

''ان کے دل کے مقام پر یہ لکڑی کی کیلیں اتار دو۔'' فادر جان نے انہیں حکم دیا۔ مگر وہ ان کے پاس جاتے ہوئے ڈر رہے تھے۔ جب فادر جان نے دوبارہ حکم دیا تو وہ ڈرتے ڈرتے ان کی طرف بڑھے۔ اس سے پہلے کہ وہ ان کے پاس جاتے، اچانک ہی ان پانچوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ سب ڈر کر پیچھے ہٹے۔ وہ دیدے گھما گھما کر چاروں طرف دیکھ رہے تھے اور پھر جیسے ہی ان کی نظریں انسانوں پر پڑیں، وہ غراتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ تیر اندازوں نے گھبرا کر ان پر تیر چلائے لیکن اتنے پاس سے بھی وہ نشانہ نہ لے سکے۔ وہ ان کی طرف بڑھے تو سب بدحواسی میں سیڑھیوں کی طرف بھاگے تھے۔ حالانکہ وہ تعداد میں دو درجن سے بھی زیادہ تھے اس کے باوجود خون آشاموں کو دیکھ کر ان کی حالت خراب ہو گئی تھی۔

اس نازک موقع پر فادر جان نے اپنے حواس بحال رکھے تھے اور اس نے اپنے پاس کھڑے جیکب کے ہاتھ سے لکڑی کا ہتھوڑا لے کر اسے تہ خانے کے روشن دان کے شیشوں پر مارا۔ چھناکے سے شیشہ بکھرنے کے ساتھ ہی سورج کی روشنی اندر آئی تھی۔ فادر جان نے چلا کر کہا۔ ''باقی شیشے بھی توڑ دو۔ یہ اسی طرح مریں گے۔''

خون آشام جو سورج کی روشنی دیکھ کر گھبرا گئے تھے، اس سے بچنے کے لیے عجلت میں پیچھے ہٹے۔ یہ دیکھ کر باقیوں نے بھی حوصلہ پکڑا اور اپنے پاس موجود ہتھوڑے مار مار کر تہ خانے کے روشن دانوں کے شیشے توڑنے لگے۔ اتفاق سے سورج نکلا ہوا تھا اور اس کا رخ بھی اسی طرف تھا۔ فادر جان نے ایک شخص سے کہا۔ ''اوپر ہال میں لگے آئینے اتار لاؤ۔ جلدی کرو ورنہ سورج کی روشنی چلی جائے گی۔'' دھوپ نے تہ خانے کے بڑے حصے پر قبضہ کر لیا تھا جس سے بچنے کے لیے خون آشام ایک کونے میں جمع ہو گئے تھے اور وہیں کھڑے غرا رہے تھے۔ تیر اندازوں نے ان پر تیر چلائے تھے لیکن ان کا ان پر کوئی خاص اثر نہیں ہو رہا تھا۔ پھر اوپر سے آئینے لائے گئے اور جب ان کی مدد سے سورج کی روشنی خون آشاموں پر ڈالی گئی تو وہ بری طرح چیخنے چلانے لگے۔ سورج کی روشنی ان کو جلا رہی تھی اور ان کے جسم پھٹ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہیں آگ لگ گئی اور پھر وہاں سوائے راکھ کے کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ ان کا خاتمہ ہوتے دیکھ کر گاؤں والے خوشی سے پاگل ہو گئے تھے۔ اب انہیں کوئی خطرہ باقی نہیں رہا تھا۔ فادر جان نے بھی اطمینان کا سانس لیا۔

جب گاؤں والوں کو پتا چلا کہ تمام خون آشاموں کا خاتمہ ہو چکا ہے تو انہوں نے چرچ میں آ کر خصوصی شکرانے کی عبادت کی۔ سب فادر جان کی ذہانت کی تعریف کر رہے تھے جس نے بروقت قدم اٹھا کر سب کو بچا لیا تھا اور خون آشاموں کا خاتمہ بھی کر دیا تھا۔ جن پانچ گھروں کے پیارے خون آشاموں کا شکار ہو چکے تھے، انہوں نے بھی خوشی منائی۔ اب باقی گاؤں کو کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔

گاؤں کی واحد سرائے اور شراب خانے میں ایک لڑکا جری کام کرتا تھا۔ اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا اور وہ رات کو سرائے میں ہی سو جاتا تھا۔ یہ خون آشاموں کے خاتمے کے ایک مہینے بعد کی بات تھی۔ ایک رات وہ باہر نکلا تو واپس نہیں آیا۔ اگلے پورے دن بھی وہ غائب رہا۔ سرائے کے مالک نے اسے سارے گاؤں میں تلاش کر لیا لیکن وہ نہیں ملا۔ آنے والی رات کو وہ خود واپس آ گیا تھا۔ جب سرائے کے مالک نے اس سے پوچھا کہ وہ کہاں تھا تو اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ اس پر سرائے کے مالک کو شک ہو گیا اور اس نے اچانک ہی جری کی گردن سے اس کی قمیص کا کالر ہٹا دیا۔ وہاں دو سوراخوں کے نشان نمایاں تھے۔ سرائے کے مالک نے شور کیا اور وہاں موجود لوگوں نے جری کو پکڑ کر میز سے باندھ دیا۔ وہ مزاحمت کرتا رہا۔

''میرے خدا! اب بھی کوئی خون آشام باقی ہے۔'' ایک شخص چلایا۔ ''فادر جان کو اطلاع کرو۔''

جری میز سے بندھا ہوا ان لوگوں کو آنکھیں گھما گھما کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے انداز میں ایک عجیب سی بے گانگی تھی۔ بندھا ہوا تھا اور اب مزاحمت بھی نہیں کر رہا تھا۔ اس کے باوجود سب اس سے خوف زدہ تھے کیونکہ خون آشام رات کو پوری طرح طاقت ور ہو جاتے ہیں اور ان پر قابو پانا آسان نہیں ہوتا۔ دو آدمی فادر جان کو بلانے کے لیے بھاگے تھے۔ جب تک فادر جان نہیں آ گیا، سب کی جان پر بنی رہی۔

''کیا ہوا ہے؟'' فادر جان نے جری کی طرف دیکھا۔ ''اسے کیوں باندھ رکھا ہے؟''

''فادر! یہ کل رات سے غائب تھا اور ابھی آیا ہے۔'' سرائے کے مالک نے بتایا۔ ''میں نے اس کی گردن دیکھی تو اس پر دو سوراخ ہیں اور یہ کچھ بول بھی نہیں رہا ہے۔''

''فادر، یہ غلط ہے، مجھے کسی خون آشام نے نہیں کاٹا ہے۔'' جری پہلی بار بولا۔

''ابھی معلوم ہو جائے گا۔'' فادر نے کہا اور اپنی صلیب اتار کر اس کے سینے پر رکھ دی مگر جری نے کوئی ردِعمل نہیں دکھایا۔ فادر جان نے دوسروں کی طرف دیکھا۔ ''یہ خون آشام نہیں ہے کیونکہ کوئی خون آشام مقدس صلیب اپنے سامنے برداشت نہیں کر سکتا۔''

سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ ''شکر ہے... میں تو اس کے نشان دیکھ کر ڈر گیا تھا۔ ویسے اس کی گردن پر یہ نشان کیسے ہیں؟''

''میں رفعِ حاجت کے لیے جنگل میں گیا تھا۔ وہاں مجھے کسی چمگادڑ نے کاٹ لیا تھا۔ یہ اسی کا نشان ہے۔'' جری نے وضاحت کی۔

''لیکن تم آج سارا دن کہاں رہے تھے؟'' سرائے کا مالک مطمئن نہیں تھا۔

''میں وہیں جنگل میں رہ گیا تھا۔ واپس آتے ہوئے دھند کی وجہ سے راستہ بھول گیا تھا۔ جب صبح ہوئی تو تھک کر ایک جگہ سو گیا اور ابھی رات کو میری آنکھ کھلی تھی۔''

فادر جان نے سرائے کے مالک سے کہا۔ ''اگر تم مطمئن نہیں ہو تو میں اسے چرچ لے جاتا ہوں۔ وہاں اسے رات بھر رکھوں گا، اس سے تصدیق ہو جائے گی کہ یہ خون آشام ہے یا نہیں۔''

''بالکل فادر! اس سے تصدیق ہو جائے گی۔ آپ اسے لے جائیں۔'' سرائے کے مالک نے جلدی سے کہا۔

''چلو میرے ساتھ۔'' فادر جان نے جری سے کہا۔ سرائے کے مالک نے اس کی رسیاں کھول دیں۔ وہ میز سے اترا اور فرماں برداری سے فادر جان کے ساتھ چل پڑا۔ کچھ دیر کے بعد وہ چرچ میں تھے۔ دروازہ بند کر کے اندر آتے ہی فادر جان نے جری کو ڈانٹا۔ ''احمق! تم شام ہوتے ہی وہاں کیوں چلے گئے تھے۔ ان لوگوں کو شک ہو گیا تھا۔''

''شکر ہے آپ آ گئے ورنہ مجھے تو لگ رہا تھا کہ وہ میرے دل میں لکڑی کی کیل اتار دیں گے۔'' جری بولا۔ وہ مسکرایا تو اس کی کچلیوں کے دو لمبے دانت نمایاں ہونے لگے۔ اس دوران میں چرچ کے تہ خانے سے نکل کر مزید تین افراد وہاں آ گئے تھے۔ یہ گاؤں سے ذرا فاصلے پر رہنے والے ایک ہی خاندان کے تین افراد تھے۔ فادر جان نے ان کی طرف دیکھا اور سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''جب تک ہماری تعداد نہیں بڑھ جاتی، ہمیں بہت محتاط رہنا ہوگا ورنہ ہمارا بھی وہی انجام ہوگا جو ہمارے پیش روؤں کا ہو چکا ہے۔''

''آج رات ہم ویسلی کے گھر جائیں گے۔'' ان میں سے ایک نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ ''وہاں چار افراد ہیں۔''

فادر جان نے سر ہلایا۔ ''بہت ہوشیاری سے کام کرنا ہے۔ اب ہمیں ان کے درمیان رہتے ہوئے اپنی تعداد بڑھانی ہے۔ ذرا سا شک ہمیں مروا دے گا۔''

''پھر چلیں؟'' جری نے بے تابی سے کہا۔

''نہیں۔'' فادر جان نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ ابھی بہت سارے گھروں میں روشنیاں جل رہی تھیں۔ ''نصف رات کے بعد... جب سب لوگ سو جائیں گے۔''

ویسلی کا گھر بھی گاؤں سے ذرا دور تھا۔ گاؤں کے لوگ بے خبر تھے کہ خون آشاموں کی ایک نئی قسم وجود میں آ گئی تھی جو صلیب سے نہیں ڈرتی تھی اور چرچ میں رہتی تھی کیونکہ اس نسل کا بانی فادر جان تھا۔ جب وہ خون آشاموں کے خاتمے کے لیے پرانے چرچ میں جاتے ہوئے اندر گرا تھا تو تاریکی میں کسی نے اسے عقب سے جکڑ کر اپنے دانت اس کی گردن میں اتار دیے تھے۔ پھر روشنی اور دوسروں کا احساس ہوتے ہی اسے چھوڑ دیا تھا۔ اس کے چند دن بعد فادر جان خود خون آشام بن چکا تھا اور اس کا پہلا شکار گاؤں سے باہر ایک خاندان کا سربراہ تھا۔ وہ اسے چرچ لے گیا تھا۔ کسی نے اس پر شک نہیں کیا۔ آنے والی رات خاندان کے سربراہ نے فادر کے ساتھ مل کر اپنے بیٹے اور بیوی کو بھی اپنے جیسا بنا دیا تھا اور اب وہ ایک اور گھرانے کو اپنا نشانہ بنانے جا رہے تھے۔ جری اتفاق سے فادر جان کی نظر میں آ گیا تھا اور فادر جان نے اس کا خون پی کر اسے بھی خون آشام بنا دیا تھا۔ پھر رات تاریک ہوئی اور لوگ سو گئے تو فادر جان نے انہیں روانگی کا اشارہ کیا۔ جب وہ چرچ سے نکل کر ویسلی کے گھر کی طرف جا رہے تھے تو انہیں یقین تھا کہ کل تک ان کی تعداد نو ہو جائے گی۔

گرداب

اسما قادری

پانچویں قسط

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے لیکن اس کی باگ ڈور جب بااثر سماج کے روایتی نظام میں پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں۔ مختلف طبقات میں تقسیم اس نظامِ قانون کے بھی کئی رخ ہیں۔ بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے اور یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے..... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے۔ جہاں طاقتور مچھلی جال کو تو زکر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کرکے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہوجاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے، زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے ... سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں... کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے۔ گزرا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے ..... اُس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہوتا ہے۔ جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی سلسلہ در سلسلہ۔

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل..... ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

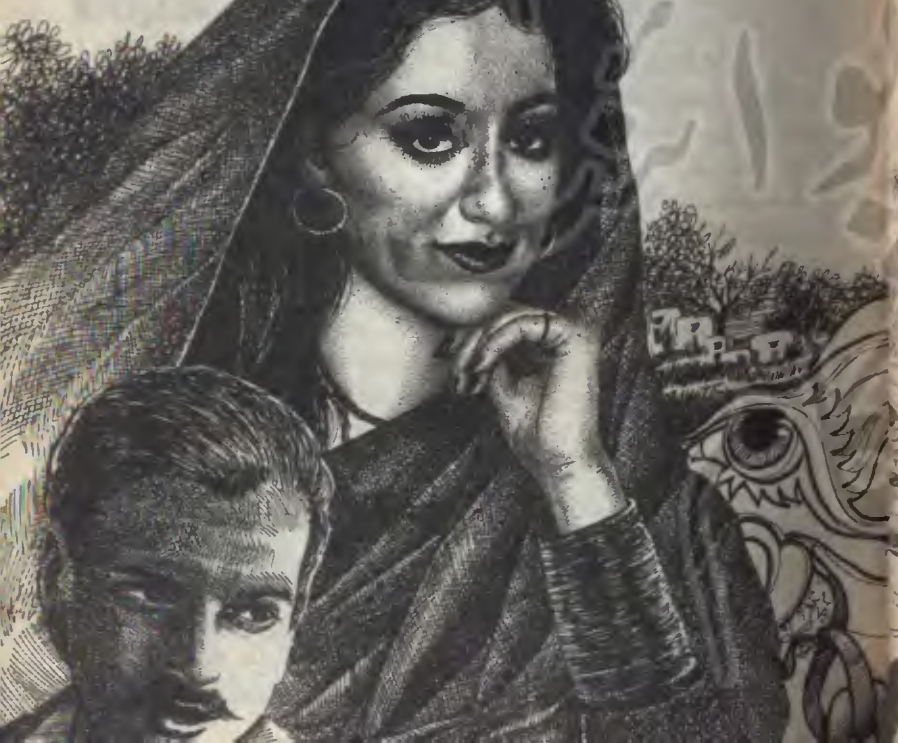

دو لاکھ کی رقم سے اس نے بہت سی امیدیں وابستہ کرلی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس رقم سے کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کرکے نیلم کے گھر والوں کو رشتے کے لیے راضی کرلے گا۔ انہیں اس کے رشتے پر سب سے بڑا اعتراض ہی یہ تھا کہ وہ ایک ڈرائیور ہے جس کی معاشرے میں کوئی عزت نہیں ہوتی۔ اس فوکری کے مقابلے میں وہ اگر پرچون کی چھوٹی سی دکان بھی کھول لیتا تو روایتی سی سوچ رکھنے والے نیلم کے والدین کے لیے قابلِ قبول ہو جاتا لیکن اس ناگہانی حادثے نے اس کی ساری امیدیں توڑ دی تھیں۔ وہ خالی خالی نظروں سے وہاں ہونے والی بھاگ دوڑ دیکھ رہا تھا۔ پولیس والوں کے علاوہ وہاں پر امدادی کارکن بھی نظر آرہے تھے۔ ایک چھوٹا سا جمگھٹا میڈیا کے افراد کا بھی تھا جنہوں نے پولیس کے ایک آفیسر کو گھیر رکھا تھا۔ حادثے کو کسی بھی قسم کی دہشت گردی کی واردات کے بجائے اتفاقی حادثہ ثابت کرنے میں زور و شور سے مصروف اس پولیس آفیسر کو اس نے آسانی سے شناخت کرلیا۔ وہ رفیق کھوکھر تھا۔ موتی والا کے کیس کا تفتیشی افسر! اگر وہ اسے یہاں دیکھ لیتا تو اس کے لیے مشکل کھڑی ہوسکتی تھی۔ رفیق کھوکھر سے بچنے کے لیے وہ ہجوم سے باہر نکلنے کے لیے پلٹا۔ اس کے سر پر سوار منکر نکیر فوراً ہی ہوشیار ہوگئے۔

''کدھر...؟'' ان میں سے ایک نے غراہٹ آمیز سرگوشی میں پوچھا۔

''یہاں سے نکلو پھر میں تم لوگوں کو ساری بات بتاتا ہوں۔'' اس نے انہیں جواب دیا اور قدم آگے بڑھا دیے۔

وہ دونوں سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ تھے۔ عامر کے گھر سے کافی دور آنے کے بعد وہ ایک جگہ آکر رک گیا۔ ان دونوں نے بھی اس کی پیروی کی۔

''معاملہ کیا ہے؟ کچھ منہ سے پھوٹو۔ تم تو ہمیں لڑکی

تک پہنچانے والے تھے۔ لڑکی کہاں ہے؟ صاف صاف بتاؤ۔" ان لوگوں کے صبر کا پیمانہ یقیناً لبریز ہو چکا تھا چنانچہ ان میں سے ایک نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"میں تمہیں لڑکی کے پاس ہی پہنچا رہا تھا لیکن اب یہ ممکن نہیں رہا ہے۔ اب میں تمہیں اس کے بارے میں صرف خبر دے سکتا ہوں۔ تم نے اپنے اشتہار میں لڑکی کے بارے میں اطلاع دینے والے کے لیے دو لاکھ کا اعلان کیا تھا۔ میں ان روپوں میں سے تمہیں ایک لاکھ واپس کر کے ایک لاکھ رکھ لیتا ہوں اور لڑکی کے بارے میں خبر دے دیتا ہوں۔" عامر کی گلی کے کونے سے یہاں تک پہنچنے میں اس کے دماغ نے تیزی سے کام کیا تھا اور پوری کی پوری رقم سے محروم ہو جانے کے بجائے اس نے سوچا تھا کہ کچھ نہ کچھ تو ہاتھ لگ ہی جائے اس لیے اب وہ ان لوگوں سے نیا سودا طے کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"یہ کیا ناٹک لگا رکھا ہے سالے! ہمیں تُو نے کیا سمجھا ہے جو اپنے اشاروں پر نچانے کی کوشش کر رہا ہے؟" اس کے مقابل موجود لوگ کوئی شریف قسم کے کاروباری بندے تو تھے نہیں کہ اس کی مرضی اور خواہش کے مطابق سودے بازی کرتے چلے جاتے۔ وہ فوراً ہی ہتھے سے اکھڑ گئے اور ان میں سے ایک نے اس کی گدی کو اپنے شکنجے جیسی انگلیوں میں جکڑ لیا۔

"چل، سیدھی طرح ہمیں لڑکی تک پہنچا۔" وہ جہاں کھڑے تھے اس طرف لوگوں کی آمد و رفت نہیں تھی اس لیے سامنے کھڑے بندے نے بلاتکلف اس کے منہ پر اپنا ہتھوڑے جیسا ہاتھ دے مارا۔

"اب میں تمہیں لڑکی تک نہیں پہنچا سکتا۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو میں اپنا ایک لاکھ کا نقصان کیوں کرتا؟ میں مجبور ہوں اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ مجھ سے ایک لاکھ واپس لے لو اور ایک لاکھ چھوڑ دو۔ بدلے میں، میں تمہیں تمہارے کام کی بات بتا دیتا ہوں۔" اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ خطرناک لوگ ہیں لیکن پھر بھی ایک لاکھ کی خاطر خطرہ مول لے کر ان سے کسی نہ کسی طرح معاملہ پٹانے کے چکر میں تھا۔

"تجھ سے کیا لینا ہے اور کیا دینا ہے، یہ فیصلہ ہم خود کریں گے۔ تو سیدھی طرح یہ بتا کہ لڑکی کہاں ہے؟" بڑی بڑی مونچھوں والے نے اپنی سرد آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے سوال کیا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چاقو باہر نکال کر اسے کھولنے لگا۔ کڑکڑاہٹ کی ہلکی سی آواز کے ساتھ چاقو کھل گیا اور اس کا چمک دار پھل اس کی نظروں کے سامنے لہرانے لگا۔ اس چاقو کے نظارے کے بعد سرمد کی ساری ہمت جواب دے گئی۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ ان لوگوں کے سامنے نہیں ٹک سکے گا چنانچہ سہمے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔

"تمہیں جس لڑکی کی تلاش تھی، وہ میرے ایک دوست عامر کے گھر میں ٹھہری ہوئی تھی۔ میں تمہیں اپنے دوست کے گھر ہی لے جا رہا تھا لیکن ابھی میرے ساتھ تم لوگوں نے سنا ہو گا کہ بارود فروش پڑوسی کے گھر میں ہونے والے دھماکے سے میرے دوست کا گھر بھی تباہ ہو گیا ہے اور میرے دوست کی ماں کے ساتھ ساتھ وہ لڑکی بھی اس حادثے میں مر گئی ہے۔" اس کی دی گئی اس اطلاع پر وہ لوگ ایک لمحے کے لیے دم بخود رہ گئے پھر بڑی مونچھوں والے نے خود کو سنبھالا اور سختی سے پوچھا۔ "لڑکی وہاں کیسے پہنچی تھی؟"

"میں نے خود اسے وہاں پہنچایا تھا۔ میں موتی والا صاحب کا ڈرائیور ہوں، انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ انہیں اپنے گھر میں لڑکی کی جان کے لیے خطرہ محسوس ہو رہا ہے اس لیے میں اسے کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچا دوں۔ ان کے حکم پر میں نے اس رات جب ان کا قتل ہوا، تب لڑکی کو اپنے دوست کے گھر پہنچا دیا تھا۔ اتنے دنوں سے ہم لوگ پریشان ہو رہے تھے کہ اب لڑکی کا کیا کریں؟ میں نے اخبار میں اشتہار پڑھا تو پیسوں کے لالچ میں آ کر آپ کو فون کر دیا لیکن اب وہ بے چاری ہی زندہ نہیں رہی تو آپ کو کہاں پہنچاؤں؟" سچ میں جھوٹ کی آمیزش کرتے ہوئے اس نے ان لوگوں کو بتایا۔ یہ سب کہنے میں اسے اس لیے مشکل پیش نہیں آئی تھی کہ عامر کے شہریار سے ملاقات کے لیے روانہ ہونے سے پہلے ہی وہ لوگ یہ کہانی تیار کر چکے تھے۔ سرمد حقیقت کو کسی طرح ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا کہ موتی والا اور اس کی بیوی کے قتل والی رات وہ ان کی کوٹھی میں چوری کی نیت سے موجود تھا۔ اس لیے یہ کہانی تیار کی گئی تھی۔ ماہ بانو نے بھی اس کہانی کی منظوری دیتے ہوئے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ کسی کو اصل حقیقت نہیں بتائے گی۔ چنانچہ اس وقت یہی کہانی اس کے کام آ رہی تھی۔

"تو ہمیں کہیں نہیں پہنچا سکتا۔ تو چل پھوٹ یہاں سے... ان روپوں میں سے تجھے ایک پیسا بھی نہیں ملے گا۔" یہ جان لینے کے بعد کہ مرنے والی لڑکی واقعی ماہ بانو ہے، سرمد اب مزید ان کے لیے کام نہیں آ سکتا، انہوں نے اس کی کمر پر ایک زوردار لات مار کر اسے پرے دھکیلا اور نوٹوں سے بھرا ہوا بیگ سنبھال کر وہاں سے چل پڑے۔ سرمد کے اندر ہمت نہیں تھی کہ ان خوں خوار لوگوں کے پیچھے جا سکتا۔

☆☆☆

پھٹنے سے نکلنے والی دونوں عورتوں کی لاشیں بری طرح مسخ ہو گئی تھیں۔ ایک تو دیوار اور چھت کے گرنے والے ملبے نے دونوں کے جسم بری طرح توڑ پھوڑ ڈالے تھے، دوسرے رہی سہی کسر بارود کی وجہ سے لگنے والی آگ نے پوری کر دی تھی۔ لاشیں تقریباً ناقابلِ شناخت ہو گئی تھیں۔ ان کی پہچان کے لیے قد و قامت اور کہیں کہیں لباس کے بچ جانے والے چیتھڑوں سے مدد لی گئی تھی۔ شناخت کا مرحلہ اتنا زیادہ دشوار اس لیے نہیں تھا کہ یہ تو یقینی طور پر معلوم تھا کہ گھر میں موجود خواتین کون تھیں۔ بس ان دونوں خواتین کی لاشوں میں سے ایک بوڑھی عورت اور ایک جوان لڑکی کی لاش کو الگ الگ کرنا تھا... تو یہ کام بہ آسانی کر لیا گیا تھا۔ عامر نے واپس لاہور پہنچنے کے بعد دونوں لاشوں کی شناخت کے سلسلے میں تصدیق کر دی تھی۔ ماہ بانو کی لاش کی سب سے بڑی پہچان اس کی سیاہ چادر کے وہ چیتھڑے تھے جو وہ ہر وقت اوڑھی رہتی تھی اور مرتے وقت بھی وہ اس کے جسم کا حصہ بن کر رہ گئے تھے۔ اپنے گھر پر گزرنے والی اس قیامت کی اطلاع عامر کو عبدالمنان سے ملی تھی۔ عبدالمنان سے مل کر اس نے ماہ بانو کی اپنے گھر موجودگی کی اطلاع دی تھی تو وہ اس اطلاع پر فوراً متحرک ہو گیا تھا۔ سب سے پہلے اس نے لاہور رانا ہاؤس میں مقیم شہریار کو اس بارے میں بتایا تھا اور پھر اس کے مشورے پر رفیق کھوکھر کو یہ ذمے داری سونپی تھی کہ وہ عامر کے گھر جا کر ماہ بانو کو اپنی تحویل میں لے لے لیکن جواباً پون گھنٹے بعد رفیق کھوکھر نے جو اطلاع دی تھی، وہ بہت اندوہناک تھی۔ غیر قانونی طور پر آبادی کے عین درمیان میں بیٹھ کر بارودی اشیا کا کاروبار کرنے والے گلو کے بارودی ذخیرے میں لگنے والی آگ نے گلو سمیت عامر کی ماں اور جواں سال ماہ بانو کی زندگیاں بھی چھین لی تھیں۔

اس حادثے کے بارے میں اطلاع ملتے ہی عبدالمنان نے مشاہرم خان کے ساتھ عامر کو لاہور بھجوانے کا بندوبست کر دیا تھا۔ عامر مشاہرم خان کے ساتھ سیدھا مردہ خانے پہنچا تھا اور ڈیوٹی پر موجود ایک پولیس مین کے سامنے اس نے اس بات کی تصدیق کر دی تھی کہ لاشیں اس کی ماں اور ماہ بانو ہی کی ہیں۔ شناخت کا مرحلہ طے ہونے کے بعد لاشیں ورثا کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اپنی ماں کی لاش کو عامر اپنے ساتھ لے گیا تھا جبکہ ماہ بانو کی لاش کو ایمبولینس میں پیر آباد روانہ کر دیا گیا تھا۔ اس کے مر جانے کے بعد اب اس بات کو چھپانے کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہ گئی تھی کہ وہ گاؤں سے نکلنے کے بعد موتی والا کی کوٹھی میں چھپی ہوئی تھی اور موتی والا نے از خود اسے اپنے ڈرائیور سرمد کی مدد سے کسی خطرے کے پیشِ نظر اس کے دوست کے گھر منتقل کر دیا تھا۔ موتی والا کی اسی رات موت سے اس بات کی تصدیق ہوتی تھی کہ واقعی اس کی کوٹھی میں کوئی خطرہ موجود تھا لیکن یہیں سے بہت سی کہانیاں اور قیاس آرائیاں بھی جنم لے رہی تھیں۔ ماہ بانو کا موتی والا سے کیا تعلق تھا؟ وہ اپنے گاؤں سے کیوں بھاگی تھی؟ وہ موتی والا کی کوٹھی تک کیسے پہنچی تھی؟ اس کی جان کو کس سے خطرہ درپیش تھا؟ موتی والا اور اس کی بیوی کو کس نے قتل کیا؟ ماہ بانو کی جس حادثے میں موت ہوئی، وہ واقعی کوئی حادثہ تھا یا کسی نے اس کے قتل کے

خواب

ایک زن مرید شوہر نے نفسیاتی معالج کو بتایا کہ وہ ہر رات کو یہی خواب دیکھتا ہے کہ وہ بارہ خوب صورت لڑکیوں کے ساتھ ایک ویران جزیرے میں رہ رہا ہے اور اسی خواب سے اس کی زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی ہے۔

نفسیاتی معالج نے کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا پُرلطف خواب دیکھنے سے آپ کی زندگی کیسے اجیرن ہو سکتی ہے؟"

زن مرید شوہر بولا۔ "پُرلطف کیا خاک...! میں پوچھتا ہوں آپ نے کبھی بارہ لڑکیوں کے لیے کھانا پکایا ہے۔"

عملی مظاہرہ

ایک دیوہیکل پہلوان ٹائپ آدمی ایک شراب خانے میں آیا اور بارٹینڈر سے کہنے لگا۔ "میں نے سنا ہے کہ تمہیں ایک گن کٹے بدمعاش کی ضرورت ہے جو ناپسندیدہ افراد سے نمٹ سکے۔"

"ضرورت تو بڑی شدید ہے مگر تمہیں اس کام کا کوئی تجربہ بھی ہے؟" بارٹینڈر نے پوچھا۔

"تجربہ تو کوئی خاص نہیں لیکن میں عملی مظاہرہ کر کے دکھا سکتا ہوں۔"

یہ کہہ کر گن کٹے بدمعاش نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ساتھ والے کمرے میں ایک مست شرابی قسم کا آدمی فون پر کسی کو گالیاں دے رہا تھا۔ گن کٹے نے کمرے میں جا کر اس شخص کو دبوچا اور کسی احتجاج کی پروا کیے بغیر اسے شراب خانے سے باہر پھینک دیا اور فاتحانہ انداز سے جھومتا ہوا واپس آ کر کہنے لگا۔

"عملی مظاہرہ پسند آیا؟"

"بہت خوب۔" بارٹینڈر نے کہا۔ "مگر نوکری کی اجازت تمہیں باس سے لینی پڑے گی۔"

"باس کہاں ہے؟" بدمعاش نے پوچھا۔

"جسے تم باہر پھینک آئے ہو وہی اس بار کا مالک ہے۔"

لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کی تھی؟ بے شمار سوالات تھے جو اٹھائے جارہے تھے لیکن وہ تمام افراد جن کو اس معاملے کی ذرا بھی بھنک تھی، اپنے ہونٹ سیے بیٹھے تھے۔ ان افراد میں شہریار بھی شامل تھا۔ رفیق کھوکھر کی، کی گئی تحقیقات کے نتیجے میں اسے اس بات کا تو یقین ہوگیا تھا کہ ماہ بانو کی موت کے پیچھے کسی دشمن کا ہاتھ نہیں اور اس کی موت یقینی طور پر ایک اتفاقی حادثے کے نتیجے میں واقع ہوئی ہے لیکن اس کی موت نے اسے بہت رنجیدہ کیا تھا۔ وہ اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد ان دنوں رانا ہاؤس میں کچھ عرصے آرام کی غرض سے ٹھہرا ہوا تھا۔ جیسے ہی اسے حادثے کی اطلاع ملی، اس نے اپنی ممانی مسز آفرین کے روکنے کے باوجود واپسی کا فیصلہ کرلیا اور اب ماہ بانو کی لاش کو لے جانے والی ایمبولینس کے ساتھ ساتھ اس کی گاڑی بھی دوڑ رہی تھی۔ گاڑی کو مشابرم خان چلا رہا تھا۔ وہ خود اس حادثے پر بہت رنجیدہ تھا۔ وہ لڑکی جس کی زندگی بچانے کے لیے اس کے دوست نے اپنی جان کی قربانی دی تھی، وہ اس طرح مرگئی تھی تو یہ اس کے لیے بھی دکھ کا مقام تھا۔ شہریار کے چہرے سے البتہ اس کی اندرونی کیفیت کا صحیح طرح اندازہ لگانا مشکل تھا۔ وہ بالکل چپ تھا اور اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے لاش کی شناخت بتانے والے نیلے پھولوں والی سیاہ چادر کے ٹکڑوں کو ضرور ملاحظہ کیا تھا لیکن لاش کا چہرہ دیکھنے کی خواہش نہیں کی تھی۔ شاید وہ بھی یہ بات سمجھتا تھا کہ یہ خواہش بے سود ہے۔ گرنے والی اینٹوں کی ضرب اور آگ کے شعلوں سے مسخ ہوجانے والے چہرے کو دیکھ کر سوائے تکلیف کے حاصل بھی کیا ہونا تھا۔ ساتھ ساتھ چلتی اس کی گاڑی اور ایمبولینس اس کے دفتر کے قریب پہنچ کر ایک دوسرے سے الگ ہوگئیں۔ وہ اپنے دفتر پر رک گیا تھا جبکہ ایمبولینس کو ابھی پیرآباد تک کا سفر طے کرنا تھا۔ دفتر میں عبدالمنان نے اس کا استقبال کیا۔ وہ خود بھی اس حادثے سے متاثر لگ رہا تھا۔

''کیا حال ہے... سب ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے؟''
اپنے دفتر میں پہنچ کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے عبدالمنان سے دریافت کیا۔

''یس سر! ایوری تھنگ از فائن۔ یہاں کے معاملات کے بارے میں، میں آپ کو فون پر مطلع کرتا ہی رہا ہوں۔ ایس پی نے کوشش کی تھی کہ اے ایس آئی اور کانسٹیبل کے قتل والے معاملے پر کوئی ایشو کھڑا کر سکے لیکن زخمی سپاہیوں کے بیانات کی وجہ سے اسے موقع نہیں مل سکا۔ کچھ ڈی آئی جی صاحب کی مداخلت کی وجہ سے بھی اسے دبنا پڑا۔ آپ بتائیں، اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ زخم ٹھیک تو ہے'' عبدالمنان نے بھانپ لیا تھا کہ شہریار کی خاموشی کے بہت بڑا طوفان چھپا ہوا ہے لیکن از خود اسے چھیڑنے کے بجائے گفتگو کو اس کے سوال کا جواب دینے اور اس کی پوچھنے تک محدود رکھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں اسی لیے چھٹی ختم کر کے واپس آگیا ہوں۔ اب ہمیں بہت تیزی سے اپنے منصوبوں پر کام کرنا ہوگا۔ میں اس بات کا بندوبست کر رہا ہوں کہ کم از کم اسکول اور صحت کے مراکز کی تعمیر میں ہمیں کسی قسم کی مداخلت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ پیرآباد والے اسکول کا کام تو بس مکمل ہی ہونے والا ہوگا۔ اسکول مکمل ہوجائے تو اس کے افتتاح اور مرکز صحت کا سنگِ بنیاد رکھنے کے کام ساتھ انجام دے دیے جائیں گے۔'' اس نے تفصیل سے اپنے منصوبے کو بیان کیا۔

''یہ تو بہت اچھی خبر ہے سر! ان منصوبوں پر جتنی جلد عمل درآمد کیا جاسکے اچھا ہوگا۔ ابھی حال ہی میں پیرآباد کی ایک لڑکی بروقت طبی امداد نہ ملنے کی وجہ سے مری ہے۔ لڑکی کا نام نگار تھا۔ وہ ماہ بانو کی بڑی بہن تھی۔ بے چارے غریب لوگوں پر آفت ٹوٹ پڑی ہے۔ آگے پیچھے دو جوان لڑکیاں اپنی جان سے چلی گئی ہیں۔'' روانی میں عبدالمنان غلطی سے ماہ بانو کا ذکر چھیڑ بیٹھا۔ یہ ذکر سن کر شہریار پل بھر کو چپ ہوا اور پھر میز کی دراز میں کچھ تلاش کرتے ہوئے بولا۔ ''اس طرف کی خیر خبر لے لینا عبدالمنان! تدفین کے سلسلے میں یا کسی اور معاملے میں ان لوگوں کو کوئی ضرورت ہو تو ان کی مدد کر دینا۔''

''او کے سر! میں خیال رکھوں گا... اور کوئی حکم؟'' ہدایت کے جواب میں اس نے مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں، فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔ میں نے موتی کے وکیل سے بات کرلی ہے۔ بورڈ کے تینوں وکلا نے بڑے اسپتال کے بجائے چھوٹے ہیلتھ یونٹس کے قیام کی منظوری دے دی ہے۔ کل تم ہمارے منصوبے کی تفصیلات کا ڈرافٹ تیار کرلینا۔ میں ایک آدھ دن میں بورڈ کے ممبران، انجینئرز اور کنٹریکٹرز وغیرہ کی ایک میٹنگ کروانے کا ارادہ رکھتا ہوں تاکہ اخراجات کا تخمینہ لگا کر باقاعدہ کام کا آغاز کیا جاسکے۔'' وہ ایک بار پھر موضوع بدل گیا تھا۔

''ٹھیک ہے سر! میں کل دوپہر تک یہ کام نمٹالوں گا۔''

اس بار عبدالمنان نے بھی احتیاط سے کام لیا اور ایسا کوئی لفظ منہ سے نہ نکالا جو اس موضوع کو چھیڑنے کا سبب بنے جس سے وہ واضح طور پر گریز کرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

☆☆☆

چودھری افتخار اپنی حویلی میں سر تھامے بیٹھا تھا۔ ماہ بانو کی موت نے ساری بازی ہی الٹ دی تھی۔ وہ جس سیمیں بدن کو اپنی دسترس میں دیکھنے کا خواہش مند تھا، اسے اس سے پہلے موت نے اپنے شکنجے میں دبوچ لیا تھا۔ وہ جو خود موت کا ہرکارہ بنا لوگوں میں موت بانٹتا پھرتا تھا، جس کے حکم سے اس کے کارندے لمحوں میں اس کے دشمنوں کی زندگی کا چراغ گل کر دیتے تھے، خود موت کے ہاتھوں شکست کھا گیا تھا۔ اب چاہے وہ دنیا الٹ کر رکھ دیتا لیکن ماہ بانو اس کے ہاتھ نہیں آنے والی تھی۔ ماہ بانو کو حاصل کرنے کے اس کے سارے دعوے دھرے کے دھرے رہ گئے تھے۔ اسے گمان بھی نہیں تھا کہ وہ اس صورتِ حال سے دوچار ہوگا۔ بالے کی طرف سے یہ اطلاع ملنے پر کہ اشتہار کے نتیجے میں ایک شخص کی طرف سے کال آئی ہے کہ وہ لڑکی کے ٹھکانے سے واقف ہے اور وہ شخص دولاکھ کے عوض انہیں اس ٹھکانے تک پہنچا سکتا ہے، وہ خوشی سے اچھل پڑا تھا اور فوری طور پر دولاکھ کی ادائیگی کے لیے تیار ہوگیا تھا۔ دولاکھ اس کے لیے کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ اس معمولی رقم کے بدلے اسے نہ صرف ماہ بانو مل جاتی بلکہ وہ شہریار کو بھی شکست سے دوچار کر دیتا لیکن جب بالے کی طرف سے اگلی خبر آئی کہ ماہ بانو ایک حادثے کے نتیجے میں ہلاک ہوگئی ہے تو اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وہ فون پر ہی بہت دیر تک بالے پر گرجتا اور اسے گالیاں دیتا رہا لیکن اس سب سے کیا حاصل ہونا تھا؟ حقیقت تو بہرحال، اپنی جگہ موجود تھی جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا تھا۔

''غیاثے کی کڑی کی لاش پہنچ گئی ہے سرکار! ابھی ابھی ایک بندہ خبر لے کر آیا ہے کہ لاہور سے ایمبولینس لاش لے کر آئی ہے۔ کہتے ہیں لاش کی حالت بڑی خراب ہے۔ ایک آدھ بندے نے ہی چہرہ دیکھا ہے اور دیکھ کر کان پکڑ لیے ہیں۔ غیاثے کی برادری کے بزرگوں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب کسی کو لاش کا چہرہ نہیں دیکھنے دیں گے۔ سنا ہے نوراں بڑی تڑپ رہی تھی اپنی دھی کے چہرے کو دیکھنے کے لیے لیکن عورتوں نے اسے پکڑ کر قابو میں کر رکھا ہے اور اسے لاش کے قریب نہیں جانے دے رہے ہیں۔ لاش کو کفن تو لاہور سے ہی پہنا کر بھیجا گیا ہے، یہاں قبر تیار ہوتے ہی اسے دفنا بھی

دیں گے۔'' منشی اللہ رکھا اجازت لے کر اندر آیا اور چودھری کو مفصل رپورٹ سنائی۔

''تدفین کے بعد حویلی سے غیاث محمد کے گھر کھانا بھجوا دینا اور اس سے کہنا کہ مجھ سے آ کر ملے۔'' منشی کی ساری بات سننے کے بعد اس نے اسے حکم دیا۔

''بہتر چودھری صاحب! میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔ غیاث محمد تو خوش ہو جائے گا کہ آپ نے اسے معاف کر دیا ہے۔'' منشی خوشامدی لہجے میں بولا۔

''میں نے غیاثے سے کہا تھا کہ اس کی دھی زندہ یا مردہ کسی بھی صورت میں مجھے ملے گی، تب ہی اس کی خلاصی ہوگی۔ اب وقت آ گیا ہے کہ میں اپنی بات پوری کروں۔ ویسے بھی اس معاملے میں مجھے اصل حساب غیاث محمد سے نہیں، دوسروں سے لینا ہے۔ غیاث محمد کی کیا حیثیت ہے کہ میرا اس سے کوئی حساب کتاب بنے۔ حساب تو ان کو دینا ہوگا جو دوست بن کر پیچھے سے دشمنی نبھاتے رہے ہیں۔ موتی والا کا معاملہ تو بالکل کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ جس بندے نے بالے کو ماہ بانو کے بارے میں خبر دی تھی، اس نے بھی یہی بتایا ہے کہ وہ اتنے دنوں سے موتی والا کے گھر چھپی ہوئی تھی۔ وہاں اسے کس نے پہنچایا، میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ موتی والا تو پہلے ہی اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے، اب میرے اس دوسرے دشمن کو بھی حساب دینا ہوگا۔ میں اسے چھوڑوں گا ہرگز نہیں۔ اسے پتا چل جائے گا کہ اس نے چودھری افتخار عالم شاہ سے بیر لیا تھا۔'' چودھری بہت غضب میں تھا۔ منشی جانتا تھا کہ اس کے غصے کا رخ کس کی طرف ہے۔ چنانچہ اپنی نمک خواری جتانے کو بڑے جوش سے بولا۔

''آپ فکر نہ کریں سرکار! آپ کی آن پر ہم سب اپنی جانیں نچھاور کر دیں گے۔ آپ بس صرف اشارہ کر دیں پھر دیکھیے گا کہ آپ کے دشمن کا کیا انجام ہوتا ہے۔''

''ابھی کچھ نہیں کرنا۔ ابھی جو میں نے اس بچونگڑے کو پہلا سبق دیا ہے، اس کا نتیجہ سامنے آنے دے۔ میرے خیال میں تو جس مامے کی گود میں بیٹھ کر وہ مجھ سے کھیلنے کی کوشش کر رہا ہے، وہ ماما خود ہی اسے سمجھا دے گا کہ چودھری افتخار سے کھیلنا بچوں کے بس کی بات نہیں۔ اگر وہ اپنے مامے کی بات سمجھ گیا تو اس کے حق میں بہتر ہوگا۔ میں تھوڑی بہت چوٹ دے کر اسے معاف کر دوں گا لیکن اگر وہ نہیں سمجھا تو پھر سارے اگلے پچھلے حساب دینے ہوں گے۔'' چودھری کا عجیب حال تھا۔ ایک طرف اس کا دل چاہتا تھا کہ ماہ بانو کو خود سے چھین لینے کے جرم میں شہریار کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے

مگر پھر اس غصے پر مصلحت پسندی حاوی ہونے لگتی اور وہ سوچتا کہ براہِ راست تصادم کے بغیر ہی کسی طرح بات بن جائے تو اچھا ہے۔ شدید غصے کے ساتھ ساتھ اپنے مفادات کے تحفظ کا خیال اسے کسی ایک فیصلے پر نہیں پہنچنے دے رہا تھا۔

''جیسا آپ حکم دیں گے ویسا ہی ہوگا سرکار! ہم آپ کے نمک خوار اور حکم کے غلام ہیں۔ آپ کی خوشی جس میں ہوگی، ہم وہی کریں گے۔'' مزاج شناس منشی نے ایک بار پھر اسے مکھن لگایا۔

''ٹھیک ہے اوئے! مجھے معلوم ہے تم لوگوں کی وفاداری کا۔ اب جا یہاں سے اور جو میں نے کہا ہے وہ کر۔ میں بھی اب تھوڑی دیر آرام کروں گا۔'' منشی کی خوشامد کے جواب میں خوش ہونے کے بجائے اس نے اسے پھٹکار سے نوازا۔ اس کا موڈ دیکھ کر منشی چپ چاپ باہر نکل گیا۔

چودھری اپنے شان دار بستر پر آ لیٹا۔ تکیے کے نیچے اب بھی ماہ بانو کی تصویریں رکھی تھیں۔ اس نے تصویریں نکالیں اور ایک نظر دیکھنے کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ کوئی اس کے عشق میں مبتلا نہیں تھا کہ تاحیات ان تصویروں کو اپنے سینے سے لگا کر ٹھنڈی آہیں بھرتا رہتا۔ یہ تصویریں تو اس نے اپنا آتشیں شوق بھڑکانے کے لیے سنبھال رکھی تھیں۔ تصویروں کو دیکھ کر وہ اس تصور سے خود کو بہلاتا رہتا تھا کہ جب یہ ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی، چاندی جیسی رنگت ترشے ہوئے بدن والی لڑکی اس کی خلوت میں آئے گی تو وہ کس طرح اسے برتے گا۔ اب جبکہ یہ امکان ہی سرے سے ختم ہو گیا تھا تو تصور کی دنیا سجا کر بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی۔ دل بہلانے کے لیے اس کے پاس اور بھی بہت ذرائع تھے۔ تصویروں کے ٹکڑے کرنے کے بعد وہ ٹیلی فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کی انگلیاں حُسن کی دکان چلانے والی اس نائکا کا نمبر ڈائل کر رہی تھیں جو اس کے ذرا سے اشارے پر ایک سے بڑھ کر ایک ہیرا چن کر اس کے ڈیرے پر بھیج دیتی۔ ماہ بانو کا غم غلط کرنے کے لیے اس کی عیاش فطرت نے اسے یہی راہ دکھائی تھی۔

☆☆☆

شہریار نے طائرانہ نظروں سے مصروفِ عمل مزدوروں کا جائزہ لیا۔ وہ بہت تن دہی سے اسکول کے نوتعمیر شدہ کمروں میں رنگ و روغن کا کام کر رہے تھے۔ کام کی رفتار بے حد تسلی بخش تھی اور اسے امید تھی کہ دو دن بعد جب اسکول کی افتتاحی تقریب منعقد کی جائے گی تو نہ صرف سارا کام مکمل ہو چکا ہوگا بلکہ کاٹھ کباڑ سمیٹ کر صفائی وغیرہ بھی کر دی

جائے گی۔ اپنے اسی خیال کا اظہار اس نے ساتھ کھڑے ماسٹر آفتاب سے بھی کیا۔

''کام تو بہت اچھے طریقے سے ہو رہا ہے۔ میرے خیال میں دو دن تک سارا کام مکمل ہو جائے گا۔''

''دو دن نہیں سر، انشاء اللہ کل شام تک رنگ و روغن اور صفائی کا کام مکمل ہو جائے گا۔ پرسوں صبح یہاں اسکول کے لیے ڈیسکیں اور میزیں کرسیاں بھی پہنچ جائیں گی۔ بچے نئی کلاسوں اور فرنیچر وغیرہ کے خیال سے بڑے خوش ہیں۔ اس وقت ان میں اتنا جوش بھرا ہوا ہے کہ باقی کے سارے کام ہم ان کی مدد سے ہی مکمل کروا لیں گے۔'' ماسٹر آفتاب کی اپنی آواز میں بڑا جوش تھا۔

''فرنیچر...؟ میں نے تو اس سلسلے میں کوئی آرڈر نہیں دیا تھا۔ کیا عبدالمنان نے اسکول کے لیے فرنیچر کا انتظام کیا ہے؟''

''نہیں سر! اصل میں، میں نے خود ہی فرنیچر کے لیے آرڈر دے دیا تھا۔ اپنی کتاب کی اشاعت کے بارے میں تو میں نے آپ کو بتایا ہی تھا، بس اسی کی رائلٹی کا چیک ملا تھا تو میں نے سوچا کہ اس رقم سے اسکول کے لیے فرنیچر کا انتظام کر دیا جائے۔'' ماسٹر آفتاب نے شرماتے ہوئے اس کے سوال کا جواب دیا۔

''آئی ایم پراؤڈ آف یو آفتاب! اتنے سارے بے ایمانوں اور لٹیروں کے درمیان تم جیسے شخص کو دیکھتا ہوں تو میرا حوصلہ بڑھ جاتا ہے اور کچھ کر دکھانے کی امنگ نئے سرے سے جاگ اٹھتی ہے۔'' اس نے بے ساختہ ہی آفتاب کے شانے کو تھپتھپاتے ہوئے اس کی کارکردگی کو سراہا۔

''میں تو اپنے حصے کا فرض انجام دینے کی کوشش کرتا ہوں سر... بس خوشی اس بات کی ہے کہ آپ جیسے قدر دان شخص کا ساتھ میسر آ گیا ہے۔ افتتاحی تقریب کے لیے میں نے اپنے ساتھی نیچر کے ساتھ مل کر کچھ منصوبہ بندی کی ہے۔ میں چاہ رہا ہوں کہ اس پر آپ سے رائے لے لوں تاکہ کوئی کمی محسوس نہ ہو۔'' آفتاب نے عاجزی سے جواب دیتے ہوئے گفتگو کا رخ دو دن بعد ہونے والی تقریب کی طرف موڑ دیا۔

''مجھے اس سلسلے میں تمہاری صلاحیتوں پر پورا اعتماد ہے۔ ظاہر ہے، بہ طور صحافی تمہارا مشاہدہ بہت وسیع ہے اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ایسے مواقع پر کس قسم کے انتظامات کیے جاتے ہیں لیکن اپنی تسلی کے لیے چاہو تو مجھے بتا بھی سکتے ہو۔''

''میرا مشاہدہ اور تجربہ اپنی جگہ لیکن یہاں جو انتظامات کیے گئے ہیں، وہ اپنے بجٹ کو اور دستیاب سہولیات کو سامنے رکھتے ہوئے محدود پیمانے پر کیے گئے ہیں۔ میں نے اس بات کا انتظام کر لیا ہے کہ اسکول کی عمارت، ڈسپنسری کے اردگرد کے علاقے اور پیر آباد کے داخلی راستے پر کاغذ کی رنگ برنگی جھنڈیاں لگائی جائیں۔ خاص خاص راستوں پر ہم چونا ڈال کر اسے صاف کرنے کا انتظام بھی کر لیں گے۔ بچوں کی مدد سے چھوٹا سا ورائٹی شو بھی ارینج کر لیا جائے گا۔''

''اس طرف سے تم بے فکر رہو۔ آخر یہ چودھری افتخار کس مرض کی دوا ہے؟ یہ سارا انتظام اس کے خرچے پر ہوگا۔''

''چودھری صاحب اس سلسلے میں تعاون پر راضی ہو جائیں گے؟ وہ تو سخت خلاف ہیں اسکول کے۔'' شہریار کی تسلی پر اس نے تشویش کا اظہار کیا۔

''مخالفت اپنی جگہ، نام بنانے کا موقع اپنی جگہ۔ اس طرف سے فارغ ہو کر میں چودھری کی حویلی ہی جاؤں گا اور مجھے یقین ہے کہ وہ ازخود ہمیں پیش کش کرے گا کہ آنے والے مہمانوں کی خاطر مدارات اس کی حویلی میں کی جائے۔ باقی اخراجات کی طرف سے بھی تم فکرمند مت ہونا۔ آرام سے خرچہ کرو اور سارا حساب کتاب بنا کر مجھے دے دو۔ اس خرچے کی وصولیابی میں اس موبائل کمپنی کے مالکوں سے کروں گا۔ سرکاری زمین پر اپنی کمپنی کا ٹاور نصب کرنے کے سلسلے میں ان پر جو حساب کتاب بنتا ہے وہ الگ ہے، میں ایک دوسرا کھاتا اسٹیج پر ان کی کمپنی کا بینر لگوا کر کھلوا لوں گا۔ تمہیں معلوم ہی ہے کہ یہ کمرشل ازم کا زمانہ ہے۔ موبائل کمپنی والے خوشی سے اس بات پر راضی ہو جائیں گے کہ اپنے بینرز لگوا کر بدلے میں ہمیں ٹھیک ٹھاک رقم ادا کر دیں۔ آخر اس تقریب کی کوریج پرنٹ اور الیکٹرانک دونوں طرح کے میڈیا پر ہونی ہے۔ موبائل کمپنی والے اپنی پبلسٹی کا یہ موقع ہرگز بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیں گے۔'' شہریار کے جواب سے اسے اندازہ ہوا کہ اس کا ہوم ورک بالکل مکمل ہے۔ کیوں نہ ہوتا... آخر کو وہ ایک بیوروکریٹ تھا جس کی پرورش بیوروکریسی اور سیاست کے دوآتشہ ماحول میں ہوئی تھی۔

''یہ تو بہت اچھی خبر سنائی آپ نے سر! اب آپ دیکھیے گا کہ تقریب کا کتنا اچھا انتظام کرواتا ہوں میں۔'' وہ حسبِ عادت پُرجوش ہو گیا۔ پھر ایک طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''لیجیے، وہ لوگ بھی واپس آ گئے۔'' شہریار نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔ کچے راستے پر اسی جانب ہی دوڑتی ہوئی آنے والی گاڑی اس کے اپنے دفتر کی تھی۔ اس گاڑی میں عبدالمنان، آفتاب کا ساتھی نیچر نیب اور وہ ٹھیکے دار سوار تھا جس سے مرکزِ صحت کی تعمیر کے سلسلے میں ان لوگوں کا کنٹریکٹ ہوا تھا۔ وہ لوگ اس پرانی ڈسپنسری کا جائزہ

لینے گئے تھے جسے وسعت دے کر مرکزِ صحت کی نئی اور جدید عمارت تعمیر کی جانی تھی۔

''ڈسپنسری کی عمارت تو بڑی خراب حالت میں ہے۔ ایک تو دیکھ بھال صحیح طرح نہیں ہوئی، دوسرے عمارت میں میٹریل بھی اچھا نہیں لگا ہوا اس لیے جگہ جگہ دیواروں میں دراڑیں پڑی ہوئی ہیں۔ چھت کی حالت بھی ایسی ہے کہ مجھے یقین ہے بارشوں کے موسم میں چھت بری طرح ٹپکتی ہوگی۔ اگر آپ میرا مشورہ مانیں تو اس پرانی عمارت کو بلڈوز کر کے مکمل نئی عمارت بنائی جائے تاکہ کام پکا ہو۔'' گاڑی ان کے قریب آ کر رکی تو ٹھیکے دار گاڑی سے اترتے ہی بولنا شروع ہوگیا۔

''ٹھیک ہے، جیسا آپ مناسب سمجھیں۔ میرا اپنا بھی یہی اندازہ تھا اسی لیے میں نے آپ کو خاص طور پر وہاں وزٹ کے لیے بھیجا تھا۔ آپ نے اپنی نظروں سے سب کچھ دیکھ لیا ہے، اب اس کے مطابق تیاری شروع کر دیں۔ جنرل صاحب کے ہاتھوں سنگِ بنیاد رکھے جانے کے بعد کام کا باقاعدہ آغاز کرنا ہوگا اور تیزی سے اسے مکمل بھی کرنا ہوگا۔ اگر آپ کی کارکردگی اطمینان بخش ہوئی تو ہم اپنے اگلے کنٹریکٹس بھی آپ کے ساتھ کرنے میں خوشی محسوس کریں گے۔ یہ بات تو میں نے آپ پر پہلے ہی واضح کر دی ہے کہ یہ کوئی سرکاری پروجیکٹ نہیں ہے اس لیے سارے کام کا بہت سختی سے جائزہ بھی لیا جائے گا اور پورا حساب کتاب بھی رکھا جائے گا۔''

''بالکل جناب! آپ فکر ہی نہ کریں۔ میں اپنا کام ایمان داری سے کر کے حلال روزی کمانے والا بندہ ہوں۔ آپ کو مجھ سے کوئی شکایت ہو، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' شہریار کی بے حد سنجیدگی سے کہی گئی بات پر ٹھیکے دار نے زور و شور سے یقین دلایا۔

''عبدالستان! تم ان کی روانگی کا انتظام کر دو۔ ہمیں تو یہاں ابھی کافی وقت لگے گا۔ ٹھیکے دار صاحب معروف آدمی ہیں، انہیں واپسی کی جلدی ہوگی۔'' ٹھیکے دار کی یقین دہانی پر کسی بھی قسم کا ردِعمل ظاہر کیے بغیر اس نے عبدالستان کو ہدایت دی۔

''میں چائے تیار کرتا ہوں سر! آپ لوگ چائے پی کر جائیے گا۔'' ان لوگوں کو جانے کے لیے پر تولتے دیکھ کر ماسٹر آفتاب نے جلدی سے پیش کش کی۔

''نہیں بھئی، فی الحال ان تکلفات میں پڑنے کا بالکل بھی وقت نہیں۔ ابھی بہت سے کام نمٹانے ہیں۔ ہاں اگر ٹھیکے دار صاحب چاہیں تو تم انہیں چائے پلا سکتے ہو۔''

''نہیں، میں بھی اب چلوں گا۔ بہت بہت شکریہ۔'' اس نے انکار کرتے ہوئے ٹھیکے دار کی طرف اشارہ کیا تو اس نے بھی جلدی سے معذرت کر لی اور وہاں موجود لوگوں سے ہاتھ ملا کر رخصت ہوگیا۔ اس کے رخصت ہوتے ہی ان لوگوں نے بھی ماسٹر آفتاب اور منیب سے رخصت لی۔ حسبِ پروگرام ان کا رخ حویلی کی طرف تھا۔ چودھری سے لاکھ اختلافات اور عداوت کے باوجود اس موقعے پر اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ اس علاقے کا سب سے زیادہ اثر رسوخ رکھنے والا بندہ تھا۔ پیر آباد میں کچھ کیا جاتا اور اس میں چودھری کی شمولیت نہ ہوتی، یہ ممکن نہیں تھا اس لیے انہیں دو دن بعد ہونے والی تقریب کے سلسلے میں لازماً اسے باقاعدہ طور پر اطلاع دینی تھی۔

''ذرا یہاں روک لو۔'' وہ لوگ اسکول سے حویلی کی طرف جانے والے راستے پر گامزن تھے کہ راستے میں دکھائی دینے والی گاؤں کی اکلوتی مسجد کو دیکھتے ہوئے شہریار نے ڈرائیور کو حکم دیا۔ وہ کافی عرصے سے اس بات کا خواہش مند تھا کہ مسجد کے پیش امام سے ملاقات کر سکے لیکن ہمیشہ پیر آباد آنے پر دیگر معاملات میں اس طرح الجھ جاتا تھا کہ اس ملاقات کا موقع ہی نہیں نکل پاتا تھا۔ اپنے ذہن میں آنے والے ایک خیال کے تحت اس وقت اس نے امام مسجد سے ملاقات کا موقع نکال ہی لیا۔ ڈرائیور نے گاڑی مسجد کے قریب لے جا کر روکی تو وہ اور عبدالستان گاڑی سے نکل آئے۔ مسجد کے دروازے سے اندر داخل ہونے کے بعد انہوں نے اپنے جوتے اتارے اور اس سمت بڑھ گئے جہاں سے بچوں کے قرآن پڑھنے کی آواز آ رہی تھی۔ مسجد بہت زیادہ بڑی نہیں تھی لیکن اس کی تعمیر اچھے طریقے سے کی گئی تھی۔ آوازوں کے تعاقب میں وہ جس دروازے تک پہنچے، وہ ایک ہال نما کمرے میں کھل رہا تھا۔ دروازے پر ہی رک کر انہوں نے اندر کا جائزہ لیا۔ فرش پر بچے ایک قطار میں بیٹھے ہل ہل کر اپنے سامنے رکھے سپاروں سے سبق پڑھ رہے تھے۔ نسبتاً اونچی مسند پر ایک صحت مند آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ آدمی کا رخ بچوں کی طرف تھا اور دروازے سے جھانکنے پر ان لوگوں کو اس کی صرف پشت نظر آ رہی تھی۔ اس آدمی کے بائیں جانب ایک بچہ کھڑا اس کا بازو دبا رہا تھا۔

''ایسا سا نہیں آیا آج بھی۔ جا کر بول دینا اس کے ماں پیو کو... اگر اب اس نے ایک دن بھی اور چھٹی کی تو میں چھتر سے اس کی وہ دھنائی کروں گا کہ کھال اتر جائے گی سالے کی۔ جس دن سے بہن مری ہے، اس نے ادھر کا رخ ہی نہیں کیا۔ لگتا ہے بہن کے ساتھ خود بھی قبر میں جا کر دفن ہو گیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اب اسے اپنے گھر میں ہی تر نوالے مل رہے ہیں اس لیے ادھر کا رخ نہیں کر رہا۔ جب گھر میں فاقے پڑ رہے تھے تو دوڑ دوڑ کر میرے پاس آتا تھا۔'' وہ بہت قہرناک لہجے میں بول رہا تھا مگر پھر شاید اس نے اپنے سامنے بیٹھے بچوں کی توجہ دروازے کی طرف محسوس کر لی اور خود بھی پلٹ کر اس طرف دیکھا۔ باقاعدہ ملاقات نہ ہونے کے باوجود شہریار اور عبدالستان کے چہرے اس کے لیے نامانوس نہیں تھے۔ عرس کے موقعے پر وہ ان لوگوں کو دیکھ چکا تھا، اب جو اس نے انہیں وہاں موجود پایا تو گھبرا کر کھڑا ہوگیا۔

''آیئے آیئے، تشریف لایئے۔ میری خوش قسمتی کہ آج آپ لوگوں نے اس جگہ کو رونق بخشی۔'' اس کا انداز اتنا فدویانہ تھا کہ لگتا تھا، اس کا بس نہ چل رہا ہو کہ ان کے قدموں میں بچھ جائے۔ ہاتھ ملانے کے لیے اس نے شہریار کا ہاتھ تھاما تو پھر چھوڑا ہی نہیں اور اسے تقریباً کھینچتے ہوئے اپنی مسند تک لے گیا۔

''تشریف رکھیے۔'' شہریار کا ہاتھ تھامے تھامے ہی اس نے زبردستی اسے مسند پر بٹھانے کی کوشش کی۔

''نہیں مولوی صاحب! میں نیچے ہی بیٹھوں گا۔ بچے قرآن لے کر نیچے بیٹھے ہوئے ہیں، میرا اوپر بیٹھنا مناسب نہیں۔'' وہ مولوی سے اپنا ہاتھ چھڑا کر بچوں کے قریب ہی نیچے بیٹھ گیا۔ اس کی اس حرکت پر کھسیاتے ہوئے مولوی نے بھی پیروی کی اور خود اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

''آپ کو کوئی کام تھا تو مجھے زحمت دی ہوتی جناب! میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔''

''نہیں مولوی صاحب! آنا تو مجھے ہی تھا، بس وقت کی قلت کی وجہ سے اب تک آ نہیں سکا تھا لیکن اب بہت ضروری ہو گیا تھا کہ میں آپ سے ملاقات کر لوں۔'' مولوی کا خوشامدانہ انداز اسے کوفت میں مبتلا کر رہا تھا لیکن پھر بھی وہ اسے عزت دے کر ہی بات کر رہا تھا۔ خاص طور پر یہاں آتے ہی اس نے مولوی کی جس طرح کی زبان سنی تھی اور اسے جس انداز میں بیٹھے دیکھا تھا، یہ دیکھ کر اس کا دل بہت خراب ہوا تھا لیکن وہ اس بات سے بھی واقف تھا کہ اس قسم کے دیہی ماحول میں مولویوں وغیرہ کو خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے اس لیے ان میں خود بہ خود ہی ذرا سا تکبر پیدا ہو جاتا ہے۔

''آپ حکم کیجیے جناب! آپ کے حکم کی تعمیل کر کے مجھے دلی خوشی ہوگی۔''

''حکم نہیں بس ایک چھوٹا سا کام ہے۔ دو دن بعد گاؤں میں اسکول کے افتتاح اور مرکزِ صحت کے سنگِ بنیاد رکھنے کے سلسلے میں ایک تقریب منعقد کی جا رہی ہے۔ تقریب کا آغاز اللہ کے بابرکت نام سے ہو، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ تقریب میں تشریف لا کر تلاوت قرآن پاک کر دیجیے گا۔'' یہ کوئی ایسا کام نہیں تھا جس کے لیے وہ خود چل کر مولوی کے پاس آتا لیکن مسجد کے مولوی کی گاؤں کے ماحول میں اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ اس سے تعلقات بہترین رکھنے کا خواہش مند تھا۔ دوسرے اسکول اور مدرسے کے درمیان پائی جانے والی کھینچا تانی کو بھی اس موقعے پر ختم کرنا ضروری تھا اس لیے وہ خود سے چل کر یہاں آیا تھا۔

''آپ کہتے ہیں تو میں آ جاؤں گا، ویسے ذاتی طور پر میں اسکول کو پسند نہیں کرتا۔ نہ جانے کون ہیں یہ ماسٹر لوگ جو انگریزی تعلیم کے ذریعے گاؤں کے سیدھے سادے لوگوں کو بگاڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' مولوی صاحب نے فوراً ہی اپنی ناپسندیدگی ظاہر کر دی۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے مولوی صاحب! اسکول میں ایسی کوئی تعلیم نہیں دی جاتی جس سے بچوں کے بگڑنے کا کوئی خطرہ ہو۔ آج کے دور میں بچوں کو دینی اور دنیاوی دونوں طرح کی تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے بلکہ آج کے دور کی کیا بات ہے، سرسید احمد خان جیسے لیڈر نے تو برسوں پہلے بھی اس بات پر زور دیا تھا کہ مسلمانوں کو اگر ترقی کرنی ہے تو دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم بھی حاصل کرنی ہوگی۔'' اس نے انہیں قائل کرنے کے لیے دلیل دی لیکن مولوی اتنی آسانی سے قائل ہونے والا بندہ نہیں تھا، اس کی دلیل سن کر فوراً ہی بولا۔

''اس وقت کی بات چھوڑیں جناب، وہ وقت الگ تھا۔ تب ہم آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے لیکن اب تو ہمیں حق حاصل ہے کہ اپنے ملک میں اپنی مرضی کی تعلیم اپنے بچوں کو دیں۔''

''وقت ابھی بھی نہیں بدلا مولوی صاحب! ابھی ہماری آزادی مکمل نہیں ہوئی۔ ابھی ہمیں اپنے لوگوں کے ذہنوں کو آزاد کروانا ہے لیکن اس وقت آپ اس ساری بحث کو جانے دیجیے اور مجھ سے اتنا تعاون کیجیے کہ مدرسے کے اوقات کچھ اس طرح طے کر لیں کہ مدرسے اور اسکول کے اوقات کے درمیان تصادم نہ ہو اور بچے دونوں جگہ جا سکیں۔'' شہریار نے بحث کے بجائے برسرِ مطلب آنا زیادہ مناسب سمجھا۔

''مدرسے کے اوقات بدلنا تو بہت مشکل ہے، آپ

اسکول کے اوقات میں ہی کچھ تبدیلی کرلیں۔'' مولوی کے جواب سے ظاہر ہوگیا کہ وہ جتنی فرماں برداری اور تابع داری کا مظاہرہ کررہا تھا، درحقیقت اتنا تھا نہیں۔ یقیناً وہ ان لوگوں میں سے تھا جو پیٹ میں ڈاڑھی رکھتے ہیں۔

''اس معاملے کو بعد میں دیکھ لیا جائے گا۔ فی الحال ہم چلتے ہیں۔ ابھی چودھری افتخار صاحب سے بھی ملاقات کرنی ہے۔'' مولوی کا انداز دیکھ کر اس نے مزید اسے منہ لگانا مناسب نہیں سمجھا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ عبدالمنان نے بھی اس کی پیروی کی۔

''ارے بھئی، ایسے کیسے جاسکتے ہیں آپ؟ کچھ چائے پانی تو پیتے جائیں۔'' مولوی زیرک آدمی تھا۔ اس کے مزاج کی برہمی کو بھانپ گیا اور اسے روکنے کی کوشش کرنے لگا۔

''نہیں مولوی صاحب! اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ ویسے بھی ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' وہ باوجود اصرار کے ایک منٹ بھی وہاں مزید ٹھہرنے پر راضی نہ ہوا۔

☆☆☆

''آپ نے تو پلا ہی بالا سارا پروگرام طے کرلیا۔ آخر میں اس علاقے کا نمائندہ ہوں۔ پیر آباد میری ملکیت ہے۔ یہاں کچھ بھی کرنے سے پہلے آپ کو مجھے اطلاع تو دینی چاہیے تھی۔'' چودھری افتخار کی حویلی پہنچنے کے بعد اس نے اسے تقریب کے حوالے سے دعوت دی تو اس کا منہ بن گیا اور وہ شکوہ کرنے لگا۔

''ہم آپ کو اطلاع دینے ہی تو آئے ہیں چودھری صاحب! اصل میں سارا پروگرام بڑی عجلت میں طے پایا اس لیے پہلے سے آپ سے باقاعدہ کوئی میٹنگ کرنے کی مہلت نہیں مل سکی۔ بہرحال، ہمیں آپ کی اس علاقے میں اہمیت کا احساس ہے اس لیے تو میں خود آپ کو دعوت دینے کے لیے آیا ہوں۔ بے شک اسکول اور مرکزِ صحت کی تعمیر سرکاری زمین پر ہورہی ہے اور فنڈز بھی ہمیں کہیں اور سے ملے ہیں لیکن آپ کی اہمیت سے انکار تھوڑی کیا جاسکتا ہے۔ آپ تشریف لائیں گے تو تقریب میں چار چاند لگ جائیں گے۔ آپ کی حیثیت تقریب میں مہمان کے بجائے میزبان کی ہوگی۔ آخر آپ پیر آباد کے چودھری ہیں۔''

اس نے بہت نرم لہجے میں چودھری کی بات کا جواب دیا۔ اس کی اہمیت بھی تسلیم کی لیکن یہ جتانا نہیں بھولا کہ بے شک پیر آباد کی بیشتر زمین اس کی ملکیت ہے لیکن جن مقامات پر وہ اپنے منصوبوں پر کام کررہا ہے، وہ زمین سرکاری ملکیت ہے اور اسے اس سلسلے میں چودھری کی اجازت لینے کی قطعی ضرورت نہیں۔ چودھری ماضی میں بدعنوان افسروں کی مدد سے اسکول والی زمین پر اپنی ملکیت جتا کر بہت عرصے تک اسکول کی توسیع کا کام روکتا رہا تھا لیکن وہ اچھی طرح واقف تھا کہ حقیقت میں زمین سرکار کی ہی ہے اور شہریار یہ بات ثابت کرسکتا ہے اس لیے اس زمین پر سے اپنی ملکیت کے دعوے سے چپ چاپ دست بردار ہوگیا تھا۔ اگر اسے ماضی میں اس بات کا خیال آجاتا کہ آنے والے وقت میں کوئی آفیسر اس کے خلاف بھی چل سکتا ہے تو وہ کسی طرح اس بات کا بندوبست کرلیتا کہ زمین اس کے نام منتقل ہوجائے مگر اب تو وہ صرف اندر ہی اندر تلملا کر رہ گیا تھا۔

''اپنی جلد بازی کی عادت پر قابو پانے کی کوشش کیجیے۔ جوانی کے زور میں آپ ذرا ضرورت سے زیادہ ہی جوش سے کام لیتے ہیں لیکن جوش میں کبھی کبھی آدمی کو نقصان بھی پہنچ جاتا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ہی آپ اچھے خاصے زخمی ہوئے ہیں۔ خدانا خواستہ اس واقعے میں آپ کو کوئی بڑا نقصان بھی پہنچ سکتا تھا۔ چلیں خیر، آپ کی تو بچت ہوگئی لیکن بے چارے غریب پولیس والے مارے گئے۔ مجھے تو بڑا افسوس ہوا ان بے چاروں کی موت کا سن کر۔'' تلملاہٹ کو چھپا کر چہرے پر مربیانہ مسکراہٹ سجاتے ہوئے اس نے شہریار کو کچوکا لگانے کی کوشش کی۔ اس کی آنکھوں کی مسکراہٹ بڑی معنی خیز تھی جیسے وہ شہریار کو جتا رہا ہو کہ دیکھا بچو! بڑے طرم خان بنتے تھے۔ کیسا بے وقوف بنایا میں نے تمہیں۔

''پولیس والوں کے مارے جانے کا مجھے بھی افسوس ہے لیکن میرے نزدیک وہ لوگ قابلِ فخر ہیں کہ کسی دوسرے کو نقصان پہنچانے کے بجائے اپنے فرض کی ادائیگی کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ ان کی اس قربانی کو بھلایا نہیں جائے گا اور قاتلوں کو ایک دن عبرت ناک انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔'' وہ خود پر بڑا جبر کرکے وہاں آیا تھا اور ایسی کوئی بات چھیڑنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا جس سے اس کی قلبی کیفیت کا اظہار ہو لیکن چودھری خود ہی بات کو اس رخ پر لے گیا تھا کہ گفتگو میں تلخی کا عنصر در آیا تھا۔

''میرے خیال میں ہمیں کسی تکلیف دہ موضوع پر بات کرنے کے بجائے فی الحال تقریب کے حوالے سے بات کرنی چاہیے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ پیر آباد میں ایسی کوئی تقریب ہورہی ہے۔ اس سے پہلے اعلیٰ افسران عرس میں شرکت کی غرض سے یہاں آتے رہے ہیں لیکن ان کی وہ آمد ذاتی نوعیت کی ہوتی تھی۔ اس بار ایک سرکاری مقصد سامنے ہے۔ جنرل توحید کو بہ طور مہمانِ خصوصی مدعو کیا گیا ہے۔ بے

شک موجودہ حکومت میں ان کے پاس کوئی بڑا عہدہ نہیں ہے لیکن ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ پچھلی حکومت میں وہ صوبائی وزیر اطلاعات ونشریات تھے۔ اب بھی ان کے حکومتی حلقوں میں گہرے تعلقات وروابط ہیں۔ میڈیا والے بھی ہر اہم موقعے پر ان کی رائے لینا ضروری سمجھتے ہیں۔ موجودہ وزیر خزانہ سے ان کی قریبی رشتے داری ہے۔ اگر وہ یہاں سے خوش ہوکر گئے تو ہم کم از کم پیرآباد کے لیے تو کافی مراعات حاصل کرسکتے ہیں۔'' معاملات کو تلخی کی طرف جاتا دیکھ کر عبدالمنان نے گفتگو میں مداخلت کی اور جلدی جلدی بولتے ہوئے ان دونوں کو موقعے کی نزاکت کا احساس دلانے لگا۔

''ہم تو پہلے بھی کسی کی مہمان نوازی میں کوئی کمی نہیں کرتے۔ جنرل صاحب بے شک سرکاری دعوت پر آئیں گے لیکن پیرآباد آنے کے بعد ان کی حیثیت سرکاری مہمان کے بجائے ہمارے ذاتی مہمان کی ہوگی۔ تقریب کا آپ لوگ جیسے چاہے انتظام کریں لیکن مہمانوں کا کھانا حویلی میں ہی ہوگا۔ آپ بس مجھے مہمانوں کی تعداد بتا دیں، باقی انتظامات ہوجائیں گے۔'' شہریار کا اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا تھا۔ اپنی اہمیت جتانے اور اعلیٰ عہدے داروں سے تعلقات بڑھانے کا یہ موقع چودھری کسی طرح ضائع نہیں کرسکتا تھا اس لیے فوراً دعوت کی ذمے داری خود قبول کرلی۔

''جیسی آپ کی مرضی چودھری صاحب! ویسے تو ہم نے اس سلسلے میں انتظامات کرلیے تھے لیکن آپ کا اصرار ہے تو آپ ہی اس موقعے پر میزبانی کرلیں۔'' اپنا موڈ بحال کرتے ہوئے اس نے فوراً ہی چودھری کی پیش کش قبول کرلی۔

''میری پیش کش قبول کرنے کا شکریہ اے سی صاحب! اگر آپ انکار کردیتے تو مجھے بڑا افسوس ہوتا۔ اصل میں مہمان نوازی ہماری روایت ہے اور چاہے کوئی دشمن بھی چل کر ہمارے پاس آئے تو ہم اس کی خاطر ضرور کرتے ہیں۔'' چودھری جس وقت یہ جملے کہہ رہا تھا، عین اسی وقت ایک ملازم لوازمات سے بھری ٹرالی دھکیلتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ اس ملازم کو نظرانداز کرتا ہوا شہریار ایک دم سے اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔

''اچھا چودھری صاحب! اب اجازت دیجیے۔'' شہریار نے چودھری کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ عبدالمنان بھی اس کی پیروی میں اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا۔

''اس طرح اچانک کہاں چل دیے اے سی صاحب! کچھ چاۓ پانی تو پیتے جائیے۔''

''بہت شکریہ چودھری صاحب! آج بالکل فرصت نہیں آپ کی مہمان نوازی سے فیض یاب ہونے کی۔ اس لیے پلیز ہمیں اجازت دیجیے۔'' چودھری کے روکنے کے باوجود وہ مزید وہاں بیٹھنے پر راضی نہیں ہوا۔ یہ تو مصلحت پسندی تھی جو اسے یہاں تک لے آئی تھی ورنہ دل قطعی راضی نہ ہوتا تھا اس شخص سے بات کرنے پر۔ مجبوری کے باعث وہ یہاں آگیا تھا لیکن کچھ کھانے پینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اس لیے چودھری کے روکتے روکتے بھی باہر نکل گیا۔ باہر مشابرم خان گاڑی لیے ان کا منتظر تھا۔ ان لوگوں کے بیٹھتے ہی اس نے گاڑی اسٹارٹ کردی۔ حویلی سے نکل کر وہ لوگ گاؤں سے باہر جانے والے راستے کی طرف گامزن ہوگئے۔

''مشابرم خان! ذرا گاڑی قبرستان کی طرف لے لو۔'' اس نے اچانک ہی یہ حکم دیا جس کی تعمیل کی گئی۔ قبرستان پہنچنے کے بعد وہ گاڑی سے اتر کر قبرستان میں داخل ہوا تو عبدالمنان اور مشابرم خان بھی چپ چاپ اس کے ساتھ ہولیے۔ قبرستان زیادہ بڑا نہیں تھا۔ چند پکی قبروں کے سوا وہاں زیادہ تر قبریں کچی ہی تھیں۔ ان قبروں کے درمیان ان لوگوں کو فوراً ہی قریب قریب بنی دو نئی قبریں نظر آگئیں۔ قبروں پر کتبے موجود نہیں تھے لیکن وہ لوگ اندازہ کرسکتے تھے کہ یہ قبریں تھوڑے دنوں کے وقفے سے مرنے والی ان دو سگی بہنوں کی ہیں جو زندگی سے اپنے حصے کی خوشیاں وصول کیے بغیر ہی دنیا سے چلی گئی تھیں۔ دونوں میں سے ایک قبر کی مٹی زیادہ تازہ تھی جس سے پتا چل رہا تھا کہ یہ ماہ بانو کی قبر ہوگی۔ شہریار نے اس قبر کے سرہانے کھڑے ہوکر دعائے مغفرت کے لیے ہاتھ بلند کردیے۔ عبدالمنان اور مشابرم خان نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ تقریباً پانچ منٹ تک وہ اسی طرح ہاتھ بلند کرکے بند آنکھوں کے ساتھ دعا مانگتا رہا۔ دعا کے اختتام پر اس نے منہ پر ہاتھ پھیر کر آنکھیں کھولیں تو میلے کپڑوں میں ملبوس دبلا پتلا اور سانولی رنگت والا ایک شخص دوسری قبر کے پاس کھڑا اپنی طرف دیکھتا نظر آیا۔ اس کے چہرے پر گہرے رنج اور دکھ کے تاثرات تھے۔ اسے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر وہ شخص جھجکتا ہوا اس کے قریب آگیا۔

''آپ اس ضلع کے اے سی صاحب ہوتا؟'' اس کے چہرے کو بہ غور دیکھتے ہوئے اس نے استفسار کیا جس کا جواب اس نے محض سر ہلا کر دیا۔ اس وقت وہ خود گہرے دکھ کی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے مدد کی درخواست لے کر اپنے پاس آنے والی نوعمر لڑکی کی قبر کے پاس کھڑے ہوکر اس کے لیے دعائے مغفرت کرنے کا تجربہ بہت تکلیف دہ تھا۔ ابھی تو وہ اس لڑکی کے لیے اپنے دل میں پیدا ہونے والی کشش کا تجزیہ بھی نہیں کرپایا تھا کہ وہ اس دنیا کو بے دم ہی چھوڑ گئی تھی۔ وہ یک دم ہی بہت سرگرم ہوکر اس دکھ کے ازالے کی کوشش میں لگ گیا تھا اور سب سے پہلے پیرآباد میں اپنے منصوبوں پر کام کا آغاز کردیا تھا۔

''سنا ہے کہ آپ ہمارے پنڈ میں اسپتال بنوا رہے ہیں۔ یہ آپ کا ہم لوگوں پر بڑا احسان ہوگا۔'' اس کی طرف سے تصدیق ہوجانے پر وہ شخص اس کا ہاتھ تھام کر بڑی عاجزی سے بولا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ شہریار کے اشارے پر مشابرم خان نے بڑھ کر اسے سنبھالا۔

''تم کون ہو؟ کیا نام ہے تمہارا؟'' وہ شخص سنبھلا تو اس نے اس سے پوچھا۔

''میں انور ہوں جی! یہ میری گھر والی کی قبر ہے۔ ویاہ کے دو برس بعد ہمیں خوشی کی خبر ملی تھی، پر جانے پھر اچانک کیا ہوا کہ اس وچاری کی طبیعت بگڑ گئی۔ ادھر پنڈ میں کوئی ڈاکٹر تو ہے نہیں۔ دائی ہی ٹونے ٹوٹکے آزماتی رہی، پر جب کوئی فیدہ (فائدہ) نہیں ہوا تو اس نے کہہ دیا کہ اپنی گھر والی کو شہر کے اسپتال لے جاؤ۔ اسپتال لے جانے کے لیے میرے پاس کوئی انتظام نہیں تھا۔ میں نے منشی جی کی بہت خوشامد کی کہ حویلی کی کسی گڈی میں میری گھر والی کو اسپتال پہنچا دیں، پر غریبوں کی کون سنتا ہے جی۔ میں نے بھاگ دوڑ کرکے بڑی مشکل سے جب تک سواری کا بندوبست کیا، تب تک دیر ہو چکی تھی۔ وچاری میری گھر والی رستے میں ہی تڑپ تڑپ کر مرگئی۔'' اس کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو جاری ہوگئے۔

''مجھے ان حالات کے بارے میں معلوم ہے انور! مجھے معلوم ہے کہ علاج کی سہولت نہ ہونے کی وجہ سے اکثر اس قسم کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ پیرآباد سمیت دوسرے دیہاتوں میں بھی جلد از جلد ایسے اسپتال بنائے جائیں جہاں لوگوں کا بروقت علاج ہوسکے۔ تمہاری بیوی کی موت کا سن کر مجھے بہت افسوس ہوا ہے۔ بس اب تم دعا کرو کہ جلد یہاں اسپتال بن جائے تاکہ تمہاری جیسی تکلیف کسی دوسرے کو نہ اٹھانی پڑے۔'' شہریار نے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا تو اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے ہتھیلی کی پشت سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور ذرا جوش سے بولا۔

''اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیں صاحب!''

''ابھی تو ایسی کوئی ضرورت نہیں۔ ویسے تم یہ بتاؤ کہ کام کیا کرتے ہو؟'' اس نے یونہی پوچھ لیا۔

''کام مجھے سارے آتے ہیں۔ بڑا دم ہے میرے بازوؤں میں۔ منشی مجھے جس کام پر بھی لگا دے، میں آرام سے کرلیتا ہوں۔ آپ کو بھی ضرورت ہو تو آزما کر دیکھ لینا۔'' وہ سینہ تان کر فخر سے بولا تو شہریار نے پُرخیال نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ یہ دکھی آدمی جو چودھری کے منشی کے خلاف دل میں شکوہ بھی رکھتا تھا، اس کے لیے کارآمد بھی ثابت ہوسکتا تھا۔

''ٹھیک ہے انور! ابھی تو نہیں لیکن ضرورت پڑنے پر میں تمہیں ضرور آزماؤں گا۔ تم ذہنی طور پر تیار رہنا۔'' وہ انور کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے قبرستان سے نکلنے والے راستے کی طرف چل پڑا۔ بہت سے کاموں کا بوجھ سر پر ہونے کے باوجود اس کا ذہن انور کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا۔ اگر اپنے دعوے کے مطابق واقعی وہ بہت کارآمد آدمی تھا تو اس سے کئی اہم کام لیے جاسکتے تھے۔

☆☆☆

آخری جملہ تحریر کرنے کے بعد اس نے قلم بند کرکے قلم دان میں رکھا تو بے حد مطمئن اور خوش تھا۔ آج کی تقریب بہت شان دار رہی تھی۔ مرکزِ صحت کا سنگِ بنیاد رکھنے کے بعد جنرل توحید اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسکول آئے تھے۔ انہوں نے اسکول کی چھوٹی سی عمارت کو دیکھ کر بہت خوشی کا اظہار کیا تھا اور یقین دہانی کروائی تھی کہ مستقبل میں اس اسکول کی عمارت میں توسیع کے سلسلے میں وہ بھرپور کردار ادا کریں گے اور ایک دن یہ چھوٹا سا اسکول ہائی اسکول اور کالج کے درجے تک پہنچ جائے گا۔ انہوں نے بہت مؤثر الفاظ میں گاؤں کے لوگوں کو تعلیم کی طرف راغب کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔ تقریب میں شریک گاؤں والوں کے پُرجوش ردعمل نے ظاہر کیا تھا کہ وہ ان کی باتوں سے متاثر ہوئے ہیں۔ تقریب میں چودھری افتخار کے علاوہ اردگرد کے دوسرے زمینداروں نے بھی شرکت کی تھی اور ناچار ہی سہی، اس تعلیمی پروگرام کو سراہا تھا۔ موبائل کمپنی والے بھی اس تقریب میں بڑے سرگرم رہے تھے۔ میڈیا کوریج سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے اپنی پبلسٹی مہم بھرپور طریقے سے چلائی تھی۔ لوگوں کو موبائل کے استعمال کی طرف راغب کرنے کے لیے انہوں نے اپنی موبائل کمپنی کی سم کے ساتھ چند موبائل سیٹ مفت تقسیم کیے تھے۔ آفتاب اور منیب کو بھی ایک ایک سیٹ دیا گیا تھا۔ مجموعی طور پر تقریب بہت کامیاب رہی تھی اور اس وقت آفتاب نے اس تقریب سے متعلق رپورٹ بھی لکھ کر

مکمل کی تھی۔ اس رپورٹ کو اتوار کی اشاعت میں شامل ہونا تھا۔ یہ رپورٹ اس نے ایک فیچر کی شکل میں لکھی تھی جس میں پیرآباد کے ساتھ ساتھ اردگرد کے دیگر دیہاتوں کے مسائل کا احاطہ کرتے ہوئے ان علاقوں میں فروغِ تعلیم کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے مخیر حضرات کو اس کارِ خیر میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی تھی۔ اخبار بین طبقے میں اے اے منشا کا نام معتبر تھا اور وہ اسے ایک حق پرست قلم کار کی حیثیت سے پسند کرتے تھے اس لیے اس بات کا اچھا خاصا امکان تھا کہ وہ اس کی اپیل پر ضرور متوجہ ہوتے۔ وہ اس معاملے میں اتنا پُرجوش تھا کہ پچھلے دو دن کی مسلسل محنت اور آج کی تقریب کی معروفیت کی وجہ سے ہونے والی تھکن کو قطعی نظرانداز کر کے قلم تھام کر بیٹھ گیا تھا۔ منیب کی نیند خراب نہ ہو، اس خیال سے اس نے کمرے کی ٹیوب لائٹ بند کر کے ٹیبل لیمپ کی روشنی میں اپنا کام مکمل کیا تھا۔ مسلسل جھکے جھکے لکھتے رہنے کی وجہ سے اکڑ جانے والی گردن کا تناؤ ذرا کم ہوا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کھڑکی تک گیا جو باہر کی طرف کھلتی تھی۔ کھڑکی کھول کر اس نے باہر جھانکا۔ باہر رات کا مخصوص اندھیرا اور سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ بس صرف چاند کی روشنی تھی جس میں وہ اسکول کا ہیولا اور اردگرد کا دھندلا سا منظر دیکھ سکتا تھا۔ اردگرد کے منظر سے تو اسے اتنی دلچسپی نہیں تھی لیکن اسکول اس کے خوابوں کی شاہراہِ تعبیر پر آنے والا پہلا سنگِ میل تھا اس لیے وہ اسے بہت محبت پاش نظروں سے دیکھنے میں منہمک تھا۔ مشکل سے دو منٹ ہی گزرے تھے کہ منظر میں پیش آنے والی ایک متحرک تبدیلی نے اسے چونکا دیا۔ وہ دو آدمی تھے جو آس پاس محتاط نظروں سے دیکھتے ہوئے اسکول کی طرف بڑھ رہے تھے۔ آفتاب نے کھڑکی تک آنے سے قبل ٹیبل لیمپ بجھا نہ دیا ہوتا تو وہ کھلی کھڑکی سے آنے والی روشنی کی وجہ سے اس کی طرف متوجہ ہو سکتے تھے لیکن اس وقت وہ اسے نہیں دیکھ سکے تھے۔ رات کے اس پہر مشکوک انداز میں اسکول کی طرف بڑھنے والے ان دو افراد کو دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا لیکن وہ اندازہ نہیں کر سکا کہ وہ لوگ کون ہیں اور کیوں اس طرف آئے ہیں۔ ان دونوں افراد میں سے ایک نے اپنے ہاتھ میں کچھ تھاما ہوا تھا۔ اندھیرے میں ابھرنے والے اس شے کے خاکے سے وہ یہی اندازہ لگا سکا کہ وہ کوئی کین نما شے ہے۔ وہ دونوں افراد ساتھ ساتھ چلتے ہوئے نئے تعمیر شدہ اسکول کے کمروں میں سے ایک کے دروازے پر رکے۔ دروازے کے قریب پہنچ کر ہاتھ میں کین تھاما ہوا شخص زمین پر بیٹھ گیا جبکہ دوسرا کھڑا رہا۔ کھڑے ہونے والے شخص کی پوزیشن ایسی تھی کہ زمین پر بیٹھنے والا شخص آفتاب کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ نہیں دیکھ سکا کہ اس شخص نے کمرے کے دروازے کے قریب بیٹھ کر کیا کارروائی کی ہے۔ انہوں نے جو کچھ بھی کیا تھا، وہ بس لمحوں کا کھیل تھا۔ اس کے بعد وہ دونوں دوسرے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

اب آفتاب کے لیے اپنی جگہ کھڑے رہنا ممکن نہیں تھا۔ وہ دونوں جو بھی تھے اور جس انداز میں بھی کارروائی کر رہے تھے لیکن یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ ان کا مقصد نیک نہیں ہے۔ وہ اندھیرے میں ہی تیزی سے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور ان دونوں کو للکارا۔ ''کون ہو تم لوگ اور کیا کر رہے ہو؟'' اس کی للکار پر وہ دونوں تیزی سے پلٹے۔ اسی وقت اس نے فضا میں پھیلی پیٹرول کی بُو محسوس کی۔ لمحہ بھر میں ہی اس پر ظاہر ہو گیا کہ وہ لوگ کیا کرنے جا رہے ہیں۔

''رک جاؤ۔'' چیخنے کے انداز میں بولتا ہوا آفتاب تیزی سے ان کی طرف لپکا لیکن اس سے تھوڑی سی تاخیر ہو گئی تھی۔ اس کے ان لوگوں تک پہنچنے سے قبل ہی فضا میں ایک شعلہ سا ابھرا۔ یہ ننھا سا شعلہ ماچس کی جلتی ہوئی تیلی کا تھا جس نے تیلی جلانے والے کے ہاتھ سے تیزی سے نیچے کا سفر طے کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں خوفناک شعلے بھڑکنے لگے۔ ان شعلوں کو بھڑکانے کے ذمے داروں نے وہاں رک کر آفتاب کا مقابلہ کرنے کے بجائے پھرتی سے راہِ فرار اختیار کر لی لیکن وہ اس سارے منظر کو دیکھ کر خود اس بری طرح بھڑک اٹھا تھا کہ انہیں بھاگنے کا موقع دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ پوری قوت سے دوڑتا ہوا وہ ان لوگوں کی طرف لپکا اور بھاگنے والوں میں سے ایک کی گردن پیچھے سے دبوچ لی۔ اپنے ساتھی کو پکڑا جاتا دیکھ کر دوسرا شخص جو ذرا آگے نکل گیا تھا، واپس پلٹا اور آفتاب کے پہلو میں لات رسید کرتے ہوئے اپنے ساتھی کو چھڑوانے کی کوشش کی لیکن اس وقت اس پر جنون سوار تھا اور وہ ایک لات سے ہرگز بھی قابو میں نہیں آ سکتا تھا۔ پہلے شخص کی گردن بائیں ہاتھ میں جکڑے جکڑے اس نے خود پر حملہ کرنے والے دوسرے شخص کی ناک پر دائیں ہاتھ سے ایک زوردار مکا مارا اور پھر اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اس پر اس کے ساتھی کو اس انداز میں دھکیلا کہ دونوں کے سر ایک دوسرے سے بری طرح ٹکرائے اور ان کے حلق سے زوردار چیخیں نکلیں مگر پھر وہ دونوں سنبھل گئے اور خوں خوار انداز میں اس کی طرف لپکے۔ انہوں نے دونوں پہلوؤں سے اس پر حملہ آور ہوتے ہوئے اس کے چہرے کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ بہ یک وقت ان دونوں کے

اپنے چہرے کی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ یک دم نیچے بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں کی کہنیوں کا استعمال کرتے ہوئے ان کے جسم کے نچلے حصے پر نازک مقامات پر ضرب لگائی۔ اس کے یک دم نیچے بیٹھ جانے کی وجہ سے وہ دونوں ایک دوسرے کے مکوں کی زد پر آ گئے تھے۔ اس پر سے یہ ضرب لگی تو بلبلا اٹھے اور نیچے بیٹھے ہوئے آفتاب کو اٹھنے کا موقع دیے بغیر اس پر پل پڑے۔

''کون ہے؟ کیا ہو رہا ہے یہاں؟ آفتاب! کیا یہ تم ہو؟'' اسی وقت فضا میں منیب کی گھبرائی ہوئی آواز ابھری۔ بہت گہری نیند میں ہونے کے باعث اس کی آنکھ ذرا مشکل سے کھلی تھی اور اردگرد کی صورتِ حال دیکھ کر وہ گھبرا گیا تھا۔ آگ کے بھڑکتے شعلوں نے ساری فضا پر ہیبت سی طاری کر دی تھی اور ان شعلوں کی روشنی میں تین افراد ایک دوسرے سے برسرِ پیکار نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے دو کے چہروں پر سیاہ نقاب تھے اور انہوں نے جس تیسرے فرد کو اپنی زد پر لیا ہوا تھا، وہ ان کے درمیان گھرا ہونے کی وجہ سے واضح طور پر نظر نہیں آ رہا تھا لیکن کپڑوں کی وجہ سے منیب نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ آفتاب ہے۔

''خبردار! قریب مت آنا ورنہ گولی مار دوں گا۔'' لڑنے والوں میں سے ایک نے اپنا ہاتھ روک کر اپنے کُرتے کی جیب میں سے ریوالور نکالا اور اسے منیب کی طرف لہراتے ہوئے دھمکی دی۔ وہ جہاں تھا، وہیں رک گیا۔

''بس، اب تم بھی سیدھے ہو جاؤ۔ ہمیں خون خرابے کا حکم نہیں اس لیے اب تک تمہیں بخشا ہوا ہے لیکن اب ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کی تو اچھا نہیں ہو گا۔'' منیب کو آسانی سے پسپا ہوتا دیکھ کر اس نے اپنے ریوالور کا رخ آفتاب کی طرف کیا۔ وہ اب بھی ہاتھ پیر چلاتا ہوا اپنے مقابل کو زک پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ریوالور بردار کی دھمکی کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوا اور اس کی طرف توجہ دیے بغیر اس نے ایک زوردار پنچ اپنے حریف کی آنکھوں کے نیچے دے مارا۔ اس کی اس حرکت پر ریوالور بردار شخص بری طرح تلملایا اور لات گھما کر زور سے اس کی کنپٹی پر ماری۔ یہ ضرب خاصی شدید تھی، آفتاب الٹ کر پیچھے جا گرا۔

''چل یار! نکل بھاگیں۔ لگتا ہے گاؤں والے جاگ گئے ہیں اور اسی طرف آ رہے ہیں۔'' فضا میں ابھرتے ہلکے ہلکے شور کی آواز سن کر ریوالور بردار نے اپنے ساتھی سے کہا اور اس کا ہاتھ تھام کر اسے کھڑا کرتے ہوئے ایک سمت دوڑ لگانے کی کوشش کی۔ فضا میں ابھرتے شور کی بھنبھناہٹ آفتاب نے بھی سن لی تھی۔ اسے امید تھی کہ اگر وہ کچھ دیر اور ان دونوں کو روکنے میں کامیاب ہو گیا تو گاؤں والے وہاں پہنچ جائیں گے۔ وہ لوگ پہنچ جاتے تو پھر ان دونوں کا وہاں سے بچ نکلنا مشکل ہو جاتا۔ وقت کی یہ چھوٹی سی مہلت حاصل کرنے کے لیے اس نے اپنی تمام تر ہمتیں مجتمع کیں اور الٹ کر گرنے کے بعد کسی نکیلے پتھر کی زد میں آ کر پھٹ جانے والے اپنے سر کی تکلیف پر قابو پاتا ہوا ان دونوں کے پیچھے لپکا۔ آوازیں اب بہت قریب آ چکی تھیں، چنانچہ اس بار ریوالور بردار نے اپنے لیے کوئی خطرہ مول لینا مناسب نہیں سمجھا اور ریوالور کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے گولی چلا دی۔ جوش میں آگے بڑھتے ہوئے آفتاب کو ایک جھٹکا لگا اور اپنی دائیں ٹانگ کی ران میں دہکتے ہوئے انگارے کی اذیت محسوس کرتا ہوا وہ نیچے گر گیا۔ حملہ آور اس کی طرف سے مطمئن ہو کر فاصلے پر بندھے گھوڑوں تک پہنچے اور لپک کر ان پر سوار ہوتے ہوئے برق کی طرح نکل بھاگے۔ ان کے یہ گھوڑے پہلے اس کی نظر میں نہیں آئے تھے۔ آ بھی جاتے تو وہ کیا کر لیتا؟ جتنی کوشش وہ کر سکتا تھا، اپنی جان کی بازی لگا کے کر چکا تھا اور اب بے بسی سے زمین پر گرا بلند سے بلند تر ہوتے آگ کے شعلوں کی رقص کرتی روشنی میں ان کو بھڑکانے والوں کو فرار ہوتا دیکھ رہا تھا۔ ان شعلوں میں کیا کچھ جلا تھا، یہ حساب تو بعد میں ہی ہوتا لیکن اپنے خوابوں کو یوں جلتا دیکھنا بہت تکلیف دہ تھا۔ اس آگ کی جلن اپنے روم روم میں محسوس کرتا وہ کب ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا، خود اسے بھی علم نہیں ہو سکا۔

☆☆☆

کل تک جو عمارت رنگوں سے مزین تھی، آج ایک سیاہ ڈھانچے کی صورت میں کھڑی تھی۔ آگ نے اس کی ساری خوب صورتی کو چاٹ لیا تھا۔ کمروں میں ڈالا گیا نیا فرنیچر، دیواروں پر لگے سافٹ بورڈز، چارٹس اور وہ آرائشی جھنڈیاں جو کل کی تقریب کے اہتمام کے لیے بطورِ خاص لگائی گئی تھیں، سب جل کر خاک ہو گئی تھیں۔ وہ گمبھیر خاموشی کے ساتھ ہونٹ بھینچے ساری تباہی کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس تباہی کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے، اس معاملے میں اسے کوئی شک نہیں تھا۔ پیرآباد کے اس اسکول کی ترقی سے سب سے زیادہ تکلیف ایک ہی شخص کو تھی اور وہ شخص چودھری افتخار تھا۔ اپنی منافقانہ خصلت سے کام لیتے ہوئے اس نے ماتھے پر شکن ڈالے بغیر کل کی تقریب میں شرکت بھی کی تھی، اسکول کی توسیع پر خوشی کا اظہار بھی کیا اور آنے والے معزز مہمانوں کی

ضیافت کا بھرپور انتظام بھی کیا لیکن موقع ملتے ہی پہلی فرصت میں اپنی چال چل گیا تھا۔ آگ اتنی خوفناک تھی کہ اس نے نئے تعمیر شدہ کمروں کے ساتھ ساتھ پرانے کمروں کو بھی نقصان پہنچایا تھا۔ پیٹرول کی آگ ویسے ہی خطرناک ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ اس جگہ تک کوئی ہنگامی امداد پہنچانا بھی آسان نہیں تھا۔ ابتدا میں تو گاؤں والوں نے ہی بالٹیوں وغیرہ سے پانی ڈال کر آگ بجھانے کی کوشش کی لیکن اس کوشش سے آگ اور بھی بھڑک اٹھی۔ ان حالات میں بس ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ منیب نے اپنے موبائل فون سے ہنگامی امداد کے لیے کال کر دی۔ چودھری کی بدولت قائم ہونے والے موبائل کمپنی کے نیٹ ورک نے اس بُرے وقت میں بڑا ساتھ دیا۔ فون کال پر آگ بجھانے والی گاڑیاں اور ایمبولینس فوری طور پر پیر آباد روانہ کر دی گئیں۔ ایمبولینس پہنچنے تک زخمی آفتاب کو گاؤں کے لوگوں نے اپنے طور پر ابتدائی طبی امداد دے دی تھی لیکن سر پر لگنے والی چوٹ اور ران پر گولی کے باعث آنے والا زخم مہلک تھا۔ ان زخموں سے اس کا کافی خون بہہ گیا تھا۔ شہریار کو صبح سے قبل ہی اس حادثے کی خبر ہو گئی تھی لیکن فوری طور پر پیر آباد آنے کے بجائے اس نے نورکوٹ کے اس چھوٹے سے اسپتال جانا زیادہ مناسب سمجھا تھا جہاں آفتاب کو لے جایا گیا تھا۔ اس اسپتال میں طبی سہولیات بہت کم تھیں۔ وہاں ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر سے جو کچھ بن پڑا تھا، وہ اس نے اپنے طور پر کر دیا تھا اور پھر اس کے حکم پر آفتاب کو فوری طور پر لاہور کے لیے روانہ کر دیا گیا تھا۔ آفتاب کی زندگی اس کے لیے بہت قیمتی تھی اس لیے اسے بچانے کے لیے وہ اپنے تمام تر اختیارات کو بروئے کار لے آیا تھا۔ نورکوٹ سے ایمبولینس کی روانگی کے ساتھ ہی ایک ایمبولینس لاہور سے بھی روانہ ہوئی تھی۔ اس ایمبولینس میں جدید سہولیات کے ساتھ ایک ڈاکٹر اور میل نرس بھی موجود تھا۔ یہ انتظام اس لیے تھا کہ یہاں سے جانے اور لاہور سے آنے والی ایمبولینس جس مقام پر بھی آپس میں ملیں، آفتاب کو لاہور والی ایمبولینس میں منتقل کر کے راستے میں ہی بہتر طبی امداد کی فراہمی شروع کر دی جائے۔ اس کی یہ حکمتِ عملی بہت کامیاب رہی تھی اور صبح یہاں کے لیے روانہ ہونے سے قبل اسے اطلاع مل گئی تھی کہ آفتاب کی جان اب خطرے سے باہر ہے۔

''آگ نے اتنی فیصد عمارت کو نقصان پہنچایا ہے۔ دوبارہ سے اس عمارت کو مرمت کرنے اور قابلِ استعمال بنانے میں کافی وقت لگے گا۔ تحقیقاتی ٹیم کی رپورٹ کے مطابق آگ پیٹرول ڈال کر لگائی گئی تھی۔ آگ کس نے اور کیوں لگائی، اس سلسلے میں ابھی حقائق سامنے نہیں آ سکے ہیں۔ وقوعہ کے ایک گواہ ماسٹر منیب سے ہمیں جو معلومات حاصل ہوئی ہیں، اس کے مطابق رات کے آخری پہر اس کی آنکھ عجیب و غریب شور کی آوازوں سے کھلی تھی۔ کمرے کی کھڑکی اور دروازہ کھلا ہوا تھا اور ماسٹر آفتاب کمرے میں موجود نہیں تھا۔ منیب نے باہر آ کر دیکھا تو اسے ماسٹر آفتاب دو نقاب پوشوں سے لڑتا ہوا نظر آیا۔ اس نے اس لڑائی میں دخل دینا چاہا تو حملہ آوروں میں سے ایک نے ریوالور دکھا کر اسے دور رہنے پر مجبور کر دیا۔ ماسٹر آفتاب کو بھی اس نے گولی مارنے کی دھمکی دی تھی لیکن وہ جوش میں اس دھمکی کو خاطر میں نہیں لایا اور حملہ آوروں کے فرار کی راہ میں مزاحم ہونے کی کوشش کی۔ طیش میں آ کر دھمکی دینے والے نے اس پر گولی چلا دی۔ لڑائی کے دوران وہ پہلے ہی اچھا خاصا زخمی ہو چکا تھا، گولی لگنے کے بعد بالکل ہی حواس کھو بیٹھا۔ حملہ آور اسے گولی مارنے کے بعد اپنے گھوڑوں پر بیٹھ کر فرار ہو گئے تھے۔ کھوجی کے ذریعے گھوڑوں کے سموں کا کھوج لگانے کی کوشش بھی بے کار گئی۔ ان لوگوں نے فرار کے لیے ایسا راستہ اختیار کیا کہ کھوج مل ہی نہیں سکا۔ اب ہمارے پاس واحد آپشن یہی ہے کہ ماسٹر آفتاب ہوش میں آنے کے بعد کوئی ایسی بات بتا دے جس سے حملہ آوروں کے بارے میں کوئی کلیو مل سکے۔ اس نے حملہ آوروں سے براہِ راست مقابلہ کیا تھا، اس مقابلے کے دوران ہو سکتا ہے اس نے ان لوگوں کو شناخت کر لیا ہو۔ ان لوگوں سے اس کی کوئی ذاتی دشمنی بھی ہو سکتی ہے۔'' اس کے ساتھ وہاں موجود ایس پی اسے واقعے کے بارے میں بریف کرتے ہوئے اپنی رائے بھی دے رہا تھا۔ اس کے آخری جملے نے شہریار کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ وہ جانتا تھا کہ ایس پی اس حادثے اور اس کے ذمے داروں سے واقف تھا لیکن پھر بھی معاملے کو ایسا رخ دینے کی کوشش کر رہا تھا جس سے کسی حد تک واقعے کی ذمے داری آفتاب پر تھوپی جا سکے۔

''ماسٹر آفتاب نہ تو کوئی لٹیرا ہے، نہ جاگیردار اور نہ ہی کوئی اعلیٰ عہدے دار... اس لیے اس کی کسی سے اتنی شدید ذاتی دشمنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ویسے بھی واقعہ جس انداز میں پیش آیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ مجرم اسکول کی عمارت کو نقصان پہنچانے آئے تھے۔ اگر انہیں آفتاب سے کوئی ذاتی دشمنی ہوتی تو وہ اتنا لمبا کھڑاگ پالنے کے بجائے سیدھے سیدھے اسے گولی مار کر ختم کر سکتے تھے۔ اس لیے پلیز، آپ اپنی تفتیشی ٹیم سے کہیں کہ ماسٹر آفتاب کی ذات کو فوکس کرنے کے بجائے واقعے کی نوعیت کو فوکس کریں اور ان لوگوں کے بارے میں جاننے کی کوشش کریں جنہیں یہاں اسکول کے وجود پر اعتراض ہے۔'' بے حد رکھائی سے ایس پی کی بات کا جواب دے کر وہ اپنے ساتھ ہی موجود عبدالسنان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''عبدالسنان! سارے نقصان کا تخمینہ لگواؤ اور ساتھ ہی فوری طور پر یہ بھی حساب لگاؤ کہ اسکول کی عمارت کو کم سے کم عرصے میں دوبارہ اسٹیبلش کرنے میں کتنے اخراجات آئیں گے۔ میں زیادہ دن تک اس اسکول کو بند نہیں دیکھنا چاہتا... اور ہاں، اس بار سیکیورٹی کے لیے بھی کوئی معقول انتظام کر لینا۔ جنہوں نے ایک بار یہ حرکت کی ہے، وہ دوبارہ بھی ایسی کوئی کوشش کر سکتے ہیں۔ ان سازشی عناصر کی کوئی اور کوشش دوبارہ ہرگز کامیاب نہیں ہونی چاہیے۔'' سخت لہجے میں احکامات جاری کر کے وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

''پھر کیا کہتے ہو انور! تم یہ کام کر لو گے؟''

''کیوں نہیں سر جی! میں نے خود آپ سے کہا تھا کہ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیے گا۔ اب بھلا میں انکار کیسے کر سکتا ہوں؟''

''کام ذرا خطرناک ہے۔ بات کھل جانے کی صورت میں تم چودھری کے عتاب کا بھی شکار ہو سکتے ہو، اس لیے میں نہیں چاہتا کہ اس سلسلے میں تم پر کوئی زبردستی کروں۔''

''میں سوچ سمجھ کر ہی آپ کا کام کرنے پر راضی ہوا ہوں سر جی! میری سمجھ میں یہ گل آ گئی ہے کہ بندے کے نصیب میں اگر کوئی نقصان لکھا ہو تو پھر وہ بچ نہیں سکتا۔ چودھری صاحب جب میرے سسرال والوں سے ناراض (ناراض) تھے تو میں نے اسی لیے ان لوگوں سے ناتا توڑ لیا تھا کہ کہیں چودھری کا غصہ مجھے اور میرے گھر والوں کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے... پر کیا ہوا؟ گھر بیٹھے بیٹھے ہی اتنا بڑا نقصان ہو گیا۔ میری گھر والی بھی جان سے گئی اور میں اپنے بچے کی خوشی بھی نہیں دیکھ سکا۔ جب بھی اس نقصان کا خیال آتا ہے تو شمشی جی کی بے مروتی یاد آ جاتی ہے۔ اگر وہ اس دن کان دے دیتے تو شاید میری گھر والی بچ جاتی۔ میرا دل کھٹا ہو گیا ہے ان لوگوں کی طرف سے۔ جن کی خاطر ہم اپنا خون پسینا بہاتے ہیں انہیں ہمارا کوئی خیال ہی نہیں۔ آپ کم از کم ہمارے گاؤں کی بھلائی کے لیے تو سوچ رہے ہیں۔ گاؤں میں اسکول اور اسپتال بن جائیں گے تو گاؤں ترقی کرے گا۔ ہمارے لوگوں کے روزگار کا بندوبست ہو گا۔'' انور نے بہت جوش سے اس کی بات کا جواب دیا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ چودھری افتخار کی ریشہ دوانیوں پر قابو پانے کے لیے کچھ نہ کچھ ایسا انتظام کرنا پڑے گا جس کے ذریعے اس کی چالوں کا توڑ کیا جا سکے۔ اب تک اس نے چودھری کے خلاف جو بھی کارروائی کی تھی، اس کے نتیجے میں ناکامی ہی ملی تھی۔ انور سے قبرستان میں ہونے والی ملاقات کے بعد اس کے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ چودھری کے کارندوں میں سے ہی کسی کو استعمال کیا جائے تو کوئی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ اسکول میں آگ لگنے کے واقعے کے بعد اس خیال میں مزید مضبوطی آ گئی تھی اور اس نے انور کو کچھ رقم کی آفر کے ساتھ یہ ذمے داری سونپی تھی کہ وہ چودھری کے خلاف ثبوت فراہم کرنے میں ان کی مدد کرے۔ انور جو بیوی کی موت کے بعد اچھا خاصا دل برداشتہ ہو گیا تھا، اس کام کے لیے فوراً ہی راضی ہو گیا۔

''ٹھیک ہے پھر تم سارے معاملات پر نظر رکھنا۔ خاص طور پر یہ جاننے کی ضرور کوشش کرنا کہ جنگل سے لکڑی یا کھالیں کس دن اور کس وقت اسمگل کی جائیں گی۔ تمہارے لیے موبائل فون کا انتظام ہو گیا ہے۔ تم عبدالسنان سے موبائل سیٹ لے لینا اور اس کا استعمال بھی سیکھ لینا۔ موبائل سے یہ فائدہ ہو گا کہ تم فوری طور پر ہمیں ہر بات کی اطلاع دے سکو گے۔ مگر خیال رکھنا کہ تمہارا موبائل کسی کی نظروں میں نہ آئے ورنہ تم مشکل میں پڑ جاؤ گے۔ میں نے تمہیں نظروں میں آنے سے بچانے کے لیے خاص طور پر دفتر کے بجائے یہاں اپنے گھر پر تم سے ملاقات رکھی تھی۔ تم بھی احتیاط کرنا اور کسی کو معلوم نہ ہونے دینا کہ تم کہاں گئے تھے۔'' شہریار اسے اس کا کام اچھی طرح سمجھا چکا تھا۔ یہ آخری ہدایات اس نے صرف حفظِ ماتقدم کے طور پر دی تھیں۔

''آپ کا بہت بہت شکریہ سر جی کہ آپ نے اتنا خیال کیا۔ میں آپ کی بتائی ہر بات یاد رکھوں گا۔'' انور نے عاجزی سے جواب دیا لیکن جانے کے لیے اٹھا نہیں۔

''کیا بات ہے انور! کیا کچھ اور بھی پوچھنا ہے؟'' اس کے انداز کو دیکھتے ہوئے شہریار نے پوچھا۔

''نہیں سر جی! پوچھنا تو کچھ نہیں، پر ایک عرض کرنی ہے۔''

''کہو، کیا بات ہے؟'' اس کی جھجک کو محسوس کرتے ہوئے شہریار نے حوصلہ دیا۔ ''کوئی مسئلہ ہے تو بتاؤ... میں تمہاری مدد کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔''

''وہ جی میرا سالا ہے نا الیاسا۔ وہ دو دن سے غائب

ہے۔ گھر سے تو مدرسے کے لیے نکلا تھا، پر مولوی صاحب کہتے ہیں کہ وہ مدرسے آیا ہی نہیں۔ ہر طرف اسے ڈھونڈ لیا ہے۔ پلس (پولیس) میں بھی رپٹ (رپورٹ) لکھوائی ہے لیکن کچھ خبر ہی نہیں مل رہی اس کی۔ آپ بڑے افسر ہیں، اگر پلس والوں پر زور دیں گے تو وہ الیاسے کو ٹھیک طرح سے تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔ ابھی تو انہوں نے رپٹ لکھنے کے سوا کچھ بھی نہیں کیا۔ وچارے چاچا چاچی کی بُری حالت ہے۔ پہلے ہی وہ دو جوان بیٹیوں کا صدمہ کھا کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس پر الیاس بھی غیب (غائب) ہو گیا۔ اکو ایک تو پُتر ہے وہ ان کا۔ آپ سمجھ ہی سکتے ہیں کہ ان وچاروں پر اس کی گم شدگی سے کیا گزر رہی ہو گی۔'' انور کی دی ہوئی اطلاع نے اسے بُری طرح چونکا دیا۔ گاؤں سے کسی بچے کا یوں غائب ہو جانا معمولی بات نہیں تھی۔ شہروں میں تو پھر بھی امکان ہوتا ہے کہ بچے بھیڑ بھاڑ میں اتفاقاً اِدھر اُدھر ہو جائیں لیکن گاؤں کے محدود ماحول میں جہاں ہر فرد دوسرے فرد سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے، کسی بچے کا یوں غائب ہو جانا بہت غیر معمولی واقعہ تھا۔ اس واقعے سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ بچہ کسی حادثے سے دوچار ہوا ہے اس لیے دو دن گزر جانے کے باوجود اس کا کوئی اتا پتا نہیں مل سکا ہے۔

''میں تھانے فون کر کے ہدایت کر دوں گا۔ تم اس بارے میں فکر مند مت ہو۔'' انور پر اپنی پریشانی ظاہر کیے بغیر اس نے اسے تسلی دی تو وہ شکریہ ادا کرتا ہوا رخصت ہو گیا۔ انور کے روانہ ہوتے ہی اس نے متعلقہ تھانے فون کر کے تھانے دار کو الیاس کے سلسلے میں سختی سے ہدایت دی اور فون کرنے کے بعد غیاث محمد کے خاندان کے بارے میں سوچنے لگا۔ ان لوگوں نے خود کو کسی مصیبت سے بچانے کے لیے ماہ بانو کا بیاہ چودھری افتخار سے کرنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن چودھری تو انہیں کیا نقصان پہنچاتا، وہ ویسے ہی پے در پے نقصانات کی زد میں آتے جا رہے تھے۔ شاید ابھی کچھ دیر پہلے انور نے صحیح کہا تھا کہ جو نقصان آدمی کے نصیب میں لکھ دیا گیا ہو، آدمی اس سے بچ کر نہیں نکل سکتا۔ غیاث محمد بھی مسلسل ایسے ہی نقصانات کی زد پر تھا۔

☆☆☆

''آپ؟'' اسپتال کے کمرے میں داخل ہوتی کشور کو دیکھ کر وہ بُری طرح چونکا اور اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں اس کے منہ سے ایک زوردار کراہ نکل گئی۔

''پلیز! آپ لیٹے رہیں۔'' وہ تیزی سے آگے بڑھی اور اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے اٹھنے سے روکا۔

''آپ یہاں کیسے آئیں؟''

''مجھے آپ کے زخمی ہونے اور لاہور کے اسپتال میں داخل ہونے کی خبر مل گئی تھی۔ خبر ملتے ہی میرا دل بے چین ہو گیا کہ کسی طرح آپ کو دیکھ لوں۔ بڑی مشکل سے رو دھو کر اماں کو راضی کیا کہ حویلی میں دل گھبرا رہا ہے، تھوڑے دنوں کے لیے لاہور چل کر رہیں۔ آپ کی پریشانی میں ویسے ہی میرا رو رو کر بُرا حال ہو گیا تھا۔ کھانا پینا بھی چھوٹ گیا تھا۔ میری ایسی حالت دیکھ کر اماں نے اباجی کو راضی کر لیا کہ کچھ دنوں کے لیے وہ ہم لوگوں کو لاہور بھیج دیں۔ کل رات ہی ہم لوگ یہاں پہنچے تھے۔ صبح صبح میں نے اماں سے بہانہ کیا کہ میرے پیٹ میں بہت درد ہو رہا ہے۔ انہوں نے ڈرائیور کو بھیج کر ڈاکٹر کو گھر بلوا لیا۔ ڈاکٹر نے کھانے کے لیے دوا دی جو ظاہر ہے میں نے نہیں کھائی مگر اماں پر یہی ظاہر کیا کہ دوا کھانے کے باوجود میرا درد بڑھتا جا رہا ہے۔ رانی بھی گاؤں سے میرے ساتھ یہاں آئی ہے۔ اس نے اماں کو مشورہ دیا کہ بی بی کو اسپتال لے چلتے ہیں۔ اب بے چاری اماں نیچے انتظار گاہ میں بیٹھی ہیں اور میں ڈاکٹر کو دکھانے اور مختلف ٹیسٹ وغیرہ کروانے کے بہانے یہاں ہوں۔ رانی میرے ساتھ ہی ہے اور باہر کھڑی ہے۔'' وہ بیڈ کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھنے کے بجائے ابھی تک کھڑی ہوئی تھی اور مزے سے اپنا کارنامہ سنا رہی تھی۔

''آپ کو اس طرح یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ اس طرح آنے میں کوئی گڑبڑ بھی ہو سکتی ہے۔ میں نے آپ سے وعدہ لیا تھا کہ آپ اس طرح خود کو خطرے میں ڈال کر مجھ سے ملنے نہیں آئیں گی۔'' ساری بات سن کر آفتاب نے اسے ٹوکا۔

''سوری آفتاب! مجھے اپنا وعدہ یاد ہے لیکن آپ کے زخمی ہونے کا سن کر میں رہ نہیں سکی۔ آپ نہیں سمجھ سکتے کہ جب مجھے آپ کے زخمی ہونے کی خبر ملی تو میرے دل پر کیا گزری۔ مجھے رانی نے بتایا تھا کہ آپ کو کہاں کہاں چوٹیں لگی ہیں اور یقین جانیں میں نے اپنے جسم پر ان ساری جگہوں پر درد محسوس کیا ہے۔ پھر سب سے بڑھ کر آپ کو گولی لگنے کی خبر نے میرے ہوش اڑا دیے تھے۔ بھلے سے ٹانگ میں ہی لگی ہو لیکن گولی کوئی معمولی چیز تو نہیں ہوتی جو میں سن کر آرام سے بیٹھی رہتی۔ میرا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ اڑ کر آپ کے پاس پہنچ جاؤں مگر میں جن ان دیکھی زنجیروں میں جکڑی ہوں ان سے نجات حاصل کرنا بھی تو آسان نہیں۔ اب بھی اتنی کوشش کے بعد یہ چند پل ہی حاصل کر پائی ہوں... ورنہ دل تو یہ چاہتا ہے کہ سارا وقت یہاں آپ کے ساتھ رہوں، آپ کی خدمت کروں اور آپ کے ہر درد کو چن لوں۔'' جذبات سے بھیگی آواز میں کہتی ہوئی وہ اپنی نرم انگلیوں سے اس کی آنکھ کے قریب پڑے ہوئے نیل کے نشان کو سہلا رہی تھی۔ اس کے جذبات سے بھیگی آواز اور نم آنکھیں دیکھ کر آفتاب کا دل پسیج گیا۔ اس نے بہت محبت سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بولا۔

''اب تو آپ نے مجھے دیکھ لیا نا۔ آپ کو تسلی ہو گئی ہو گی۔ دیکھیں، میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔''

''خاک ٹھیک ہیں۔ اتنے ڈھیروں زخم لگے ہیں۔'' اس کی آنکھوں کی نمی تیزی سے آنسوؤں کی روانی میں بدل گئی۔

''زخم لگے ہیں لیکن اب درد بالکل نہیں ہو رہا۔ آپ نے مجھے چھو کر میرا سارا درد اپنی انگلیوں کی پوروں میں سمیٹ لیا ہے۔'' آفتاب کے اس جملے پر وہ تھوڑی سی محجوب ہو گئی اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کی گرفت سے آزاد کروانے کی کوشش کی لیکن اس کی گرفت مضبوط تھی، سو کامیاب نہ ہو سکی۔

''یہ میرا موبائل فون ہے، آپ اسے اپنے پاس رکھ لیں۔ میرا پہلے والا سیٹ تو اس دن کی لڑائی میں ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ میں نے اپنے لیے یہ نیا سیٹ منگوایا ہے۔ اس کا نمبر ابھی کسی کے پاس نہیں ہے۔ آپ اسے رکھیں، میں اپنے لیے دوسرا سیٹ اور سم منگوا کر آپ کو اس پر کال کروں گا۔ آپ فون پر مجھ سے بات کر لیا کریں گی تو آپ کی تسلی بھی ہو جائے گی اور اس میں زیادہ خطرہ بھی نہیں ہو گا۔'' آفتاب نے اپنے سرہانے رکھا موبائل چارجر سمیت اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے دونوں چیزیں اپنے بائیں ہاتھ میں تھام لیں۔ دایاں ہاتھ تو بہ دستور آفتاب کی گرفت میں ہی تھا۔

''بس اب آپ جائیں۔'' آفتاب نے اس سے کہا اور اپنے ہاتھ کی گرفت میں موجود اس کے ہاتھ کی پشت پر آہستہ سے بوسا دیا۔ عین اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور شہریار کمرے میں داخل ہوا۔ آفتاب نے پھرتی سے کشور کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ سر سے سرک جانے والی اپنی چادر درست کرتی ہوئی تیزی سے دروازے کی طرف لپکی۔ وہاں رانی اُفتاں و خیزاں کھڑی تھی۔ یقیناً شہریار کو دیکھ کر وہ اتنی حواس باختہ ہو گئی تھی کہ بروقت اندر اطلاع نہیں کر سکی۔

''کیسی طبیعت ہے اب تمہاری؟ میں پرسنل وزٹ پر لاہور آیا تھا، سوچا تمہاری خیریت بھی پوچھتا ہوا چلا جاؤں۔'' وہاں پھیلنے والی ہلچل لحاتی تھی۔ کشور کے روانہ ہوتے ہی کمرے میں سکون ہو گیا۔ شہریار نے اس سارے منظر سے قطعی بے نیازی برتتے ہوئے کرسی سنبھال کر بیٹھتے ہوئے اس سے گفتگو کا آغاز کیا۔

''اللہ کا شکر ہے اب تو کافی بہتر ہوں۔ انشاء اللہ جلد یہاں سے نجات پا کر گاؤں پہنچ جاؤں گا۔''

''تم پہنچو گے تو تمہیں سب کچھ ٹھیک ٹھاک ملے گا۔ میں نے آرڈر کر دیا ہے کہ مجھے اسکول جلد از جلد ورکنگ کنڈیشن میں چاہیے۔ وہاں کام جاری ہے۔ جلد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے ایک نئے ٹیچر کا بھی ارینجمنٹ کر لیا ہے۔ اب اسکول شروع ہو گا تو وہ ٹیچر بھی تمہارے ساتھ ہو گا۔ میں گاؤں کا ایک مکان تم لوگوں کے لیے ٹھیک کروا رہا ہوں۔ اب تمہارے استعمال والا کمرا بھی اسکول میں ہی شامل ہو گا۔ اسکول کے اوپر کے کام کاج، صفائی اور نگرانی کے لیے میں نے ایک چوکیدار کا انتظام کر دیا ہے۔ انشاء اللہ آئندہ دشمنوں کی اس طرح کی کوئی سازش کامیاب نہیں ہو گی۔'' اس نے آفتاب کو خوش خبری سنائی۔

''تھینک یو سر! مجھے اسکول کی طرف سے بہت فکر تھی۔'' اس خبر کو سن کر اس نے ممنونیت کا اظہار کیا۔

''اتنی فکر مت کیا کرو۔ اسکول تمہارے اکیلے کا مسئلہ نہیں، میں خود بھی اس سلسلے میں بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ تھوڑا سا مالی نقصان برداشت کرنا بھی میرے لیے مشکل نہیں لیکن تم جیسے قیمتی اور مخلص شخص کو کھونا میں ہرگز بھی پسند نہیں کروں گا۔ سو پلیز! بی کیئرفل۔''

''میں خیال رکھوں گا سر!'' شہریار کی نصیحت کے جواب میں اس نے وعدہ کیا۔

''لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ تم نے خود کو میرے اندازے سے بڑھ کر خطروں میں ڈال رکھا ہے۔ باہر جو لڑکی کھڑی تھی، میں نے اسے پہچان لیا ہے۔ وہ چودھری افتخار کی ملازمہ ہے اور میں نے کئی بار اسے حویلی میں دیکھا ہے۔ اس ملازمہ کی موجودگی سے مجھے یہی سمجھ آیا ہے کہ کچھ دیر قبل جو خاتون یہاں موجود تھیں، ان کا حویلی سے ہی کوئی تعلق ہے۔''

''وہ چودھری افتخار کی سب سے چھوٹی بیٹی کشور ہے۔'' شہریار کے گمبھیر لہجے کے جواب میں اس نے آہستہ سے بتایا۔

''اوہ! آئی سی۔'' اس نے ہونٹ سکیڑے۔ ''پھر تو واقعی معاملہ میرے اندازے سے بہت زیادہ خطرناک ہے۔ ویسے تو یہ تمہارا پرسنل معاملہ ہے اور میں کسی کی ذاتیات میں دخل دینا پسند نہیں کرتا لیکن تم سے میں پھر بھی یہ ضرور کہوں گا کہ تم نے اپنے آپ کو بہت زیادہ خطرے میں ڈال رکھا ہے۔ یہ چودھری ٹائپ کے لوگ خود تو بے شک دوسروں کی عزتوں سے کھیلتے پھرتے ہیں لیکن اپنے گھر کی خواتین کے معاملے

میں بڑے حساس ہوتے ہیں۔'' اسے آفتاب سے اتنی زیادہ انسیت ہوگئی تھی کہ خلافِ طبیعت اسے نصیحت کر بیٹھا۔

''میں جانتا ہوں سر! لیکن یہ بات آپ بھی سمجھتے ہوں گے کہ بعض معاملات میں انسان خود اچھا خاصا مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے لیکن آپ یہ مت سمجھیں کہ میری اور کشور کی روٹین میں ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔ وہ بے چاری میری حالت کا سن کر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر بڑی مشکلوں سے یہاں پہنچی تھی پھر بھی میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ آئندہ یہ غلطی نہ کریں۔'' وہ وضاحت دینے لگا۔

''او کے! تم جیسے مناسب سمجھو یہ معاملہ ہینڈل کرو۔ میں اب چلتا ہوں۔ میں نے اسپتال والوں کو تو ہدایت کر دی ہے لیکن اگر پھر بھی تمہیں کوئی ضرورت ہو تو فون پر مجھے اطلاع دے دینا... ٹیک کیئر!'' حسبِ عادت اس نے اچانک ہی بات ختم کر دی اور آفتاب سے ہاتھ ملا کر رخصت ہوگیا۔

☆☆☆

''میں کوشش کر رہا ہوں بختیار صاحب کہ آپ کے گاؤں کے مسائل جلد از جلد حل کروا سکوں۔ آج میں جن لوگوں کو اپنے ساتھ لایا تھا، انہوں نے آپ کے علاقے کا سروے کر کے مرکزِ صحت کے لیے جگہ کا انتخاب کیا ہے۔ اب اس کے مطابق یہ لوگ نقشہ وغیرہ بنائیں گے تو پھر کام شروع ہوگا۔ میں نے سوچا ہے کہ اس مرکزِ صحت کا سنگِ بنیاد رکھنے کے لیے پانی و بجلی کے وفاقی وزیر کو دعوت دوں۔ وہ اگر یہاں آنے پر راضی ہو گئے تو پھر میڈیا کے لوگوں کے سامنے ہی ہم ان سے نور پور میں بجلی کی سپلائی کے سلسلے میں درخواست کریں گے۔ میڈیا والوں کی موجودگی میں وہ یہاں بجلی فراہم کرنے کا وعدہ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ ایک بار انہوں نے وعدہ کر لیا تو پھر میں ان کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ سیاسی نمائندے اپنا کردار بالکل بھی ادا نہیں کر رہے۔'' آج وہ سروے ٹیم کے ساتھ نور پور پہنچا ہوا تھا۔ عبدالمنان کو اس نے پیر آباد میں اسکول کی مرمت کے کام کا جائزہ لینے کی ذمے داری سونپی تھی اور خود یہاں آ گیا تھا۔ پھر انہیں روانہ کر کے خود نور پور کے چودھری بختیار سے ملاقات کے لیے چلا آیا تھا۔ پیروں سے معذور مگر کھلے دل کا چودھری بختیار اسے پسند آیا تھا۔

''سیاسی نمائندوں کی تو بات ہی نہ کریں جی۔ سارے کے سارے کٹھ پتلیوں کی طرح ہیں۔ چودھری افتخار جیسے لوگوں نے مڈل کلاس کے پڑھے لکھے بندوں کو پکڑ کر الیکشن میں کھڑا کر دیا تھا۔ ان بندوں کو کوئی جانتا تھا، نہ پہچانتا تھا لیکن ہماری عوام کو تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ان پر حکومت کرنے والے جس کی طرف اشارہ کر دیں، یہ بنا سوچے سمجھے اسے ووٹ دے دیتے ہیں۔ جو بندے یہاں سے ایم این اے اور ایم پی اے بنے ہیں، وہ تو سرے سے یہاں ملتے ہی نہیں۔ شہروں میں جا کر انہوں نے اپنے گھر بنا لیے ہیں اور مزے سے بیوی بچوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ کبھی کبھی ادھر کا چکر لگا لیتے ہیں اور اپنے آقاؤں کے حکم کے مطابق کام کرتے رہتے ہیں۔ حکومت خوش ہے کہ اس کی شرط کے مطابق پڑھے لکھے بندوں کے پاس سیاسی نمائندگی ہے۔ چودھری افتخار جیسے مطمئن ہیں کہ بھلے سے نام کسی کا بھی ہو لیکن اصل آقا وہی ہیں اور ان کے اشاروں پر ناچنے والے سیاسی نمائندوں کو بھی کوئی اعتراض نہیں کہ نقصان انہیں بھی نہیں، وہ اپنی جگہ عیش کر رہے ہیں۔'' چودھری بختیار نے اس کی بات کے جواب میں جو تبصرہ کیا، وہ تلخ سہی لیکن مبنی بر حقیقت تھا۔ وہ خود اپنی ملازمت کے مختصر عرصے میں یہ بات بھانپ گیا تھا اسی لیے اس نے ان نمائشی نمائندوں سے کچھ خاص تعلق بھی نہیں رکھا تھا اور خود اپنی مرضی سے آزادانہ کام کر رہا تھا۔

''میں نے خود بھی یہ سارے حالات بھانپ لیے ہیں بختیار صاحب! مجھے پوری طرح سے احساس ہے کہ یہاں کوئی بھی شخص عوام کے ساتھ مخلص نہیں ہے اور جو کچھ کرنا ہے، مجھے خود ہی کرنا ہے اسی لیے میں سارا وقت بھاگ دوڑ میں لگا رہتا ہوں۔ انشاء اللہ آپ جلد اپنے گاؤں سمیت سارے ضلع میں بہت سی تبدیلیاں دیکھیں گے۔'' چودھری بختیار کی بات سن کر اس نے اسے تسلی دی اور پھر رخصت کی اجازت لے کر وہاں سے روانہ ہوگیا۔ حسبِ معمول اس کی گاڑی مشاہدم خان ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ چودھری بختیار کے گھر سے وہ لوگ نور پور سے باہر جانے والے راستے کی طرف بڑھ گئے۔ ابھی ان کی گاڑی گاؤں کی حدود سے باہر نہیں نکلی تھی کہ ایک منظر نے انہیں چونکا دیا۔ ایک جیپ بہت تیز رفتاری سے دوڑتی ہوئی آئی اور ان سے کافی فاصلے پر رک گئی۔ جیپ میں چار پانچ آدمی سوار تھے لیکن ان میں سے کسی کی بھی توجہ ان کی گاڑی کی طرف نہیں تھی۔ وہ سب ان کے دیکھتے ہی دیکھتے چھلانگیں مار کر جیپ سے اترے اور ایک طرف دوڑنے لگے۔ ان کے ہاتھوں میں موجود ڈنڈے اور کلہاڑیاں بہت نمایاں تھیں۔ جیپ جس رخ سے آتی نظر آئی تھی، اس سے یہی اندازہ ہو رہا تھا کہ جیپ سواروں کا تعلق نور پور سے نہیں ہے، وہ کہیں باہر سے آئے ہیں۔ ان کے تیور بھی کافی خطرناک لگ رہے تھے۔ ان کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کسی کے

تعاقب میں ہیں۔ ان سے آگے ایک لڑکا اور لڑکی تھے جو تیزی سے درختوں کے جھنڈ کی طرف بھاگ رہے تھے۔

''گاڑی روک لو مشاہدم خان!'' یہ محسوس کر کے کہ ان دونوں کی جان خطرے میں ہے، اس نے حکم دیا۔ اس وقت میں ان کی گاڑی جیپ کے قریب پہنچ چکی تھی۔ مشاہدم خان نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے فوراً گاڑی کو بریک لگا دیے۔ وہ اور شہریار بہ یک وقت گاڑی سے باہر نکلے۔ اس وقت اگر عبدالمنان ساتھ ہوتا تو شاید انہیں اس معاملے میں ملوث ہونے سے روکتا لیکن مشاہدم خان ایک تو حکم کا غلام تھا، دوسرے خود بھی مہم جو فطرت کا مالک تھا، سو فوراً اس کا ساتھ دینے چل پڑا۔ اب وہ لوگ بھی درختوں کے اس جھنڈ کی طرف بھاگ رہے تھے جہاں انہوں نے پہلے لڑکا لڑکی اور بعد میں ان کا تعاقب کرنے والوں کو داخل ہوتے دیکھا تھا۔ اس جگہ کی زمین بہت نرم تھی اس لیے بھاگنے میں مشکل پیش آ رہی تھی مگر اس کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ قدموں کی آواز پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ اگر وہ لوگ اس راستے پر گاڑی لانے کی کوشش کرتے تو گاڑی کے ٹائر پھنس سکتے تھے۔ وہ دونوں ممکنہ رفتار سے دوڑتے ہوئے درختوں کے جھنڈ میں داخل ہوئے تو کچھ آوازیں ان کی سماعتوں سے ٹکرا گئیں۔ ان آوازوں کا تعاقب کرتے ہوئے وہ دبے قدموں آگے بڑھے۔ جھنڈ میں ذرا ہی آگے انہیں لڑکا لڑکی اور جیپ میں آنے والے افراد نظر آ گئے۔

''دیکھ قربان! میں کہہ رہا ہوں کہ تُو سامنے سے ہٹ جا۔ تُو اس کے سامنے دیوار بن کر کھڑا نہیں رہ سکتا۔ میرے بندے تجھے ایک جھٹکے میں ہٹا سکتے ہیں لیکن میں صرف اس لیے لحاظ کر رہا ہوں کہ اپنے ہی نوکروں کے ہاتھوں تیری ہستی (بے عزتی) نہ ہو۔'' قربان کے نام سے پکارا جانے والا ایک بیس بائیس سالہ نوجوان تھا جس نے ایک سہمی ہوئی لڑکی کو اپنی پشت کے پیچھے چھپا رکھا تھا۔ لڑکی کی پیٹھ چوڑے تنے والے ایک درخت سے لگی ہوئی تھی اس لیے کسی کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ نوجوان کو سامنے سے ہٹائے بغیر لڑکی تک پہنچ سکے اور نوجوان کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ ہرگز لڑکی کے سامنے سے نہیں ہٹے گا۔ شہریار نے لڑکی کو شناخت کر لیا۔ وہ چودھری بختیار کی چھوٹی بہن تھی۔ پچھلی بار وہ لوگ نور پور آئے تھے تو انہوں نے اس لڑکی کو چودھری بختیار کے گھر میں دیکھا تھا۔

''تو سامنے سے ہٹ رہا ہے یا میں ان لوگوں سے کہوں کہ تجھے گھسیٹ کر سامنے سے ہٹائیں اور باندھ کر جیپ میں ڈال دیں؟'' نوجوان کو سامنے سے ہٹتے نہ دیکھ کر اس شخص نے دھمکی آمیز لہجے میں پوچھا۔

''نہیں بھرا! میں نہیں ہٹوں گا۔ فریدہ تک پہنچنے کے لیے تمہیں میری لاش پر سے گزرنا پڑے گا۔ یہ میرے بلاوے پر یہاں تک آئی تھی، اس کی حفاظت میری ذمے داری ہے۔'' قربان نامی نوجوان نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

اس کے جواب سے شہریار کو اندازہ ہوا کہ وہ نوجوان اور اسے دھمکی دینے والا آپس میں بھائی ہیں لیکن دو سگے بھائیوں میں سے ایک فریدہ کی جان کا دشمن اور دوسرا اس کا محافظ کیوں بنا ہوا تھا، یہ بات اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

''لاشیں ہم صرف اپنے دشمنوں کی گراتے ہیں۔ اس بے شرم لڑکی تک پہنچنے کے لیے مجھے تیری لاش گرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرے بندے ایسے ہی تجھے قابو کر لیں گے۔'' اس شخص نے اطمینان سے کہا اور اپنے بندوں کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ وہ لوگ قربان کی طرف بڑھنے لگے۔ فریدہ جو پہلے ہی سہمی ہوئی تھی اور بھی زیادہ خوف زدہ ہوگئی اور پشت پر سے ہی لڑکے سے اس بری طرح چمٹ گئی جیسے اس کے وجود میں سما کر خود کو اپنے دشمنوں کی نظر سے چھپا لینا چاہتی ہو۔

''ٹھہرو۔'' شہریار جواب تک خاموش تماشائی بنا ہوا تھا، یک دم ہی درخت کے پیچھے سے نکل کر ان لوگوں کے سامنے آ گیا۔ کسی تیسرے کی ہاتھاپائی شروع ہونے سے قبل اس نے مداخلت ضروری سمجھی۔ اس کے ساتھ ساتھ مشاہدم خان بھی منظر پر آ گیا۔

''کون ہو تم لوگ؟'' وہ شخص چونکا۔ اس کے ساتھی بھی بھڑکے ہوئے نظر آنے لگے۔

''میں شہریار عادل ہوں۔ اس علاقے کا اسسٹنٹ کمشنر۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہاں کیا ہو رہا ہے؟'' ان لوگوں کے تیوروں کو خاطر میں لائے بغیر اس نے اطمینان سے اپنا تعارف کروایا اور سخت لہجے میں پوچھا۔

''دیکھیں سر جی! یہ ہمارے گھر کا معاملہ ہے۔ آپ اس معاملے میں دخل نہ دیں۔ ہم آپ اس مسئلے کا حل نکال لیں گے۔'' وہ شخص اس کا تعارف سن کر کچھ دبا تو ضرور لیکن اپنے طور پر اڑی بازی کرنے کی بھی کوشش کی۔ یقیناً ان لوگوں کی اس غیر متوقع مداخلت نے اسے بدمزہ کر دیا تھا، البتہ فریدہ اور قربان کے چہروں پر اپنے لیے مدد آ جانے پر رونق دوڑ گئی تھی۔

''گھر کا مسئلہ تھا تو گھر کی چار دیواری میں بیٹھ کر حل

کرتے۔ ہتھیاروں کے زور پر ان دونوں کو اس ویرانے میں گھیر کر کھڑے ہو اور کہتے ہو کہ گھر کا مسئلہ ہے۔ میں ابھی فون کر کے پولیس کو بتاتا ہوں۔ تھانے میں رہ کر پولیس کے ڈنڈے کھاؤ گے تو ساری بدمعاشی نکل جائے گی۔'' اسے اس شخص کی خصلت کا اندازہ ہو گیا تھا اس لیے اس سے اسی زبان میں بات کر رہا تھا جو اس کی سمجھ میں آ سکے۔ اس کے پیچھے کھڑے مشابرم خان نے حفظِ ماتقدم کے تحت اپنا ریوالور بھی نکال لیا تھا۔ اس صورتِ حال نے سناٹا سا طاری کر دیا۔

''پولیس تک بات نہ پہنچائیں سر! یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہ میرے وڈے بھرا ہیں۔ پولیس تک بات پہنچی تو بڑی بدنامی ہو گی۔ آپ نے ابھی دیکھا ہی ہو گا کہ میں فریدہ کی خاطر اپنی جان دینے کے لیے بھی تیار تھا۔ اس کی عزت اور جان کی حفاظت میں اپنی ذمے داری سمجھتا ہوں اس لیے آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ پولیس میں بات نہ جانے دیں، اس سے فریدہ کی بدنامی ہو جائے گی۔'' شہریار کو موبائل پر نمبر پنچ کرتے دیکھ کر قربان نے آگے بڑھ کر اس سے درخواست کی۔

''ٹھیک ہے، تم کہتے ہو تو میں اس معاملے میں پولیس کو انوالو نہیں کرتا لیکن یہ بتاؤ کہ اب آگے کیا کرنا ہے؟'' اسے خود بھی اندازہ تھا کہ پولیس میں بات جاتی تو بدنامی تو لازمی ہی ہوتی اور چودھری بختیار جیسے نیک فطرت شخص کے ساتھ یہ بڑی زیادتی ہوتی۔ اس لیے قربان کی درخواست پر اس نے فوراً موبائل جیب میں رکھ لیا۔ اس جگہ ویسے ہی سگنلز بہت کم آ رہے تھے اور اسے امید نہیں تھی کہ کسی تھانے سے رابطہ ہو سکے گا۔

''میں اپنے بھرا کے ساتھ چلا جاتا ہوں۔ آپ فریدہ کو اس کے گھر تک حفاظت سے پہنچا دیں۔ بس پھر سمجھیں کہ بات ختم۔'' شہریار کے ساتھ مذاکرات کی ذمے داری نوجوان قربان نے سنبھال لی تھی اور اس کا پھنے خان بھائی اپنے ساتھیوں کے ساتھ چپ چاپ کھڑا تھا۔

''ٹھیک ہے، اس لڑکی کی عزت کی خاطر میں یہ بات مان لیتا ہوں ورنہ جو کچھ میں نے یہاں دیکھا تھا، اس کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں تم سب کو تھانے میں بند کروا کر تمہارے دماغ درست کروا دوں۔'' سخت لہجے میں کہتے ہوئے اس نے معاملہ ختم ہونے کا اشارہ دیا۔ درختوں کے جھنڈ سے وہ لوگ اس طرح باہر نکلے کہ فریدہ اس کے ساتھ تھی اور قربان اپنے بھائی اور اس کے آدمیوں کے ساتھ جا رہا تھا۔

''آپ کا بہت بہت شکریہ جی! اگر آپ نہ پہنچتے تو جانے آج میرے ساتھ کیا ہو جاتا۔'' وہ لوگ گاڑی میں آ کر بیٹھے تو اب تک خاموش کردار بنی فریدہ نے اپنے لب کھولے اور اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''کسی تنہا جوان لڑکی کے ساتھ کیا کچھ ہو سکتا ہے، یہ تو تمہیں اپنے گھر سے اتنی دور اس ویرانے میں آنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔'' اس نے خشک لہجے میں کہا تو اس نے شرمندہ ہو کر نظریں جھکا لیں البتہ رونے کا سلسلہ اب بھی ہلکی ہلکی سسکیوں کی صورت میں جاری تھا۔

''یہ کون لوگ تھے؟ اور کیا معاملہ تھا... کیا تم مجھے بتاؤ گی؟'' ذرا سے توقف کے بعد اس نے فریدہ سے پوچھا۔ وہ لوگ ابھی تک اسی جگہ موجود تھے اور اس نے مشابرم خان کو گاڑی چلانے کا حکم نہیں دیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ گھر پہنچنے سے پہلے فریدہ خود کو سنبھال لے۔

''قربان ساتھ والے گاؤں کے زمیندار کا پُتر ہے۔ اس کے اور ہمارے خاندان کے بیچ ہمیشہ سے لڑائی رہی ہے۔ بھائی جی کی ٹانگیں جس حادثے میں ٹوٹیں، اس کے بارے میں بھی یہی خیال کیا جاتا ہے کہ اس حادثے کے پیچھے قربان کے باپ کا ہاتھ ہے، پر بھائی جی کو تو آپ نے دیکھا ہے کہ کیسے ٹھنڈے دماغ کے آدمی ہیں۔ انہوں نے کبھی یہ بات کسی اور کے سامنے نہیں کہی۔ شاید اکیلے ہونے کی وجہ سے وہ کمزور پڑ گئے ہیں۔ خیر جو بھی بات ہو، میں آپ کو اپنے اور قربان کے بارے میں بتا رہی تھی۔ قربان سے میری ملاقات ایک ویاہ پر ہوئی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا اور مجھ پر مر مٹا۔ مجھے بھی وہ اچھا لگا۔ یہ تو ہمیں بعد میں پتا چلا کہ ہمارے خاندان ایک دوسرے کے بیری ہیں۔ دشمنی کی وجہ سے ملنا جلنا نہیں تھا تو ہم ایک دوسرے کو پہچانتے بھی نہیں تھے۔ پیار کا بندھن بندھنے کے بعد خبر ہوئی تو دشمنی پیچھے چلی گئی، پر دوسرے لوگ تو ہماری طرح اس دشمنی کو نہیں بھول سکتے تھے۔ ابھی آپ نے جس آدمی کو دیکھا تھا، وہ قربان کا وڈا بھرا سجان تھا۔ اسے ہمارے بارے میں خبر ہوئی تو وہ قربان کے پیچھے پڑ گیا کہ فریدہ کا خیال دل سے نکال دو، پر قربان نہیں مانا۔ وہ بہانے سے چھپ چھپ کر مجھ سے ملنے آتا رہا۔ سجان کو اس کا پتا چل گیا اور اس نے دھمکی دی کہ اگر تو نے فریدہ سے ملنا نہیں چھوڑا تو میں اسے اٹھا کر لے جاؤں گا اور اس کی عزت خراب کر کے لاش چودھری بختیار کے گھر کے سامنے پھنکوا دوں گا۔ قربان پچھلی واری مجھ سے ملنے آیا تھا تو اس نے مجھے یہ بات بتائی تھی لیکن ساتھ ہی

اسے یہ بھی یقین تھا کہ سبحان بھرا صرف دھمکی دے رہا ہے، کرے گا کچھ نہیں اس لیے آج بھی وہ مجھ سے ملنے آگیا۔ جہاں آپ نے آج ہمیں دیکھا ہے، ہم ہمیشہ ادھر ہی ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ شاید سبحان بھرا کو بھی یہ بات معلوم تھی جب ہی قربان کے پہنچتے ہی وہ خود بھی پیچھے پہنچ گیا۔ وہ تو رب کا کرم ہے کہ آپ آگئے اور میری جان بچ گئی۔'' اس کے پوچھنے پر فریدہ نے سارا قصہ سنا دیا۔

''چودھری بختیار کو اس معاملے کا کچھ علم ہے؟''

''نہ جی۔ انہیں کچھ بھی نہیں پتا۔ آپ بھی انہیں کچھ نہ بتانا۔'' اس کا سوال سن کر وہ جلدی سے بولی۔

''ٹھیک ہے، نہیں بتاؤں گا۔'' شہریار نے اس سے وعدہ کیا اور مشابرم خان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''گاڑی موڑ لو۔ پہلے ہم انہیں چودھری بختیار کے گھر چھوڑ دیتے ہیں۔''

''نہ جی... گھر تک چھوڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں آپ ہی چلی جاؤں گی۔ جن سے خطرہ تھا وہ تو چلے گئے، اب مجھے کوئی ڈر نہیں۔ یہ میرا اپنا پنڈ ہے، یہاں کے سارے لوگ بھی میرے اپنے ہیں۔ یہاں والوں میں سے کوئی مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتا، پر اگر میں آپ کی گڈی میں گھر تک گئی تو بھائی جی کو کھوج لگ جائے گی کہ میں آپ کے ساتھ کیوں آئی ہوں۔''

فریدہ اس کی پیش کش سے صاف انکار کر کے گاڑی سے اتر گئی۔ اس نے بھی کوئی تعرض نہیں کیا۔ وہ جانتا تھا کہ فریدہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اسے واقعی یہاں سے اپنے گھر پہنچنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی البتہ اس کے ساتھ جانے پر وہ بات کھلنے کا اندیشہ تھا جسے وہ چھپانا چاہتی تھی۔ خود شہریار اس معاملے کو کھولنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس طرح کی کئی کہانیاں اس کے اردگرد پھیلی ہوئی ہوں گی اور وہ ایسی ہر کہانی میں خود کو ملوث کر کے اپنا وقت ضائع نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

''سلامیلکم سر جی! میں ایس ایچ او بشیر کاکڑ بات کر رہا ہوں جی۔''

''وعلیکم السلام۔ کہو کاکڑ، اس بچے الیاس کے سلسلے میں تم نے کیا کیا؟ میں نے تم سے کہا تھا کہ جلد از جلد بچے کا پتا کر کے اسے اس کے ماں باپ تک پہنچاؤ، پر ابھی تک تم نے کوئی رپورٹ ہی نہیں دی۔'' بشیر کاکڑ کی آواز سن کر اس نے فوراً اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

''اسی بارے میں تو رپورٹ دینے کے لیے آپ کو زحمت دی ہے سر جی! آپ کے حکم پر ہم دن رات الیاس کو ڈھونڈنے میں لگے ہوئے تھے۔ سارا گاؤں چھان مارا، بسوں کے اڈے پر بھی جا کر پوچھ گچھ کی تھی کہ کہیں بچہ گاؤں سے باہر تو نہیں نکلا مگر کچھ معلوم ہی نہیں ہو رہا تھا لیکن آج دوپہر ہمیں سب پتا چل گیا۔ بڑے سنسنی خیز انکشافات ہوئے ہیں جی۔ اتنے سالوں کی سروس میں، میں نے ایسا گھناؤنا معاملہ کبھی نہیں دیکھا۔ لوگوں کا کچھ پتا ہی نہیں چلتا، سامنے سے اتنے نیک نظر آتے ہیں اور اندر سے پورے شیطان ہوتے ہیں۔ جو اللہ کے گھر میں بیٹھ کر بھی ایسی گھناؤنی حرکتیں کرے، اسے شیطان کیا شیطان سے بڑھ کر کہیں تو کم ہے جی۔''

''تفصیل اور ترتیب سے ساری بات بتاؤ مگر اپنے ذاتی خیالات اور تبصروں کے بغیر۔ میرے پاس اتنا فالتو ٹائم نہیں کہ تمہاری بے سروپا باتیں سنتا رہوں۔'' اس نے کاکڑ کو ٹوکا۔

''میں الیاس کے کیس کے سلسلے میں بتا رہا تھا جی۔ الیاس کے بارے میں خبر مل گئی ہے، پر اچھی خبر نہیں ہے۔ آج دوپہر سے پہلے گاؤں کا ایک لڑکا میرے پاس آیا تھا۔ لڑکے کا نام ادریس ہے۔ الیاس سے یہی کوئی تین چار برس بڑا ہوگا۔ ادریس میرے پاس آیا اور زور دینے لگا کہ اگر مجھے الیاس کی تلاش ہے تو میں مسجد کی تلاشی لوں اور مولوی غلام محمد سے اس کے بارے میں پوچھ گچھ کروں۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ یہ لڑکا مولوی پر الزام لگانے کی کوشش کیوں کر رہا ہے؟ میں نے اس سے اس کے اس شک کی وجہ پوچھی تو پہلے تو وہ کچھ بتانے پر راضی نہیں ہوا پھر میں نے ذرا ڈرایا دھمکایا اور تھانے میں بند کرنے کی دھمکی دی تو اس نے زبان کھول دی۔ اس کی بتائی ہوئی باتوں سے مجھے پتا چلا کہ مولوی کتنا گندہ آدمی ہے۔ ادریس نے رو رو کر مجھے مولوی کے اس ظلم کے بارے میں بتایا جو وہ اس کے ساتھ کرتا رہا تھا۔ الیاس کے بارے میں اس نے خیال ظاہر کیا کہ مجھے شک ہے کہ مولوی نے اسے بھی اپنی ہوس پوری کرنے کے لیے استعمال کیا ہوگا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے اسی وقت شک پڑ گیا تھا جب چودھری کی ناراضی کی وجہ سے غیاث محمد کے گھر میں فاقے ہو رہے تھے اور الیاس مدرسے میں مولوی کے پاس کھانا کھا کر آتا تھا۔ بھوک سے بے حال الیاس کو یقیناً اس نے اپنے مطلب کے لیے راضی کر لیا تھا لیکن جب غیاث محمد کے حالات سدھر گئے تو اس نے مدرسے کا رخ کرنا چھوڑ دیا۔ کئی بار مولوی غلام محمد نے بچوں سے پیغام بھیج کر الیاس کو بلوایا، پر وہ مدرسے جانے پر راضی نہیں ہوا۔ جس دن وہ غائب ہوا، اس روز غیاث محمد نے مار پیٹ کر اسے مدرسے بھیجا تھا۔ بس پھر اس کے بعد وہ نہیں ملا۔ ادریس شک کے باوجود کسی کے سامنے زبان کھولنے کی ہمت نہیں کر سکا لیکن آج جب اس نے نوراں کو روتے پیٹتے دیکھا تو اس سے اس کی حالت نہیں دیکھی گئی اور وہ میرے پاس تھانے آگیا۔ ادریس کی رپورٹ پر میں فوراً اپنے بندے لے کر مسجد پہنچا، پر معلوم ہوا کہ مولوی غلام محمد آج صبح ہی اپنے کسی کام سے گاؤں سے باہر گیا ہے اور اس وقت موجود نہیں۔ مسجد میں دو تین بچے موجود تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ مولوی صاحب کے حکم پر مسجد کی صفائی کر رہے ہیں۔ ان بچوں سے پوچھ گچھ کرنے پر معلوم ہوا کہ جس روز الیاس غائب ہوا، اس روز وہ مدرسے آیا تھا لیکن مولوی صاحب اسے دیکھ کر بہت غصہ ہوئے اور غصے میں اس کا ہاتھ پکڑ کر مدرسے کے لیے استعمال ہونے والے کمرے سے باہر لے گئے کہ اب تجھے یہاں پڑھنے آنے کی ضرورت نہیں۔ بچوں نے بتایا کہ مولوی صاحب نے الیاس کو مارا بھی تھا اور انہوں نے اس کے رونے کی آواز بھی سنی تھی لیکن پھر اس کی آواز آنا بند ہو گئی اور مولوی صاحب واپس آکر انہیں پڑھانے لگے۔ یہ سارا واقعہ ہمیں پہلے بھی معلوم تھا لیکن ادریس کے بیان کی روشنی میں دوبارہ سوچا تو معاملہ مشکوک لگا۔ ہم نے مسجد کی تلاشی لینے کا فیصلہ کیا۔ ساری مسجد کھلی ہوئی تھی لیکن وہ کمرا جس میں مولوی غلام محمد رہتا تھا، اس میں تالا پڑا تھا۔ ہم نے تالا توڑ کر کمرے کی تلاشی لی تو وہاں سے ایسی کئی چیزیں ملیں جن سے اندازہ ہوا کہ مولوی واقعی مشکوک کردار کا بندہ تھا۔ انگریزی رسالوں سے کاٹی گئی گندی تصویریں، عجیب عجیب دوائیں اور کلوروفام کی بوتل اس کے کپڑوں کے صندوق سے ملی، پر الیاس وہاں نہیں تھا۔ اسی وقت میرے دل میں ایک خیال آیا۔ میں نے سوچا مولوی نے ساری مسجد کی صفائی کا کام بچوں کے ذمے لگایا تھا تو اپنے کمرے کی صفائی کیوں نہیں کروائی؟ اس پہ کیوں تالا مار کر چلا گیا؟ ساری مشکوک چیزیں تو اس کے کپڑوں کے صندوق میں بند تھیں اور صندوق پر تالا لگا تھا۔ اگر وہ صفائی کے لیے اپنا کمرا کھلا چھوڑ کر بھی چلا جاتا تو کسی کو اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ میں نے بچوں سے پوچھا کہ کیا ہمیشہ مولوی صاحب اپنا کمرا خود صاف کرتے ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ نہیں، ہمیشہ تو ہم ہی صفائی کرتے ہیں بس آج ہی مولوی صاحب تالا لگا کر چلے گئے ہیں۔ اس بات کو سن کر میرا شک اور بھی پکا ہو گیا۔ میں نے اپنے سپاہیوں سے کہا کہ کمرے کے فرش پر بچھی چٹائی اٹھا دیں۔ سپاہیوں نے چٹائی اٹھانے کی کوشش کی تو وہ فرش سے چپکی ہوئی تھی۔ انہوں نے زور لگا کر چٹائی کو فرش سے اکھاڑ دیا۔ چٹائی ہٹی تو میرا شک یقین میں بدل گیا۔ کمرے کا فرش کھدا ہوا تھا اور صاف پتا چلتا تھا کہ اسے کھودنے کے بعد دوبارہ مٹی ڈال کر برابر کیا گیا ہے۔ میں نے کدال اور پھاوڑا وغیرہ منگوا کر دوبارہ کھدائی کروائی تو ذرا سی دیر میں مولوی کا جرم سامنے آگیا۔ الیاس کی لاش وہاں موجود تھی اور اس کی حالت سے ظاہر تھا کہ لاش کو دفنائے پندرہ سولہ گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں گزرا۔ اپنے تجربے سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ اسے گلا گھونٹ کر مارا گیا ہے۔ اصل بات پوسٹ مارٹم ہونے کے بعد سامنے آجائے گی۔''

بشیر کاکڑ اس کے حکم پر تفصیل سے ساری رپورٹ سناتا گیا اور وہ دم سادھے اس بھیانک واردات کا قصہ سنتا رہا۔ اس ساری تفصیل کو سنتے ہوئے اس کا اپنا ذہن بھی واقعات کا تجزیہ کرتا جا رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ غلام محمد جب الیاس کا ہاتھ پکڑ کر بہ ظاہر اسے مسجد سے باہر نکال آیا تھا تو دراصل اس وقت وہ اسے باہر نہیں لے گیا تھا بلکہ اپنے ذاتی استعمال کے کمرے میں لے جا کر اسے بے ہوش کر دیا تھا۔ اس کے بعد قوم لوط کا وہ نمائندہ اپنی ہوس پوری کرتا رہا لیکن دو تین دن گزر جانے کے بعد اسے احساس ہوا کہ الیاس کی اتنے دن کی گم شدگی کے بعد اس کا منظر پر آنا خطرناک بھی ہو سکتا ہے تو اس نے اس معصوم بچے کو ختم کر کے اپنے ہی کمرے میں اس کی قبر کھود کر اسے دفنا دیا۔ مولوی غلام محمد پہلی ملاقات میں ہی اسے اچھا نہیں لگا تھا لیکن پھر بھی اسے یہ اندازہ ہرگز بھی نہیں تھا کہ وہ اتنے مکروہ کردار کا مالک ہوگا۔ جو کچھ ایس ایچ او نے اسے بتایا تھا، اسے سن کر تو اس کے اندر شعلے سے بھڑک اٹھے تھے اور بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح وہ غلیظ آدمی سامنے آجائے تو اپنے ہاتھ سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔

''مولوی کے بارے میں کیا اطلاع ہے... وہ کہاں گیا ہے اور کب تک واپس آئے گا؟'' خوفناک سنجیدگی کے ساتھ اس نے ایس ایچ او سے پوچھا۔

''مولوی کسی کو کچھ بتا کر تو نہیں گیا، پر میں نے اس کے بارے میں جو تفتیش کروائی ہے اس سے پتا چلا ہے کہ وہ اردگرد کے کسی گاؤں ہی گیا ہے۔ جس بس میں وہ بیٹھا تھا، اس کے کنڈیکٹر نے بتایا ہے کہ اللہ آباد یا میرو میں سے کسی ایک گاؤں کے قریب اترا تھا۔ صحیح جگہ اسے یاد نہیں تھی۔ میں نے دونوں جگہ اپنے بندے بھیجے ہیں۔ وہ واپس آجائیں تو پھر پتا چل سکے گا کہ مولوی کہاں ہے؟ وہ جہاں بھی ہوا،

میرے سپاہی اسے ہتھکڑیاں لگا کر لے آئیں گے۔ اس کی گرفتاری کے بعد میں آپ کو خبر کردوں گا۔ ابھی تو اس لیے فون کیا تھا کہ آپ کو اب تک کی رپورٹ دے دوں۔'' ایس ایچ او نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے یقین دہانی کروائی۔

''ٹھیک ہے۔ وہ گرفتار ہو جائے تو مجھے خبر دینا۔ میں اس شخص کو اس کے جرم کی کڑی سے کڑی سزا دلواؤں گا۔ اور ہاں، سنو! کوشش کرنا کہ الیاس کے ورثاء کو اس کی لاش کارروائی کے بعد بغیر کسی پریشانی کے جلد مل جائے۔ وہ بے چارے پہلے ہی دکھی ہوں گے، انہیں مزید تکلیف نہیں پہنچنی چاہیے۔'' ایس ایچ او کو ہدایات دینے کے بعد اس نے فون بند کر دیا اور عبدالمنان کو اپنے کمرے میں بلا کر واقعے کے بارے میں آگاہ کیا اور تعزیت کے لیے پیر آباد جانے کا فیصلہ بھی سنایا۔

جب وہ لوگ پیر آباد پہنچے تو غیاث محمد کے گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ ایک تو معصوم بچے کی بھیانک موت پھر اس شخص کے بارے میں ہونے والا انکشاف جسے وہ بہت نیک سمجھتے تھے اور جس کی ہر بات پر عمل کرتے تھے۔ لوگوں میں سخت اشتعال اور غم و غصے کے جذبات پائے جاتے تھے۔ شہر یار کو دیکھ کر وہ لوگ زور و شور سے مطالبہ کرنے لگے کہ مجرم کو فوراً گرفتار کر کے اسے سخت سزا دی جائے۔ اس نے لوگوں کو تسلی دی اور انہیں یقین دلایا کہ مجرم کو کسی حال میں معاف نہیں کیا جائے گا۔ اس کے بعد وہ غیاث محمد سے ملا۔ اکلوتے بیٹے کی موت نے اسے بالکل گم صم کر دیا تھا۔ شدتِ غم سے وہ رونے کے لائق بھی نہیں رہا تھا، البتہ نوراں خوب پچھاڑے کھا رہی تھی اور بین کر کر کے رو رہی تھی۔ گاؤں کے لوگ بھی افسردہ تھے اور اس کے ساتھ آنسو بہا رہے تھے۔ مختصر عرصے میں تیسری بار نوراں کی کوکھ اجڑی تھی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ وہ جو تعزیت کے خیال سے وہاں گیا تھا، اسے اندازہ ہوا کہ وہ ان لوگوں کو کوئی تسلی نہیں دے سکتا۔ چند رسمی جملے بہ مشکل ادا کرنے کے بعد وہ وہاں سے روانہ ہو گیا، البتہ ایک خیال بہت شدت سے اس کے ساتھ تھا۔ خود کو تباہی سے بچانے کے لیے نوراں اور غیاث محمد نے ماہ بانو کو داؤ پر لگانے کا سوچا تھا لیکن انہیں کیا خبر تھی کہ چودھری افتخار کی ذات کے علاوہ بھی ایک ذات ہے جو طاقت رکھتی ہے۔ جو رحمٰن ہے اور رحیم بھی لیکن جب لوگ اس کی رحمت پر بھروسا کرنے کے بجائے زمینی خداؤں کے خوف میں مبتلا ہو کر ان کی اطاعت کرنے لگتے ہیں تو وہ اپنے قہار اور جبار ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ اب یہ بندوں پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ خود کو کی جانے والی اس تنبیہ پر سنبھل کر رب کائنات سے توبہ و استغفار کرلیں یا سرکشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گلے شکووں پر اتر آئیں۔

☆☆☆

''کیا خیال ہے باجوہ صاحب، اس ہفتے مال سپلائی کر دیا جائے؟ چمڑے کے کارخانے والے کا مسلسل فون آ رہا ہے کہ مال کی شارٹیج کی وجہ سے اسے مشکل ہو رہی ہے۔ جن پارٹیوں کے ساتھ وہ بزنس کرتا ہے، وہ پارٹیاں تقاضا کر رہی ہیں۔ لکڑی کے سلسلے میں بھی میری ایک نئی پارٹی سے بات ہو گئی ہے۔ موتی والا کی طرح اس پارٹی کے ساتھ شراکت کے بجائے صرف مال سپلائی کر کے رقم پکڑنے کا معاملہ طے کیا ہے میں نے۔ شراکت داری میں لوگوں کو راز مل جاتے ہیں اور بندے کا کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کب کس کا دماغ پھر جائے۔ موتی والا بھی اتنے برسوں تک ہمارے ساتھ کام کرتا رہا اور آخر میں جا کر غداری پر اتر آیا۔ بے کار میں حب الوطنی کا بھوت چڑھ گیا تھا سالے پر۔ اب بھی دیکھ لیں، کمینے کے مرنے کے بعد بھی وہ اے سی کا بچہ اس کی جائیداد سے اسکول و اسپتال بنواتا پھر رہا ہے۔''

''مال تو بالکل تیار ہے چودھری صاحب! جب سے شہر یار عادل اے سی بن کر آیا ہے، سپلائی ہو ہی نہیں سکی۔ ضلع سے باہر جانے والی گاڑیوں کی وقت بے وقت چیکنگ ہونے لگتی ہے، ایسے حالات میں مال سپلائی کرنے کا رسک نہیں لیا جا سکتا۔ تارڑ صاحب کی موجودگی سے بھی ہمیں زیادہ فائدہ نہیں ہے۔ شہر یار اکثر ان کے علم میں لائے بغیر ہی کوئی بھی کارروائی کر ڈالتا ہے۔ ایسے میں مجھے تو مال سپلائی کرتے ہوئے بہت خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ اگر مال پکڑا گیا تو میری ہی گردن پھنسے گی۔ سب سے پہلے مجھ سے ہی سوال کیا جائے گا کہ جنگل سے غیر قانونی طور پر لکڑی اور کھالیں نکلیں کیسے؟'' چودھری افتخار کی بات سن کر اقبال باجوہ نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

''آپ کے تحفظ کا مجھے پورا خیال ہے باجوہ صاحب! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم کام کرنے سے پہلے آپ کے بارے میں نہ سوچیں۔ میں نے حالات کا جائزہ لینے کے بعد ہی سپلائی کی بات کی ہے۔ میرے بندے اچھی طرح دیکھ بھال چکے ہیں کہ آج کل سڑک پر کہیں چیکنگ نہیں ہو رہی۔ شہر یار آج کل رفاہی کاموں میں معروف ہے۔ اسپتالوں اور اسکولوں کی تعمیر کے چکر میں اسے دوسری باتوں کی طرف دھیان دینے کی فرصت نہیں مل رہی اور اب وہ مولوی غلام محمد والے معاملے میں بھی الجھ گیا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ جگہ جگہ مولوی کے اسکیچ والے پوسٹر لگا کر اسے گرفتار کروانے میں مدد دینے والے کے لیے انعام کا اعلان کیا گیا ہے۔ مولوی کو گرفتار کروانے کے لیے شہر یار دیوانہ ہو رہا ہے۔ ان دنوں ضلعی پولیس اس چکر میں پھنسی جگہ جگہ مولوی کو تلاش کرتی پھر رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے لیے یہ بہت اچھا موقع ہے۔ ہم اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر اپنا مال سپلائی کر سکتے ہیں۔'' چودھری نے اسے حوصلہ دیا۔

''بات تو آپ کی صحیح ہے۔ واقعی ہم اس موقعے کا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اگر ایک بار مال یہاں سے باہر نکل گیا تو مسئلہ حل ہو جائے گا۔ آگے تو پھر ہماری وہی پرانی سیٹنگ بنی ہوئی ہے۔ آگے کوئی ہمارے مال کو روکنے والا نہیں ہو گا۔'' وہ قائل ہونے لگا پھر اس کا دھیان مولوی غلام محمد کی طرف گیا تو وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''ویسے یہ آپ کا مولوی غلام محمد تو بڑی اونچی چیز نکلا۔ اس سے ایسے کام کی امید نہیں تھی مجھے۔ اگر وہ پولیس کے ہاتھ لگ جاتا تو ٹھیک ٹھاک مشکل میں پڑ جاتا۔ اب بھی جانے کہاں چھپا بیٹھا ہے کہ کسی کے ہاتھ نہیں آ رہا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ آپ کے علاوہ بھی اسے کسی کی سپورٹ حاصل تھی اور اب وہ اسی شخص کی پناہ میں چھپا بیٹھا ہے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔ آدمی وہ خبیث ہے۔ اس بات کو میں نے سمجھ لیا تھا اس لیے تھوڑی سی رقم اور سہولتیں دے کر اس سے اپنے مطلب کے کام لیتا رہا۔ اس کی وجہ سے مجھے بڑی آسانی تھی۔ گاؤں والے اس کی بات بہت مانتے تھے اس لیے مجھے لوگوں کو جس چیز سے دور رکھنا ہوتا، اس کے لیے مولوی سے کہہ دیتا۔ مولوی اللہ کے عذاب اور جہنم کے ڈراوے دے کر لوگوں کو قابو میں کر لیتا تھا لیکن اب اس کا جو کارنامہ کھل کر سامنے آیا ہے، اس کے بعد تو مجھے ڈر ہے کہ لوگ اس کی سکھائی پڑھائی ساری باتیں بھول کر اپنی من مانی کرنے لگیں گے۔'' چودھری نے بھی اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔

''یہ تو زیادہ بڑا مسئلہ نہیں ہے چودھری صاحب! غلام محمد کے بعد گاؤں کی مسجد ہمیشہ خالی تو نہیں رہے گی۔ اس کی جگہ جو نیا مولوی آئے گا، آپ اسے اپنا بنا لیجیے گا۔ پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اس کے سامنے بڑے بڑے زاہد ڈگمگا جاتے ہیں۔'' باجوہ نے مشورہ دیا۔

''خیر، جانے دیں اس معاملے کو۔ یہ معاملہ تو میں وقت پر خود ہی دیکھ لوں گا۔ اس وقت جو اصل مسئلہ ہے وہ مال کی سپلائی کا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ لکڑی اور کھالیں دونوں ایک ساتھ ہی سپلائی کر دی جائیں۔''

''یہ تو بہت زیادہ رسک والی بات ہو جائے گی چودھری صاحب! بے شک آپ کو اطمینان ہے کہ شہر یار کا آج کل اس معاملے کی طرف دھیان نہیں لیکن اگر اتفاق سے اسے کچھ بھنک پڑ گئی اور وہ عین وقت پر چھاپا مار بیٹھا تو ہمیں تو بہت زیادہ نقصان ہو جائے گا۔'' چودھری کی تجویز سن کر اس نے فوراً اعتراض کیا۔

''ایسا نہیں ہو گا۔ میں نے اس بارے میں ساری منصوبہ بندی کر لی ہے۔ میں ایسا انتظام کر دوں گا کہ وہ کہیں اور اس طرح سے مصروف ہو جائے کہ اسے ہوش ہی نہ رہے۔'' چودھری نے گہرے اطمینان کے ساتھ جواب دیا اور اسے اپنا منصوبہ سمجھانے لگا۔ اس منصوبے کو سن کر وہ بھی مطمئن ہو گیا۔

☆☆☆

''نور پور کی تقریب کے سلسلے میں کیا تیاری ہے عبدالمنان! اس موقعے پر ہر کام بالکل پرفیکٹ ہونا چاہیے۔ میں نے وزیر صاحب سے بڑی مشکل سے وقت لیا ہے۔ کوشش کرنا کہ تقریب کا انتظام ایسا ہو کہ وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے اس دورے کا پورا پورا فائدہ حاصل کیا جائے۔''

''آپ فکر نہ کریں سر! میں سب انتظامات کا ذاتی طور پر جائزہ لے رہا ہوں۔ نور پور میں تقریب کے لیے سارے انتظامات کر لیے گئے ہیں۔ مرکزِ صحت اور اسکول کے نقشے تیار ہیں۔ وزیر صاحب کے سنگِ بنیاد رکھنے سے پہلے انہیں یہ نقشے دکھا کر اپنے پروجیکٹ کے بارے میں بریف کیا جائے گا۔ میڈیا والوں اور دوسری اہم شخصیات کو دعوت نامے بھیج دیے گئے ہیں۔ انشاء اللہ اس تقریب کا پیر آباد کی تقریب سے زیادہ اچھا رسپانس سامنے آئے گا۔'' عبدالمنان نے اسے تسلی دی۔

''پیر آباد میں کام کیسا چل رہا ہے؟ الیاس کی لاش ڈسکور ہونے کے بعد میں دوبارہ وہاں کا چکر لگا ہی نہیں سکا۔ وزیر صاحب کو راضی کرنے، ان سے تقریب میں شرکت کا وقت لینے کے لیے ہی اتنی بھاگ دوڑ کرنی پڑی کہ کسی اور طرف دھیان ہی نہیں دے سکا۔''

''وہاں کا کام بالکل اے ون طریقے سے چل رہا ہے۔ اسکول کی مرمت کا کام تو تقریباً مکمل ہو گیا ہے، بس دو چار دن اور لگیں گے پھر عمارت استعمال کے قابل ہو جائے گی۔ ماسٹر آفتاب بھی اس دوران اسپتال سے فارغ ہو کر واپس پہنچ جائے گا۔ ویسے آدمی بڑے کام کا ہے وہ۔ اسپتال

میں بستر پر لیٹے لیٹے بھی اسے چین نہیں ہے۔ کل کے اخبار میں اسکول والے حادثے پر اس کا ایسا کاٹ دار کالم شائع ہوا ہے کہ میں پڑھ کر اُش اُش کر اٹھا۔ اس نے کسی کا نام لیے بغیر اس انداز میں حادثے کا ذکر کیا ہے کہ ذمے داران سمجھ بھی جائیں کہ کس کی طرف اشارہ ہے اور کوئی اسے یہ بھی نہ کہہ سکے کہ تم نے میرا نام کیوں لیا؟'' پیر آباد کے بارے میں رپورٹ دیتے دیتے عبدالمنان نے ماسٹر آفتاب کے بارے میں بھی رپورٹ دے دی۔ ماسٹر آفتاب کے لیے اس کے لہجے میں گہری ستائش تھی۔

''آفتاب بہت ذہین آدمی ہے لیکن مسلسل خطروں سے کھیل رہا ہے۔ مجھے اس کی طرف سے بڑی فکر رہتی ہے۔'' وہ اپنوں کے سمجھانے کے باوجود کسی بھی خطرے کو خاطر میں لائے بغیر وہی کچھ کرتا تھا جو مناسب سمجھتا تھا لیکن آفتاب کی طرف سے اسے سچ مچ فکر رہنے لگی تھی۔ خصوصاً کشور والا معاملہ سامنے آنے کے بعد اسے سخت تشویش تھی کہ اگر کسی کو اس بات کی بھنک پڑ گئی تو آفتاب کی خیریت سو فیصد خطرے میں پڑ جائے گی اور وہ ایک مخلص اور کام کے آدمی کو ضائع نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔

''خطرہ تو ہم سب کے لیے ہی ہے سر! ہم جن لوگوں کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں وہ ہم سے زیادہ بااختیار بے شک نہیں ہیں لیکن اس لیے زیادہ خطرناک ہیں کہ ان میں انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ انسانوں کی جان سے کھیلنا اور انہیں نقصان پہنچانا ان کے لیے کوئی بڑی بات نہیں۔ آپ کو بھی ایک پیغام مل تو چکا ہے کہ چپ چاپ راستے سے ہٹ جائیں ورنہ اگلی بار بات مزید بڑھ سکتی ہے۔'' اس کا اشارہ اس حادثے کی طرف تھا جس میں شہریار کو باقاعدہ ٹریپ کر کے زخمی کیا گیا تھا۔

''میں ایسی دھمکیوں سے ڈرنے والا نہیں۔'' اس نے بے نیازی سے شانے اچکائے اور اچانک یاد آجانے پر پوچھا۔ ''تم نے اس اے ایس آئی اور کانسٹیبل کے گھر والوں کو بھی تقریب میں آنے کی دعوت دے دی ہے نا؟ میں چاہتا ہوں کہ اس تقریب میں ان دونوں خاندانوں کے لیے مالی مدد کا اعلان کیا جائے۔ ان لوگوں کا جو نقصان ہوا ہے اسے تو پورا نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کی عزت افزائی اور مالی معاونت کے ذریعے دوسرے لوگوں کو یہ پیغام تو دیا جا سکتا ہے کہ فرض کے لیے جان قربان کرنے والوں کی قربانی رائیگاں نہیں جاتی۔''

''یس سر! میں نے ان لوگوں کو دعوت بھجوا دی ہے۔ تقریب والے دن دفتر کی گاڑی انہیں لینے جائے گی۔''

عبدالمنان نے اطلاع دی۔ اسی وقت میز پر رکھا فون بج... لگا۔ اس نے ایک فائل کو کھولتے ہوئے عبدالمنان کو کال ریسیو کرنے کا اشارہ کیا۔ اس نے ریسیور اٹھا کر ایک منٹ کے لیے بات کی اور پھر ریسیور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''ایس پی تارڑ صاحب لائن پر ہیں سر! آپ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔'' اس نے اپنی ناگواری کے احساس کو چھپاتے ہوئے ریسیور تھام لیا۔ اس شخص کو سخت ناپسند کرنے کے باوجود وہ اس سے بات کرنے پر مجبور تھا۔ ایک ہی ضلع میں رہ کر وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے پیشہ ورانہ ذمے داریوں کی وجہ سے رابطے میں رہنے پر مجبور تھے۔ سجاد رانا کی یقین دہانی کے باوجود ابھی تک کوئی ایسی انتظامی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی کہ تارڑ سے نجات مل جاتی۔ اس شخص کی جڑیں بھی یقیناً مضبوط تھیں اس لیے سجاد اسے ابھی تک وہاں سے اکھاڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

''السلام علیکم اے سی صاحب! کہیے کیسے مزاج ہیں آپ کے؟'' اس کے ہیلو کہتے ہی دوسری طرف سے معظم تارڑ کی پُرجوش آواز سنائی دی۔

''وعلیکم السلام۔ فرمائیے کیسے یاد فرمایا آپ نے؟'' ایس پی کی گرم جوشی کو خاطر میں لائے بغیر اس نے براہِ راست کال کرنے کا مقصد دریافت کیا۔

''آپ کو ایک اہم اطلاع دینے کے لیے فون کیا تھا۔ ویسے تو یہ پولیس کا معاملہ ہے لیکن چونکہ آپ پہلے بھی پرائی اس معاملے میں دلچسپی ظاہر کر چکے ہیں، اس لیے میں نے سوچا کہ آپ سے یہ معاملہ شیئر کر لیا جائے۔ آپ پر مجھے پورا اعتماد ہے کہ آپ اس ٹاپ سیکرٹ معاملے میں بہت احتیاط سے کام لیں گے۔''

''کیسا معاملہ؟'' معظم تارڑ کی ادھوری باتوں نے اس کے تجسس کو بھڑکایا۔

''میں ڈاکوؤں والے معاملے کی بات کر رہا ہوں۔ آپ نے جب مجھ سے اس معاملے پر بات کی تھی، تب سے ہی میں نے اس پر خصوصی نظر رکھی ہوئی تھی۔ آج ہی ایک مخبر یہ اطلاع لے کر آیا ہے کہ ڈاکو آج رات کارروائی کرنے والے ہیں۔ ان کا نشانہ پیر آباد، میرو یا اللہ آباد میں سے کوئی ایک گاؤں ہو سکتا ہے۔ مخبر کو گاؤں کے بارے میں کنفرم معلوم نہیں لیکن یہ طے ہے کہ کارروائی آج رات ہی کی جائے گی۔ میں نے سوچا کہ آپ سے بھی مشورہ کر لوں۔ ویسے تو میں نے اپنے طور پر پولیس فورس کے جوانوں کو ہدایات دے دی ہیں۔ ان تینوں ہی مقامات پر پولیس فورس موجود رہے گی۔

ڈاکوؤں نے جس طرف کا بھی رخ کیا، انہیں منہ کی کھانی پڑے گی لیکن آپ بھی اس سلسلے میں اگر کوئی ہدایت دینا چاہتے ہیں تو مجھے دے دیں۔ میں اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کروں گا۔'' معظم تارڑ کی دی ہوئی اطلاع واقعی بڑی زوردار تھی۔ اگر ڈاکو اس اطلاع کے مطابق سچ مچ کارروائی کرنے والے تھے تو یہ بہت اچھا موقع تھا کہ انہیں گھیر کر گرفتار کر لیا جائے۔

''آپ نے اس سلسلے میں جو اقدامات کیے ہیں ذرا مجھے اس کی تفصیل بتا دیں تارڑ صاحب! تب ہی میں آپ کو کوئی مشورہ دینے کے قابل ہو سکوں گا۔'' معاملہ ایسا تھا کہ وہ سارے اختلافات بھلا کر سنجیدگی سے ایس پی کے ساتھ گفتگو کرنے لگا۔ اس نے بھی بلاتامل مختصراً اپنے منصوبے کی وضاحت کر دی۔ اس کی طے کردہ حکمتِ عملی بہت اچھی تھی اور اس کے پیچھے اس کا برسوں کا تجربہ صاف نظر آ رہا تھا۔

''ویری نائس تارڑ صاحب!'' شہریار نے فوراً اسے سراہا۔ ''آپ کی حکمتِ عملی بہت اچھی ہے۔ بس آپ اس بات کا خاص خیال رکھیے گا کہ پولیس فورس کے لوگ سادہ لباس میں اور بہت خاموشی سے ان تینوں جگہوں پر اپنی پوزیشن سنبھالیں۔ جس طرح ہمیں خبر ملی ہے اسی طرح کوئی ڈاکوؤں کے لیے بھی مخبری کر سکتا ہے۔ اگر انہیں پولیس والوں کی موجودگی کی بھنک بھی مل گئی تو وہ پیچھے ہٹ جائیں گے اور ہمارے ہاتھ سے انہیں گرفتار کرنے کا سنہری موقع نکل جائے گا۔''

''میں خیال رکھوں گا سر! بس تھوڑی سی پریشانی یہ ہے کہ تین تین گاؤں کور کرنے کی وجہ سے ہمیں نفری کی تھوڑی کمی کا سامنا ہے لیکن یہ ایڈوانٹیج بھی ہے ہمارے پاس کہ ڈاکو بے خبری میں آئیں گے اس لیے ہمارے جوان ان پر کم تعداد کے باوجود بھی قابو پانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔''

''یہ بہت بڑا ایڈوانٹیج ہے تارڑ صاحب! بے خبری میں تھوڑی فورس کے ساتھ بھی آپ ڈاکوؤں کی بڑی تعداد پر قابو پا سکتے ہیں۔ اسی لیے تو میں نے آپ سے کہا ہے کہ آپ پوری کوشش کیجیے گا کہ کسی کو کانوں کان آپ کی کارروائی کا علم نہ ہو سکے۔'' شہریار نے زور دے کر کہا۔

''یہ بات تو میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں سر! بس آپ دعا کیجیے گا کہ ہمیں کامیابی ملے۔''

''وش یو بیسٹ آف لک تارڑ صاحب!'' اس نے تارڑ کی جذباتی درخواست کے جواب میں کہا اور فون بند کر کے تجسس نظروں سے اپنی طرف دیکھتے عبدالمنان کی طرف متوجہ ہو کر اسے ساری تفصیل کہہ سنائی۔

''کہیں ان لوگوں نے آپ کو نقصان پہنچانے کے لیے کوئی نیا پلان نہ بنایا ہو۔'' ساری بات سن کر عبدالمنان نے شک کا اظہار کیا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ شہریار حسبِ عادت پُرجوش ہو چکا ہے اور اس سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ خود اس کارروائی میں حصہ لینے کے لیے پر تول رہا ہو۔

''ہو سکتا ہے تمہارا شک صحیح ہو۔ اسی لیے میں نے ایس پی کے سامنے ایسا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا جس سے اسے لگے کہ میں اس کارروائی میں شامل ہونا چاہتا ہوں، البتہ اس معاملے کی تصدیق کے لیے میں دور دور سے ہی سہی لیکن ان لوگوں پر نظر ضرور رکھوں گا۔ رہی نقصان پہنچنے کی بات تو تم فکر مت کرو، اس بار میں ہوشیار ہوں اور پہلے سے اپنی حفاظت کے لیے ایسے انتظامات کر کے جاؤں گا کہ مجھے نقصان پہنچانے کی خواہش رکھنے والے اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکیں۔'' اس کے اس جواب پر عبدالمنان ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ اس جذباتی جوان کو اس کے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتا۔

☆☆☆

رات دھیرے دھیرے گہری ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اپنی گاڑی میں ڈی ایس پی منظور کے ساتھ موجود تھا۔ اس کی گاڑی حسبِ معمول مشابرم خان ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس گاڑی کے پیچھے ایک پولیس جیپ بھی موجود تھی۔ اس نے عین وقت پر اپنا یہ فیصلہ بدل دیا تھا کہ اس مہم میں اپنی انوالمنٹ کو ایس پی تارڑ سے پوشیدہ رکھے گا۔ شام کے وقت خود فون کر کے اس نے ایس پی سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اس کے کیے ہوئے انتظامات کا جائزہ لینے تینوں گاؤں کا دورہ کرنا چاہتا ہے۔ ایس پی نے اس کی اس خواہش پر کوئی تعرض نہیں کیا تھا، البتہ یہ احساس ضرور دلایا تھا کہ اس کا یہ اقدام خود اس کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ حالات کا کچھ پتا نہیں تھا۔ ڈاکو کسی بھی وقت تینوں میں سے کسی بھی گاؤں پر دھاوا بول سکتے تھے اور اگر وہ کسی ایسے گاؤں میں داخل ہو جاتے جہاں وہ موجود ہوتا تو اسے نقصان پہنچنے کا احتمال تھا۔ وہ ایس پی کے اس خدشے کو خاطر میں نہیں لایا تھا اور اپنی خواہش پر قائم رہتے ہوئے علاقہ ڈی ایس پی کو اپنے پاس بھیجنے کے احکامات دے دیے تھے۔ اب ڈی ایس پی اس کے ساتھ تھا اور وہ لوگ پیر آباد اور میرو کا دورہ کر چکے تھے۔ وائرلیس پر ایس پی مسلسل ان لوگوں سے رابطے میں تھا۔ موبائل فونز ہر جگہ کام نہیں کرتے تھے اس لیے وائرلیس اس موقعے پر زیادہ

کارآمد تھا۔ وہ لوگ میرو سے نکلے تو ایک بار پھر ایس پی نے ان لوگوں سے رابطہ کر لیا۔ وائرلیس سیٹ ڈی ایس پی منظور کے پاس تھا۔ پہلے اس نے ایس پی سے بات کی اور اسے بتایا کہ وہ لوگ میرو سے نکل کر اب اللہ آباد کی طرف جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ایس پی کی خواہش پر اس نے شہریار سے بھی اس کی بات کروادی۔ شہریار نے اس سے بات کرتے ہوئے پیرآباد اور میرو میں اس کے کیے گئے انتظامات پر مکمل اطمینان ظاہر کرتے ہوئے ایک بار پھر اسے اپنے اللہ آباد جانے کے بارے میں بتایا اور ساتھ ہی یہ اطلاع بھی دی کہ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنے بنگلے پر واپس چلا جائے گا، البتہ ایس پی جب چاہے دفتر فون کر کے اس کے پی اے عبدالسنان سے رابطہ کر سکتا ہے۔ کسی بھی ہنگامی صورتِ حال کے پیشِ نظر عبدالسنان آج کی رات دفتر میں ہی گزارنے والا تھا۔ ایس پی نے اس پیش کش پر اس کا شکریہ ادا کیا اور اطمینان دلایا کہ پولیس فورس آرام سے اس معاملے کو ہینڈل کر لے گی۔ اس نے شہریار کو یہ احساس بھی دلایا تھا کہ رات بہت زیادہ ہو گئی ہے اور اب اسے جلد از جلد خطرے کے ان علاقوں سے نکل جانا چاہیے۔ جواباً اس نے ایس پی کو بتایا تھا کہ دورے کی اصل وجہ کو چھپانے کے لیے اسے دونوں گاؤں میں علاقے کے مسائل سننے پر کچھ وقت صرف کرنا پڑا تھا۔ اس لیے اندازے سے زیادہ وقت لگ گیا تھا لیکن اب اللہ آباد میں وہ زیادہ وقت لگانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس ساری گفتگو کے بعد ایس پی اور ان کے درمیان رابطہ منقطع ہو گیا اور وہ گمبھیر سنجیدگی کے ساتھ مشابرم خان سے بولا۔ ''اللہ آباد جانے کی کوئی ضرورت نہیں مشابرم خان! گاڑی ضلع سے باہر جانے والی سڑک پر لے لو۔'' اس کے ساتھ بیٹھا ڈی ایس پی اس حکم پر چونکا اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''اللہ آباد میں پولیس فورس کے لوگ موجود ہیں اور مجھے یقین ہے کہ باقی دونوں جگہوں کی طرح وہاں بھی بہت اچھا انتظام ہو گا۔ اس وقت ہم اللہ آباد کے بجائے وہاں جائیں گے جہاں ہماری زیادہ ضرورت ہے۔''

''تو پھر میں ایس پی صاحب کو پروگرام کی اس تبدیلی کے بارے میں انفارم کر دیتا ہوں۔ انہیں آپ کی سیفٹی کی طرف سے بہت فکر تھی اس لیے انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ کی ساری موومنٹ سے انہیں باخبر رکھوں۔'' ڈی ایس پی نے وائرلیس سیٹ کی طرف ہاتھ بڑھائے۔

''لیکن میں انہیں اپنی موومنٹ سے بے خبر رکھنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ میرا ساتھ دیں تو بہت فائدے میں رہیں گے۔ آخر آپ کو بھی تو ایسے کسی کارنامے کی ضرورت ہے جس کے بعد آپ کا ڈی ایس پی سے ایس پی بننے کا راستہ آسان ہو جائے۔ اگر آپ ایس پی صاحب کے احکامات کی تعمیل میں لگے رہے تو آپ کا ریکارڈ ایسے کارناموں سے خالی ہی رہے گا، اس لیے بہتر ہے کہ آپ میری بات مان لیں۔'' ڈی ایس پی کا وائرلیس کی طرف بڑھتا ہاتھ رک گیا اور وہ معنی خیز لہجے میں اس سے بولا۔

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا سر!'' وہ اس کی بات سن کر مزید الجھا ہوا نظر آنے لگا۔

''میرا مطلب بہت واضح ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جو ڈراما آپ کے ایس پی صاحب نے رچایا ہوا ہے، مگر آپ اس سے بے وقوف نہ بنیں اور اس جگہ پہنچ جائیں جہاں اصل کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ اب تک جو میں آپ کے ساتھ ادھر اُدھر گھومنے میں وقت برباد کرتا رہا ہوں، وہ صرف اس لیے تھا کہ مجھے اس ڈرامے میں انوالو کرنے والوں کو یقین آ جائے کہ میں ان کے بنائے ہوئے پلان سے بے وقوف بن گیا ہوں لیکن یہ سچ نہیں ہے۔ یہ ان لوگوں کو جلد پتا چل جائے گا، بس اس کے لیے آپ کے تھوڑے سے تعاون کی ضرورت ہے اور یقین جانیے اس تعاون کے نتیجے میں آپ نقصان میں نہیں رہیں گے۔'' وہ دھیرے دھیرے ڈی ایس پی کو سارا پلان سمجھانے لگا۔

آج شام ہی انور نے اسے فون پر اطلاع دی تھی کہ بڑے لوڈرز کے ذریعے لکڑی اور کھالیں باہر بھیجی جا رہی ہیں۔ اپنے دعوے کے مطابق وہ واقعی کارآمد ثابت ہوا تھا اور عین وقت پر ایک اہم اطلاع فراہم کر کے اسے ایس پی کے جال میں پھنسنے سے بچا لیا تھا۔ انور کی کال کے بعد وہ پوری طرح سارا معاملہ سمجھ گیا تھا لیکن ایس پی کو بہ دستور یہ تاثر دے رہا تھا کہ وہ اس کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس چکا ہے۔ اس تاثر کو مضبوط کرنے کے لیے اس نے باقاعدہ پیرآباد اور میرو کا دورہ بھی کر ڈالا تھا لیکن اب اللہ آباد جانے کا وہ ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اب رات کا وہ حصہ شروع ہو چکا تھا جب اس کا اس مقام پر پہنچنا ضروری تھا جہاں لوڈرز کو روکا جانا تھا۔

''میں آپ کی ساری بات سمجھ گیا ہوں سر! مجھے آپ کا ساتھ دینے پر بھی کوئی اعتراض نہیں لیکن اس کام کے لیے ہمارے پاس نفری بہت کم ہے۔ ان دونوں لوڈرز کے ساتھ کئی افراد ہو سکتے ہیں۔ لوڈرز کو روکنے اور ان افراد سے نمٹنے کے لیے ہمیں زیادہ نفری کی ضرورت ہو گی۔'' ساری بات سن کر ناپسندیدگی ظاہر کرنے کے ساتھ ڈی ایس پی نے ایک اہم مسئلے کی طرف اس کی توجہ دلائی۔ اسے معلوم تھا کہ ڈی ایس پی راضی ہو جائے گا۔ حالانکہ اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ اب تک وہاں جو کچھ ہوتا رہا تھا، اس سے ڈی ایس پی مکمل طور پر ناواقف نہیں ہو گا۔ وہ جانتا ہو گا کہ یہاں سے لکڑی اور کھالوں کی غیر قانونی اسمگلنگ ہوتی رہتی ہے لیکن اپنا کچھ نہ کچھ حصہ لے کر چشم پوشی اختیار کر لیتا ہو گا، پر اب اس نے اسے جو آفر دی تھی، وہ زیادہ بڑی تھی۔ اس کی پشت پناہی میں وہ یہ کارروائی کرتا تو خود اپنے افسروں کے عتاب سے بھی محفوظ رہتا اور مفت میں ایک کارنامہ بھی اس کے حصے میں لکھ دیا جاتا۔ محکمے کی طرف سے اس کارنامے کو سراہے جانے کے ساتھ میڈیا کی طرف سے جو پذیرائی ملتی، وہ اس کارروائی کا ایک اور پلس پوائنٹ ہوتی۔

''نفری کی طرف سے آپ فکر نہ کریں۔ نورکوٹ کے تھانے کا کچھ عملہ کسی ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے میں نے تھانے میں رکھنے کی ہدایت دی تھی۔ وہاں ایک آدھ کانسٹیبل کو چھوڑ کر ہم باقی بندوں کو اپنے ساتھ لے سکتے ہیں۔ بس اتنا انتظام کرنا ہو گا کہ کسی کو ان بندوں کے ہمارے ساتھ جانے کا فوری طور پر علم نہ ہو سکے۔ اس کے لیے میں نے سوچ لیا ہے کہ وقتی طور پر تھانے کے فون کو تار کاٹ کر ناکارہ کر دیا جائے گا۔ جب وہاں سے کسی کا رابطہ ہی نہیں ہو گا تو یہ بھی نہیں پتا چل سکے گا کہ ہمارے ساتھ کوئی گیا ہے۔'' وہ پورا لائحہ عمل طے کر چکا تھا۔ ڈی ایس پی اس کی ہدایات کے مطابق عمل کرتا چلا گیا۔ جلد وہ لوگ سارے انتظامات کے ساتھ اس مقام پر پہنچ گئے جہاں انہیں لوڈرز کو روکنا تھا۔ اس بار وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ پُرامید تھا، اس لیے جوش بھی زیادہ تھا۔ ان کے ساتھ موجود پولیس کے جوانوں نے سڑک پر رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔ اب کوئی بھی گاڑی بغیر چیکنگ کے وہاں سے نہیں گزر سکتی تھی۔ اس سارے عمل کے دوران ایک بار پھر ایس پی کی کال آئی تھی اور ڈی ایس پی نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا تھا کہ اے سی صاحب تھک گئے تھے اس لیے اللہ آباد کا دورہ کیے بغیر ہی اپنے بنگلے پر واپس چلے گئے۔ خود اپنے بارے میں اس نے بتایا تھا کہ وہ اردگرد کے کسی تھانے میں موجود رہے گا اور جیسے ہی کہیں پر ڈاکوؤں کی آمد کی اطلاع ملی، اپنے ساتھ موجود سپاہیوں کو لے کر وہاں پہنچ جائے گا۔ اس بات کے بعد دوبارہ ایس پی نے رابطے کی زحمت نہیں کی تھی اور وہ لوگ پورے اطمینان سے اپنا کام کر رہے تھے۔ انہیں بہت زیادہ دیر تک انتظار کی زحمت نہیں اٹھانی پڑی اور سڑک پر دو قوی ہیکل لوڈرز آگے پیچھے دوڑتے اس طرف آتے نظر آئے۔ آگے والے لوڈر نے رکاوٹ کے بالکل قریب پہنچنے کے بعد بریک لگائے۔ یقیناً سڑک پر موجود یہ رکاوٹ ان کے لیے بالکل غیر متوقع تھی۔ انہیں تو یہی کہہ کر بھیجا گیا ہو گا کہ جاؤ... راستہ بالکل صاف ہے۔ معمول کے مطابق ڈیوٹی پر رہنے والے بھی آج موجود نہیں کہ انہیں نفری کی کمی کا بہانہ کر کے آج رات کسی نہ کسی جگہ کھپا دیا گیا ہے۔ ایسے میں اچانک راستے میں آنے والی یہ رکاوٹ ان کے لیے پریشان کن ہی ثابت ہوئی ہو گی۔ آگے والے لوڈر کے رکنے کے بعد پچھلے لوڈر کو بھی خود بہ خود ہی رکنا پڑا تھا۔

''کیا بات ہے سنتری بادشاہ! یہ راستہ کیوں بند کر کے کھڑے ہو؟'' اگلے ٹرک ڈرائیور نے کھڑکی سے جھانک کر قریب آنے والے سپاہی سے پوچھا۔

''ہمیں ان لوڈرز کی تلاشی لینی ہے۔ تم لوگ نیچے اتر دو تاکہ ہم اپنا کام کر سکیں۔''

''او یار چھوڑ اس تلاشی ولاشی کو... ہم لوگ جلدی میں ہیں۔ کچھ لے کر معاملہ ختم کر... کیوں بے کار میں اپنا اور ہمارا وقت برباد کرتا ہے۔''

اس بار ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے آدمی نے گفتگو میں دخل دیتے ہوئے سپاہی کو لالچ دیا لیکن ظاہر ہے، وہ اس پیش کش کو قبول کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا چنانچہ جواباً سختی سے بولا۔ ''بکواس بند کرادئے... ہمیں خبر ملی ہے کہ ان ٹرکوں پر غیر قانونی مال جا رہا ہے۔ ہمیں ہر حال میں ان کی تلاشی لینی ہے۔''

''تیرے باپ میں بھی دم نہیں کہ زبردستی تلاشی لے سکے۔ ہم ایسی کی تیسی کر کے رکھ دیں گے تم لوگوں کی۔'' وہ شخص پھنکارتا ہوا ہاتھ میں ریوالور لے کر نیچے اترا لیکن فوراً ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ سامنے نظر آنے والے دو تین سپاہیوں کے علاوہ بھی پولیس کے بہت سے جوان ان کے گرد موجود ہیں جنہوں نے انہیں گھیر لیا ہے۔

''تم لوگ گھیرے جا چکے ہو۔ بہتر ہے کہ ہتھیار ڈال دو اور خود کو قانون کے حوالے کر دو۔'' فوراً ہی بلند آواز میں کیا گیا اعلان بھی سنائی دیا جس کے بعد کسی شک کی گنجائش ہی نہیں رہی کہ وہ لوگ پھنس چکے ہیں۔ دونوں ڈرائیوروں سمیت وہ کُل چار تھے اور جس انداز میں پولیس والوں نے انہیں گھیرا تھا، اس سے صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ ان کے بارے میں باخبر تھے۔ ایسی صورت میں یہ ممکن نہیں تھا کہ پولیس کی نفری کم ہوتی۔ انہیں اپنے پھنس جانے کا شدت سے احساس ہوا لیکن وہ ہتھیار ڈال کر خود کو پولیس کے حوالے بھی نہیں کر سکتے تھے،

اس لیے گھبراہٹ میں فوری طور پر فائر کھول دیا۔ فوراً ہی پولیس کی طرف سے بھی جوابی فائر ہوا لیکن وہ لوگ بہت محتاط فائرنگ کر رہے تھے۔ شہریار نے اس سلسلے میں خاص ہدایت دی تھی۔ وہ مجرموں کو زندہ گرفتار کرنا چاہتا تھا تاکہ ان کے ذریعے اصل افراد تک پہنچا جا سکے۔ اس احتیاط پسندی نے مجرموں کو موقع دے دیا کہ وہ موقعے سے فرار ہونے کی کوشش کریں۔ دو افراد اس کوشش میں کامیاب بھی ہو گئے۔ فائر کرتے ہوئے انہوں نے پہلے آہستہ آہستہ سڑک چھوڑی پھر کچے میں اتر کر اندھیرے کا حصہ بن گئے۔ تیسرے نے بھی اپنے ساتھیوں کی پیروی کرنے کی کوشش کی لیکن اسے یہ موقع نہیں دیا گیا۔ دو رانفلو سے بہ یک وقت فائر ہوئے۔ ایک گولی اس کے پیر میں لگی اور دوسری پشت میں گھس گئی۔ گولیاں کھا کر وہ ایک جھٹکے سے گرا تو پھر حرکت نہیں کی۔ شاید پشت پر لگنے والی گولی نے دل تک رسائی حاصل کر کے اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا تھا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر چوتھے بندے نے ہتھیار پھینک کر ہاتھ اٹھا دیے۔ فوراً ہی پولیس کے جوانوں نے اسے گھیر کر اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی۔ زخمی شخص کا معائنہ کیا گیا تو وہ مر چکا تھا۔ دونوں لوڈرز کا سرسری سا جائزہ لینے کے بعد ہی یہ بات سامنے آ گئی کہ انور کی دی گئی اطلاع بالکل درست تھی۔ لوڈرز پر وہی مال لدا ہوا تھا جس کو اتنے دنوں سے پکڑنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اس کامیابی پر شہریار کا چہرہ جگمگانے لگا۔ ڈی ایس پی منظور بھی بہت خوش تھا۔ اس ساری کارروائی میں اسے بھاگ دوڑ کچھ خاص نہیں کرنا پڑی تھی لیکن کریڈٹ پورا پورا اسے ہی ملتا۔ شہریار اس پورے کیس میں خود سامنے نہیں آ سکتا تھا۔ ساری ستائش پولیس کے حصے میں ہی آنی تھی۔

"اسے کسی محفوظ جگہ رکھنا۔ یہ بڑے کام کا بندہ ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کی مدد سے ہم اصل مجرموں تک پہنچ سکتے ہیں۔" گرفتار شدہ شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے ہدایت دی جس کے جواب میں ڈی ایس پی نے بڑی فرماں برداری سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس وقت وہاں بڑی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ گرفتار شخص کو محفوظ مقام پر پہنچانا، مردہ آدمی کے لیے ایمبولینس کا انتظام اور مقامی میڈیا کو پولیس کی اس کارکردگی سے آگاہ کرنے کے مسائل درپیش تھے۔ مختصر نفری کے ساتھ یہ سارے معاملات نمٹانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ مفرور افراد کے پیچھے جانے والے بھی اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار کر آ چکے تھے۔ ان لوگوں کے فرار ہو جانے کا اسے افسوس تھا لیکن جتنی بڑی کامیابی ملی تھی، اس کے مقابلے میں یہ چھوٹا سا نقصان برداشت کیا جا سکتا تھا۔ اس قسم کے آپریشنز میں ایسی چھوٹی موٹی کوتاہیوں کا مارجن رکھنا ہی پڑتا ہے۔

"سر! وائرلیس پر کال آ رہی ہے۔" وہ لوگ ابھی ان معاملات کو دیکھ ہی رہے تھے کہ مشابرم خان نے آ کر اطلاع دی۔ ڈی ایس پی کا وائرلیس سیٹ اسی کی گاڑی میں تھا۔ اس اطلاع پر اس نے سوالیہ نظروں سے شہریار کی طرف دیکھا اور اس کی طرف سے کال ریسیو کرنے کا اشارہ ملنے پر خود گاڑی کی طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے چہرے پر گمبھیر تاثرات تھے۔ وہ کچھ پریشان بھی لگتا تھا۔

"خیریت؟" شہریار نے پوچھا۔

"ایس پی صاحب تھے۔ نور پور گاؤں پر ڈاکوؤں نے حملہ کر کے وہاں پر کافی لوٹ مار مچائی ہے اور فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ڈاکوؤں کی وہاں آمد کی اطلاع بہت دیر سے ملی۔ اطلاع ملنے کے بعد بھی فوری طور پر کارروائی نہیں کی جا سکی۔ ضلع کی زیادہ تر پولیس پیر آباد، میر داد اور ... آباد کی حفاظت پر مامور تھی۔ نور کوٹ تھانے میں موجود نفری کو بھی ہم اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ پھر تھانے کا فون بھی ناکارہ تھا اس لیے کوئی رابطہ نہیں ہو سکا۔ دوسری جگہوں پر موجود پولیس کے جوان جب تک نور پور پہنچے، وہاں سارا کھیل ختم ہو چکا تھا۔ ایس پی صاحب خود نور پور میں ہیں اور مجھے بھی وہیں کال کیا ہے۔" اس نے اطلاع دی تو شہریار گویا ششدر رہ گیا۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ ڈاکوؤں کا ہوا کھڑا کر کے لکڑی اور کھالوں کی اسمگلنگ کی طرف سے اس کی توجہ ہٹانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن وہاں تو سچ مچ ڈاکوؤں نے کارروائی ڈال دی تھی، البتہ جن جگہوں کے بارے میں اطلاع دی گئی تھی، ان سے ہٹ کر بالکل مختلف جگہ پر یہ کام ہوا تھا۔ اب یہ نہیں معلوم تھا کہ ڈاکوؤں کو پولیس کے تاک میں بیٹھے ہونے کی خبر مل گئی تھی اس لیے انہوں نے اپنا رخ بدل لیا تھا یا اصل ڈراما ہی اس طرح پلان کیا گیا تھا۔ یہ بات کوئی بعید از امکان نہیں تھی کہ ڈاکوؤں کے حملے کا ڈراما بھی اس کی توجہ ہٹانے کے لیے ہی بنایا گیا ہو اور اس ڈرامے کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے نور پور کو ٹارگٹ بنایا گیا ہو۔ اس طرح ڈرامے پر حقیقت کا بھی گمان ہوتا اور ڈاکو بھی محفوظ رہتے جیسا کہ ہوا بھی تھا۔ زمینداروں، پولیس اور ڈاکوؤں کا آپس کا گٹھ جوڑ کوئی نئی بات تو نہیں تھی۔ تینوں گروہوں کے لوگ آپس کے مفاد کی خاطر ایک دوسرے کی مدد بہ وقت ضرورت کرتے ہی رہتے تھے۔

"آپ نے ایس پی صاحب کو یہاں کی صورتِ حال کے بارے میں آگاہ کیا تھا؟" لمحہ بھر میں یہ ساری باتیں سوچنے کے بعد اس نے ڈی ایس پی سے پوچھا۔

"نو سر! وہ اتنی جلدی میں تھے کہ اپنی بات کہہ کر رابطہ ختم کر دیا۔ مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں ملا۔"

"انہیں آپ کے بتائے بغیر بھی تھوڑی دیر میں معلوم ہو ہی جائے گا۔ بہتر ہے اس تھوڑی سی مہلت سے فائدہ اٹھا کر آپ اپنا کام مکمل کر لیں۔ میں خود اپنے ڈرائیور کے ساتھ نور پور کے لیے روانہ ہو رہا ہوں۔ آپ سے اس بارے میں کسی بھی قسم کی جواب دہی کی جائے تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ بھی کیا گیا، اے سی صاحب کے کہنے پر کیا گیا۔ آپ کے نور پور نہ پہنچنے کی وجہ میں خود ایس پی صاحب کو بتا دوں گا۔" ڈی ایس پی کا جواب سن کر اس نے اس سے کہا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے حکم پر مشابرم خان نے گاڑی کو ہوائی جہاز بنا دیا۔ فراٹے بھرتی ہوئی گاڑی جس تیزی سے نور پور کی طرف دوڑ رہی تھی، اسی تیزی سے اس کا ذہن بھی دوڑ رہا تھا۔ وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ کچھ دیر پہلے جو کچھ ہوا ہے، اس پر سارے ملوث افراد بُری طرح تلملائیں گے۔ بہرحال، وہ انہیں زک تو پہنچا ہی چکا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ گرفتار ہونے والا شخص کن ناموں کی نشان دہی کرتا ہے اور اس شخص کے بیان کی بنیاد پر اس جرم میں ملوث کن افراد پر گرفت کی جا سکتی ہے؟ اپنی اس کامیابی کے ساتھ ساتھ اسے نور پور کی بھی فکر ستا رہی تھی۔ اس چھوٹے سے گاؤں میں ڈاکوؤں نے جانے کتنی تباہی مچائی ہو گی؟ غریب دیہاتیوں کو پہنچنے والے نقصان کے خیال نے اپنی اتنی بڑی کامیابی کی خوشی کو ماند کر دیا تھا۔

☆☆☆

"میرے بچو! یہ حربے نئے نہیں ہیں۔ یہ حربے یہود و نصاریٰ پہلے بھی ہم پر آزماتے رہے ہیں۔ وہ لوگ کبھی خوراک، تعلیم اور صحت کے نعرے لگاتے ہوئے آتے ہیں اور انسانی ہمدردی کی آڑ میں معصوم لوگوں کے ذہنوں کو قابو میں کر کے انہیں اپنا معمول بنا لیتے ہیں۔ ان کفار کا اصل مقصد ہمارے لوگوں کے عقائد بدل کر انہیں اپنے مذہب میں شامل کرنا ہوتا ہے۔ اب انہوں نے ایک اور چال چلی ہے۔ ان کا منصوبہ ہے کہ بے شک مسلمان اپنا مذہب نہ چھوڑیں لیکن ان کے عقیدے اس طرح بدل جائیں کہ وہ بس نام کے ہی مسلمان رہ جائیں۔ اس کام کے لیے وہ ایسے روشن خیالی کا راگ الاپنے والے مسلمانوں کا استعمال کر رہے ہیں جنہیں تم اپنے علاقے میں آج کل سرگرم دیکھ رہے ہو۔ ہمارے علاقے کا نیا اے سی بھی انہی لوگوں میں سے ہے۔ بھولے بھالے لوگ بڑے متاثر ہو رہے ہیں کہ اے سی ان کی بھلائی کے کام کر رہا ہے لیکن انہیں کیا معلوم کہ اس کے بنائے ہوئے اسکولوں میں جو تعلیم دی جائے گی، اس سے مسلمان بچوں کا ذہن خراب ہو جائے گا۔ وہ اپنے دین کو بھول جائیں گے۔ اس چال باز اے سی کا اپنا تعلق ایسے گھرانے سے ہے جہاں کوئی اللہ رسول سے ڈرنے والا نہیں۔ ان کی محفلوں میں کھلے عام شراب پی جاتی ہے، عورتوں کو نچایا جاتا ہے، جوا کھیلا جاتا ہے۔ ان کے بینک اکاؤنٹ حرام کی کمائی سے بھرے ہیں۔ ایسے بے دین شخص سے کیسے توقع رکھی جا سکتی ہے کہ اس کا کوئی کام مسلمانوں کی بھلائی کے لیے ہو گا۔" کھچڑی ڈاڑھی والا وہ شخص اپنے سامنے بیٹھے چار پانچ لڑکوں سے بڑے نرم لہجے میں بات کر رہا تھا۔ ان لڑکوں میں سے کسی کی عمر سولہ سترہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ بہت توجہ سے اس شخص کی باتیں سن رہے تھے۔

"مگر مولانا صاحب! آج کل تو پورے ضلع میں نئے اے سی کی بڑی دھوم ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ ایک ایمان دار اور بہادر افسر ہے۔ اسی کی وجہ سے یہاں سے ہونے والی لکڑی اور کھالوں کی اسمگلنگ کا بھانڈا پھوٹا ہے۔" تقریباً چودہ سال کے ایک گورے چٹے لڑکے نے جس کی مسیں ابھی بھیگنی شروع ہوئی تھیں، کہا تو وہ شخص ایسے انداز میں مسکرایا جیسے کسی بچے کی نادانی پر مسکرایا جاتا ہے اور پھر پہلے سے بھی زیادہ پُرشفقت لہجے میں بولا۔

"یہی تو وہ ہتھکنڈے ہیں میرے بچے جن سے وہ لوگوں کو متاثر کرنا چاہتا ہے۔ سارے میں اس کی واہ واہ ہو گئی لیکن دیکھو، ابھی تک کھل کر کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ یقیناً اندر ہی اندر اس نے اور پولیس نے اسمگلروں سے کٹ مکا کر لیا ہو گا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ مال پکڑا بھی اس لیے گیا ہو گا کہ اسمگلرز اسے اس کی مرضی کا بھتا نہیں دے رہے ہوں گے۔ تم لوگ دیکھ لینا کہ آئندہ ایسا کچھ نہیں ہو گا۔"

"میرے بس میں ہو تو میں ایسے مکار لوگوں کو جان سے مار دوں۔ ایسے دو چار مارے جائیں گے تو ان کے باقی ساتھیوں کے دماغ خود بہ خود ہی ٹھکانے آ جائیں گے۔" جذبات کی شدت سے سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ تیز لہجے میں یہ جملہ بولنے والا لڑکا بھی کوئی چودہ پندرہ برس کا تھا۔

"تحمل سے میرے بچے! تحمل سے۔ ہمیں بہت سوچ سمجھ کر ان لوگوں سے نمٹنا ہو گا۔ یہ بڑے پہنچ والے لوگ

ہیں۔تمہاری طرح خود میرا دل بھی غصے سے بھرا ہوا ہے۔ خاص طور پر ان لوگوں نے مولوی غلام محمد پر جو رکیک الزام لگایا ہے، اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو سینہ جل اٹھتا ہے۔ ایک معلم اور مسجد کے امام پر ایسا گندہ الزام انہوں نے لگایا ہی اس لیے ہے کہ لوگوں کا دل مذہبی ذہن رکھنے والے افراد کی طرف سے خراب ہو جائے۔ دنیا جانتی ہے کہ پولیس جو چاہے وہ کرسکتی ہے۔ جانے انہوں نے کب کس طرح اس معصوم بچے کو غائب کر کے اسے جان سے مارا اور پھر لاش مولوی صاحب کے کمرے سے دریافت کرلی۔ بے چارے مولوی غلام محمد سیدھے سادے سے آدمی تھے۔ وہ اس سازش سے کیسے نمٹتے۔ بے چارے اپنی جان اور عزت بچانے کے لیے نہ جانے کہاں چھپ کر بیٹھے ہوں گے؟ وہ جو پیرآباد میں کافی عرصے سے ماسٹر لوگوں کے دماغ خراب کرنے کی کوشش کرر ہا تھا، اس کی تو بڑے عرصے سے خواہش تھی کہ مسجد والا مدرسہ بند ہو جائے۔ اب اس سازش کے بعد تو ظاہر ہے اس کا مطلب پورا ہی ہوگیا ہوگا۔ میرے خیال میں تو وہ ماسٹر بھی اس سازش میں اسسٹنٹ کمشنر کے ساتھ شامل ہو گا۔ بہر حال جس نے جو کچھ کیا ہے، ایک دن ضرور بھگتے گا۔ یوں سمجھ لو کہ ابھی ان کفار کے آلۂ کاروں کی رسّی دراز ہے۔ جس دن رسّی کھنچ گئی، سب کا دم ناک میں آجائے گا۔'' وہ لہجے میں بڑی حلاوت لیے ان معصوم ذہنوں میں زہر بھر رہا تھا۔

''کیا ہم ان لوگوں کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے مولانا صاحب؟ اپنے دین کے خلاف سازش کرنے والے ان لوگوں کے خلاف جہاد کرنا تو ہم سب پر فرض ہے۔'' وہی لڑکا ایک بار پھر جوش سے بولا۔

''اس کے لیے بڑے حوصلے اور ہمت کی ضرورت ہے۔ جہاد جہاد پکارنا الگ بات ہے لیکن وقت پڑنے پر جان کی بازی لگانا بڑا مشکل ہوتا ہے۔'' اس نے جانچنے والی نظروں سے اپنے سامنے بیٹھے لڑکوں کو دیکھا۔

''وقت پڑنے پر ہم اس بات کو ثابت کر سکتے ہیں۔ ہمارا جذبہ صرف زبانی نہیں ہے، ہم عمل کی بھی ہمت رکھتے ہیں۔'' ان میں سے دو تین لڑکے ایک ساتھ بول اٹھے۔

''شاباش میرے بچو! ہمارے دین کو تمہارے ہی جیسے جانبازوں اور دلیروں کی ضرورت ہے۔ مجھے فخر ہے کہ تمہارے اندر یہ ہمت اور جذبہ میری تربیت نے پیدا کیا ہے۔ تمہاری وجہ سے میری آخرت بھی سنور جائے گی۔'' لڑکوں کے اس جذبے پر وہ آب دیدہ سا ہوگیا۔

''پھر آپ ہمیں بتائیں کہ ہم کیا کریں مولانا صاحب؟ ہم جلد سے جلد کچھ کرنا چاہتے ہیں۔'' لڑکوں نے اصرار کیا۔

''ابھی نہیں میرے بچو! ابھی حوصلے اور تحمل کا وقت ہے۔ ضرورت پڑنے پر میں خود تم لوگوں کو بتاؤں گا کہ کیا کرنا ہے۔ ابھی تم لوگ انتظار کرو۔'' اس نے لڑکوں کو ٹالا پھر کمرے کی دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''وقت زیادہ ہوگیا ہے۔ اب تم لوگ گھر جاؤ اور جاکر آرام کرو۔ میں بھی کچھ دیر کے لیے آرام کروں گا تاکہ تہجد کے لیے اٹھ سکوں۔'' اس حکم پر لڑکے فرماں برداری سے اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے اور عقیدت سے اس کے ہاتھ کی پشت چوم کر رخصت لینے لگے۔ اس نے بھی ہر لڑکے کے سر پر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیر کر ہر ایک کے لیے انفرادی طور پر نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

''عبدالمتین! پتر آج تم یہیں رک جاؤ۔ آج میرے ساتھ ہی تہجد اور فجر پڑھنا۔'' ان لڑکوں میں سے سب سے زیادہ پُرجوش نظر آنے والا لڑکا جب آخر میں اس سے رخصت لینے کے لیے آگے بڑھا تو اس نے بہت محبت سے اسے حکم دیا۔ وہ فوراً راضی ہوگیا۔ اپنے استاد کے حکم کی تعمیل کرنا تو اس پر فرض تھا اور پھر ان کے ساتھ عبادت میں شریک ہونا بھی ایک سعادت تھی جس سے وہ کبھی کبھی کسی لڑکے کو نوازتے تھے۔ اس رات عبدالمتین کو نہ صرف یہ سعادت نصیب ہوئی بلکہ ایسا بہت کچھ سننے کو ملا جس کو سن کر اس کے جلتے بلتے سینے میں سکون سا اتر آیا۔

☆☆☆

''اور سنا رحمتے! پنڈ کی کیا خبریں ہیں؟ بڑے دنوں سے تُو نے کہیں کی کوئی خبر ہی نہیں دی۔'' بڑی چودھرائن نے فرش پر ایک طرف بیٹھی، اپنے دوپٹے کے کنارے پر بیل ٹانکتی رحمتے سے پوچھا۔ اس وقت وہ دوپہر کے کھانے کے بعد آرام کرنے لیٹی ہوئی تھی اور نجمی اس کے پیر دبا رہی تھی۔

''پنڈ کی کیا کوئی نئی خبر ہونی ہے جی! جب سے غیاثے کے پتر والا مامله (معاملہ) ہوا ہے، ہر طرف چپ لگی ہے۔ نوراں اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھی ہے۔ غیاثا بھی گپ چپ سا ہو گیا ہے۔ زہرہ بھی کبھی آکر ماں پیو کو دیکھ جاتی ہے، پر اصل میں اسے میاں کی باہر کی کمائی کی ہوا لگ گئی ہے اس لیے پیکے میں زیادہ دل نہیں لگتا۔ میں نے سنا ہے کہ اس نے وہ بغیر تار والا فون بھی لے لیا ہے۔ اس پر روز میاں سے بات کرتی ہے۔''

''اسے موبائل کہتے ہیں اماں۔'' چودھرائن کے پیر دباتی نجمی نے درمیان میں لقمہ دیا۔

تبٰرک الّذی جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا

آپ کے ستارے کیا کہتے ہیں؟

آپ کے لیے کون سا سال، مہینہ، دن بہتر رہے گا؟ محبت، دولت اور دیگر معاملات میں کب کامیابی ملے گی؟

معروف ماہرِ فلکیات سید محمد علی قادری سے راہنمائی حاصل کریں۔

آپ کے۔۔۔ وہ قادری صاحب آپکے دنیاوی مسائل کا حل قرآنی آیات اور اسماء الحسنٰی سے پیش کرتے ہیں۔

☆ میری شادی کب ہوگی؟ رشتے آتے ہیں مگر بات نہیں بنتی، اب تک شادی کی اُمید ہے؟ (فرح ناز، کراچی)

● آپ کی شادی میں وقتی دُشواریاں ہیں، اب صورتِ حال بہتر ہورہی ہے، شادی کا امکان جون 2010ء تک ہے۔

☆ میرا نام اصغر حسین ہے میں اپنانام تبدیل کرنا چاہتا ہوں، میرے لیے کون سا نام بہتر رہے گا؟ (اصغر حسین، لاڑکانہ)

● بیٹا! بلوغت کے بعد نام تبدیل کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، محنت کریں انشاءاللہ کامیابی ملے گی۔

☆ میں کاروبار کرنا چاہتی ہوں، بیرونِ ملک کاروبار کرنا مناسب رہے گا یا یہیں کوئی کاروبار کروں؟ شادی کب تک ہوگی، مبارک نگینہ کون سا ہے؟ (سمیعہ ناز، کراچی)

● بیٹی سمیعہ ناز! ماشاءاللہ آپ کے اندر بہت صلاحیتیں ہیں، آپ گھریلو اشیاء سے متعلق کوئی کاروبار کریں تو بہت کامیابی ملے گی۔ شادی کا امکان جنوری 2011ء تک ہے۔ مبارک نگینہ۔۔۔ سیدھے ہاتھ کی کسی انگلی میں پہن سکتی ہیں۔

☆ ۔۔۔ لوح بنوائی تھی، اللہ کا شکر ہے میرا بانڈ لگ گیا ۔۔۔ قرض اُتر گیا، اب لوح کا کیا کروں؟ (نفیسہ کنول، ۔۔۔)

● ۔۔۔ شکر ادا کریں، لوح ٹھنڈی کروادیں، نماز کی پابندی رکھیں۔

☆ قادری صاحب! میری منگنی گھر والوں نے زبردستی کہیں ۔۔۔ کی تھی جبکہ میں کسی اور کو چاہتی تھی، کوئی اُمید نظر نہیں ۔۔۔ آپ سے لوح بنوائی، وظیفہ پڑھا، اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ لڑکے والوں نے خود ہی منگنی توڑ دی اور میری منگنی اب میری پسند سے ہورہی ہے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ! لوح کا کیا کرنا ہے؟ (بینش، لاہور)

● بیٹی! لوح کو اب ٹھنڈا کروادیں، ایک تسبیح نکاح ہونے تک جاری رکھیں، نماز کی پابندی رکھیں۔

☆ قادری صاحب! میرے شوہر اپنے گھر والوں کے کہنے میں تھے مجھ پر بہت ظلم کرتے تھے، میں گھر کا سارا کام کرتی تھی مگر پھر بھی میری کوئی عزت نہیں تھی، آپ سے لوح اور مبارک نگینہ لیا، وظیفہ پڑھا، اب اللہ کا شکر ہے شوہر میرا خیال رکھنے لگ گئے ہیں، گھر والوں کے رویے میں بھی بہت تبدیلی آئی ہے، اٹھتے بیٹھتے آپ کو دعائیں دیتی ہوں، لوح کا کیا کرنا ہے؟ (فاطمہ بتول، ملتان)

● بیٹی! لوح کو اب ٹھنڈا کروادیں، بس اپنے حسنِ سلوک سے سب کے دل جیتیں، وظیفہ کی ایک تسبیح ابھی پڑھتی رہیں، شوہر کے آرام اور ضروریات کا بھی خیال رکھیں، اللہ تعالیٰ تم کو ازدواجی سکون عطا فرمائے، نماز کی پابندی کا خیال رکھیں۔

O....O....O

محمد علی قادری: A-911، سیکٹر 11-B، نارتھ کراچی، نزد ٹیلی فون ایکسچینج، کراچی۔
موبائل: 0300-2756587
E-mail:
mashal_e_raah@yahoo.com / mashal_e_raah1@hotmail.com

''اے ہاں، وہی موبئل۔ اسی پر لگی رہتی ہے یا پھر ٹی وی دیکھتی رہتی ہے۔ اب ایسے مزے چھوڑ کر بھلا وہ روز روز پیکے کیوں جانے لگی۔ چھوڑا ہوا ہے ماں پیو کو ان کے حال پر۔''

''چھوٹے لوگوں کو کچھ مل جائے تو وہ ایسے ہی ہو جاتے ہیں۔ نئے نئے ملنے والے روپے کی چمک انہیں آپے میں نہیں رہنے دیتی۔ زہرہ کو بھی میں دیکھ رہی ہوں۔ جب سے ویاہ ہوا ہے، حویلی میں آ کر جھانکا تک نہیں۔'' بڑی چودھرائن نے جلسے ہوئے لہجے میں تبصرہ کرتے ہوئے شکوہ کیا۔

''آہو جی! یہ تو آپ سولہ آنے ٹھیک دس رہی ہیں۔ میں تو زہرہ کا حال دیکھ کر شکر کرتی ہوں کہ وہ ماہ بانو ویاہ کر اِدھر حویلی میں نہیں آسکی۔ زہرہ تو اتنے سے روپے پا کر ہی آپے سے ایسی باہر ہوگئی ہے کہ سیدھے منہ گل نہیں کرتی... گر جو وہ دوسری مالکن بن کر حویلی آجاتی تو جانے ہمارے ساتھ کیسا سلوک کرتی؟'' چودھرائن کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے رحمتے نے ایک ایسی بات چھیڑ دی جس کو چودھرائن ماہ بانو کی موت کے بعد بھی نہیں بھلا سکی تھی۔ کہنے کو تو اس معاملے کو سب لوگوں سے چھپا لیا گیا تھا لیکن حویلی میں کام کرنے والے خود بہ خود ہی اس قصے سے واقف ہو گئے تھے اور رحمتے اور اس کی بیٹیاں تو تھیں بھی ذرا بڑی چودھرائن کی سر چڑھی۔ حویلی کے بہت سے راز وہ خود انہیں بتا دیتی تھی لیکن اس وقت اسے یہ ذکر برا لگا تھا۔ اپنی ناگواری کا اظہار کرنے کے لیے وہ پیر دباتی نجمی پر چڑھ دوڑی۔

''دم نہیں ہے تیرے ہاتھوں میں؟ ایسے پولے پولے ہاتھوں سے پیر داب رہی ہے جیسے چار دن سے فاقے پر ہے۔'' اس نے اپنی ٹانگ اس زور سے نجمی کے پہلو میں ماری کہ وہ جھٹکے سے دور جا گری۔

''ٹھیک سے پیر دبا کم بخت ورنہ میں تیرے ٹوٹے ٹوٹے کر دوں گی۔ جن کا کھاتی ہے ان کی خدمت نہیں کرے گی تو کیا کرے گی؟ دیکھا نہیں غیاثے کے خاندان کا حال۔ ماہ بانو نے سرکشی دکھائی تھی، اس سمیت پورے خاندان پر پیر سرکار کا قہر نازل ہوگیا۔'' رحمتے نے نمک حلالی دکھانے کے لیے فوراً بیٹی کو دو ہتڑ لگاتے ہوئے بے بھاؤ کی سنائی۔ وہ دونوں طرف کی مار کھا کر منہ بنائے بغیر ایک بار پھر چودھرائن کے قدموں میں بیٹھ کر اس کے پیر دبانے لگی۔ اس بار وہ زیادہ زور لگا رہی تھی۔

''ماف (معاف) کر دیجیے گا اسے چودھرائن جی! اصل میں آج کل ان دونوں بہنوں پر کام بھی تو بہت بڑھ گیا ہے۔ نوراں نے جب سے حویلی آنا چھوڑا ہے، اس کے حصے کا کام بھی میری دھیاں ہی نبیڑتی (نمٹاتی) ہیں۔ وہ رانی بچی تو کسی کام جوگی ہے ہی نہیں۔ سارا وقت کشور بی بی کے کمرے میں گھسی چاپلوسی کرتی رہتی ہے۔ اور تو اور اب اس نے ان کی کتابیں بھی لے کر پڑھنی شروع کر دی ہیں۔ میری نجمی اور شادو سیدھی سادی ہیں۔ انہیں کام سے بچنے کے لیے یہ چالاکیاں کرنی نہیں آتیں کہ کشور بی بی کے آگے پیچھے پھرتی رہیں۔ سچی گل ہے جی! ہم تو آپ کو ہی حویلی کا اصل مالک سمجھتے ہیں اس لیے سب سے زیادہ آپ کی ہی خدمت کر کے خوش ہوتے ہیں۔'' رحمتے اب اپنی بیٹی کی صفائی دیتے ہوئے بڑی چالاکی سے دوسروں کے خلاف چودھرائن کے کان بھر رہی تھی۔ ان پڑھ اور مغرور چودھرائن فوراً اس کی باتوں میں آگئی اور غصے سے بولی۔

''اس رانی کی بچی کا تو میں ایک منٹ میں دماغ ٹھیک کر دوں گی، پر پہلے مجھے کشور کا بھی کچھ بندوبست کرنا ہوگا۔ مظلوم کہہ کہہ کر اس کا دماغ بھی آسمان پر چڑھا دیا ہے سب نے۔ اس کا جو جی چاہتا ہے، منوا لیتی ہے۔ ناہید بھی ہر وقت دھی کی سفارشی بنی رہتی ہے۔ مجھے بھی خوشامدیں کر کے راضی کر لیتی ہے کہ میں چودھری صاحب سے اس کی ضدیں منوانے کے لیے سفارشیں کروں، پر میں نے بھی سوچ لیا ہے کہ اس کڑی کو اب ذرا قابو میں کرنا ہے ورنہ زیادہ ہی سر پر چڑھ جائے گی۔'' بڑی چودھرائن کا سوچنا اس وقت اس کے لہجے سے جھانک رہا تھا۔

''آپ ٹھیک کہتی ہیں وڈی چودھرائن! یوں تو میں کمی ذات ہوں اور میرا کچھ کہنا چھوٹے منہ سے بڑی گل ہے، پر یہ تو زمانے کا دستور ہے جی کہ دھیوں کو ذرا باندھ کے رکھو، تب ہی خاندان کی عزت سلامت رہتی ہے۔ اب آپ لوگوں نے کشور بی بی کو موبئل بھی لے کر دے دیا۔ یہ تو انہیں وڈی آزادی دینے والی گل ہے جی۔''

''کیا کہا تو نے... کیا ہے کشور کے پاس؟'' چودھرائن چونک کر جلدی سے سیدھی ہوئی۔

''موبئل جی! وہی بغیر تار والا فون۔ کیا آپ کو نہیں معلوم؟ مجھے لگتا ہے چھوٹی چودھرائن نے آپ سے چوری اپنی دھی کو موبئل دلوایا ہے۔'' نجمی اور شادو کی جاسوسی کے نتیجے میں کشور کے پاس موبائل کی موجودگی کا راز ان لوگوں پر کھل گیا تھا۔ ساتھ ہی اسے چوری چھپے موبائل پر بات کرتے دیکھ کر وہ یہ بھی سمجھ چکی تھیں کہ اس کے پاس موبائل کی موجودگی سب کے علم میں نہیں ہے۔ بروقت ٹوہ لگانے والی ماں بیٹیاں کشور کے بدلے ہوئے انداز پر دیے ذرا نہیں۔ اس کے پاس موبائل کی موجودگی کا علم ہوتے ہی ان کے پیٹ میں کھد بد ہونے لگی۔ آج موقع دیکھتے ہی رحمتے اس بات کو بڑی چودھرائن کے علم میں لے آئی۔ اس قسم کی لگائی بجھائی یوں بھی اس کی فطرت میں شامل تھی اور یہاں اس کے نتیجے میں مالکان سے قربت بڑھانے کا موقع مل رہا تھا چنانچہ اس نے بہت چالاکی سے اس بات کو بڑی چودھرائن کے گوش گزار کر دیا۔ نتیجہ حسب توقع تھا۔ چودھرائن لیٹنے سے اٹھ بیٹھی تھی جس کا مطلب تھا کہ اس نے اس اطلاع میں گہری دلچسپی لی ہے۔

''گل سن رحمتے! کسی اور کو یہ سب مت بتانا۔ بس تو اور تیری بیٹیاں مل کر چپکے سے نظر رکھنا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ چودھری صاحب سے بھی چھپا کر یہ کام کیا گیا ہے۔ وہ تو عورتوں کو فون کے پاس بھی آسانی سے نہیں جانے دیتے، بھلا کشور کو موبائل کیسے دلا سکتے ہیں؟ یقیناً ناہید نے چھپ چھپا کر اپنی دھی کو موبائل دلایا ہے یا پھر ہو سکتا ہے اسے بھی خبر نہ ہو۔ کشور اتنی بار کتابیں شتابیں خریدنے کے بہانے شہر جاتی ہے، وہیں چپکے سے اس نے موبائل بھی خرید لیا ہوگا۔ تو بس کسی طرح اصل گل معلوم کر لے اور نظر رکھ کہ کشور کس سے گل کرتی ہے۔'' اس نے فوراً رحمتے کو ذمے داری سونپا جسے اس نے خندہ پیشانی سے قبول کر لیا۔

☆☆☆

''نور پور میں ساری تیاریاں مکمل ہیں نا عبدالمنان؟ دھیان رکھنا کہ اس موقعے پر کوئی بدمزگی نہ ہو۔ ڈاکے کی واردات کے بعد ویسے ہی میڈیا والے بڑی تنقیدیں کر رہے ہیں۔ ایس پی بھی کھنچا کھنچا سا ہے۔ اس رات ڈاکوؤں کی بجائے تھانے میں موجود نفری کو بغیر اس کے علم میں لائے اسمگلرز کے خلاف استعمال کرنے کے معاملے کو اس نے بہت ہوا دی ہے۔ اس کی باتوں سے میڈیا نے یہی تاثر لیا ہے کہ اگر تھانے میں موجود نفری کو وہاں سے نہ ہٹایا جاتا تو شاید بروقت ڈاکوؤں کے خلاف کارروائی ممکن ہوتی۔ اس کے واویلے کی وجہ سے لوگ پوری طرح اندازہ نہیں کر پا رہے ہیں کہ لکڑی اور کھالوں کی اسمگلنگ کو روکنا کتنا بڑا کارنامہ ہے۔''

''آپ ایس پی کی باتوں پر کان نہ دھریں سر! اس کا معاملہ اس کھسیانی بلی کا سا ہے جو صرف کھمبا ہی نوچ سکتی ہے۔ اپنی طرف سے تو اس نے اور اس کے ساتھیوں نے بہت اچھی چال چلی تھی کہ ڈکیتی کی واردات کے ہنگامے میں کسی کا اسمگلنگ کی طرف دھیان ہی نہیں جائے گا لیکن انور کی بروقت اطلاع نے ان لوگوں کی یہ سازش ناکام کر دی۔ میڈیا والے بھی اتنے بے وقوف نہیں ہیں کہ اسمگلنگ کے تدارک کے لیے کی جانے والی کارروائی کی اہمیت کو نہ سمجھ سکیں۔ انہوں نے ایس پی کی بکواس کو صرف اس لیے اہمیت دی ہے کہ انہیں آپ کے اور اس کے درمیان چپقلش کی بو آگئی ہے اور اب وہ اس آگ کو ہوا دے کر اپنے اخبارات کے لیے چٹ پٹی خبریں حاصل کرنے کی کوشش میں ہیں۔ نور پور کی غریب عوام کے ڈاکوؤں کے ہاتھوں لٹ جانے کی خبریں بھی انہوں نے لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے چھاپی ہیں لیکن میرے خیال میں آج جب متاثرہ لوگوں میں امدادی چیکس تقسیم کیے جائیں گے تو ایسی کسی شکایت کی گنجائش ہی باقی نہیں رہے گی۔''

نور پور میں ڈاکوؤں نے جو واردات کی تھی، اس میں لوگوں کا بہت زیادہ نقصان نہیں ہوا تھا۔ بس چند ہی لوگ تھے جو متاثر ہوئے تھے۔ واردات کے انداز سے لگتا تھا کہ ڈاکو بہت عجلت میں اپنی کارروائی کر کے فرار ہو گئے ہوں۔ باقاعدہ منصوبہ بندی سے کی جانے والی ڈاکا زنی میں عموماً اس قدر عجلت دیکھنے میں نہیں آتی۔ ڈاکو بڑی تفصیل سے کارروائی کرتے ہیں لیکن نور پور میں معاملہ مختلف تھا جس سے شہر یار کو اپنے اس شک پر اور بھی یقین ہو گیا تھا کہ یہ سارا مصنوعی سیٹ اپ تھا اور ڈاکا زنی کی واردات صرف ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے کروائی گئی تھی۔

ڈاکا زنی کی اس واردات کو ایشو بناتے ہوئے کچھ لوگوں نے وزیر بجلی و پانی کے نور پور جانے کو سیکیورٹی کے حساب سے رسک قرار دیتے ہوئے دبے لفظوں میں اس تقریب کو ڈیلے کرنے کی بھی تجویز پیش کی تھی لیکن اس سلسلے میں اس نے وزیر صاحب سے ذاتی طور پر بات کر کے ان سے تقریب وقت پر ہی منعقد کرنے کی تائید حاصل کر لی تھی۔ وہ خود اس بات پر متفق تھے کہ ایک عام سی واردات کو اہمیت دے کر تقریب ملتوی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ شہر یار سے بات ہونے کے اگلے ہی دن اخبارات میں ان کا یہ بیان شائع ہوا تھا کہ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ اس بیان پر وزیر صاحب کی خوب واہ واہ ہوئی تھی۔

شہر یار کے لیے فی الحال اتنا ہی کافی تھا کہ وزیر صاحب نے آنے سے انکار نہیں کیا تھا اور تقریب وقت پر ہی منعقد ہو رہی تھی۔ ایک دن پہلے وہ خود نور پور کا چکر لگا کر تقریب کے سلسلے میں کیے جانے والے انتظامات کے بارے میں ہدایات دے کر آیا تھا۔ ڈاکے کے بعد خوف زدہ ہو

جانے والے نور پور کے باشندوں سے بھی اس نے خاص طور پر بات چیت کی تھی اور انہیں سمجھایا تھا کہ جو کچھ ہوا، اسے بھول جائیں اور اسے یاد رکھیں جوان کے آنے والے کل کو روشن و تابناک بنا سکتا ہے۔ گاؤں والے اس نکتے کو سمجھ گئے تھے اور اسے امید تھی کہ ان کے تعاون سے منعقد کی جانے والی تقریب بہت کامیاب رہے گی۔

''میں ایس پی کی زبانی کلامی باتوں کو بالکل بھی خاطر میں نہیں لاتا ہوں لیکن جہاں تک مجھے اس کی فطرت کا اندازہ ہوا ہے، وہ بڑا کینہ پرور آدمی ہے۔ ایسے آدمی موقع ملنے پر بدلہ ضرور لیتے ہیں۔ اگر اس نے بدلہ لینے کی ٹھانی ہوگی تو آج کا دن اس کے لیے بہترین ہے۔ سیکیورٹی پلان عملی طور پر اس کے ہاتھ میں ہے۔ وہ کوئی ایسا موقع تلاش کر سکتا ہے جس کے ذریعے یہ ثابت کیا جا سکے کہ وزیر صاحب کا نور پور جانا سیکیورٹی کے حساب سے سچ مچ خطرناک تھا اور میں نے پروگرام کو برقرار رکھنے پر اصرار کر کے حماقت کی ہے۔'' پیشانی کو انگلی سے رگڑتے ہوئے اس نے عبدالمنان سے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

''آپ فکر نہ کریں سر! میرے خیال میں وہ ایسی غلطی نہیں کرے گا کیونکہ کسی بھی بدمزگی کی صورت میں اس پر بھی ذمے داری عائد ہوگی بلکہ زیادہ ذمے داری اسی پر ہوگی۔ پھر بھی اگر آپ کہیں تو میں وزیر صاحب کی آمد سے پہلے نور پور کا چکر لگا کر ایک دفعہ اور جائزہ لے لیتا ہوں تاکہ اگر کہیں کوئی سقم نظر آئے تو اسے دور کیا جا سکے۔'' عبدالمنان نے اسے تسلی دیتے ہوئے تجویز پیش کی۔

''میرے خیال میں یہ مناسب رہے گا۔'' اس کا یہ چھوٹا سا جملہ عبدالمنان کے لیے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ وہ فوراً ہی نور پور کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد شہریار دوسرے امور کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گیا۔ پروگرام کے مطابق وزیر صاحب کو لاہور سے یہاں پہنچنے کے بعد کچھ دیر اس کے بنگلے پر رکنا تھا۔ یہاں وہ تھوڑی دیر رک کر آرام کرتے اور دوپہر کا کھانا کھاتے پھر اس کے بعد نور پور جا کر تقریب میں شرکت کرتے۔ واپسی میں ایک بار پھر انہیں اس کے بنگلے پر رک کر شام کی چائے پینی تھی۔ یہ انتظام لاہور سے نور پور تک کی طویل مسافت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیا گیا تھا۔

وزیر صاحب کی آمد کے پیشِ نظر بنگلے میں بھی خوب رونق اور ہلچل مچی ہوئی تھی۔ بارہ بجے تک اس ہلچل نے بیوروکریسی کا مخصوص لبادہ اوڑھ لیا۔ بنگلے کے ملازمین اور انتظامی عملے کے تحرک کے باوجود وہاں ایسا سکوت محسوس ہونے لگا جیسے وہاں معروفِ عمل لوگ کسی خاص قسم کے مادے سے تخلیق کیے گئے ہیں جن کے چلنے پھرنے اور بات چیت کرنے کے نظام میں کوئی ایسی ترکیب کارفرما ہے کہ ہر کام انجام تو پاتا ہے لیکن آواز نہیں ابھرنے پاتی۔ پونے ایک بجے تک عبدالمنان بھی نور پور سے واپس آ گیا۔ اس نے وہاں کے انتظامات پر مکمل اطمینان ظاہر کرتے ہوئے اطلاع دی کہ اسٹیج کے چاروں طرف لگائی جانے والی رسیوں کو، جو لوگوں کو اسٹیج سے دور رکھنے کے لیے ایک باؤنڈری لائن کے طور پر لگائی جاتی ہیں، کھلوا کر اس نے دوبارہ مزید فاصلے سے لگوا دیا ہے۔ اس طرح اگر کوئی شخص ان حد بندی کرنے والی رسیوں کو پھلانگ کر اسٹیج تک پہنچنے کی کوشش بھی کرتا تو اسے موقع نہ ملتا اور وہ درمیان میں ہی دھر لیا جاتا۔ شہریار نے اس کی اس کارکردگی کو سراہا۔ ایک بج کر پانچ منٹ پر کال موصول ہوئی کہ وزیر صاحب سوا ایک بجے تک ضلع کی حدود میں داخل ہو جائیں گے۔ اس کال کے موصول ہوتے ہی وہ لوگ پہلے سے تیار گاڑیوں میں ان کے استقبال کے لیے روانہ ہو گئے۔ ٹھیک سوا ایک بجے انہوں نے اپنے ضلع کی حدود میں وزیر صاحب کا استقبال کیا پھر ایک مشترکہ قافلے کی صورت میں بنگلے پر پہنچ گئے۔ اس موقعے پر ایس پی معظم تارڑ بھی موجود تھا اور دو نام نہاد ایم این اے اور ایم پی اے بھی جنہیں یہاں کے عوام کی نمائندگی کا شرف حاصل تھا۔ لنچ بالکل نارمل ماحول میں کیا گیا۔ لنچ کے بعد وہ لوگ نشست گاہ میں آ کر بیٹھے تو وزیر صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ کی جھلک دکھائی دی اور وہ شہریار سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔

''یو آر سو ینگ مسٹر شہریار! پہلی بار جب میں نے راؤ صاحب سے آپ کا ذکر سنا تھا، تب ہی سمجھ گیا تھا کہ آپ کوئی ینگ پرسن ہی ہوں گے۔ آپ کے کام میں جس قسم کا جوش اور تیزی نظر آتی ہے، اس کی ایک نوجوان سے ہی امید کی جا سکتی ہے۔''

''میرے خیال میں سر... یہ آدمی کے اندرونی احساسات کی بات ہوتی ہے۔ اگر آدمی کے اندر جذبہ زندہ ہو تو عمر سے بہت زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ آپ میری ایج گروپ کے فرد نہیں لیکن پھر بھی اتنا لمبا سفر طے کر کے یہاں تک تو آ ہی گئے ہیں نا۔'' موقعے کی مناسبت سے وزیر صاحب کو تھوڑا سا خوش کر دینے میں اس نے حرج نہیں سمجھا۔ وہ یہاں سے خوش واپس جاتے، تب ہی یہاں کے لوگوں کے لیے خوش حالی کے در کھل سکتے تھے۔ وزیر صاحب کی گہری ہوتی مسکراہٹ نے ظاہر کیا کہ اس کا جملہ کارگر ثابت ہوا ہے اور وہ اس سے لطف اندوز ہوئے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے میڈیا کے افراد کو پانچ منٹ کا ٹائم دیا اور اپنے اتنے لمبے سفر کو جذبہ حب الوطنی سے منسلک کرتے ہوئے دو چار مخصوص جذباتی جملے ادا کیے۔ اس کارروائی کو بھگتانے کے بعد وہ لوگ نور پور کے لیے روانہ ہو گئے۔ اس بار وہ اور شہریار ایک ہی گاڑی میں تھے۔ راستے میں وہ انہیں ضلع میں کیے جانے والے ترقیاتی کاموں اور منصوبوں کی تفصیلات سناتا رہا۔ وہ خاموشی سے بلاتبصرہ سب کچھ سنتے رہے۔ اپنے پروجیکٹس کی تفصیل سناتے ہوئے جب اس نے اپنے کام میں پیش آنے والی رکاوٹوں کا تذکرہ چھیڑا تو وہ بے حد توجہ سے سنتے رہے پھر یک دم ہی بولے۔

''جس طرح آپ کو شکایات ہیں اسی طرح دوسرے لوگوں کو بھی آپ سے کچھ شکایات ہیں مسٹر شہریار! ان لوگوں کا کہنا ہے کہ آپ اپنے فیملی بیک گراؤنڈ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے اختیارات سے تجاوز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔'' ان کی بات سن کر اسے اندازہ ہو گیا کہ جن لوگوں کے لیے وہ رکاوٹ بن رہا ہے، انہوں نے اوپر اقتدار کے ایوانوں میں اپنی فریاد پہنچا دی ہے۔ وزیر بجلی و پانی کا بہ ظاہر ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن انہیں موقع دیکھ کر مذاکرات کے لیے تو استعمال کیا جا سکتا تھا۔

''میرے خیال میں، میں نے ایسی کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اسسٹنٹ کمشنر کی حیثیت سے مجھے اختیار حاصل ہے کہ میں اپنے ضلع میں ہونے والے ہر کام پر نظر رکھوں اور اس کی فلاح و بہبود کے لیے اقدام اٹھاؤں۔ آپ کے خیال میں اسکولز اور صحت کے مراکز قائم کرنے یا لوگوں کو بنیادی سہولیات فراہم کرنے کی کوشش کرنے میں ایسا کون سا کام ہے جسے اختیارات سے تجاوز کرنا قرار دیا جا سکے؟'' اس کا لہجہ نرم لیکن لفظوں میں کاٹ تھی۔ وزیر صاحب ذرا سا پہلو بدل کر رہ گئے پھر گلا کھنکھارتے ہوئے بولے۔

''میرا اشارہ پچھلے دنوں کی جانے والی اس کارروائی کی طرف ہے جس کے ذریعے لکڑی اور کھالوں کی اسمگلنگ کو روکا گیا ہے۔ بہ ظاہر تو یہی کہا گیا کہ سارا کارنامہ ڈی ایس پی منظور کا تھا اور آپ نے صرف منظوری دی تھی لیکن حقیقت سے آپ بھی واقف ہیں اور میں بھی کہ آپ اس ساری کارروائی میں براہِ راست شریک رہے تھے۔ ایس پی تارڑ صاحب کو شکایت ہے کہ اس بے وقت کارروائی کی وجہ سے وہ نور پور میں ہونے والی ڈکیتی کی واردات کو روکنے کے لیے مؤثر اقدامات نہیں کر سکے۔ آپ کو کچھ کرنے سے پہلے کم از کم انہیں تو اعتماد میں لینا چاہیے تھا۔''

''میں انہیں اعتماد میں لے کر ایک بار پہلے بھی کارروائی کرنے کا تجربہ کر چکا ہوں۔ اس تجربے کی ناکامی نے مجھے مجبور کیا کہ میں اس تجربے کو دہرانے کی غلطی نہ کروں۔'' شہریار نے بہت سادگی سے وزیر صاحب کی بات کا جواب دیا۔

''آپ کا یہ جملہ براہِ راست الزام کے زمرے میں آتا ہے۔'' انہوں نے بہ غور اس کا چہرہ دیکھا۔

''میں نے آپ کو صرف اپنے تجربے کے بارے میں بتایا ہے۔''

''کیا گرفتار ہونے والے شخص نے اس طرح کا کوئی اشارہ دیا ہے؟'' انہوں نے اسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا۔ اس گاڑی میں ڈرائیور کے علاوہ اگلی نشست پر ان کا پی اے بھی بیٹھا تھا لیکن ان افراد کا شمار محرم راز لوگوں میں ہوتا تھا اس لیے وہ کھل کر گفتگو کر رہے تھے۔

''نہیں، اس نے ایک دوسرے فرد کا نام لیا ہے لیکن وہ شخص جس تکون کا حصہ ہے اس میں ایس پی صاحب بھی شامل ہیں۔ گرفتار ملزم کے ساتھ آپ اس شخص کو بھی جلد عدالت میں دیکھیں گے۔ اگر پولیس اس شخص کا ریمانڈ لینے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو باقی دو کے گلے میں پھندا ڈالنا بھی زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوگا۔'' وہ جانتا تھا کہ یہ سب باتیں ویسے بھی چھپنے والی نہیں اس لیے خود سے بتا کر ان کا اعتماد حاصل کرنا مناسب سمجھا۔ گفتگو کے اس موڑ پر آنے کے بعد ان کی گاڑی نور پور کی حدود میں داخل ہو گئی۔ یہاں لوگ وزیر صاحب کے والہانہ استقبال کے لیے موجود تھے۔ چنانچہ گفتگو کو مزید آگے جاری رکھنا ممکن نہیں تھا۔ لوگ وزیر صاحب کے لیے زوردار نعرے لگا رہے تھے۔ ان نعروں کے درمیان کوئی نعرہ شہریار کے لیے بھی سنائی دے جاتا تھا۔ نعرے لگاتے اور ڈھول کی تھاپ پر ناچتے لوگوں کے درمیان گھری گاڑیاں بڑی مشکل سے رینگتی ہوئی پنڈال تک پہنچیں۔ پروگرام کے مطابق پہلے وزیر صاحب کو یہاں مرنے والے اے ایس آئی اور کانسٹیبل کے لواحقین کو تعریفی اسناد اور امدادی چیکس دینے تھے۔ چودھری بختیار اور وزیر صاحب کی تقاریر تو لازمی ہی تھیں۔ پروگرام میں ڈکیتی سے متاثر ہونے والے نور پور کے باشندوں کے لیے چھوٹی مالیت کے امدادی چیکس کی تقسیم کے سلسلے کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ اس تبدیلی سے وزیر صاحب کو پیشگی آگاہ کر دیا گیا تھا جس پر انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ ایک طرح سے یہ تبدیلی

بھی ان کے لیے مفید ہی تھی۔ آج کا دن تو ویسے ہی وہ اس تقریب کے لیے وقف کر چکے تھے۔ اگر آٹھ دس منٹ اس کام میں خرچ بھی ہو جاتے تو کوئی حرج نہیں تھا بلکہ میڈیا کی بھرپور کوریج کی وجہ سے انہیں مزید شہرت ہی ملنی تھی۔ اس تقریب سے فارغ ہو کر وہ اسکول اور مرکزِ صحت کا سنگِ بنیاد رکھتے اور پھر اس کے بعد واپسی ہو جاتی۔

گاڑیاں پنڈال تک پہنچیں تو پولیس اور وزیر صاحب کے ذاتی اسکواڈ نے مل کر انسانی جسموں کی ایک حفاظتی دیوار سی بنا دی۔ اس دیوار کے حصار میں وزیر صاحب اور دیگر... وی آئی پیز کو بہ حفاظت اسٹیج تک پہنچا دیا گیا۔ اسٹیج پر چودھری بختیار پہلے سے موجود تھا۔ اس نے اپنی بیساکھیوں کے سہارے کھڑے ہو کر وزیر صاحب کا استقبال کیا۔ وزیر صاحب نے بھی جواباً اسے بڑی شفقت بھری مسکراہٹ سے نوازتے ہوئے اس سے مصافحہ کیا۔ پھر تمام حضرات نے اپنی مخصوص نشستیں سنبھال لیں۔ تقریب کا آغاز روایتی طور پر تلاوت قرآن پاک سے کیا گیا۔ کمپیئرنگ کی ذمے داری سنبھالنے کے لیے پیرآباد سے ماسٹر منیب کو بلوایا گیا تھا۔ آفتاب اگرچہ اسپتال سے فارغ ہو کر آ چکا تھا لیکن ابھی اس کے لیے اتنی دور آ کر یہ ذمے داری سنبھالنا تکلیف دہ ثابت ہوتا اس لیے اسے زحمت نہیں دی گئی تھی۔ تلاوت کے بعد منیب نے نور پور کے زمیندار چودھری بختیار کو ڈائس پر آنے کی دعوت دی۔ وہ بیساکھیوں کے سہارے چلتا ڈائس تک پہنچا اور بڑے مؤثر انداز میں وزیر صاحب کی آمد پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بڑی خوب صورتی سے آہستہ آہستہ بات کو نور پور کے مسائل کی طرف لے گیا۔ اسٹیج کے پیچھے رکھے جنریٹرز کے شور پر معذرت کا اظہار کرتے ہوئے اس نے نور پور میں بجلی کی فراہمی کے لیے بھی درخواست کر ڈالی۔ وہ تقریر ختم کر کے اپنی نشست پر واپس آ کر بیٹھا تو منیب نے وزیر صاحب کو ڈائس پر آنے کی دعوت دی۔ وہ مسکراتے ہوئے اپنی نشست سے اٹھ کر ڈائس تک آئے۔ ان کے ڈائس پر آنے پر لوگوں نے ایک بار پھر نعرے بازی شروع کر دی۔ کچھ جذباتی قسم کے نوجوان نعرے لگاتے ہوئے حفاظتی حصار کے طور پر لگائی جانے والی رسّی کے بالکل قریب آ گئے۔ ان نوجوانوں میں سے ایک پندرہ سالہ نوجوان جوش میں یک دم ہی رسّی پھلانگ کر اسٹیج اور رسّی کے درمیان موجود خالی جگہ پر آ کودا۔ اس نوجوان نے گھیردار شلوار کے ساتھ ڈھیلا ڈھالا کرتہ پہن رکھا تھا۔ وہ جیسے ہی کود کر لوگوں کے درمیان میں سے اس طرف آیا، حفاظت پر مامور افراد فوراً حرکت میں آ گئے۔ انہیں اس جذباتی نوجوان کو پکڑ کر واپس رسّی کے اس طرف موجود عوام کے درمیان پہنچا دینا تھا۔ دوسری طرف وہ اسٹیج تک پہنچنے کا خواہش مند نظر آتا تھا۔ نوجوان کی اس حرکت پر اسٹیج پر بیٹھا شہریار بے چینی محسوس کرنے لگا۔ نوجوان کا چہرہ اس کے لیے شناسا سا تھا اور اس کے چہرے پر موجود تاثرات بھی کچھ نئے نہیں تھے۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ جذباتی نوجوان اسٹیج پر پہنچ کر کیا کرنا چاہتا ہے۔ سیکیورٹی والوں نے اسے بری طرح جکڑ لیا تھا اور اسے اسٹیج تک نہیں آنے دے رہے تھے جس پر وہ زور زور سے چیختا ہوا کچھ بول رہا تھا۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے اسٹیج پر موجود افراد اس کے الفاظ سمجھ نہیں پا رہے تھے مگر سب ہی اس صورتِ حال پر اپنی جگہ جز بز سے ہو رہے تھے۔ ڈائس پر کھڑے وزیر صاحب نے ابھی تک اپنی تقریر شروع نہیں کی تھی۔ ماتھے پر ناگواری کی ہلکی سی لکیر لیے وہ خاموشی سے اس ہنگامے کے نمٹ جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے ذاتی باڈی گارڈز ان کے دائیں بائیں آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ہنگامہ کرنے والا نوجوان نہتا تھا اس لیے صورتِ حال زیادہ تشویشناک نظر نہیں آ رہی تھی اور وہ لوگ یہی قیاس کر رہے تھے کہ وہ وزیر صاحب کے قریب پہنچ کر ذاتی طور پر ان سے اپنا کوئی مسئلہ بیان کرنا چاہتا ہے۔ یہ ساری لمحوں کی کہانی تھی اور سب لوگوں کو امید تھی کہ سیکیورٹی والے ایک آدھ منٹ میں اس مسئلے سے نمٹ لیں گے لیکن یہ اطمینان بس چند لمحوں کا ہی تھا۔ اس کے بعد جو واقعہ پیش آیا، وہ نہایت غیر متوقع تھا۔ جوش سے بھرے نوجوان کو سیکیورٹی والے گھسیٹ کر پنڈال سے باہر لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں، یہ تو سب نے دیکھا لیکن اس کے بعد جو کان پھاڑ دھما کا سنائی دیا اور آگ کے شعلے بلند ہوئے، اس نے کسی کو کچھ سمجھنے کی مہلت نہیں دی۔ دھماکے نے زمین کو لرزا کر رکھ دیا تھا اور لکڑی کا اسٹیج اس لرزش کو برداشت نہ کرتے ہوئے اپنی جگہ قائم نہیں رہ سکا تھا۔ تباہ ہوتے اسٹیج پر موجود میزوں، کرسیوں، ڈائس، مائکس اور آرائشی پھولوں سمیت انسانی وجود بھی تتر بتر ہو کر رہ گئے تھے۔ اس تباہی میں کس پر کیا گزری تھی، کچھ خبر نہیں تھی۔ بس ہر طرف مرتے ہوئے اور زخمی انسانوں کی کراہوں کے ساتھ، بلند خوف زدہ چیخیں تھیں جو سنائی دے رہی تھیں اور دیکھنے کے لیے آگ کے شعلوں کا رقص تھا۔ اس رقص میں نور پور کے عوام کی خوشیاں اور امیدیں ان کے دم توڑتے جسموں کے ساتھ ہی دم توڑ رہی تھیں۔

حادثات و سانحات کی شکار... پناہ کی تلاش میں سرگرداں ماہ بانو کی داستان حیات کے واقعات اگلے ماہ پڑھیے

بین الاقوامی سطح پر جو شاطرانہ سیاسی بساط بچھائی جاتی ہے اور اس کے مہرے جس انداز میں نقل و حرکت کرتے ہیں ... اسے عام شہری نہیں سمجھ سکتا ... ایسے ہی سنگین ماحول کی عکاسی کرتی درد ناک کہانی جو آپ کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دے گی۔

ایک درندے کا کھیل جس کے مقابل ایک بڑا درندہ تھا

محمد عمر نعمان

بڑا درندہ

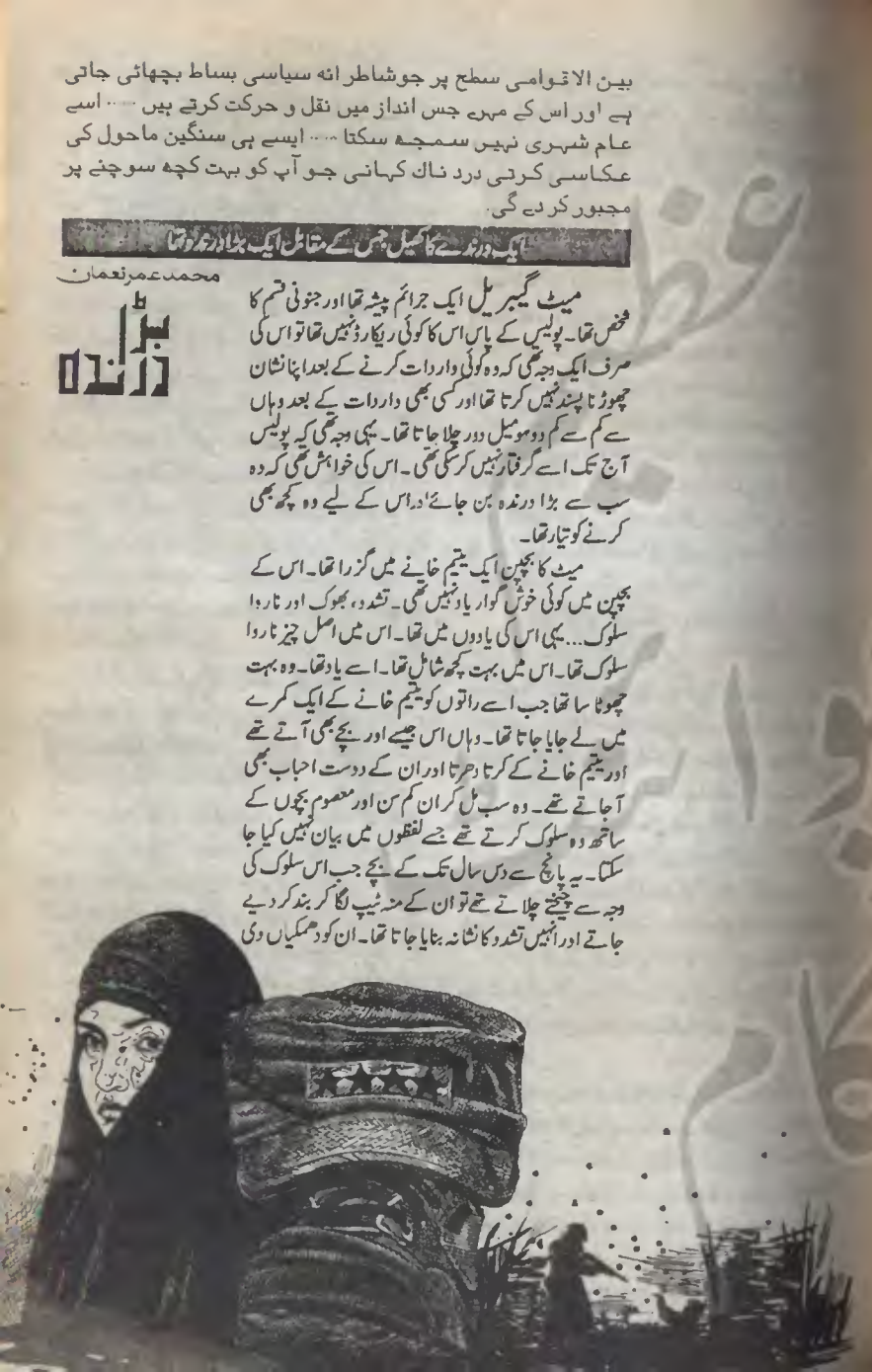

میٹ گیبریل ایک جرائم پیشہ تھا اور جنونی قسم کا شخص تھا۔ پولیس کے پاس اس کا کوئی ریکارڈ نہیں تھا تو اس کی صرف ایک وجہ تھی کہ وہ کوئی واردات کرنے کے بعد اپنا نشان چھوڑنا پسند نہیں کرتا تھا اور کسی بھی واردات کے بعد وہاں سے کم سے کم دو سو میل دور چلا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پولیس آج تک اسے گرفتار نہیں کر سکی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ سب سے بڑا درندہ بن جائے، اس کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔

میٹ کا بچپن ایک یتیم خانے میں گزرا تھا۔ اس کے بچپن میں کوئی خوش گوار یاد نہیں تھی۔ تشدد، بھوک اور ناروا سلوک... یہی اس کی یادوں میں تھا۔ اس میں اصل چیز ناروا سلوک تھا۔ اس میں بہت کچھ شامل تھا۔ اسے یاد تھا۔ وہ بہت چھوٹا سا تھا جب اسے راتوں کو یتیم خانے کے ایک کمرے میں لے جایا جاتا تھا۔ وہاں اس جیسے اور بچے بھی آتے تھے اور یتیم خانے کے کرتا دھرتا اور ان کے دوست احباب بھی آ جاتے تھے۔ وہ سب مل کر ان کم سن اور معصوم بچوں کے ساتھ وہ سلوک کرتے تھے جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یہ پانچ سے دس سال تک کے بچے جب اس سلوک کی وجہ سے چیختے چلاتے تھے تو ان کے منہ ٹیپ لگا کر بند کر دیے جاتے اور انہیں تشدد کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ ان کو دھمکیاں دی

جاتی تھیں اور بات نہ ماننے والوں کو بھوکا رکھا جاتا تھا۔

میٹ شکل وصورت کا اچھا تھا اس لیے وہ خاص طور سے ان لوگوں کا نشانہ بنتا تھا۔ کئی بار اس کے ساتھ اتنا وحشیانہ سلوک کیا گیا کہ اس کے جسم سے خون جاری ہوگیا تھا۔ اسے نہیں معلوم کہ وہ اس یتیم خانے تک کیسے آیا تھا؟ لیکن جب اس نے ہوش سنبھالا تو خود کو یہیں پایا۔ پانچ سال کی عمر سے اس نے اس خاص کمرے میں جانا شروع کیا... بلکہ اسے لے جایا جاتا تھا۔ جب وہ روتا اور احتجاج کرتا تو اسے مارا پیٹا جاتا تھا اور اسے بھوکا رکھا جاتا تھا۔ جو لڑکے زیادہ مزاحمت کرتے تھے، انہیں کئی کئی دن کھانے کو کچھ نہیں دیا جاتا تھا۔ وہ بھوک سے مجبور ہو کر مزاحمت ترک کر دیتے تھے اور ان لوگوں کی شیطانی خواہشات کی تکمیل کرنے لگتے تھے۔

میٹ ہر ہفتے باقاعدگی سے ان لوگوں کا نشانہ بنتا تھا۔ دس سال کی عمر تک وہ اس اذیت کا اتنا عادی ہوگیا تھا کہ ایک بار انفیکشن کی وجہ سے یتیم خانے میں یہ رات نہیں منائی گئی تو اس کا جسم اذیت طلب کرنے لگا۔ تب اسے پتا چلا کہ وہ اس اذیت کا عادی ہوگیا ہے۔ وہ اس سے نفرت بھی کرتا تھا اور اس کی طلب بھی کرتا تھا۔

پھر اس کھیل میں ایک نیا رنگ شامل ہوگیا تھا۔ وہاں اب عورتیں بھی آنے لگی تھیں۔ یہ اوباش عورتیں ان کم عمر لڑکوں سے اپنی خواہشات کی تسکین کرانے کی کوشش کرتی تھیں۔ ان عورتوں کے ساتھ کم سن لڑکیاں بھی آتی تھیں جو یتیم خانے کی انتظامیہ کے مردوں کی ہوس کا نشانہ بنتی تھیں۔ میٹ کو بعد میں پتا چلا کہ یہ عورتیں اور لڑکیاں بھی ایک یتیم خانے سے تعلق رکھتی تھیں اور اب یہ بھی ان لوگوں کے ساتھ اس رات میں شریک ہوتی تھیں۔ اس طرح انہوں نے اپنے شیطانی کھیل کو توسیع دے لی تھی۔ لڑکیوں کے یتیم خانے سے آنے والی ان عورتوں نے ہوس پرستی میں مردوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ تب سے ہی میٹ کو عورتوں سے نفرت ہوگئی تھی۔

اس کے بعد میٹ تین برس اور وہاں رہا تھا۔ اس دوران میں لڑکیوں کے یتیم خانے سے آنے والی لڑکیاں بھی اتنی منجھ گئی تھیں کہ انہوں نے پختہ عمر عورتوں کی جگہ سنبھال لی تھی۔ میٹ کے ذہن میں اس بات نے اپنی جگہ بنالی تھی کہ عورت معصوم ہوتی ہی نہیں ہے۔ اس نے کسی طرح روپیٹ کر جونیئر اسکول پاس کرلیا اور اس کے بعد وہ موقع ملتے پر وہاں سے بھاگ نکلا۔ اسے تعلیم سے بھی نفرت تھی۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ اسے اس یتیم خانے اور اس سے وابستہ ہر شے سے نفرت ہوگئی تھی۔

اس وقت اسے دنیا کے بارے میں بہت کم علم تھا۔ اسے یہ تک نہیں معلوم تھا کہ وہ کس جگہ رہتے تھے اور یہ ادارہ ملک کی کس ریاست میں قائم تھا۔ یتیم خانے کے منتظمین جان بوجھ کر بچوں کو جنرل نالج سے لاعلم رکھتے تھے اور ان کی کوشش ہوتی تھی کہ بچوں کو بیرونی دنیا کے بارے میں کم سے کم علم ہو... بلکہ وہ انہیں ڈرانے کی کوشش کرتے تھے تاکہ بچے یتیم خانے سے فرار کی نہ سوچیں۔ اس کے باوجود بچے فرار ہو جاتے تھے۔ یتیم خانے والے انہیں تلاش کرنے کی کوشش بھی نہیں کرتے تھے بلکہ کسی چیز کی چوری کا الزام عائد کر کے ان کے بارے میں پولیس میں رپورٹ کرا دیتے تھے تاکہ بچے کبھی پولیس کے ہاتھ لگیں یا ان کی شکایت لے کر پولیس کے پاس جائیں تو ان کی بات پر کوئی یقین نہ کرے۔ مگر کوئی بھی لڑکا جو بھاگتا تھا، وہ کبھی پولیس کے پاس نہیں جاتا تھا کیونکہ اسے پتا ہوتا تھا کہ اس صورت میں اسے یتیم خانے کے حوالے کر دیا جائے گا اور وہ اپنی شکایت کی سزا بھگتے گا۔ اس لیے جو بھاگتا تھا، وہ پولیس سے بھی دور رہتا تھا۔

میٹ کا بھی پولیس کے پاس جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ یتیم خانے میں اسے یہ تو پتا تھا کہ دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے رقم کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اس کا صحیح سے اندازہ اسے باہر نکل کر ہوا تھا۔ دو دن کی بھوک سے مجبور ہو کر اس نے پہلا جرم کیا اور ایک باغ میں لگے کرنا رنگیاں چرائی تھیں اور چرائی بھی کیا تھیں، اس نے وہیں بیٹھ کر کھائیں اور پھر باغ کے مالک کے دہاں آنے پر بھاگ نکلا تھا۔ اس نے یتیم خانے سے نکلنے کے بعد پہلا سبق یہ سیکھا تھا کہ اگر اپنی طلب صحیح راستے سے پوری نہ ہو تو اسے کسی بھی طریقے سے پورا کر لو۔ ایک سال میں وہ چوری میں ماہر ہوگیا تھا۔ گھروں میں گھس کر رقم اور چیزیں چرا لیا کرتا تھا اور کسی کے آنے سے پہلے ہی بھاگ نکلتا تھا۔ متعدد بار ایسا ہوا کہ کوئی گھر والا آگیا۔ مگر اسے کوئی پکڑ نہیں سکا اور وہ ہمیشہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔

سترہ سال کی عمر میں اس نے پہلا قتل کیا تھا۔ وہ ہائی وے کے ساتھ کھڑے ایک ٹریلر میں گھسا اور اس سے پہلے کہ وہ اپنا کام کر کے وہاں سے نکلتا، اس کا نشے میں دھت مالک وہاں آگیا۔ وہ اپنا ٹریلر کھڑا کر کے نزدیکی بار تک چلا گیا تھا۔ جب اس نے میٹ کو دیکھا تو غصے میں گالیاں بکتا ہوا اس کی طرف بڑھا اور ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ خود کو سنبھالتا، وہ میٹ کو کہاں سے قابو کرتا۔

''ذلیل لڑکے... تو اندر کیسے آیا؟''

اسے بے بس دیکھ کر میٹ کا خوف اطمینان میں بدل گیا تھا۔ اس نے آرام سے اسے دھکا دے کر کاؤچ پر گرایا اور پھر اس کی شرٹ اتار کر اس کے ٹکڑے کیے اور اس سے اس کے ہاتھ پیر باندھ دیے۔ اس کام میں اسے کوئی مشکل نہیں ہوئی تھی۔ جب وہ ٹریلر میں داخل ہوا تھا تو اسے عجلت تھی اس لیے اس نے صحیح سے تلاشی بھی نہیں لی تھی مگر اب اسے کسی کا خوف نہیں تھا۔ اس نے آرام سے پورے ٹریلر کی تلاشی لی اور ایک جگہ چھپی رقم برآمد کرلی۔ یہ کوئی سات ہزار ڈالرز تھے اور میٹ کے لیے یہ بہت بڑی رقم تھی کیونکہ اس نے آج تک اتنی بڑی رقم نہیں دیکھی تھی۔ ساتھ ہی اسے رقم والی جگہ سے ایک البم اور ڈھیر ساری میگزین فلمیں بھی ملی تھیں۔ البم مختلف مردوں اور عورتوں کی ناگفتہ بہ قسم کی تصاویر پر مشتمل تھی۔

وہ شخص اسے گالیاں دے رہا تھا اس لیے میٹ نے اسی کے گندے موزوں سے اس کا منہ بند کر دیا۔ جب اس نے رقم اور دوسری چیزیں نکالیں تو اس نے اس شخص کا منہ کھولا اور البم اس کے سامنے رکھ دی۔

''یہ کیا ہے؟''

''یہ البم ہے۔'' اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ ''میں نے اپنی تسکین کے لیے رکھا ہے۔''

مگر میٹ کو محسوس ہوا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے اور اس نے اس سے سچ اگلوانے کے لیے اس کے جسم پر پہلے چھری سے کٹ لگایا اور پھر اس پر نمک اور مرچ کا محلول چھڑکا۔ یہ ساری چیزیں اسے ٹریلر کے کچن سے مل گئی تھیں۔ اس نے جب بھی نہیں اگلا تو اگلے مرحلے میں میٹ نے استری گرم کر کے اس کے جسم کے کئی حصوں کو جلا دیا۔ اگر اس کا منہ آزاد ہوتا تو اس کی چیخیں شاید ہائی وے سے گزرنے والوں کو متوجہ کرلیتیں مگر میٹ نے اس کا منہ بند کر دیا تھا۔ اسے بھی اس شخص سے کچھ اگلوانے میں اتنی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے تو اس پر تشدد کرنے میں لطف آرہا تھا۔

جب وہ تڑپتا اور بل کھاتا اور اذیت سے اس کا جسم اینٹھ جاتا تو میٹ قہقہے لگاتا تھا۔ اب وہ خود اسے بتانا چاہ رہا تھا مگر میٹ کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جب اس نے استری سے اس کے جسم کی بیشتر کھال جلا دی تو اس نے پھر ان زخموں پر نمک اور مرچ کا محلول چھڑکا۔ جہاں آبلے پڑ جاتے وہاں وہ چاقو سے کٹ لگاتا تھا تاکہ اسے زیادہ سے زیادہ اذیت پہنچا سکے۔ مگر وہ اس کھیل سے زیادہ دیر لطف اندوز نہیں ہوسکا۔ اس شخص نے چند گھنٹوں بعد جان دے دی تھی۔ اس کا جسم اتنی اذیت برداشت نہیں کرسکا تھا۔ میٹ کو اس کے مرنے کا کوئی افسوس نہیں تھا، بس اس بات کا افسوس تھا کہ وہ کچھ دیر اور کیوں زندہ نہیں رہا۔ اس کے مرنے کے بعد اس نے وہیں اطمینان سے کھانا کھایا اور اور پھر اپنے سارے نشان مٹا کر وہاں سے روانہ ہوگیا۔ اگلی صبح وہ ایک اور شہر میں تھا اور ایک بار میں اس نے اپنے کارنامے کی ٹی وی رپورٹ دیکھی تھی۔ جب پولیس نے اسے درندہ قرار دیا تو اسے عجیب سی خوشی محسوس ہوئی۔ اسی وقت اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ سب سے بڑا درندہ بنے گا۔

پولیس کے مطابق مرنے والا بلیک میلر تھا اور اس کے پاس سے بے شمار معزز افراد کی ایسی تصاویر نکلی تھیں کہ اگر وہ منظر عام پر آجاتیں تو وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے۔ مرنے والا فوٹو گرافر تھا اور اس نے اپنی صلاحیتوں کو منفی انداز میں استعمال کیا تھا۔ اس کی بھیانک لاش دیکھ کر لوگوں کے دل دہل گئے ہوں گے لیکن میٹ نے اس سے بھی لطف اٹھایا تھا۔ اس نے سوچا کہ کاش وہ اسے دیر تک زندہ رکھ سکتا۔ وہ اتنی جلدی مر گیا تھا۔ ساتھ ہی اس نے فیصلہ کیا کہ آئندہ اس نے کسی کو قتل کیا تو اتنی آسانی سے اسے مرنے نہیں دے گا۔

اس پہلے قتل کے بعد اس نے اگلے ایک سال تک کسی کو قتل نہیں کیا کیونکہ اسے اس کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جس کو بھی قتل کرے، پوری طرح قابو کر کے اور اپنی مرضی سے کرے اور ایسا کوئی موقع اس کے ہاتھ نہیں آیا تھا۔ پھر پورے ایک سال بعد اس نے موقع تلاش کرلیا۔ یہ ایک کال گرل تھی جو ایک گندے سے اپارٹمنٹ میں رہتی تھی۔ اس اپارٹمنٹ کے عقب میں..... لوہے کی چیزیں بنانے والی ورک شاپ تھی۔ اس لیے وہاں ہر وقت اتنا شور ہوتا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ اس کال گرل کی طرف وہ اس وجہ سے متوجہ ہوا کہ وہ خود اس کے سر ہوگئی تھی۔ وہ

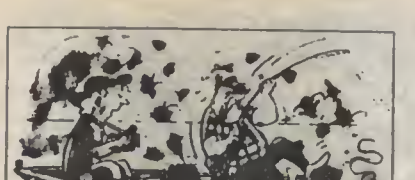

''خدا کے لیے مچھلی کو کھینچ کر نکال بھی چکو... میں تصویر کھینچنے کے لیے انتظار کر رہی ہوں۔''

چاہتی تھی کہ میٹ اسے حاصل کرے اور اس کے وقت کی قیمت ادا کرے... جبکہ میٹ کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور جب اس نے لڑکی کو واضح انکار کر دیا تو اس نے چراغ پا ہو کر میٹ کو گالیاں دیں اور اس سے بیس ڈالرز طلب کیے۔ میٹ اس کے مطالبے پر حیران ہوا تھا۔

''بیس ڈالرز... لیکن کس بات کے؟''

''یہ جو میں نے تم پر... وقت لگایا ہے اور خود کو ایکسپوز کیا ہے مجھے اس کا معاوضہ چاہیے۔''

''وقت تم نے اپنی مرضی سے لگایا ہے اور مجھے تمہارے اس گندے جسم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میرے نزدیک تمہارا کپڑوں میں ہونا یا بے لباس ہونا برابر ہے۔''

اس پر اس نے میٹ کو نہایت فحش گالیاں دیں۔ اس نے اسی وقت سوچ لیا تھا کہ وہ اس کو ضرور قتل کرے گا۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد اس نے جوڈی کا پیچھا کیا اور اس کے اپارٹمنٹ کا پتا چلالیا۔ اسے یہ بھی پتا چل گیا کہ وہ شام چھ سے صبح چار بجے تک باہر رہتی تھی اور اس دوران میں صرف ایک وجہ سے اپنے اپارٹمنٹ میں آتی تھی کہ اس کے گاہک کے پاس اسے لے جانے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی تھی۔

تیسرے دن میٹ اس کے اپارٹمنٹ میں داخل ہوا اور یہ کام اس کے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا کیونکہ اسے قفل شکنی کا فن آ گیا تھا۔ حسب معمول جوڈی صبح چار بجے اپنے گندے اپارٹمنٹ میں داخل ہوئی۔ دو کمروں کا یہ اپارٹمنٹ گندے کپڑوں اور دوسری چیزوں سے اٹا ہوا تھا۔ میٹ کو اپنے مطلب کی چیزیں تلاش کرنے میں خاصی مشکل پیش آئی تھی لیکن جب جوڈی آئی تو وہ اس کے استقبال کے لیے تیار تھا۔ اس نے اندر آنے والی جوڈی پر عقب سے وار کیا تھا اور وہ چکرا کر گر پڑی۔ میٹ نے ہاتھ ہلکا رکھا تھا۔ اس کے بعد اس نے پھرتی سے اسے باندھ دیا۔ جوڈی جلد ہوش میں آ گئی تھی اور اس نے خود کو بندھا پا کر آزاد کرانے کی کوشش کی مگر رسی کی گرفت سخت تھی۔ ساتھ ہی میٹ نے اس کا منہ بھی بند کر دیا تھا اس لیے وہ آواز بھی نہیں نکال سکتی تھی۔ ابھی ورک شاپ بند تھی اس لیے سناٹا تھا۔ ورک شاپ میں کام کا آغاز صبح آٹھ بجے ہوتا تھا۔ میٹ بھی اپنے کام کا آغاز آٹھ بجے کرتا، اس لیے وہ آرام سے بیٹھ گیا اور جوڈی کی غوں غاں سے لطف اندوز ہونے لگا۔ وہ خوف زدہ اور بے قرار تھی کہ میٹ یہ سب کیوں کر رہا ہے؟

''فکر مت کرو۔'' میٹ نے اس کے فریج سے نکالی بیئر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔ ''کچھ دیر بعد میں تمہیں بہت لطف دوں گا۔''

جوڈی کسی قدر مطمئن نظر آنے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید میٹ اس کو جسمانی طور پر حاصل کرنا چاہتا۔ جیسے ہی آٹھ بجے اور ورک شاپ کی جانب سے مشینوں کا شور بلند ہوا، میٹ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد آنے والے سات آٹھ گھنٹے جوڈی کے لیے بھیانک ترین ثابت ہوئے تھے جبکہ میٹ اس کے ایک ایک لمحے سے لطف حاصل کرتا رہا تھا۔ اسے جوڈی کے جسم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ تو اسے دھیرے دھیرے تباہ کرنے میں دلچسپی رکھتا تھا اور اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ جوڈی دیر تک زندہ رہے جبکہ جوڈی چیخ چیخ کر مرنے کی دعا کر رہی تھی۔ میٹ نے اس کا منہ کھول دیا تھا۔ اسے اجازت دے دی تھی کہ وہ جتنا چاہے چیخے چلائے۔ مشینوں کے شور میں اس کی آواز میٹ کو بڑی مشکل سے سنائی دے رہی تھی... کسی اور تک کیسے جاتی؟ آٹھ گھنٹے بعد جوڈی کی خواہش پوری ہو گئی اور فرشتۂ اجل نے آ کر اسے اس اذیت سے نجات دلا دی۔ میٹ ناخوش نہیں تھا کیونکہ اس کھیل نے اسے تھکا دیا تھا۔ اس لیے جوڈی کے باتھ روم میں خود کو صاف کر کے اس نے کچھ دیر وہاں آرام کیا اور جب بلڈنگ میں ذرا چہل قدمی شروع ہوئی تو وہ بھی نکل گیا۔ کسی نے اس پر دھیان نہیں دیا تھا۔ اگلے روز اخبارات میں اس قتل کا چرچا تھا اور اس بار اسے پریس نے درندہ قرار دیا تھا۔

جوڈی کے بعد میٹ نے دس برسوں میں کوئی سات کال گرلز کو قتل کیا۔ وہ ضرورت کے تحت جرائم کرتا تھا اور تسکین کے لیے قتل کرتا تھا۔ بتیس سال کی عمر تک وہ اسی طرح انیس افراد کو مار چکا تھا اور ایک بار بھی پکڑا نہیں گیا تھا۔ اس نے کچھ اصول بنا لیے تھے۔ اول وہ کسی ایسے فرد کو شکار کرتا تھا جو اکیلا رہتا ہو۔ دوسرے وہ کسی عام آدمی کو نہیں مارتا تھا، نہ ہی کسی خاندان والے فرد کو شکار بناتا تھا۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ اس کا شکار مجرمانہ سرگرمیوں سے تعلق رکھتا ہو تاکہ پولیس اسے عام سا قتل سمجھے۔ تیسرے اسے اس شکار سے کچھ نہ کچھ ملے تاکہ وہ جلد از جلد اس جگہ سے دور چلا جائے۔

انیس قتل معمولی نہیں ہوتے لیکن اس نے یہ اتنی چالاکی سے کیے تھے کہ پولیس اسے تلاش کرنا تو ایک طرف رہا، ان وارداتوں کا آپس میں کوئی تعلق بھی نہیں جوڑ سکی تھی اور ان سب کو الگ الگ نامعلوم قاتلوں کے کھاتے میں ڈالا گیا تھا۔ اس نے آخری واردات ایک نوعمر کال گرل کے ساتھ کی تھی۔ ان دنوں اس کے پاس کار تھی اور وہ اس کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ میٹ نے اسے ایک ویرانے میں لے جا کر سکون سے قتل کیا تھا جہاں اس کی چیخیں سننے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ اس نے لڑکی کو مار کر اس کی لاش وہیں ایک ندی میں بہا دی تھی۔ اس طرح پولیس یہ جاننے میں بھی ناکام رہی تھی کہ لڑکی کو اصل میں قتل کہاں کیا گیا تھا۔ میٹ وہاں سے آرام سے نکل گیا تھا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس کے خیال میں اس نے درندہ ہونے کا ٹائٹل اپنے نام کرا لیا تھا۔

اس وقت وہ ایک ہائی وے پر سفر کر رہا تھا۔ یہ ریاست اڈاہو کا علاقہ تھا۔ ہائی وے کے دونوں طرف دلدلی زمین پر گھنے جنگلات تھے۔ یہ علاقہ تاحدِ نگاہ ویران تھا۔ اچانک اس کی کار کے انجن سے آوازیں آنے لگیں۔ اور کچھ دیر بعد انجن گھڑگھڑا کر بند ہو گیا۔ اس نے اتر کر بونٹ ہٹایا لیکن اسے انجن سے متعلق کچھ علم نہیں تھا۔ اس لیے وہ ہاتھ مار کر رہ گیا اور کار اسٹارٹ نہیں ہوئی۔ اس نے پھر کار اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی اور سیلف مار مار کر بیٹری بھی ختم کر دی۔

اب اس کے پاس...... پیدل مارچ کرنے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں رہا تھا۔ وہ اپنا بیگ کندھے سے لٹکائے سڑک کے کنارے چلا جا رہا تھا اور اسے یہ فکر تھی کہ آج کسی آبادی تک نہ پہنچ سکا تو اسے بھوکا رہنا پڑے گا کیونکہ اس کے پاس کھانے کے لیے بھی کچھ نہیں تھا اور اس سڑک پر اسے اتنی دیر میں کسی اور گاڑی کی جھلک بھی نظر نہیں آئی تھی۔ اس لیے جب عقب سے اسے کسی گاڑی کے انجن کی آواز آئی تو اسے بہت خوشی ہوئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ آنے والی ایک درمیانے سائز کی بس تھی اور اس نے ہاتھ ہلایا تو وہ اس کے پاس آ کر رک بھی گئی۔ اس کا دروازہ کھلا اور میٹ اندر داخل ہوا۔ اس نے دیکھا کہ سیٹوں پر ایک جیسی سرمئی ٹی شرٹ پہنے اور سیاہ عینک لگائے جوان اور مضبوط جسامت والے مرد بیٹھے تھے۔

''کیا یہ پرائیویٹ بس ہے؟'' اس نے ڈرائیور سے پوچھا۔

''ہاں لیکن تم فکر مت کرو۔'' ڈرائیور کے بجائے اس کے پاس بیٹھے ایک شخص نے جواب دیا۔ ''تم کو کہاں جانا ہے؟''

''کہیں بھی نہیں۔'' میٹ اس کے پاس بیٹھ گیا۔ ''میں ایک سیلانی ہوں اور میری گاڑی پیچھے خراب ہو گئی ہے اس لیے پیدل سفر کر رہا ہوں۔''

''تب تم ہمارے سینٹر تک چلو۔ وہاں سے تم جہاں جانا چاہو جا سکتے ہو۔''

''سینٹر؟'' میٹ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''ہاں یہ ایک سیکیورٹی فرم کا ٹریننگ سینٹر ہے۔ میں اس کا ٹرینر ہوں۔'' اس شخص نے پیچھے بیٹھے افراد کی طرف

''بہت شوق تھا تمہیں سیٹیاں بجا بجا کر پرندوں کو بلانے کا...!''

اشارہ کیا۔ میٹ نے غور کیا، اس نے بالکل سیاہ رنگ کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس نے میٹ سے اپنا تعارف کرایا۔ ''مجھے میجر ریان کہتے ہیں۔''

''میٹ۔'' اس نے صرف اتنا کہا۔ اپنا تعارف کرانے میں وہ ہمیشہ محتاط رہتا تھا۔ ''یہ کس قسم کی سیکیورٹی فرم ہے؟''

''ہم بڑے پیمانے پر سیکیورٹی فراہم کرتے ہیں جیسے اداروں کو... سفارت کاروں اور جنگ زدہ علاقوں میں اپنے لوگوں کو سیکیورٹی دیتے ہیں۔''

میٹ کو ان کے بارے میں دلچسپی محسوس ہو رہی تھی اس لیے وہ میجر ریان سے کرید کرید کر سوال کرتا رہا۔ اس نے بتایا کہ ان کی فرم جس شخص کو ملازمت کے لیے منتخب کرتی ہے، اسے بہترین قسم کی تربیت اور بہت شان دار تنخواہ کے ساتھ اسے ملازمت دیتی ہے۔ دورانِ ملازمت ان لوگوں کا ہر ممکن خیال رکھا جاتا ہے۔ اس نے معنی خیز انداز میں ہر قسم کا خیال رکھنے کی بات کی تھی۔ میٹ اور وہ آپس میں باتیں کرتے رہے۔ میٹ کو وہ اس لحاظ سے اچھا لگا تھا کہ اس نے اپنے بارے میں تو کھل کر بتایا تھا لیکن اس کے بارے میں زیادہ بات نہیں کی تھی... اور اس نے اپنے بارے میں پوچھے گئے سوالات کے جو جواب دیے، اس نے ان پر ردوکد نہیں کی اور انہیں جوں کا توں تسلیم کر لیا تھا۔ کچھ دیر بعد بس ایک بڑے سے احاطے میں داخل ہوئی جس میں کوئی درجن بھر چھوٹی بڑی عمارتیں تھیں اور ایک طرف فائرنگ رینج سے فائرنگ کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے دلچسپی سے میجر ریان کی طرف دیکھا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟''

''زیرِ تربیت لوگ فائرنگ کی مشق کر رہے ہیں۔ تم

دیکھو گے؟''

''ہاں... کیوں نہیں۔'' میٹ فوراً راضی ہو گیا۔

باقی افراد بس سے اتر کر کہیں چلے گئے۔ میجر ریان اسے فائرنگ رینج تک لایا۔ وہاں درجن بھر سے زیادہ افراد جدید طریقوں سے اور جدید ترین ہتھیاروں سے فائرنگ کی مشق کر رہے تھے۔ میٹ کو یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔ جب میجر ریان نے اسے مشق میں شامل ہونے کے لیے کہا تو اس کی دلی مراد بر آئی تھی۔ میجر ریان نے اسے ایک چھوٹا مگر مہلک اسمتھ اینڈ ولسن دیا تھا۔ شروع میں اس نے درست نشانہ نہیں لیا لیکن پھر اس کی تین گولیاں نشانے پر لگی تھیں۔ میجر ریان نے اسے حیرت سے دیکھا۔

''کیا تم پہلے بھی نشانے بازی کی مشق کرتے رہے ہو؟''

''نہیں، میں نے آج پہلی بار کوئی آتشیں ہتھیار پکڑا ہے۔''

''تم میں نشانے بازی کی فطری صلاحیت ہے۔'' میجر ریان نے تعریفی انداز میں کہا۔ ''کیا خیال ہے، بڑے ہتھیاروں سے مشق کرو گے۔''

خود میٹ بھی یہی چاہتا تھا مگر اس سے کہتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ اس بار میجر ریان نے اسے ایک اسالٹ رائفل دی اور میٹ نے اس سے بھی اچھی کارکردگی دکھائی تھی۔ میجر نے اسے شاباشی دی تو اس کا سینہ فخر سے پھول گیا۔ فائرنگ رینج سے وہ سینٹر کے بار میں آئے جہاں نہ صرف بہترین شرابیں تھیں بلکہ ان کو سرو کرنے والی لڑکیاں بھی خوب تھیں۔ میجر نے اس کے لیے واڈکا کا آرڈر دیا۔ اس نے لڑکیوں کی طرف اشارہ کیا۔

''میرا نہیں خیال تھا کہ یہاں یہ بھی ہوں گی۔''

میجر ریان مسکرایا۔ ''میں نے بتایا تھا کہ ہم اپنے لوگوں کا ہر طرح سے خیال رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی یہاں پر بے شمار لڑکیاں ہیں۔ یہاں ایک نائٹ کلب بھی ہے۔''

میٹ کا دل چاہ رہا تھا کہ اسی جگہ رہ جائے اور کچھ نہیں تو اسے چند دن یہاں رہنے کا موقع مل جائے۔ میجر ریان نے شاید اس کی خواہش بھانپ لی تھی۔ اس نے خود ہی پیش کش کر دی۔ ''تم چند دن یہاں رک کیوں نہیں جاتے؟ میں تمہاری گاڑی بھی منگوا دوں گا اور اس میں کوئی مسئلہ ہے تو یہاں مکینک دیکھ لے گا۔''

میٹ اس کی بات پر حیران رہ گیا۔ میجر اس پر بہت ہی مہربان ہو رہا تھا۔ لیکن شک والی کوئی بات نہیں تھی اس لیے وہ مان گیا۔ میجر اسے لے کر ایک رہائشی عمارت میں آیا۔ اس میں زیر تربیت افراد ٹھہرائے جاتے تھے اور یہاں بے شمار کمرے تھے جو بہترین سہولتوں سے آراستہ تھے۔ میجر نے ایک کمرا اس کے حوالے کر دیا۔ ''تم چار دن یہاں رہ سکتے ہو۔ کھانے کے لیے عمارت میں میس ہے۔ وہاں سے تم جس وقت چاہو اپنی پسند کا کوئی بھی کھانا حاصل کر سکتے ہو، بغیر کسی ادائیگی کے۔''

یہ سب میٹ کے تصور سے بھی زیادہ تھا۔ ''میں تمہارا شکر گزار ہوں میجر ریان۔''

''کوئی بات نہیں، انجوائے کرو۔'' اس نے مسکرا کے کہا اور چلا گیا۔ میٹ نے کبھی خواب میں بھی ایسی رہائش کا نہیں سوچا تھا جو یہاں اسے دی گئی تھی۔ میجر ریان نے اسے بتا دیا تھا کہ یہ رہائش زیر تربیت افراد کی تھی۔ اگر یہ زیر تربیت افراد کی رہائش تھی تو یہ لوگ اپنے تربیت یافتہ افراد کو کیسی رہائش دیتے ہوں گے؟ یہ سوچ کر ہی میٹ کو سنسنی کا احساس ہو رہا تھا۔ رات کو کھانے کے لیے وہ نیچے میس میں آیا جہاں کم سے کم پانچ سو افراد کے بیک وقت کھانے کی گنجائش تھی اور تقریباً اتنے ہی افراد وہاں موجود تھے۔ کوئی دو درجن سے زیادہ ڈشز تھیں اور سب کی سب اعلیٰ معیار کی! بہت عرصے بعد میٹ نے اتنا اچھا کھانا جی بھر کر کھایا تھا بلکہ زندگی میں شاید ہی اس نے کبھی اس سے اچھا کچھ کھایا ہو۔ وہاں موجود افراد آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے اور بالکل دوستانہ ماحول تھا۔ بے اختیار اس کے اندر خواہش جاگی کہ کاش! وہ بھی یہاں کا ایک حصہ بن جائے۔ مگر پھر اس نے اپنے بارے میں سوچا تو اسے مایوسی ہوئی۔ بھلا یہ لوگ کیوں اسے لینے لگے؟ اس نے تو ہائی اسکول بھی پاس نہیں کیا تھا۔

کھانے کے بعد بیشتر لوگ بار اور نائٹ کلب جانے کے لیے اٹھ گئے، وہ بھی ان کے ساتھ چلا آیا۔ اس نے بار جانے کے بجائے نائٹ کلب کا انتخاب کیا تھا اور جب وہ اندر آیا تو وہاں موجود درجنوں اور ان سے بھی زیادہ چمکتی لڑکیوں نے اسے زرا بد حواس کر دیا۔ میجر نے صحیح کہا تھا یہاں لڑکیاں بے شمار اور ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ ان میں سے ایک اس پر کچھ مہربان ہو گئی اور اس نے میٹ کے ساتھ ڈانس کیا۔ رات گئے جب وہ نشے میں دھت وہاں سے جانے لگا تو کسی نے اس سے ایک ڈالر بھی طلب نہیں کیا۔ یہ سب بالکل مفت تھا۔ اسے لگا جیسے وہ کوئی سہانا خواب دیکھ رہا ہے۔

جیسے تیسے لڑکھڑاتے قدموں سے وہ واپس اپنے کمرے تک آیا اور بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے بعد اسے لگا جیسے اس نے کوئی خواب دیکھا تھا۔ اسے لگا کہ کچھ لوگ اسے اسٹریچر پر ڈال کر کہیں لے جا رہے ہیں پھر اسے ایک کرسی پر نیم بیدار حالت میں لٹا دیا گیا اور اسے بازو میں ہلکی سی چبھن بھی محسوس ہوئی۔ اس کے بعد وہ جیسے ہواؤں میں اڑنے لگا۔ اسے کچھ آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ نفسیاتی مریض ہے... انیس افراد کو قتل کر چکا ہے... ہمارے کام کا آدمی ہے... اسے ہائر کرو۔''

صبح وہ جاگا تو بستر پر تھا۔ اسے رات کا خواب یاد تھا۔ اس نے بے ساختہ اپنے بازو کو دیکھا جہاں اسے چبھن کا احساس ہوا تھا مگر وہاں کوئی نشان نہیں تھا۔ اس کے ذہن میں پہلا خدشہ یہی آیا تھا کہ اسے کوئی انجکشن دے دیا گیا تھا اور اس کے زیر اثر اس نے کوئی اعتراف کیا تھا۔ ورنہ یہاں کسی کو کیا پتا کہ اس نے انیس قتل کیے ہیں۔ گرم پانی سے غسل کر کے وہ باہر آیا تو اس کے خدشات خاصی حد تک کم ہو گئے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ اس نے خواب ہی دیکھا تھا۔ وہ میس میں تھا کہ میجر ریان وہاں آ گیا۔ اس نے میٹ کو گلے میں لگانے والا ایک بیج دیا۔

''معاف کرنا، میں کل تمہیں یہ بیج دینا بھول گیا تھا۔ اس کے بغیر تم سینٹر میں ہر جگہ نہیں جا سکتے۔''

''میں کل نائٹ کلب گیا تھا۔'' میٹ نے اسے بتایا۔

''وہاں جا سکتے ہو لیکن فائرنگ رینج یا ایسی کسی جگہ تم اس کے بغیر نہیں جا سکو گے۔ باہر جاتے ہوئے اسے گلے میں ڈال لینا اور کوئی پوچھے تو میرا حوالہ دینا۔''

''ٹھیک ہے میجر!'' میٹ نے اس سے بیج لے لیا۔ ناشتے کے بعد وہ باہر نکلا۔ زیر تربیت افراد اور فرم کے ملازمین ورزش اور مشقوں میں مصروف تھے۔ میٹ سارا دن گھومتا پھرتا رہا۔ جب اسے بھوک لگتی تو وہ میس آ جاتا تھا۔ رات کا کھانا کھا کر وہ نائٹ کلب کے بجائے بار چلا گیا۔ وہاں اسے ایک آدمی ملا اور دونوں میں بات چیت ہوئی۔ میٹ پہلی بار کسی سے بے تکلف ہوا تھا۔ بل نامی اس شخص نے میٹ کو بتایا کہ وہ دو لاکھ ڈالرز سالانہ تنخواہ پر کام کر رہا ہے اور اگلے مہینے اسے ایک ٹیم کے ہمراہ عراق بھیجا جا رہا ہے۔ میٹ نے حیرت سے پوچھا۔

''ایک جنگ زدہ ملک میں تمہارا کیا کام ہے؟''

بل چٹخارا لیتے ہوئے بولا۔ ''وہیں تو ہمارا اصل کام ہے۔'' اس نے ہاتھ سے فائرنگ کا اشارہ کیا۔ ''وہاں ہمیں کھل کر شکار کرنے کا موقع ملے گا۔''

''قتل!'' میٹ نے غور کیا۔ ''تم وہاں لوگوں کو قتل کرو گے؟''

''ایسا ہی سمجھ لو اور اس قتل کے خلاف کہیں کوئی عدالت بھی نہیں لگے گی۔ یعنی سزا کا خوف بھی نہیں ہو گا۔''

''تم اپنے ملک کے لیے کام کرو گے؟''

''لازمی بات ہے۔'' بل نے تصدیق کی۔ ''فرم کی خدمات ہماری حکومت نے حاصل کی ہیں۔''

اس رات میٹ نے پھر کوئی خواب دیکھا۔ اسے کہیں لے جایا گیا تھا اور کوئی اس سے کہہ رہا تھا کہ وہ یہاں ملازمت کر لے۔ یہ اس کے مطلب کا کام ہے۔ وہ لوگوں کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ یہاں وہ لوگوں کو بلا خوف و خطر قتل کر سکے گا اور اسے سزا کا بھی کوئی خوف نہیں ہو گا۔ صبح وہ جاگا تو خواب والی بات اس کے ذہن میں تھی اور اس کی خود کی بھی یہی خواہش تھی کہ وہ اس فرم میں ملازمت کر لے جو اپنے ملازمین کو اتنی بڑی تنخواہ اور شاندار سہولیات دیتی تھی۔ مگر ساتھ ہی اسے یہ خوف بھی تھا کہ اسے مسترد نہ کر دیا جائے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں میجر ریان سے بات کر کے دیکھے گا۔

ناشتے کے بعد اس نے میجر ریان کو تلاش کیا تو اسے اس کے دفتر کا پتا بتایا گیا۔ وہ اپنے دفتر میں موجود تھا۔ اس نے گرم جوشی سے میٹ کا استقبال کیا۔ ''میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

میٹ نے بلا تمہید اس سے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔

''میں تمہاری فرم میں کام کرنا چاہتا ہوں؟''

''کیسا کام؟'' میجر نے اسے غور سے دیکھا۔

''وہی جو دوسرے کر رہے ہیں۔''

''یعنی سیکیورٹی پرسنل کا؟''

''ہاں... مجھے یہ کام اچھا لگا ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ میں تمہارے معیار پر پورا نہیں اتر سکوں گا۔''

''یہ تم سے کس نے کہا؟'' میجر کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''مجھے تو تم بہترین جسمانی صحت کے مالک نظر آتے ہو۔''

''میں زیادہ تعلیم یافتہ نہیں ہوں۔'' اس نے دبی زبان میں کہا۔ ''میں نے اسکول بھی پاس نہیں کیا ہے۔''

''تم فکر مت کرو، ہمارے ہاں ملازمت کرنے والے کو صرف لکھنا پڑھنا آنا چاہیے۔'' میجر نے اسے تسلی دی۔

''لیکن کیا تم سنجیدہ ہو؟''

''ہاں، سو فی صد۔''

''تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہاں ملازمت کرنے والے پانچ سال کا کنٹریکٹ کرتے ہیں۔ اس سے پہلے وہ صرف اسی صورت میں ملازمت چھوڑ سکتے ہیں جب وہ کسی وجہ سے جاب کے قابل نہ رہیں۔''

''میں تیار ہوں۔''
''دوسرے، تمہیں چھ مہینے کی تربیت دی جائے گی۔ یہ ملازمت کی مدت میں شمار نہیں ہوگی۔''

اس بار میٹ نے صرف سر ہلایا۔ میجر نے بتایا کہ پہلے اسے کچھ تحریری امتحان دینا ہوگا اور یہ بہت آسان اور سادہ ہو گا۔ اس کے بعد اس کا انٹرویو ہوگا جس کے بعد اسے تربیت کے لیے منتخب کیا جائے گا۔ تربیت کے دوران اسے ہائی ٹیک الیکٹرانک آلات سے لے کر جدید ترین اسلحے کے استعمال کی تربیت دی جائے گی اور تربیت کے بعد جب وہ ملازمت میں آئے گا تو فرم کو حق ہوگا کہ اسے کہیں بھی بھیج سکے۔

''مجھے معلوم ہے کہ تم لوگ اپنے آدمی عراق تک بھیجتے ہو۔''

''ہم سیکیورٹی کنسلٹنٹ ہیں اور اپنے گاہکوں کے لیے ہر قسم کی سیکیورٹی ڈیزائن کرنے سے لے کر فراہم کرنے تک سب کرتے ہیں۔''

اگلے دن میٹ کا تحریری ٹیسٹ تھا اور یہ واقعی بہت آسان تھا۔ اس نے آرام سے اسے پاس کر لیا۔ اس سے اگلے دن اس کا انٹرویو تھا۔ میجر نے اسے خبردار کیا تھا کہ وہ اپنے ماضی کے بارے میں قطعی جھوٹ نہ بولے کیونکہ اس کی تصدیق کی جائے گی۔ ہاں، اس نے کوئی غیر قانونی کام کیا ہے تو بے شک اس کے بارے میں نہ بتائے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ اس نے بلا جھجک اعتراف کر لیا کہ وہ ایک یتیم خانے میں پلا بڑھا تھا اور وہاں سے پندرہ سال کی عمر میں فرار ہو گیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ اب تک آوارہ گردی کرتا رہا اور اس نے کسی ایک جگہ ٹک کر کام کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اسے بتایا گیا کہ وہ اس ملازمت میں پانچ سال کے لیے پابند ہوگا اور اگر اس نے اس سے پہلے ملازمت چھوڑنے کی کوشش کی تو اس کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی۔

اس کے کاغذات تیار ہوئے، بینک اکاؤنٹ کھولا گیا اور اس کے ہاتھ پر ایک نمبر ٹیٹوز کیا گیا۔ یہ اس کی کہنی کے عین نیچے تھا۔ اس کے تمام میڈیکل ٹیسٹ ہوئے تھے اور اس کے بعد اسے تربیت کے لیے آنے والے نئے بیج میں شامل کر دیا گیا تھا۔ تربیت بہت سخت تھی، اسے صبح سویرے اٹھا دیا جاتا تھا۔ ورزش کے بعد ان لوگوں کو خالی ہاتھ سے لڑنے کی... تربیت دی جاتی تھی۔ اس کے بعد ناشتا اور ناشتے کے بعد ان کو جنگ میں استعمال ہونے والے جدید برقی اور مواصلاتی آلات کے استعمال کی تربیت دی جاتی تھی۔ شام کے سیشن میں انہیں آتشیں ہتھیاروں کی مشق کرائی جاتی اور رات کے کھانے سے پہلے انہیں ایک بار پھر سخت ورزش کے مرحلے سے گزرنا پڑتا تھا۔

ہفتے میں ایک دن جسمانی تربیت کے بجائے ان کی زبانی کلاس بھی ہوتی تھی۔ ان کو لیکچرز اور موویز کی مدد سے بتایا جاتا تھا کہ مسلح دہشت گردوں سے کس طرح نمٹا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ انہیں نظریاتی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ انہیں بتایا جاتا تھا کہ دنیا کے کن خطوں کے لوگ ان کے ملک اور ان کے دین کے دشمن تھے اور وہ ان کے خلاف کس قسم کی جنگ لڑ رہے تھے۔ انہیں بتایا جاتا تھا کہ دشمن کی سرزمین پر موجود ہر شخص ان کا دشمن ہوتا ہے اور اسے مارنا جائز اور ضروری ہوتا ہے۔ اس میں مرد، عورت اور بوڑھے بچے کی کوئی تخصیص نہیں ہوتی۔

میٹ کو ان نظریاتی کلاسز میں زیادہ مزہ آتا تھا کیونکہ یہ سب باتیں اس کے مزاج کے عین مطابق تھیں۔ انہیں اس قسم کی ویڈیوز بھی دکھائی جاتی تھیں جن میں فرم کے سیکیورٹی اہلکار لوگوں پر اندھا دھند فائرنگ کرتے اور ان کا قتل عام کرتے دکھائی دیتے تھے۔ میٹ اور اس کے ساتھی ان ویڈیوز سے بہت متاثر ہوتے تھے اور ان کے اندر بے ساختہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ وہ بھی اس قسم کے کھیلوں میں حصہ لیں۔

ان ویڈیوز کو کلنگ اسپورٹس کا نام دیا گیا تھا اور اس میں جو سیکیورٹی اہلکار زیادہ لوگوں کو مارتا تھا، وہ فاتح شمار ہوتا تھا۔ میٹ بہت خوش تھا کہ اسے اس قسم کے کھیل میں شامل ہونے کا موقع ملے گا۔ ہفتے کے چھ دن سخت تربیت کے بعد ایک دن کے لیے ان کو آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا اور اس دن وہ دل کھول کر تفریحات میں حصہ لیتے تھے۔ وہاں عیاشی کا ہر سامان میسر تھا۔ شراب، جوا اور عورت... یہی تو چاہیے تھا۔

ایک مہینے کی تربیت کے بعد ہی میٹ اپنے اندر واضح تبدیلیاں محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کا جسم پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط ہو گیا تھا اور وہ ذہنی لحاظ سے بھی خود کو مضبوط محسوس کرنے لگا تھا۔ تربیت کے دوران اس کی کارکردگی بہت اچھی رہی تھی اور وہ اپنے تمام ساتھیوں سے آگے تھا۔ خاص طور سے ہتھیاروں کے استعمال میں اس نے مہارت حاصل کر لی تھی۔ اس کے ساتھی اتوار کے دن کے منتظر رہا کرتے تھے کیونکہ اس دن انہیں کھل کر تفریح کرنے کا موقع ملتا تھا جبکہ میٹ کو اس لیے انتظار رہتا تھا کہ وہ کلنگ اسپورٹس کی ویڈیوز دیکھتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کی تربیت مکمل ہوتے ہی اسے کسی ایسے علاقے میں بھیج دیا جائے جہاں پر فرم کے سیکیورٹی اہلکار جنگ میں شامل ہوں اور اسے لوگوں کو قتل کرنے کا موقع ملے۔

چھ مہینے گزر گئے اور تربیت کے بعد اسے فی الحال سینٹر میں ہی تعینات کر دیا گیا۔ اس کے اندر خون کی پیاس بڑھ رہی تھی اور وہ جلد از جلد کسی کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے پورے آٹھ مہینے تک کسی کو قتل نہیں کیا تھا۔ کبھی کبھی اس کا دل چاہتا کہ اس سینٹر میں ہی کسی کو قتل کر دے لیکن ایسا کرنا بہت خطرناک ہو سکتا تھا۔ اول تو وہاں سارے ہی چھٹے ہوئے بدمعاش تھے اور ان میں سے کئی ایک قاتل بھی تھے۔ دوسرے وہ کسی پر قابو پا بھی لیتا تو اسے اذیت دے کر نہیں مار سکتا تھا۔ دورانِ تربیت اسے معلوم ہو گیا تھا کہ تربیت پانے والے اکثر افراد جرائم پیشہ تھے اور ان میں سے کئی ایک قاتل تھے مگر وہ عدالت کا سامنا کرنے کے بجائے یہاں مزے کر رہے تھے... جیسا کہ وہ یہاں تھا۔ اسے لگتا تھا کہ فرم والے ان کے جرائم سے جان بوجھ کر چشم پوشی کر رہے تھے اور انہوں نے خاص مقصد کے تحت ایسے لوگوں کو جمع کیا تھا۔ وہ سب مجرمانہ اور سفاک ذہنیت رکھتے تھے اور ان سے کوئی بھی غیر قانونی کام آسانی سے کرایا جا سکتا تھا۔

اس وسیع و عریض ٹریننگ سینٹر میں بیک وقت ایک ہزار افراد کو تربیت دینے کی گنجائش تھی اور یہاں ایک وقت میں دو ہزار افراد موجود ہوتے تھے۔ میٹ حیران تھا کہ یہ لوگ یہ قدر اخراجات کیسے کرتے تھے؟ کیا انہیں اس کی واپسی ہو پاتی تھی؟ تربیت اور ان لوگوں کو رکھنے پر اس قدر خرچ اور پھر ان لوگوں کو بیش قیمت تنخواہیں دینا... اس سب کے لیے رقم کہاں سے آتی تھی؟ اسے دورانِ تربیت ہر مہینے چھ ہزار ڈالرز کی تنخواہ دی جاتی تھی اور جب اس کی تربیت ختم ہو گئی تو اسے پندرہ ہزار ڈالرز ماہانہ ملنے لگے تھے۔ اس کے علاوہ سال میں بونس اور کارکردگی بونس الگ ملتا تھا۔ اگر انہیں کسی جنگ زدہ علاقے میں بھیجا جاتا تو اس کا الاؤنس الگ سے تھا۔ ان کی خوراک سے لے کر ان کا میڈیکل تک سب فرم کے ذمے تھا۔ ان کی عیاشی کا سارا بار بھی فرم اٹھا رہی تھی۔

وہ حیران تھا۔ اس کی معلومات کے مطابق امریکی فوج کے سپاہیوں کو بھی یہ تنخواہ اور سہولیات نہیں دی جاتی تھیں جو یہ فرم اپنے معمولی سیکیورٹی اہلکاروں کو دے رہی تھی۔ لیکن اتنا تو وہ سمجھتا تھا کہ یہ عنایات بے سبب نہیں تھیں اور یہ کسی نہ کسی طریقے سے ان سے اپنے اخراجات وصول کر لیں گے۔ یہ بات تھی کہ اسے یا اس کے ساتھیوں میں سے کسی کو اس کی پروا نہیں تھی۔ وہ آج مست اور خوش تھے اور انہیں کل کی فکر نہیں تھی۔

تربیت مکمل ہونے کے دو مہینے بعد ان لوگوں کو بتایا گیا کہ انہیں عراق بھیجا جا رہا ہے۔ حکومت سے ایک معاہدے کے تحت فرم ایک ہزار سیکیورٹی اہلکار بھیج رہی تھی۔ ان میں میٹ کا گروپ بھی شامل تھا اور اس کا سربراہ میجر ریان تھا۔ عراق میں قیام کے دوران انہیں امریکی فوج کا مرتبہ اور سہولیات فراہم کی جائیں گی اور وہ ان کے ساتھ مختلف آپریشنز میں حصہ لیں گے۔ میٹ بہت خوش تھا کہ اسے حرکت میں آنے کا موقع مل رہا تھا۔ ان کا گروپ پہلے بسوں کے ذریعے ایک ائر بیس پہنچا جہاں سے امریکن ائر فورس کے طیاروں نے انہیں عراق پہنچا دیا۔ وہ راستے میں کئی جگہ رکے تھے مگر ان لوگوں کو طیاروں سے باہر آنے کی اجازت نہیں تھی۔

عراق پہنچنے پر انہیں شمالی عراق میں ایک شورش زدہ علاقے میں بھیجا گیا۔ یہاں امریکی فوج کا ایک بہت بڑا اڈا تھا۔ اس میں ان لوگوں کو بھی ایک کمپاؤنڈ دیا گیا تھا۔ وہاں پہنچنے کے دوسرے دن ہی انہیں ایک آپریشن میں حصہ لینا پڑا۔ میٹ اور اس کے ساتھیوں کو امریکی فوج کے ہراول دستے کے طور پر مزاحمت کاروں کے علاقے میں داخل ہو کر ان کا صفایا کرنا تھا۔ پہلے فضا سے بمباری کی جاتی اور اس کے بعد پیدل فوج بکتر بند گاڑیوں اور ٹینکوں کی آڑ میں علاقے میں داخل ہو جاتی۔ روانگی سے پہلے میٹ کے گروپ کمانڈر میجر ریان نے انہیں حکم دیا۔ ''حرکت کرتے ہر آدمی کو شوٹ کرنا ہے۔ اٹ از آرڈر!''

''چاہے وہ کوئی بھی ہو؟'' ایک اہلکار نے سوال کیا۔
''چاہے وہ تمہاری ماں ہی کیوں نہ ہو۔'' میجر ریان غرایا۔

جب وہ اس علاقے کے قریب پہنچے تو وہاں گن شپ ہیلی کاپٹروں سے بے پناہ شیلنگ کی جا رہی تھی اور ان کا نشانہ علاقے میں موجود عام رہائشی عمارتیں تھیں۔ میٹ جس بکتر بند میں تھا، وہ سب سے آگے تھی۔ اس نے دیکھا کہ بم باری سے بچنے کے لیے عام لوگ جن میں بچے اور بوڑھے بھی تھے، بے تحاشا بھاگ رہے تھے مگر ان کے لیے کہیں جائے پناہ نہیں تھی۔ برستے راکٹ اور بم ان کے پرخچے اڑا رہے تھے۔

میٹ نے اپنے ساتھ موجود میجر ریان سے پوچھا۔
''کیا یہاں مسلح افراد موجود ہیں؟''
''بالکل ہیں۔'' اس نے یقین سے کہا۔ ''یہاں ہر عمارت میں مسلح دہشت گرد چھپے ہوئے ہیں۔''
''تب وہ باہر نکل کر مقابلہ کیوں نہیں کر رہے؟''

کمانڈر مسکرایا۔ ”ان میں اتنی سکت نہیں ہے کہ ہمارے سامنے آسکیں۔ ابھی گن شپ چلے جائیں گے تو ہم بچ جانے والے دہشت گردوں کا شکار کریں گے۔“

آدھے گھنٹے بعد گن شپ ہیلی کاپٹرز اپنا اسلحہ استعمال کرنے کے بعد واپس روانہ ہوئے اور باقی کام زمینی دستوں کے لیے چھوڑ دیا۔ اشارہ ملتے ہی بکتر بند گاڑیاں اور ٹینک علاقے میں داخل ہونے لگے۔ بمباری کا شکار ہونے والی عمارتوں کا ملبا راستوں پر بکھر گیا تھا۔ اس سے انہیں آگے بڑھنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ جب وہ پوری طرح علاقے میں گھس گئے تو میجر ریان نے باہر نکل کر عمارتوں میں موجود دہشت گردوں کو مارنے کا حکم دیا اور اس کے آدمی باہر نکل کر سامنے آنے والے ہر انسان کو شوٹ کرنے لگے۔

میٹ بھی بڑے جوش و خروش سے باہر نکلا تھا۔ اس نے پہلے ایک بوڑھے عراقی کو گولی ماری اور پھر اس کی لاش سے لپٹنے والی بوڑھی عورت کو بھی گولی ماردی۔ لیکن جب اسی گلی سے دو چیختی چلاتی نوعمر لڑکیاں نکل کر ان لاشوں کے گرد بین کرنے لگیں تو میٹ سے ان پر گولی نہیں چلائی گئی۔ ان پر گولی چلاتے ہوئے وہ ہچکچا رہا تھا۔ اس کے ساتھی نے کہا۔

”ماروان کو۔“

”یہ بچیاں تو ہیں۔“ وہ ہچکچا کر بولا۔

”احمق! یہ صرف دشمن ہیں۔“ اس کے ساتھی نے یہ کہتے ہوئے اپنی رائفل کا برسٹ کھول دیا اور دونوں بچیاں لمحوں میں چھلنی ہو کر رہ گئیں۔ اس کے بعد وہ عمارتوں میں گھسے اور ان میں چھپے افراد کو شوٹ کرنے لگے۔ میٹ کو جلد پتا چل گیا تھا کہ وہ عام شہریوں کا قتل عام کررہے تھے اور ان میں کوئی بھی مبینہ دہشت گرد نہیں تھا۔ کم سے کم دو سو افراد اس کے سامنے مارے گئے تھے اور اس سے پہلے لاتعداد بمباری کا نشانہ بن چکے تھے۔ میٹ نے بھی کئی افراد کو مارا تھا لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ اسے اس کی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ حالانکہ وہ یہاں آیا ہی اس مقصد کے تحت تھا کہ اسے لوگوں کو قتل کرنے کا موقع ملے گا۔ ہر فرد کو... جسے وہ قتل کرتا تھا، اس کی موت سے میٹ کے دل پر بوجھ بڑھتا جاتا تھا۔ کئی گھنٹے کی کارروائی کے بعد انہوں نے علاقہ کلیئر کر دیا تھا۔ یعنی اب وہاں کوئی زندہ فرد نہیں بچا تھا۔ اس کے بعد امریکی فوج کے ٹرک آکر وہاں سے لاشیں لے جانے لگے اور وہ اپنے اڈے پر واپس آگئے۔ میٹ اپنی ذہنی کیفیت سے اتنا پریشان تھا کہ وہ آتے ہی شراب پر ٹوٹ پڑا۔ اس کے ساتھی بھی نوشے تھے لیکن وہ فتح کا جشن منا رہے تھے اور وہ خود فراموشی چاہتا تھا۔

اس نے اتنی پی لی تھی کہ پھر اسے کچھ ہوش نہیں رہا تھا۔ اگلے دن جاکر اسے ہوش آیا تو میجر ریان نے اسے خبردار کیا کہ کسی بھی سیکیورٹی اہلکار کو اتنی نہیں پینی چاہیے کہ وہ اپنی حفاظت کے خیال سے بھی غافل ہو جائے۔ اس نے کہا۔

”یہ عراق ہے، یہاں کبھی بھی کچھ ہو سکتا ہے۔“

مگر میٹ کو میجر ریان کی نصیحت سے زیادہ یہ فکر تھی کل کی کارروائی کا کیا جواز تھا۔ اس عام شہری علاقے پر حملہ کیوں ہوا تھا؟ جب اس نے پوچھا تو اسے بتایا گیا کہ اس علاقے میں گشت کے دوران ایک امریکی بکتر بند گاڑی کو بارودی سرنگ کا نشانہ بنایا گیا تھا اور اس حملے میں بکتر بند میں موجود سات امریکی فوجی زخمی ہو گئے تھے۔ اس کے جواب میں اس علاقے میں یہ کارروائی کی گئی تھی۔ مارے جانے والوں کی لاشیں وہاں سے اٹھا کر ٹرکوں کے ذریعے سو میل دور ایک مردہ خانے میں منتقل کر دی گئی تھیں جہاں ایک ہفتے بعد ان کو لاوارث قرار دے کر دفنا دیا جاتا۔ اس کارروائی میں کم سے کم سات سو شہری مارے گئے تھے۔

’سات کے بدلے سات سو!‘ میٹ نے سوچا۔

اگلے دو مہینے میں میٹ اور اس کے ساتھیوں کو ایسی تین کارروائیوں میں حصہ لینا پڑا تھا۔ اس میں انہوں نے عام عراقی لوگوں کا قتل عام کیا تھا اور یہ بے گناہ تھے۔ ان کا قصور صرف اتنا تھا کہ ان کے علاقے میں حریت پسندوں نے امریکی فوج کو نشانہ بنایا تھا۔ ہر کارروائی کے بعد میٹ کو لگتا تھا کہ اس کے دل کا بوجھ بڑھ گیا ہے۔ ہر بار اسے خود فراموشی کے لیے شراب کا سہارا لینا پڑتا تھا۔

چھ مہینے بعد انہیں جنوب مغربی عراق کے ایک صحرائی علاقے میں واقع امریکی اڈے کی سیکورٹی کے فرائض سونپے گئے تھے کیونکہ یہاں چھاپا مار آئے دن امریکی فوج پر حملے کرتے تھے اور وہ دن دہاڑے ان پر آپڑتے تھے۔ میٹ اور اس کے ساتھیوں کی مدد سے اس اڈے کے گرد دو سو گز کا حفاظتی علاقہ بنایا گیا تھا جس میں داخل ہونے والے ہر اجنبی کو گولی مارنے کا حکم تھا۔ اڈے کے پاس ہی ایک چشمہ تھا جس سے مقامی لوگ پانی لیا کرتے تھے۔

پہلے چشمے پر آنے والوں کو گولی نہ مارنے کا حکم تھا مگر اچانک ہی ایک دن سیکیورٹی والوں کو حکم دیا گیا کہ اب چشمے پر آنے والوں کو بھی گولی ماردی جائے اور ایسا مقامی آبادی کو خبردار کیے بغیر کیا گیا تھا کیونکہ اگلے ہی روز وہ صبح سویرے معمول کے مطابق پانی لینے کے لیے آنے لگے۔ پہلے میٹ کے ساتھی نے ایک چرواہے کو گولی ماری، اس کے بعد پانی

لینے کے لیے آنے والی دو عورتوں کو شوٹ کر دیا۔ یہ دیکھ کر باقی لوگ پیچھے ہٹ گئے تھے مگر ان کی جانب سے احتجاج کیا جانے لگا۔ بوڑھا چرواہا اور دونوں عورتوں کی لاشیں چشمے کے پاس پڑی تھیں۔ ان کے وارث انہیں اٹھا کر لے جانا چاہتے تھے۔ چرواہے کی بیٹی جذباتی ہو کر آگے آئی تو میٹ کے ساتھیوں نے اس پر رائفلیں تان لیں اور چلا چلا کر اسے زمین پر لیٹ جانے کا حکم دینے لگے۔ انہیں خوف تھا کہ اس نے کوئی خودکش جیکٹ نہ باندھ رکھی ہو۔

”لیٹ جاؤ... لیٹ جاؤ۔“ میٹ کا ساتھی عربی میں کہہ رہا تھا۔ باقی افراد نے آڑ لے لی تھی تاکہ اگر عورت کوئی دھماکا کرے تو وہ محفوظ رہیں۔ عورت سہم کر زمین پر لیٹ گئی۔ پھر میٹ کے ساتھی نے اسے حکم دیا کہ وہ اپنا لباس اوپر کرے ورنہ اسے گولی ماردی جائے گی۔ مجبور عورت نے یہ بھی کیا۔ اس نے کوئی خودکش جیکٹ نہیں پہن رکھی تھی اور اسے نیم عریاں دیکھ کر وہ لوگ قہقہے لگانے لگے۔ عورت خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

اس روز امریکی ہائی کمانڈ سے حکم آیا کہ مقامی لوگوں کو بلاوجہ نہ مارا جائے۔ شاید مقامی نمائندین نے اپنی شکایت اوپر پہنچائی تھی۔ لیکن اس حکم کے آنے کے بعد جب میٹ نے امریکی فوجیوں کو جوش و خروش سے تیاری کرتے دیکھا تو اس نے ایک میرین سے پوچھا۔ ”کیا کہیں کارروائی کی تیاری ہے؟“

”ہاں، ان لوگوں کو سبق سکھانا ہے۔“ اس نے مقامی لوگوں کے بارے میں ایک غلیظ لفظ استعمال کیا تھا۔ میٹ کو اس کا علم نہیں تھا۔ وہ اپنی گن کی صفائی میں لگا ہوا تھا، اس نے پوچھا۔

”کیا ہمارا دستہ بھی شامل ہے؟“

”ظاہر ہے، ورنہ کون ہمیں تحفظ دے گا۔“ وہ بولا۔

”تم تیار نہیں ہو تو جلدی سے تیار ہو جاؤ۔“

میٹ اپنے حصے میں آیا جہاں اس کے ساتھی بھی خوش خوش تیار ہو رہے تھے۔ اس کے ایک ساتھی بوگارڈ نے کہا۔

”آج مزہ آئے گا۔“

”یہ مزے تو ہم روز ہی کرتے ہیں۔“ میٹ کا لہجہ کسی قدر تلخ ہو گیا تھا۔

”نہیں، آج ہم زیادہ شکار کریں گے۔“ بوگارڈ بولا۔

جیسے ہی شام ڈھلی، وہ بکتر بند گاڑیوں میں سوار ہو کر خون کے پیاسے درندوں کی طرح نکل پڑے۔ میٹ اور اس کے ساتھی حسبِ معمول آگے تھے۔ وہ پاس کے گاؤں تک آئے تھے۔ یہ بستی ایک کچی چار دیواری میں تھی۔ اندر گھستے ہی بکتر بند گاڑیوں پر لگی مشین گنوں سے فائرنگ شروع کر دی گئی۔ جو شخص بھی گھر سے باہر تھا، وہ جلدی سے اپنے گھر میں گھس گیا۔ یہ نہتے اور عام لوگ تھے۔ وہ کسی صورت باقاعدہ فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے بعد میگا فون سے اعلان کیا گیا کہ بستی کے تمام لوگ باہر میدان میں آجائیں۔ کوئی فرد اندر نہ رہے۔ پھر وارننگ دی گئی کہ کوئی شخص اگر اندر رہ گیا تو اسے فوراً گولی ماردی جائے گی۔ ان سب کو باہر آنے کے لیے دس منٹ کی مہلت دی گئی تھی۔ میگا فون پر بار بار یہ وارننگ دہرائی جارہی تھی۔ وہ اعلان کرنے کے لیے اپنے ساتھ ایک مقامی شخص کو لائے تھے۔

اس اعلان پر گھروں سے کچھ لوگ نکلے جن کی تلاشی لے کر انہیں بستی کے ساتھ میدان میں بٹھا دیا گیا۔ عورتیں بھی تلاشی سے مستثنیٰ نہیں تھیں۔ ایک ایک کر کے بستی کے سارے لوگ باہر آگئے۔ ان کی تعداد دو سو سے کچھ اوپر تھی۔ اس کے بعد میٹ اور اس کے ساتھیوں نے گھروں میں گھس کر تلاشی لینا شروع کر دی۔ وہ تلاشی کے ساتھ لوٹ مار بھی کر رہے تھے۔ جس کے ہاتھ جو نقدی یا کوئی قیمتی چیز آتی تھی، وہ اسے اپنی جیب میں ڈال لیتا تھا۔ ان کو دو گھروں میں کچھ افراد چھپے ہوئے ملے تھے جنہیں فوراً گولی ماردی گئی تھی۔ نہ جانے وہ کون تھے؟ یہ جاننے کی کسی نے کوشش بھی نہیں کی تھی۔ بستی کو صاف کر کے وہ میدان میں آئے جہاں بستی والوں کی قسمت کا فیصلہ کیا جانا تھا۔

میجر ریان نے بستی کے لوگوں میں سے چُن چُن کر ان کو الگ کرنا شروع کر دیا جو جوان اور صحت مند تھے، ان میں مرد بھی شامل تھے اور عورتیں بھی۔ پندرہ سال سے کم عمر اور پچاس برس سے اوپر کے لوگوں کو وہ ایک طرف کر رہا تھا۔ جب سب کو الگ کر لیا تو جوان اور صحت مند لوگوں کو ایک طرف کر دیا گیا اور انہیں بکتر بند گاڑیوں کے ساتھ ایک بڑے سے کنٹینر ٹرک میں سوار ہونے کا حکم دیا گیا۔ جب وہ ہچکچائے تو میجر ریان نے فائر کر کے ایک شخص کو ہلاک کر دیا۔ اس پر باقی جلدی سے کنٹینر میں سوار ہونے لگے۔ مارا جانے والا نوجوان تھا۔ رہ جانے والے گروہ سے ایک بوڑھی عورت دوڑتی ہوئی آئی اور اس سے لپٹ کر دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ وہ اس نوجوان کی ماں تھی۔ جب جانے والے سب کنٹینر میں سوار ہو گئے اور اس کا دروازہ بند کر دیا گیا تو میجر ریان نے اس بوڑھی عورت کو بھی سر میں گولی ماردی اور پھر سیکیورٹی اہلکاروں کو حکم دیا۔

''ان سب کو بھی ٹھکانے لگا دو۔''

انہوں نے بیک وقت فائر کھول دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سو کے قریب لوگ خاک و خون میں لتھڑ گئے۔ جب سب گر گئے تو چند اہلکار دیکھنے لگے کہ کوئی بچا تو نہیں ہے اور پھر جس پر ذرا سا شبہ ہوتا کہ اس میں کچھ جان باقی ہے، وہ اکے سر میں گولی مار دیتے تھے۔ میٹ ایک طرف کھڑا تھا اور اس کی طبیعت یہ منظر دیکھ کر خراب ہو رہی تھی۔ اسے خود پر حیرت ہونے لگی کہ وہ خود بے شمار افراد کو مار چکا تھا۔ ان میں سے انیس کو وہ خود اپنے ہاتھ سے اذیتیں دے کر ہلاک کر چکا تھا اور اب قتل ہوتے دیکھ کر اس کی طبیعت خراب ہونے لگتی تھی۔

''دوست! آج تم نے کوئی شکار نہیں کیا۔'' اس کے ایک ساتھی نے مسرور لہجے میں پوچھا۔ ''میں نے آج سات افراد کو مارا ہے۔''

''میں اس قتل و غارت گری کا مقصد سمجھنے سے قاصر ہوں۔'' اس نے کہا تو اس کے ساتھی نے اسے حیرت سے دیکھا۔

''مقصد... ہمارا کام انہیں ختم کرنا ہے۔ یہ ہمارے دشمن ہیں۔''

''یہ عورتیں، بوڑھے اور بچے؟'' میٹ نے لاشوں کی طرف اشارہ کیا۔

''دوست! یہ عورتیں، بوڑھے اور بچے نہیں ہیں۔ یہ عراقی ہیں اور ہر عراقی ہمارا دشمن ہے۔ ہم اپنے دشمنوں کو ختم کر رہے ہیں۔ یہ دیکھے بغیر کہ وہ کون ہیں۔''

میٹ نے خود کو یاد دلایا کہ وہ بھی تو لطف حاصل کرنے کے لیے قتل کرتا رہا ہے مگر اس وضاحت کو اس کے دل نے قبول نہیں کیا تھا۔ وہ ہمیشہ ایسے لوگوں کو مارتا تھا جو خود بھی کسی نہ کسی طرح مجرم ہوتے تھے اور اسے ان کے مذہب سے کوئی سروکار نہیں ہوتا تھا۔ اسے مذہب کے نام پر کی جانے والے اس اندھا دھند اور بے پناہ قتل عام سے وحشت ہو رہی تھی۔ پھر اسے حیرت تھی کہ ان میں سے کچھ لوگوں کو زندہ کیوں پکڑا گیا تھا؟ مارنا تھا تو سب کو مار دیتے۔ یہی سوال اس نے اپنے افسر سے کیا۔ اس نے جواب دیا۔

''یہ ہمارے کام آئیں گے۔''

''وہ کس طرح؟''

''ابھی ہم انہیں جہاں لے جائیں گے وہاں تم خود دیکھ لینا۔''

اپنا کام ختم کر کے انہوں نے حسبِ معمول لاشیں ایک ٹرک میں ڈال کر ان کو کسی اور مقام کے لیے روانہ کر دیا۔ یہ عراق میں قابض فوج کی تکنیک تھی۔ وہ کسی ایک مقام پر شہری آبادی کا قتل عام کر کے ان کی لاشیں کسی دوسرے علاقے میں بھیج دیتے تھے اور مقامی عراقی حکام کو یہ کہہ کر لاشیں دے دی جاتی تھیں کہ یہ چھاپا ماروں کا نشانہ بن گئے ہیں۔ اس کی تصدیق کوئی کسی طرح بھی نہیں کر سکتا تھا۔ عراقی اسپتالوں کے مردہ خانے ایسی لاشوں سے بھرے ہوئے تھے اور ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ انہیں فرداً فرداً دفن کرنا ممکن بھی نہیں تھا۔ اس لیے لاشوں کو اجتماعی طور پر دفنا دیا جاتا تھا۔ میٹ حیران تھا کہ کیا امریکی اس ملک کی ساری آبادی کو ختم کرنے آئے تھے؟ آخر اس بے پناہ قتل عام کا اور کیا مقصد ہو سکتا تھا؟

وہ وہاں سے چلے اور اپنے اڈے پر آنے کے بجائے ایک اور کیمپ میں پہنچے۔ وہاں پر میٹ نے دیکھا کہ قیدی بنا کر لائے جانے والے عراقیوں کو بے ہوش حالت میں نکالا جا رہا تھا۔ نہ جانے ان کو کس چیز سے بے ہوش کیا گیا تھا؟ میٹ نے میجر ریان سے پوچھا تو اس نے بتایا۔

''انہیں سفر کے دوران گیس کی مدد سے بے ہوش کیا گیا ہے تاکہ یہ یہاں مزاحمت نہ کر سکیں۔''

''مزاحمت... وہ کس لیے؟''

کمانڈر معنی خیز انداز میں ہنسا۔ ''کوئی تمہارا دل گردہ یا آنکھیں نکالنا چاہے تو کیا تم آسانی سے اس کی اجازت دے دو گے؟''

''یہاں ان لوگوں کے اعضا نکالے جائیں گے؟'' میٹ دم بہ خود رہ گیا۔

''ہاں، انہوں نے مرنا تو ہے... تو کیوں نا پہلے یہ ہمارے کام آ جائیں۔'' اس نے کہا۔

''اور اس کے بعد؟''

''کچرے کا کیا کیا جاتا ہے؟'' میجر ریان نے اس سے سوال کیا۔

میٹ کے ذہن میں خیال آیا کہ یہ انسان ہیں یا درندے... جو اپنے جیسے انسانوں کے ساتھ یہ سلوک کرنے جا رہے ہیں۔

اس نے دیکھا کہ بے ہوش افراد کو نکال کر زمین پر ایک قطار میں ڈال دیا گیا تھا اور ڈاکٹرز ان کا معائنہ کر رہے تھے۔ پھر جس کی طرف ڈاکٹر اشارہ کرتا اسے اسٹریچر پر ڈال کر اندر لے جایا جاتا تھا۔ سو میں سے کوئی نوّے افراد کو اندر لے جایا گیا تھا اور باقی وہیں پڑے تھے۔ میٹ نے دیکھا کہ

میجر ریان ڈاکٹروں سے بات کر رہا ہے۔ شاید ان لوگوں کے عوض رقم کی بات ہو رہی تھی۔ اس دوران میں اندر سے لاشیں لا کر اسی ٹرک میں ڈالی جانے لگیں۔ جس میں بستی کے لوگوں کی لاشیں تھیں۔ یہ بے چارے وہ لوگ تھے جن کے زندہ جسموں سے اعضا نکال کر انہیں مار دیا گیا تھا اور اب ان کی لاشیں بھی ٹھکانے لگائی جا رہی تھیں۔ میٹ کا سر گھوم رہا تھا۔ اس نے کمانڈر سے کہا۔

''ان بچ جانے والوں کا کیا کیا جائے گا۔''

''ابھی دیکھو۔'' اس نے کہا۔

سیکیورٹی اہلکاروں نے بچ جانے والے افراد کے سروں میں ایک ایک گولی مار کر بے ہوشی کی حالت میں ہی ہلاک کر دیا اور ان کی لاشیں بھی لاشوں والے ٹرک میں ڈال دی گئیں۔ اس کے بعد وہ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ میٹ پاگل ہو رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ان سب کو ہلاک کر دے۔ وہ تو خود کو درندہ سمجھتا آیا تھا لیکن یہ تو اس سے بھی کہیں آگے کی چیز تھے۔ وہ اپنی تسکین کی خاطر لوگوں کو قتل کرتا تھا لیکن ان کو بیچتا تو نہیں تھا۔ آج پہلی بار اسے اپنے امریکی اور درندہ ہونے پر شرمندگی ہو رہی تھی۔

وہ واپس آئے تو اسے شراب کے ساتھ نیند کی گولیاں بھی استعمال کرنا پڑی تھیں۔ نیند کی گولیاں اس کے وہ ساتھی بھی باقاعدگی سے استعمال کرتے تھے جو لوگوں کو قتل کر کے ان کی لاشوں پر رقص کرتے تھے۔ میٹ نے ایسے ہی ایک ساتھی سے گولیاں لیں، تب کہیں جا کر اسے نیند آئی تھی۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ یہ لوگ اپنے آدمیوں کو بے پناہ سہولیات اور تنخواہیں کیوں دیتے تھے۔ کوئی بھی شخص اس قسم کا قتل عام برداشت نہیں کر سکتا۔ فوج کی بات اور ہوتی ہے۔ اس کی تربیت اس طرح کی جاتی ہے کہ وہ انسانی جذبات سے بالاتر ہو کر احکامات کی تکمیل کرے لیکن وہ سب عام لوگ تھے اور ان کے اعصاب یہ قتل و غارت گری زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

یہ لوگ امریکی حکومت سے بھاری معاوضہ لے رہے تھے۔ ساتھ ہی دولت کمانے کے لیے انسانوں کے اعضا نکال کر فروخت کرنے کا مکروہ کاروبار کر رہے تھے۔ ان کی ہوس کی کوئی حد نہیں تھی۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے ساتھی اس سمیت رفتہ رفتہ پاگل پن کی طرف جا رہے تھے۔ وہ بے تحاشا شراب پینے لگے تھے اور ساتھ ہی منشیات بھی استعمال کرتے تھے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ انہیں منشیات کے استعمال سے روکا بھی نہیں جاتا تھا جبکہ امریکی فوجیوں کے لیے منشیات کا استعمال سنگین جرم تھا اور ان میں سے کوئی اس میں ملوث پایا جاتا تو اس کا فوری طور پر ٹرائل ہوتا تھا۔

عراق آنے کے ساتویں مہینے میں میٹ اور اس کے گروپ کو بغداد کے نواح میں ایک امریکی بیس پر تعینات کر دیا گیا تھا کیونکہ یہاں پر حریت پسندوں نے ایک مہینا پہلے ہی ایک خودکش ٹرک حملے میں ایک کانوائے کو اڑا دیا تھا۔ سنا یہ تھا کہ اس حملے میں دو درجن امریکی فوجی مارے گئے تھے لیکن اس واقعے کو دبا دیا گیا تھا۔ پھر جب ایک امریکی اخبار نے اسے رپورٹ کیا تو صرف دو فوجیوں کی ہلاکت کا اعتراف کیا گیا تھا۔ اصل میں عراق اور افغانستان میں لڑنے والی امریکن فوج کا ایک بہت بڑا حصہ ان افراد پر مشتمل ہے جن کا کوئی والی وارث نہیں ہے اور جو اکیلے زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی اموات کو ظاہر نہیں کیا جاتا اور انہیں مرنے کے بعد خاموشی سے امریکا لا کر کسی نامعلوم قبرستان میں دفنا دیا جاتا ہے۔ صرف ان لوگوں کی ہلاکت کا سرکاری سطح پر اعتراف کیا جاتا ہے جن کے والی وارث ہوتے ہیں اور ان کو جواب دینا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرکاری طور پر جن امریکن سپاہیوں کی ہلاکت کا اعتراف کیا جاتا ہے، ان میں سے ننانوے فیصد کا خاندان ہوتا ہے اور ان کی دھوم دھام سے تدفین کی جاتی ہے۔ ایک جائزے کے مطابق سترفی صد امریکی فوجیوں کا کوئی والی وارث نہیں ہوتا اور وہ مر جائیں تو ان کی لاش کا دعوے دار بھی نہیں ملتا۔ اس لیے ایسے فوجیوں کی ہلاکت چھپا لی جاتی ہے۔ یہ سارے حقائق رفتہ رفتہ میٹ کے علم میں آ رہے تھے۔

اس کے باوجود مسلسل ہلاکتوں کی وجہ سے امریکی حکومت پر دباؤ بڑھ رہا تھا۔ اس کو کم کرنے کے لیے انہوں نے یہ ترکیب نکالی کہ امریکا سے جرائم پیشہ افراد سیکیورٹی پرسنل کے نام پر بھرتی کر کے انہیں عراق لایا گیا اور ان سے یہاں قتل و غارت گری کا کام لیا جا رہا تھا۔ ان کی حفاظت کا بھی کوئی بندوبست نہیں تھا اور اگر ان میں سے کوئی مارا جاتا تھا تو امریکی حکومت اس کی جواب دہ نہیں تھی کیونکہ یہ امریکی فوج کا حصہ نہیں تھے۔ ان لاوارث جرائم پیشہ لوگوں کا کوئی پوچھنے والا بھی نہیں ہوتا تھا اس لیے ان کی ہلاکت کی خبریں بھی منظر عام پر نہیں آتی تھیں۔ حالانکہ امریکی فوجیوں سے زیادہ یہ لوگ عراق میں مارے جا رہے تھے۔ یہ سارے حقائق رفتہ رفتہ میٹ کے علم میں آ رہے تھے۔

میٹ کو جہاں تعینات کیا گیا تھا، یہ فوجی اڈا شہری آبادی سے کچھ فاصلے پر تھا۔ اور اڈے سے ذرا دور سے ایک

سڑک گزرتی تھی۔ ظاہر ہے، اس سے شہری گزرنے پر مجبور تھے لیکن امریکن میرین نے اس سڑک پر ایک چیک پوسٹ قائم کرلی تھی اور وہ وہاں سے گزرنے والے لوگوں کو روک کر ان کی تلاشی لیتے تھے۔ جب سے ٹرک بم کا دھماکا ہوا تھا، امریکن میرین دیوانے ہو گئے تھے اور انہوں نے ذرا سے شبے پر وہاں سے گزرنے والی گاڑیوں پر فائرنگ معمول بنالی تھی۔ ان واقعات میں عام شہریوں کی ہلاکت ہوتی تھی مگر کٹھ پتلی عراقی حکومت اپنے دارالحکومت میں امریکیوں کو اس درندگی سے روکنے میں ناکام رہی تھی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شہروں سے دور امریکی، عراقی عوام کے ساتھ کیا نہیں کررہے ہوں گے۔

میٹ کی ڈیوٹی چیک پوسٹ پر ہوتی تھی۔ ایک دن وہاں سے دو نوعمر لڑکیاں اسکول کے یونیفارم پہنے گزر رہی تھیں۔ امریکی فوجیوں نے انہیں تلاشی کے نام پر جنسی طور پر ہراساں کیا تو وہ سہم کر رونے لگیں۔ میٹ نے ان سے کہا۔ ''انہیں تنگ مت کرو... ان کو جانے دو۔''

''کیوں تمہیں کیوں پریشانی ہو رہی ہے؟'' ایک میرین نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

''یہ معصوم بچیاں ہیں۔''

''یہ صرف ہماری دشمن ہیں۔'' میرین نے بھی وہی بات کی تھی جو میٹ اپنے ایک ساتھی کے منہ سے سن چکا تھا۔ میٹ نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''دشمن وہ ہوتا ہے جس سے انسان لڑ سکے۔''

''لگتا ہے تمہیں لڑنے کا بہت شوق ہے۔'' ایک میرین سارجنٹ نے استہزائیہ انداز میں کہا اور اپنے ساتھیوں سے بولا۔ ''انہیں اندر لے چلو، مجھے یہ مشکوک لگ رہی ہیں۔''

میٹ اچھی طرح جانتا تھا کہ ان بچیوں کو اندر لے جا کر یہ درندے ان کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ اس نے سختی سے کہا۔ ''ان کو لے جانے کی ضرورت نہیں ہے انہیں جانے دو۔''

''کیا ضروری ہے اور کیا نہیں، یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔'' سارجنٹ نے سرد لہجے میں کہا۔ ''لے جاؤ ان کو۔''

دو میرین لڑکیوں کو کھینچ کر اندر لے جانے لگے تو وہ تڑپنے اور مچلنے لگیں مگر وہ بے بس تھیں۔ کچھ دیر بعد اندر سے ان کی گھٹی گھٹی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ میٹ کو لگا جیسے اس کے سر میں خون جمع ہو رہا ہے۔ اسے یتیم خانے کا وہ کمرا یاد آگیا جہاں معصوم بچوں کو ایسی ہی اذیت سے گزرنا پڑتا تھا اور وہ اسی طرح گھٹی گھٹی آواز میں چیختے تھے۔ اسے لگا کہ یتیم خانے کے وہ مکروہ کردار یہاں بھی آگئے ہیں۔ سارجنٹ اس کی حالت پر ہنس رہا تھا اور دوسرے میرین بے تابی سے اپنی باری کا انتظار کررہے تھے۔ میٹ نے سارجنٹ کو دیکھا اور ہنسا۔

''میں تو سوچتا تھا کہ میں ہی سب سے بڑا درندہ ہوں۔''

سارجنٹ اس کی بات سمجھا نہیں۔ اس نے کہا۔ ''فکر مت کرو تمہیں بھی اپنی درندگی دکھانے کا پورا موقع ملے گا۔''

''لیکن تم مجھ سے بھی بڑے درندے ہو۔'' میٹ بہ دستور ہنستا رہا اور اسی طرح ہنستے ہنستے اس نے سارجنٹ کو گولی ماردی۔ اس کے بعد اپنے سامنے موجود باقی دو میرین کو بھی شوٹ کردیا۔ ابھی فائرنگ کا شور تھما بھی نہیں تھا کہ وہ رائفل بہ دست چیک پوسٹ کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ اندر موجود چار میرین ان معصوم بچیوں کو پامال کرنے میں مگن تھے۔ ان کے خیال میں فائرنگ معمول کی بات تھی اور عراقیوں پر کی گئی تھی۔ میٹ نے اپنی رائفل کا باقی میگزین ان لوگوں پر خالی کر دیا۔ اس نے لڑکیوں کو بچانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس نے انہیں جس حال میں دیکھا، اس کے خیال میں ان کا مرجانا ہی بہتر تھا۔ اگر وہ زندہ رہتیں تو کبھی اس بے رحم دن کو فراموش نہیں کرسکتی تھیں۔ اس اذیت سے بہتر تھا کہ وہ ایک بار ہی مر جاتیں۔ وہ ان چاروں کے ساتھ ہی ختم ہوگئی تھیں۔

باہر میرین بھاگ دوڑ کررہے تھے اور چلا چلا کر ایک دوسرے کو پکار رہے تھے۔ ان میں سے کئی نے میٹ کو اپنے ہی ساتھیوں پر فائرنگ کرتے دیکھ لیا تھا۔ جب اندر سے بھی فائرنگ کی آواز آئی تو انہوں نے چیک پوسٹ کے چاروں طرف مورچے سنبھال لیے۔ نہتے لوگوں پر آگ برسانے والے ان بزدلوں میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اپنے ہی ایک مسلح ساتھی کا سامنا کرتے۔ وہ اس کے باہر آنے کا انتظار کررہے تھے۔ اندر موجود میٹ ان کی کیفیت پر ہنس رہا تھا۔ جب وہ اسے چلا کر باہر آنے کو کہتے تھے تو وہ جواب میں قہقہہ مارتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اسے باہر نکلتے ہی شوٹ کردیں گے اور وہ ان کے ہاتھوں نہیں مرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی رائفل مین نیا میگزین لوڈ کیا اور چیخ کر بولا۔

''میں درندہ ہوں لیکن تم مجھ سے بڑے درندے ہو... اور میں تمہارے ہاتھوں .... نہیں مرنا چاہتا۔''

یہ کہہ کر اس نے رائفل کی نال اپنی ٹھوڑی کے نیچے رکھی اور ٹریگر دبادیا!

شکیل سریس

اختتامِ سفر

فنا و بقا ایک لامتناہی عمل ہے۔ زندگی کا ذکرِ خاص ہو تو موت سامنے نہ ہوتے ہوئے بھی کہیں بہت دور کسی مخفی گوشے سے ہم پہ سایہ فگن رہتی ہے ..... خطرناک اور مجرمانہ گروہوں سے وابستہ افراد کی زندگی میں سب کچھ ہوتا ہے ..... مگر سکون و آشتی کا ایک لمحہ انہیں میسر نہیں ہوتا ..... موت ایک ہیبت کی صورت ان کے حواسوں پر چھائی رہتی ..... اور ہمہ وقت تعاقب میں رہتی ہے۔

موت کے سفر پر گامزن... زندگی کی تلاش میں سرگرداں ایک عورت کی جدوجہد

نیویارک ائرپورٹ سے طیارے کو پرواز کرتے ہوئے جب تین گھنٹے گزر گئے تو جونی قوئل اپنی نشست سے اٹھا اور درمیانی راستے پر چلتا ہوا واٹر کولر تک پہنچ گیا۔ اس نے کاغذ کا ایک گلاس اٹھا کر پانی بھرا اور دو گھونٹ لینے کے بعد پیچھے بیٹھے ہوئے لوگوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ وہ سوچنے لگا کہ اتنے مسافروں میں سے اسے کس کو ہلاک کرنا ہے؟

سب سے اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے فربہ جسم والے مسافر کو جس نے پھول دار قمیص پہن رکھی تھی اور جو اپنے کیمرے کا لینس صاف کررہا تھا... یا پھر اس سیاہ بالوں والی لڑکی کو جس نے قرمزی رنگ کی مصنوعی پلکیں لگا رکھی تھیں یا ساٹھ دوسرے مسافر جو...

اس نے آخری گھونٹ لے کر گلاس خالی کیا، اسے ایک ذرا اور بھر کر پیا پھر اسے اپنی مضبوط انگلیوں سے توڑ مروڑ کر کچرے کے ڈبے میں ڈال دیا۔ اس نے قدم بڑھائے اور واش روم میں داخل ہوگیا۔ جس شخص سے اسے رابطہ قائم کرنا تھا، وہ ابھی تک وہاں نہیں پہنچا تھا جہاں وہ پانی پینے کے بہانے کچھ دیر گزار رہا تھا۔

واش روم میں آنے کا بہرحال ایک جواز ہونا چاہیے تھا اس لیے اس نے اپنے شانے سے جھولنے والے چھوٹے سے بیگ میں سے الیکٹریکل شیور نکالا اور اس کے پلگ کو ساکٹ میں داخل کرنے کے بعد بٹن دبا کر اسے آن کیا۔ شیور ایک ہلکی سی گونج کے بعد چل پڑا۔ جونی نے اسے اپنے دائیں رخسار پر رکھا اور مختصر اور مہین بالوں کو ختم کرنے لگا۔

وہ وضع قطع کے لحاظ سے کوئی بزنس مین نظر آتا تھا۔ بھورے رنگ کا سوٹ، میچ کرتی ہوئی ٹائی اور چمک دار جوتے! جسمانی اعتبار سے وہ طاقتور تھا۔ اس کے چہرے پر جو چوٹوں کے نشانات تھے، وہ کالج کے زمانے میں فٹ بال کھیلتے ہوئے لگے تھے۔ اس کی ناک پتلی اور چونچ کی طرح نوک دار تھی۔

اچانک دروازہ کھلا تو آئینے میں ایک شخص کا سراپا نظر آیا۔ اس کا سر بالوں سے عاری تھا اور اس نے ایک شکن آلود سوٹ پہن رکھا تھا۔ ''جونی قوئل؟'' اس نے پوچھا۔

جونی نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔

''میرا خیال ہے کہ تم اپنی شناخت کرادو تو مناسب ہو

گا۔'' بھاری جسم والے شخص نے کہا جس کا سر روشنی میں چمک رہا تھا۔

''میں نے کولر سے دو مرتبہ پانی بھر کر پیا تھا، یہ ایک اشارہ تھا، حالانکہ مجھے سادہ پانی پینا قطعی پسند نہیں ہے۔'' جونی نے کہا۔

''تم یقیناً جونی تونکل ہو، اس لیے کہ مجھے بتایا گیا تھا تم بگڑے ہوئے لہجے میں گفتگو کرنے کے عادی ہو۔'' اس نے مسکرا کے کہا۔ ''ٹھیک ہے، وہ عورت جسے ہلاک کرنا ہے وہ دوسری قطار میں بائیں جانب بیٹھی ہے اور اس نے بھورے اونی کپڑے پہن رکھے ہیں اور اس کا بلاؤز سفید ہے۔ فی الحال تمہیں اس پر نگاہ رکھنی ہے اور اس کے شوہر ہاورڈ کو قتل کرنا ہے۔''

دفعتاً شیور پر اس کی گرفت سخت ہوگئی۔ ''وہ کیا کرتی ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''اس کے شوہر کی موت سے مسئلہ حل ہو جائے گا اور اگر حل نہیں ہوگا تو پھر اس کی بیوی کو بھی ٹھکانے لگانا پڑے گا۔'' بھاری جسم والے نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے کہا۔

''اوہ! کیا وہ اس کے برابر والی نشست پر بیٹھا ہے؟''

''وہ اس وقت جہنم میں بیٹھا ہوا ہے۔'' گنجے نے دانت کچکچا کر کہا۔ ''تین سال پہلے ہم مونٹانا میں جو آپریشن کر رہے تھے، وہ اس میں شامل تھا مگر بعد میں وہ اچانک علیحدہ ہوگیا۔ وہ ہماری تنظیم کے کارکنوں سے واقف ہے اور اسے ہمارے سارے رازوں کا پتا ہے۔ وہ روئے زمین سے اس طرح غائب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ! ہم اسے تلاش کرتے رہے اور خاص طور پر ہم اس کی بیوی کی نگرانی کر رہے تھے۔ گزشتہ ہفتے اس کی بیوی نے ٹرینی ڈاڈ کا سفری ٹکٹ خریدا ہے۔''

''ٹرینی ڈاڈ میں اس کی عارضی رہائش ہوگی۔ وہ وسطی یا جنوبی امریکا میں ہوگا۔'' جونی نے قیاس آرائی کی۔

''وہ اتنی دور اس سے رابطہ قائم کیے بغیر نہیں جا سکتی۔'' گنجے نے کہا۔ ''ٹرینی ڈاڈ کا سفری ٹکٹ خریدنے کے لیے اس کی بیوی کو اپنی کار فروخت کرنا پڑی، یہ بات بہرحال ہمارے نزدیک اہم ہے۔ وہ یقیناً اسی سے ملنے جا رہی ہے۔''

''کیا اس کا شوہر تنظیم کے لیے خطرناک ہے؟''

''ہاں۔ وہ ایک زہریلا ناگ ہے۔ وہ تنظیم کے بیشتر کارکنوں سے واقف ہے۔''

''اور اس کی بیوی؟ اس شخص کو اتنی عقل نہیں ہے کہ وہ اپنی بیوی کو ان معاملات سے علیحدہ رکھتا؟'' جونی نے تبصرہ کیا۔

''ایسا ہی معلوم ہوتا ہے لیکن اپنی بیوی کو بلانے کا مقصد یہ ہے... کہ وہ اس پر اعتماد کرتا ہے اور اسے کوئی خاص بات بتانے والا ہے، کوئی اہم پیغام دینے والا ہے۔''

''ان کے نام کیا ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاورڈ اور نورما میکلین۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے نام تبدیل کر لیے ہیں۔ میں تمہیں ایک تصویر دیتا ہوں۔'' اس نے کہا پھر کوٹ کی اندرونی جیب سے اسٹوڈیو کی کھینچی ایک تصویر نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔

اس شخص، ہاورڈ کے بال سیاہ اور گھنگریالے تھے۔ اس کی آنکھوں سے ذہانت اور فطانت جھلکتی تھی۔ اس کی بیوی مناسب خدوخال کی تھی اور اس کا جسم گداز معلوم ہوتا تھا۔

''تم نے کہا تھا کہ اس عورت کی تین سال سے نگرانی کر رہے ہو؟''

''ہاں۔''

''اس عورت کا حلقۂ احباب تو کافی وسیع ہوگا؟''

''یہ ہر ایرے غیرے کی طرف مسکرا کر نہیں دیکھتی۔'' وہ بولا۔

جونی نے اپنے شیور کا پلگ ساکٹ سے نکالا اور اسے بیگ میں رکھ لیا۔ اس کا چہرہ پھر سے چمکنے لگا تھا۔ ''اور کوئی خاص بات؟'' اس نے کہا۔

''ٹرینی ڈاڈ میں تمہارے رابطے کا آدمی کینٹینو ہوگا۔ ممکن ہے وہ کسی اور کو تمہاری طرف بھیجے۔'' اس نے کہا۔ ''تاکہ وہ تمہاری مدد کر سکے۔''

''ہر شخص جانتا ہے کہ میں تنہا کام کرنے کا عادی ہوں۔'' جونی نے ناک سکیڑ کر کہا۔ ''کیا مجھے اس شخص کینٹینو کے احکامات پر عمل کرنا پڑے گا؟''

''ہمیں یہی ہدایت دی گئی ہے۔'' اس شخص نے واش روم کے دروازے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ''حقیقت یہ ہے کہ تنظیم کے بڑوں کو تم پر بھروسا نہیں ہے۔''

وہ دروازہ کھول کر نکل گیا تو جونی نے اپنے جسم میں ایک سرد سی لہر دوڑتی محسوس کی۔ وہ گزشتہ دو سال سے زیورخ کے ایک بینک میں خفیہ رقوم جمع کرا رہا تھا تاکہ جب وہ تنظیم کو چھوڑ دے تو سکون سے زندہ رہ سکے۔ جبکہ تنظیم ایسے کارکنوں کو پسند نہیں کرتی تھی۔

وہ دروازہ کھول کر باہر آگیا اور طیارے کے پچھلے حصے کی طرف چلا گیا جہاں میگزین اور کتابوں کا اسٹال تھا۔ اس نے ایک میگزین اٹھا لیا اور اپنی نشست کی طرف واپس آگیا۔ نورما میکلین اپنی نشست پر ٹانگیں جوڑے بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیاں باہم پھنسی ہوئی تھیں اور ہاتھ گود میں رکھے تھے۔

...اس پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالتا ہوا چلا گیا۔

☆☆☆

طیارے کو برمودا پہنچ کر اوور ہالنگ کے لیے پچیس ... تک رکنا پڑا۔ مسافروں کو اس اثنا میں آزادی تھی کہ وہ ... پورٹ لاؤنج سے ملحق ریستوران میں بیٹھ سکیں یا کمروں ... آرام کر سکیں۔ نورما ایک کمرے میں چلی گئی تو جونی اس ... دروازے کے قریب کھڑا ہو کر سگریٹ پینے لگا۔

نورما کو معلوم تھا کہ اس کا شوہر ٹرینی ڈاڈ یا اس سے ... بھی کسی مقام پر آ کر اس سے ملاقات کر سکتا ہے۔ اس ... وہ عورتوں کے کمرے میں بھی احتیاط سے دائیں بائیں ... طریں دوڑاتی رہی مگر ابھی تک وہ کہیں نظر نہیں آیا تھا۔

جب لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کیا گیا کہ مسافر طیارے میں ... پس آ جائیں تو نورما صوفے پر سے اٹھی اور نپے تلے قدموں ... سے چل پڑی۔ وہ اس دوران گرد و پیش کا جائزہ لیتی رہی تھی۔ ... جونی فاصلے سے اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ جب وہ طیارے کا ... زینہ طے کر رہی تھی تو ہوا سے اس کا اسکرٹ اڑنے لگا۔ اس ... وقت جونی کو اس کی سڈول رانیں نظر آئیں۔ اس نے دل ہی ... دل میں اعتراف کیا کہ نورما ایک بھرپور عورت ہے!

وہ ایک ائرہوسٹس کے نزدیک کھڑی ہو کر اس سے کچھ پوچھ رہی تھی۔ جونی جب ان کے قریب سے گزرا تو اس نے نورما کو اس گنجے آدمی کے بارے میں استفسار کرتے سنا جو ... اس کے رابطے میں تھا۔ جونی کے کان کھڑے ہوگئے۔

''وہ... مسٹر سنتارا؟ وہ تو برمودا میں ہی اتر گئے۔''

''اوہ، شکریہ۔'' نورما نے اطمینان کا اظہار کیا۔

جونی اپنی نشست پر پہنچ کر کسی بھاری بورے کی طرح ... گیا۔ نورما کے اس ایک سوال سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی معمولی عورت نہیں ہے اور اپنے گرد و پیش کا خیال رکھتی ہے۔ ... اس کا تعاقب کرنے میں اس وقت دشواری پیش آئی جب طیارہ سان جوآن پر اترا اور وہاں مسافروں کو پہلے کی طرح تھوڑی دیر آرام کرنے کا موقع ملا۔ وہ عورتوں، مردوں ... بچوں کے درمیان سے راستہ بناتی ہوئی لاؤنج کی طرف ... گئی تو جونی اس کے پیچھے تھا۔ وہ چونکہ اس کی نگاہ کا مرکز ... لیے جونی لوگوں سے ٹکرا رہا تھا۔ اس نے اپنے پیچھے ... ناچینیں سی تھیں، بہت سے لوگ بڑبڑا رہے تھے۔

واپس اسے طیارے میں ہی آنا تھا، اس لیے جونی ... بورڈنگ لائن میں کھڑا دیکھ کر سب کو نظرانداز کرتا ہوا ... بڑھا اور لوگوں کو دھکا دے کر طیارے میں سوار ہوا اور ... نشست پر جا کر بیٹھ گیا۔ وہ بے چینی اور اضطراب محسوس ... رہا تھا۔

ہر شمارہ خاص شمارہ

سچی کہانیوں، آپ بیتیوں، جگ بیتیوں کا بے مثال مجموعہ

ماہنامہ سرگزشت

شمارہ نومبر 2009 کی ایک جھلک

صفات ماہر

ایک معروف شاعر کی زندگی کے نشیب و فراز

جنگ عین جالوت

اس جنگ کا احوال جس کی فتح نے مسلمانوں کو مٹنے سے بچالیا

بل گیٹس

کمپیوٹر کی دنیا میں انقلاب لانے والے کی سوانح حیات

کمال با کمال

معروف اداکار کا تذکرہ، خراج تحسین

مثبت قدم

آنکھوں میں آنسو بھر دینے والی کتھا

اس کے علاوہ

16 سے زائد دلچسپ و معلوماتی قصے، فلمی و ادبی داستانیں، انعامی مقابلہ

نیا شمارہ ہر بک اسٹال پر موجود ہے

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 5895313 فیکس: 5802551

دو منٹ بعد اس نے ایک سایہ اپنے قریب رکتے دیکھا پھر ایک دل کش آواز آئی۔ ''تم اس طرح کے کام کیسے کر لیتے ہو؟''

''کون سے کام؟''

''بورڈنگ لائن میں تم میرے پیچھے تھے اور اب اپنی نشست پر موجود ہو۔'' وہ اس کی طرف جھک کر کہہ رہی تھی۔ جونی قدرت کی صناعی پر تحیر زدہ تھا۔ اتنے حسین نشیب و فراز اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

''میں جب لائن کے قریب سے گزر رہا تھا تو تم آئینے کے سامنے کھڑیں... چہرے پر پاؤڈر لگا رہی تھیں۔ غالباً تم نے مجھے آئینے میں دیکھا اور یہ تاثر لیا کہ میں تمہارے پیچھے ہوں۔'' اس نے کہا اور کوشش کر کے مسکرایا۔

نورما کی آنکھوں میں تشکیک کے سائے لہرا رہے تھے۔ جونی کو معلوم تھا کہ اگر نورما اس کی طرف سے مشکوک ہو گئی تو پھر اس کا منصوبہ ناکام ہو جائے گا۔ ''میں ایک معزز شخص ہوں... جونی توئل۔'' اس نے کوٹ کی اوپری جیب سے ایک کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''مینجمنٹ کاؤنسلر، شکاگو۔''

نورما نے کارڈ اس کے ہاتھ سے لیے بغیر اس پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔

جونی نے تنظیم سے متعلق ایسی بہت سی کمپنیوں کے کارڈ اپنی جیب میں رکھے ہوئے تھے جنہیں وہ ضرورت پڑنے پر استعمال کیا کرتا تھا۔ ''میں تنہا سفر کر رہا ہوں۔ اگر تم ٹرینی ڈاڈ میں زیادہ مصروف نہیں ہو تو...''

''نہیں، شکریہ مسٹر جونی!'' وہ مسکرا کر سیدھی ہو گئی۔ ''اگر مجھے مینجمنٹ کے سلسلے میں کوئی دشواری ہوئی تو میں تم سے رابطہ قائم کروں گی۔''

وہ درمیانی راستہ طے کر کے اپنی نشست کی طرف چلی گئی۔ اس بار جونی نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس کی اصلیت ظاہر ہو گئی تو تنظیم اس کی گردن میں پھندا ڈال دے گی۔

بار باڈوس میں اس نے کینٹینو کو تار بھیجا کہ وہ پیار کو ائرپورٹ پر اپنا آدمی بھیج دے۔ پرواز کے آخری لمحوں تک وہ میگزین میں اپنا منہ چھپائے رہا اور اس نے نورما کی طرف دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔

ٹرینی ڈاڈ میں جب وہ ائرپورٹ لاؤنج میں کھڑا اِدھر اُدھر نظریں دوڑا رہا تھا تو پیچھے سے آواز آئی۔ ''پورٹر چاہیے جناب؟ کیا میں آپ کا بیگ اٹھالوں؟'' اس سے پہلے کہ جونی مثبت یا منفی کوئی جواب دیتا، اسی آواز نے دھیمے سے کہا۔ ''مجھے کینٹینو نے بھیجا ہے۔''

جونی آواز کی طرف مڑا تو اس نے ایک مقامی نوجوان کو کھڑے پایا۔ اس نے جو قمیص پہنی ہوئی تھی اس پر اژدہے کی شکل بنی تھی۔ ٹرینی ڈاڈ کے لوگ کافی زندہ دل تھے ایسے ہی کپڑے پہنتے تھے۔

''تم نے اس عورت کو دیکھا جو بھورے اسکرٹ میں ہے؟'' جونی نے آہستہ سے پوچھا۔

''میں اسے پہلے ہی دیکھ چکا ہوں۔'' اس نے اپنے سفید دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تمہیں کچھ چاہیے تو سڑک پار سلوپ ہاؤس میں چلے جانا۔''

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ کاؤنٹر کے قریب نورما اپنا بیگ اور سوٹ کیس ایک ریڈ انڈین پورٹر کو تھمانے والی تھی کہ اس نوجوان نے اسے کہنی سے دھکیل کر ایک طرف کیا اور سوٹ کیس کا ہینڈل تھام لیا۔ پھر وہ نورما کی طرف دیکھ کر فخریہ مسکرایا اور دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ نورما ایک لمحے کے لیے ہچکچائی پھر اس کے پیچھے چلنے لگی۔

جونی نے اپنا سامان کسٹم پر چیک کرایا اور اپنا سوٹ کیس تھامے سڑک پار کر کے سلوپ ہاؤس میں چلا گیا۔ وہ ایک چھوٹا سا بار تھا۔ جونی نے اپنے لیے لائم اسکواش منگوا لیا۔ اس نے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے کر گلاس ختم کیا اور ...ایک گلاس اور منگوا لیا۔

تھوڑی دیر بعد کینٹینو کا آدمی وہاں آ گیا۔ اس نے بار کے قریب آ کر دھیمے لہجے میں کہا۔ ''وہ ائرپورٹ ہوٹل کے کمرا نمبر 114 میں ہے۔ دو روز بعد اسے یہاں سے پرواز کرنی ہے۔''

''اس وقت اس کی نگرانی کون کر رہا ہے؟''

''ڈیک مین۔ میں نے اسے پانچ ڈالر دیے ہیں۔''

''ڈیک مین سامنے والے دروازے پر بیٹھتا ہے۔ اگر وہ عورت پچھلے دروازے سے نکل گئی تو؟''

''نہیں۔ وہ ہوٹل خاردار تاروں سے گھرا ہوا ہے۔ اس کا ایک ہی گیٹ ہے اور پارکنگ لاٹ پر متعین گارڈ اس پر نظر رکھتا ہے۔ جب وہ کہیں جانے لگے گی تو گارڈ ہماری طرف ایک لڑکے کو بھیج دے گا۔ میں نے اس خدمت اور تعاون کے لیے گارڈ کو بھی پانچ ڈالر دے دیے ہیں۔''

''کیا تمہیں میرے ساتھ ہی ٹھہرنے کی ہدایت دی گئی ہے؟'' جونی نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''تمہارا نام کیا ہے؟ سامنے والی کرسی پر بیٹھ جاؤ۔''

''البرٹ!'' اس نے ایک کرسی پر تقریباً گرتے ہوئے کہا۔ ''میں رم پیوں گا۔''

''اگر تمہیں میرے ساتھ کام کرنا ہے تو سادہ پانی یا لائم سوڈا پینا پڑے گا۔'' وہ تنبیہی انداز میں بولا۔

البرٹ کی عمر تقریباً بیس سال تھی اس لیے وہ پُرجوش اور ہنگامہ پسند دکھائی دیتا تھا۔ جونی کی تنبیہ پر وہ سر جھکا کر مسکرانے لگا۔

''یہاں سے شمال کی جانب کیا ہے؟''

''کچھ اور جزائر ہیں۔'' البرٹ نے جواب دیا۔

''ایک مین نے اسے گھومنے پھرنے کے لیے جیرینڈا کی طرف جانے کا مشورہ دیا تھا مگر اس نے کہا کہ وہ لیپوری کی طرف جانا چاہتی ہے۔''

''وہ لیپوری کی طرف کیسے جا سکتی ہے؟'' جونی نے اضطراب سے کہا۔

''پہلے وہ جیرینڈا جائے گی اور وہاں نہایت مختصر سا قیام کرنے کے بعد کسی بوٹ سے سینٹ ونسنٹ کی طرف جائے گی۔ لیپوری وہاں سے بارہ میل کے فاصلے پر ہے۔ اس کے لیے اسے مچھلیاں پکڑنے والی بڑی کشتی کرائے پر لینا پڑے گی۔'' اس نے وضاحت کی۔

''تم جزیرہ لیپوری کے بارے میں جانتے ہو؟''

''لیپوری پر قدم رکھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے جیسے ہم دنیا کے آخری سرے پر آ گئے ہیں۔ اس جزیرے پر تقریباً دو ہزار افراد رہتے ہیں جو مچھلیوں کا شکار کرتے ہیں، اسمگلنگ کرتے ہیں، تھوڑا بہت غلہ اگاتے ہیں۔ کیلا وہاں زیادہ اگتا ہے۔ وہاں کی مٹی اس درخت کے لیے مناسب ہے۔ وہاں سڑکیں نہیں ہیں اس لیے نقل و حرکت میں دشواری ہوتی ہے۔ جزیرے پر بجلی بھی نہیں ہے۔ ایک بڑی سی عمارت ہے جسے وہ ہوٹل کہتے ہیں۔''

''ہوٹل میں کون رہتا ہے؟''

''زیادہ تر چور ہے رہتے ہیں۔ کچھ کینیڈین افراد نے اسے تین سال پہلے خریدا تھا۔ جب لوگوں نے وہاں قیام کرنے میں دلچسپی نہیں لی تو انہوں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔''

جونی نے محسوس کیا کہ جیسے اس کے چہرے کے عضلات میں کھنچاؤ پیدا ہو رہا ہو!

''تم اس عورت کے شوہر کا نام جانتے ہو؟''

''ہاورڈ۔''

''کیا ہم آج رات لیپوری پہنچ سکتے ہیں؟''

''اس کے لیے پہلے کسی بوٹ والے سے بات کرنا پڑے گی۔'' وہ بولا۔

''میرے لیے تمہیں ایک ریوالور کا بندوبست بھی کرنا ہوگا۔''

''کینٹینو کی ہدایت ہے کہ یہ واقعہ مقامی انداز میں پیش آنا چاہیے۔ اس لیے تم ریوالور کے بجائے چاقو استعمال کرو گے۔''

''کینٹینو کو اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔'' جونی نے درشتی سے کہا۔ اس کے دماغ میں چنگاریاں سی اڑنے لگی تھیں۔

''میرا خیال ہے کہ اسے یہ احکامات کہیں اور سے ملے ہیں۔'' البرٹ نے کہا۔

جونی کو محسوس ہوا جیسے اس سے کوئی کام نہیں لیا جا رہا ہو بلکہ اس کے گرد کوئی جال بُنا جا رہا ہو۔ اسے ایک غیر متمدن اور تاریک جزیرے پر نہتا کر کے بھیجا جا رہا تھا جیسے کسی شخص کو گرینڈ پارک میں برہنہ کر کے دھکیل دیا جائے۔ سب سے تشویشناک بات یہ تھی کہ ایک گنوار اور وحشی سا لڑکا اس کی نگرانی کرتا رہے گا۔

''البرٹ! تمہیں میری نگرانی کرنے کی ہدایت دی گئی ہے ہے نا؟''

''اوہ... نہیں جناب!'' البرٹ کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''مجھ سے جھوٹ مت بولو لڑکے! یہ بتاؤ کہ تم میرے بارے میں کیسے رپورٹ دو گے؟''

البرٹ خاموش رہا۔ جونی کو غصہ آ گیا۔ اس نے میز کے نیچے سے اس کی کرسی پر لات ماری تو وہ کرسی سمیت الٹ گیا پھر جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ بار میں موجود لوگ چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ اس نے کرسی سیدھی کی اور اس پر بیٹھ گیا۔ اب اس کے چہرے پر دکھائی دینے والی مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی۔

''یہ سب کچھ کرتے ہوئے مجھے اچھا نہیں لگا۔'' جونی نے کہا۔ ''لیکن میں ایسے لوگوں کے ساتھ کام نہیں کر سکتا جن پر مجھے اعتماد نہ ہو۔ مجھے اپنی کہانی سنا دو ورنہ یہاں سے نکل جاؤ۔''

''میں ٹیلی فون یا تار کے ذریعے سے روزانہ رپورٹ بھیجتا ہوں۔'' البرٹ نے کہا۔ ''یہ اطلاع دیتا ہوں کہ ہم اس وقت کہاں ہیں اور کہاں جانے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ اگر میں یہ رپورٹ نہ دوں تو ان کا کوئی آدمی آ کر چیکنگ کرنے لگتا ہے۔ انہیں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ تم کہیں فرار تو نہیں ہو گئے ہو۔''

جونی کی مٹھیاں بھنچنے لگیں۔ وہ تنظیم کے پھندے میں پھنس چکا تھا اور اس کی ہر مرحلے پر نگرانی کی جارہی تھی۔

"چلو ٹھیک ہے... ریوالور استعمال نہیں کیا جائے گا۔ اب یہ بتاؤ کہ لوگ یہاں کیا استعمال کرتے ہیں؟"

"چاقو، خنجر، بجلی کا تار یا سائیکل کی چین وغیرہ۔ پھر تم لاش کو سڑک پر ڈال کر فرار ہو جاؤ۔ پولیس ایسے کیس کو ہمیشہ ایک حادثہ قرار دے کر فائل بند کردیتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" جونی نے ہاتھ بڑھا کر اس کے شانے پر تھپکی دی۔ "میرا سوٹ کیس اور بیگ لے آؤ اور ایک ٹیکسی بلالو۔"

"اس عورت کا کیا ہوگا؟ کینٹینو کا کہنا ہے کہ تم اسے لے کر باہر جاؤ گے۔"

"میں اسے بھی دیکھوں گا لیکن پہلے اس کے شوہر کو دیکھنا ہے۔" جونی نے کہا۔

"تم اس عورت کے ساتھ وقت گزارو گے؟"

"سوٹ کیس یہاں لاؤ لڑکے۔" جونی نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اپنا حکم دہرایا۔

وہ لڑکا، البرٹ جب وہاں سے اٹھ کر چلا گیا تو جونی نے کوئی چیز اپنے حلق میں اٹکتی محسوس کی۔ ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ عورت کو جلد از جلد ہلاک کردیا جائے!

☆☆☆

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو نورما نے ریسیور اٹھالیا۔ دوسری طرف ہوٹل کا ڈیسک کلرک تھا جو پوچھ رہا تھا کہ اسے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟

"مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔" نورما نے ناگواری سے کہا۔ "کہہ تو چکی ہوں کہ جب کسی چیز کی ضرورت ہوگی خود ہی فون کرلوں گی۔"

"ٹھیک ہے مادام!" اس نے سعادت مندی سے کہا۔

"کسی نے میرے لیے فون تو نہیں کیا تھا؟"

"نہیں مادام!"

"اگر کوئی فون کرے تو میرے بارے میں تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے کہا اور ریسیور کو کریڈل پر رکھ دیا۔ اس ہوٹل میں آکر اس کے اعصاب میں پھر کھنچاؤ پیدا ہونا شروع ہوگیا تھا۔ ہر شخص اسے اپنی نگرانی کرتا محسوس ہوتا تھا۔ اس نے ڈیسک کلرک کو پانچ ڈالر دیے تھے لیکن اسے یقین نہیں تھا کہ وہ اس سے کلرک کی وفاداریاں خرید سکے گی۔

اسے وہ سیاہ آنکھوں والا پورٹر یاد آیا جس نے ائرپورٹ لاؤنج پر اس کا بریف کیس اور سوٹ کیس زبردستی اٹھالیا تھا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کسی کا خاص آدمی ہو اور اس کے پیچھے لگایا گیا ہو۔

اپنے انہی وسوسوں اور اندیشوں کی بنا پر وہ اب تک بھرپور نیند نہیں لے سکی تھی۔ نتیجتاً اس کی آنکھوں کے نیچے شکنیں نمودار ہونا شروع ہوگئی تھیں۔

اس نے اپنے کپڑے تبدیل کیے اور نائٹ بلب روشن کر کے بستر پر لیٹ گئی۔ ائرکنڈیشنر میں کوئی خرابی تھی اس لیے وہ آواز کے ساتھ چل رہا تھا۔ وہ تین سال بعد اپنے شوہر سے ملنے جارہی تھی جو وفادار اور دیانت دار تھا۔ اس کی ساری ضرورتوں کا خیال رکھتا تھا۔ اسے ٹوٹ کر چاہتا تھا۔

اس دوران میں جبکہ وہ نظروں سے اوجھل رہا تھا، نورما کو یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ تنظیم نے اسے ختم نہ کرادیا ہو! مگر جب ایک ہفتے پہلے اسے اپنے شوہر کی طرف سے تار ملا کہ اسے لیبوری آنا چاہیے تو نورما کو سکون حاصل ہوا۔ وہ اضطراب جو تین سالوں سے اس کے وجود پر طاری تھا، یک لخت ختم ہوگیا۔

اس تار کے نتیجے میں وہ ہزاروں میل کا سفر کر کے ٹرینی ڈاڈ پہنچ گئی تھی مگر اسے تو لیبوری جانا تھا!

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور اس نے سگریٹ سلگالیا پھر فون اٹھا کر کان سے لگایا اور زیرو ڈائل کیا تو دوسری طرف سے ڈیسک کلرک نے ریسیور اٹھایا۔ "تمہیں یاد ہے کہ میں نے تم سے پوچھا تھا کہ تیز رفتاری سے لیبوری کیسے پہنچا جاسکتا ہے؟ وہاں کے لیے کون سی فلائٹ جاتی ہے؟"

"یہاں سے براہِ راست کوئی فلائٹ نہیں جاتی۔ پہلے آپ کو پانی پر تیرنے والے طیارے کے ذریعے سینٹ ونسنٹ جانا پڑے گا۔"

"کرایہ کتنا لگے گا؟"

"کرایہ پائلٹ سے مل کر طے کیا جاتا ہے۔ ویسے تقریباً دوسو ڈالرز لگتے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

نورما نے اپنے پرس میں موجود رقم گنی اور کہا۔ "ٹھیک ہے، اس جہاز پر میرے لیے ایک نشست بک کرادو۔" اس نے کہا۔

"پائلٹ صبح آٹھ بجے آئے گا۔"

"ٹھیک ہے، تم صبح چھ بجے مجھے فون کرلینا۔" اس نے کہا اور ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

جب اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں تو اسے سان جوآن میں ملنے والا نوجوان یاد آیا، جس نے خود کو

بزنس مین ظاہر کیا تھا مگر حقیقت میں وہ بزنس مین نہیں لگتا تھا۔ اس کی آنکھوں کی طرف دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا جیسے ان میں بڑے طوفان کروٹیں لے رہے ہوں۔

☆☆☆

ہوائی جہاز کی طرح سطحِ آب پر دوڑنے والی کشتی کا نام زینیا تھا جس کی دو منزلیں تھیں۔ جونی نے اپنے لیے اوپری عرشے کی نشست بک کرائی تھی جہاں اس کے علاوہ تین مسافروں کو اور بیٹھنا تھا۔ اس کے دائیں جانب پرندوں کا ایک بیوپاری بیٹھا تھا جس نے کشتی کے چلنے سے پہلے ہی اس کا دماغ چاٹنا شروع کردیا تھا کہ وہ اس کے لیے ٹرینی ڈاڈ سے باہر کی مارکیٹ دیکھے تاکہ پرندے برآمد کیے جاسکیں۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ جونی کو اچھا کمیشن دے گا۔ جونی نے خود کو کوسا کہ اس نے بزنس مین کی حیثیت.... اختیار کیوں کی تھی۔

رات تین بجے جب وہ تاریکی میں کھلے سمندر میں سفر کررہے تھے اور جونی نیند کے جھونکے لے رہا تھا تو کسی نے اس کا شانہ پکڑ کر ہلایا۔ اس کی آنکھیں کھلیں تو اس نے البرٹ کو کھڑے دیکھا۔ وہ سرگوشی میں اس سے نچلے عرشے پر چلنے کو کہہ رہا تھا۔

جونی اس کے ساتھ وہاں چلا گیا۔ نچلے کھلے عرشے پر اس وقت کوئی نہیں تھا۔ ہوا سرد اور تند تھی۔ جونی کی قمیص پھڑپھڑا رہی تھی۔ عرشے پر لکڑی کے بہت سے کریٹ لدے ہوئے تھے۔ البرٹ نے دو کریٹوں کے درمیان ہاتھ ڈال کر چھوٹی سی تلوار نکال لی۔ ایسی تلواریں جونی نے جزیرے پر بہت سے لوگوں کو گردن میں لٹکائے دیکھا تھا۔

"یہ تمہاری تلوار ہے چیف!" البرٹ نے کہا۔

جونی نے اس کا دستہ تھام کر پوچھا۔ "یہ کس لیے؟"

"یہ بین الاقوامی ہتھیار ہے چیف! جزیرے کے لوگ اس سے بانس کاٹتے ہیں۔ اس کے علاوہ گنا، لکڑی کی شاخیں... اور اگر ضرورت پڑے تو اپنی بیویوں کا سر اڑادیتے ہیں۔ یہ تمہارا ہتھیار ہے۔"

جونی نے اپنے بدن میں سنسنی دوڑتی محسوس کی۔

"اس کا توازن بہترین ہے۔ تمہیں کہاں سے ملی؟"

"کینٹینو کی طرف سے ملی ہے۔"

"اسے واپس کردو۔ میں اس کے بغیر بھی کام کرسکتا ہوں۔"

البرٹ نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر اس کے ہاتھ سے تلوار لے لی۔ وہ چھوٹے سائز کی چوڑے پھل والی تلوار تھی جو آگے سے مڑی ہوئی تھی۔

البرٹ نے اس سے وضاحت نہیں چاہی کہ وہ تلوار کے بغیر کسی شخص کو کیسے ہلاک کرسکے گا۔ اس نے وہ تلوار انہی دو کریٹوں کے درمیان رکھ دی جہاں سے نکالی تھی۔

جونی تھوڑی دیر تک چاندنی سے محظوظ ہوتا رہا پھر اوپری عرشے پر جا کر اپنی نشست پر اونگھنے لگا۔ زینیا صبح نو بجے اپنی منزلِ مقصود یعنی سینٹ ونسنٹ پہنچ گئی۔ وہ بڑی کشتی ساحل تک نہیں جاسکتی تھی اس لیے جونی اور البرٹ ایک چھوٹی کشتی میں وہاں پہنچے۔

وہ جگہ پہاڑیوں سے گھری ہوئی تھی اور وہاں کا موسم بہت گرم تھا۔ جونی کو ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے سورج کی شعاعیں اس کے سر کو توڑتی ہوئی اندر گھس جائیں گی۔

"کیا تم لانچ چلاسکتے ہو؟" اس نے البرٹ سے پوچھا۔

"ہاں۔ اچھی طرح... اگر تم کہو تو میں ایک گھنٹے میں جیٹی پر کھڑی لانچوں میں سے کوئی ایک کرائے پر لے سکتا ہوں۔"

"ضرور۔" جونی نے کہا۔ "اس کی ضرورت پڑے گی۔" پھر وہ جزیرے کی کشادہ سڑک پر چلنے لگا جو اینٹوں سے بنی تھی۔

بازار نزدیک تھا۔ اس نے اپنے لیے مشروب کے دس ڈبے، تھوڑا سا بھنا ہوا گوشت بسکٹ کا ایک ڈبا، آدھ درجن دودھ کے ڈبے اور ایک عدد دوربین خریدلی۔

اسے یقین تھا کہ اگر حالات اس کے منصوبے کے مطابق پیش آئے تو پھر اسے لیبوری صرف ایک مرتبہ جانے کی ضرورت پیش آئے گی۔

ایک جنرل اسٹور سے اس نے گتے کا سوٹ کیس خریدا تاکہ ساری چیزیں اس میں رکھی جاسکیں۔ اپنے پہننے کے لیے اس نے سیاہ پتلون اور سیاہ جرسی لے لی۔ اسے یقین تھا کہ جب یہ لباس پہن کر وہ تاریکی میں حرکت کرے گا تو کسی کو دکھائی نہیں دے گا۔

پھر اس نے دوسرے شیلف پر جا کر ایک چھوٹی سی تلوار اٹھا کر سوٹ کیس میں رکھ لی۔ اس لیے کہ بغیر کسی ہتھیار کے وہ خود کو غیر محفوظ محسوس کررہا تھا۔

البرٹ اس وقت دکان کے اندرونی حصے کی طرف تھا اس لیے اس کے علم میں یہ بات نہیں آسکی۔ تاہم وہ بھی تھوڑی دیر بعد اسٹور سے نکل آیا اور سیدھا جیٹی کی طرف چلا گیا۔ جونی جب ٹہلتا ہوا اپنا سامان اٹھائے ساحل پر پہنچا تو البرٹ ایک لانچ کا انتظام کرچکا تھا جس کی لمبائی تیس فٹ کے قریب تھی۔ اس کی رنگت اڑی ہوئی تھی اور کیبن کے پورٹ ہول شکستہ تھے۔

''اس کا کرایہ تیس ڈالر یومیہ ہے اور اس کے علاوہ پیراکی کا ربر والا لباس مفت میں ملے گا، اس کا کرایہ نہیں لیا جائے گا۔''

''مناسب ہے۔'' جونی نے کہا اور پھر کیبن میں جا کر اپنا سوٹ کیس مناسب جگہ پر رکھ دیا۔ کیبن میں مختصر سا فرنیچر، ایک چولہا اور پینے کے پانی کا ایک کین رکھا تھا۔ ''میرا خیال ہے کہ یہاں سے چلا جائے۔'' وہ بولا۔

البرٹ نے اس کا انجن اسٹارٹ کیا اور آگے بڑھنے لگا۔ وہ چھوٹی موٹر بوٹ بڑے سمندر میں کسی بوتل کے کارک کی طرح اچھلتی ہوئی چل رہی تھی۔ ابتدا میں سمندر میں ہیجان تھا مگر جب وہ لیبوری کے قریب پہنچنے لگے تو وہ پُرسکون ہوتا چلا گیا۔

جزیرے کے لمبے ساحل پر قدِآدم گھاس کے علاوہ ناریل کے درختوں کی بہتات تھی۔ وہ موٹر بوٹ کو لنگر انداز کر کے تھوڑا آگے گئے تو البرٹ نے ایک دو منزلہ شکستہ سی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ وہی ہوٹل ہے جس کا تذکرہ میں نے کیا تھا۔'' وہ بولا۔

جونی نے گردن میں پڑی ہوئی دوربین آنکھوں سے لگا کر جائزہ لیا۔ وہ ایک ویران سا ہوٹل تھا جس کے بڑے ہال میں چند اوندھی کرسیاں پڑی تھیں۔ ''ہاورڈ نے گویا اپنے مرنے کے لیے یہ جگہ منتخب کی ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔

ایک گھنٹے کی نگرانی کے دوران کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ البتہ اس کے بعد ایک مقامی عورت جس کی رنگت سانولی سی تھی، ہوٹل سے نکل کر ساحل کی طرف گئی اور لمبی گھاس کی آڑ لے کر اس نے اوپری کپڑے اتارے اور سمندر میں چھلانگ لگا کر پیراکی کرنے لگی۔ جونی کو الجھن ہونے لگی کہ وہ عورت وہاں رہتی ہے یا ملازمہ ہے... اور کیا وہ تھوڑی دیر بعد واپس جائے گی؟ بہرحال، دونوں صورتوں میں وہ اندھادھند ہوٹل میں گھس کر ہاورڈ کو تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا اور چاروں طرف چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی اس لیے ایسا کوئی کام نہیں کیا جا سکتا تھا جس سے لوگ اس کی طرف متوجہ ہو جائیں۔

بیس منٹ بعد اس عورت نے پانی سے باہر آ کر لباس تبدیل کیا اور ہوٹل کی طرف واپس جانے لگی۔ مگر وہ آدمی نظر نہیں آیا جس پر نورما کے شوہر ہونے کا شبہ کیا جا سکتا۔

نگرانی کرتے کرتے دوپہر سے سہ پہر ہو گئی اور جونی اکتاہٹ محسوس کرنے لگا۔ اس اثنا میں البرٹ نے گتے کا سوٹ کیس کھولا تو اس کی نظر تلوار پر پڑی۔ اس نے تلوار کی دھار کا جائزہ لیا اور ناک سکیڑ کر بولا۔ ''اس سے کسی آدمی کی گردن تو کیا پکا ہوا آم بھی نہیں کٹ سکتا۔'' جونی نے [illegible] کر اسے ہدایت دی کہ وہ اس کی دھار کسی پتھر پر گھس [illegible] کر دے۔

ایک گھنٹے تک البرٹ تلوار کی دھار لگاتا رہا۔ لوہے [illegible] پتھر پر رگڑنے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے، اسے سن کر جونی [illegible] ناگواری محسوس ہوتی رہی۔ بالآخر اس نے کہا۔ ''اب رہنے دو لڑکے... میں اس تلوار سے کسی کا شیو نہیں بناؤں گا بلکہ [illegible] سے قتل کروں گا۔''

''تم اس سے شیو بھی کر سکتے ہو چیف۔'' البرٹ نے تلوار کو کلائی پر رگڑ کر بال صاف کر کے اسے دکھائے۔

اس دوران میں ہوٹل سے ایک آدمی نکلا۔ اس کے بال گھنگریالے، رخسار دبے ہوئے اور مونچھیں گھنی تھیں۔ اس کے حلیے سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ ہاورڈ ہے۔ اس نے باہر آ کر گہرے گہرے سانس لیے اور دوبارہ ہوٹل کے ہال میں چلا گیا۔ پھر اس نے اپنے لیے رم منگوائی اور بڑے بڑے گھونٹ لے کر پینے لگا۔

وہ عورت اس کے برابر آ کر بیٹھ گئی اور اس نے ایک سگریٹ سلگا کر ہاورڈ کو دیا۔ جونی نے اندازہ لگایا کہ انہوں نے رات ایک ساتھ بسر کی ہے۔ اس لمحے اسے نورما سے ہمدردی محسوس ہوئی جو چار ہزار میل کا سفر طے کر کے اپنے شوہر سے ملاقات کرنے آ رہی تھی۔

جونی نے دوربین گھما کر جزیرے کا جائزہ لیا تو یہ دیکھ کر اس کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا کہ پولیس اسٹیشن کی عمارت نزدیک ہی تھی۔

''البرٹ! تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا کہ پولیس اسٹیشن نزدیک ہی ہے؟'' اس نے کہا۔

''اوہ... نہیں!'' اس نے حیرت ظاہر کی پھر اس کے ہاتھوں سے دوربین لے کر آنکھوں سے لگالی اور عمارت کو دیکھنے کے بعد بولا۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ یہ حال ہی میں تعمیر کی گئی ہے۔ اب تم کیا کرو گے؟ انہیں کیسے قتل کرو گے؟''

''قتل تو میں کر دوں گا لیکن پہلے کے مقابلے میں اب زیادہ محتاط رہنا پڑے گا۔''

پندرہ منٹ بعد اس عمارت سے ایک باوردی پولیس والا نکلا اور ساحل کے قریب جا کر ایک درخت کے کٹے ہوئے تنے پر بیٹھ گیا۔ پھر چند مقامی افراد اور آ گئے اور وہ ہنس ہنس کر ان سے باتیں کرنے لگا۔ اس نے اپنی جیکٹ بھی اتار دی جیسے وہ تازہ ہوا سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہو۔ پھر اس نے ناریل کا پانی پیا اور واپس پولیس اسٹیشن ..... چلا گیا۔ جونی [illegible] کہ وہ پولیس والا اس وقت اسٹیشن پر تنہا ہے۔ [illegible] مقامی لوگوں سے اتنی بے تکلفی نہ برتتا۔

[illegible] بجے کے قریب وہ پولیس اسٹیشن سے نکلا اور اس [illegible] میں تالا لگانے کے بعد آبادی کی طرف چلا [illegible] جونی نے اطمینان کا سانس لیا۔

جب سورج غروب ہو گیا تو جزیرے پر تاریکی چھا [illegible] جگہوں پر کیروسین آئل کے لیمپ روشن کر دیے [illegible]

جونی نے ہوٹل کی طرف دیکھا، وہاں ایک میز پر ہاورڈ [illegible] عورت تاش کھیل رہے تھے۔ اس کی ریڈیم ڈائل والی [illegible] سات بجا رہی تھی۔ آٹھ بجے تک کوئی واقعہ رونما نہیں [illegible] سارا دن نگرانی میں گزر گیا۔

وہ البرٹ کے ساتھ موٹر بوٹ کی طرف گیا اور اس نے [illegible] میں جا کر سیاہ پتلون اور جرسی پہن لی۔ ''سمندر کا ایک [illegible] ہوٹل کے قریب ہے، اس لیے میں وہاں تک تیر کر [illegible] گا۔ میں یہ کام چاند کے طلوع ہونے سے پہلے کرنا چاہتا [illegible] میرے ہوٹل سے واپس آنے سے پہلے تم بوٹ کو لے [illegible] جیٹی کے قریب کھڑا کر دینا۔''

''کیا؟ ایسی صورت میں تو میں لوگوں کی نگاہ میں آ جاؤں گا۔'' البرٹ نے گھبرا کر کہا۔

''لوگ اب تک ہمیں دیکھ چکے ہوں گے لڑکے! اس بات کا نوّے فیصد امکان ہے کہ پولیس والے نے ہماری بوٹ کو بھی دیکھ لیا ہوگا۔ اگر تم یہیں کھڑے رہے تو لوگوں کو یاد [illegible] جائے گا کہ قتل کے وقت بوٹ یہاں کھڑی تھی۔ پولیس والا [illegible] تلاش کرنا شروع کر دے گا۔ اس لیے تم آبادی میں چلے [illegible] اور کسی بار میں بیٹھ کر ایسی باتیں کرنا شروع کر دو کہ تم ایک [illegible] بزنس مین کے لیے کام کر رہے ہو۔ ان لوگوں سے یہ بھی [illegible] کہ میں عرشے پر پڑا سو رہا ہوں۔ جب تھوڑی دیر [illegible] گا تو پھر ہم دونوں سینٹ ونسنٹ واپس چلے جائیں [illegible]''

''ہاں، اب بات بنتی نظر آ رہی ہے۔'' البرٹ نے سر [illegible]

جونی نے سیاہ کپڑے پہننے کے بعد تلوار کو اپنی دائیں [illegible] سے باندھ لیا۔

''تم واپس کیسے آؤ گے؟''

''تیر کر... تاریکی کی وجہ سے کوئی مجھے نہیں دیکھ سکے گا۔ [illegible] سارے کام منصوبہ بندی کے مطابق ہو گئے تو لاش ملنے سے پہلے ہم سینٹ ونسنٹ پہنچ چکے ہوں گے۔''

''اور اس کی بیوی کا کیا ہوگا؟''

''جب وہ پلٹ کر ٹرینی ڈاڈ پہنچے گی، ہم اس سے پہلے وہاں ہوں گے۔'' وہ بولا پھر آہستگی سے پانی میں اتر گیا۔ چند فٹ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے کہا۔ ''تم ویسا ہی کرنا جیسا میں نے کہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم کامیاب رہیں گے۔''

البرٹ نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تو وہ ان دو روشن خانوں کی طرف تیرنے لگا جو کہ حقیقت میں ہوٹل کی کھڑکیاں تھیں اور جن سے روشنی باہر آ رہی تھی۔ کپڑوں کی وجہ سے اسے تیرنے میں دشواری ہو رہی تھی، اس کے علاوہ پانی کا بہاؤ مخالف سمت میں تھا۔

وہ ہوٹل سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر نکلا۔ پھر خشکی پر پہنچ کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ البرٹ نے موٹر بوٹ اسٹارٹ کر دی اور اس کا رخ جیٹی کی طرف کر دیا۔ وہ اس کی ہدایت پر عمل کر رہا تھا۔

جونی نے تلوار ٹانگ سے کھول کر ہاتھ میں لے لی اور ہوٹل کی طرف بڑھنے لگا۔ جب وہ کھڑکی کے قریب پہنچا تو اس نے جھانک کر دیکھا۔ ہاورڈ اب بھی اس عورت کے ساتھ لابی میں بیٹھا تاش کھیل رہا تھا۔

دفعتاً ایک کیکڑا جونی کی ٹانگ پر چڑھنے لگا۔ جونی نے گھبرا کر ٹانگ کو جھٹکا دیا تو کیکڑا دور جا پڑا مگر اس کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی اور ہوٹل کی دیوار سے ٹکرا کر ریت پر گر پڑی۔ ایک کھنکھناہٹ سی پیدا ہوئی۔

''یہ کیا ہے... کیسی آواز ہے؟'' ہاورڈ نے چونک کر کہا۔ ''تم باہر جا کر دیکھو۔'' اس نے عورت کو حکم دیا۔

''کوئی جنگلی جانور ہوگا۔'' عورت نے کہا۔ ''اس طرف آوارہ کتے اور بلیاں بہت آتے ہیں۔'' پھر وہ اٹھ کر باہر آنے لگی۔

جونی اپنی جگہ پر محتاط ہو گیا۔

اس نے تلوار اٹھا کر سانس روک لی اور ساکت کھڑا ہو گیا۔ وہ عورت کو ہلاک نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن وقت پڑنے پر سب کچھ کر سکتا تھا۔

اس کے قدموں کی آواز سن کر وہ کھڑکی سے دور ہٹ کر لمبی گھاس کی طرف چلا گیا۔ وہ عورت کھڑکی کے قریب آئی۔ وہاں کچھ نہ پا کر ٹہلتی ہوئی ساحل کی طرف چلی گئی۔ اس نے ایک سگریٹ سلگا لیا اور اس کے کش لیتی رہی۔ جونی کو سگریٹ کا روشن نقطہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے تھوڑا سا وقت گزارا پھر واپس ہوٹل کے اندر چلی گئی۔

اس نے ہاورڈ کو جا کر اطمینان دلایا کہ کوئی خاص چیز نہیں تھی۔ یقیناً کوئی آوارہ جانور ہو گا جو اس طرف آ نکلا ہو گا۔

''ہاں، کئی جنگلی جانوروں کو تو میں بھی ہلاک کر چکا ہوں۔'' ہاورڈ نے کہا۔

وہ دونوں پھر کھیلنے لگے۔ عورت اس دوران ہاورڈ کا گلاس بھرتی جا رہی تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آدھے گھنٹے بعد مدہوش ہو کر اس نے اپنا سر میز سے ٹکا دیا اور اس کے ہاتھ میں دبے ہوئے تاش کے پتے فرش پر گر کر بکھر گئے۔

عورت نے انہیں اٹھانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ البتہ ہاورڈ کو سہارا دے کر اپنے ایک شانے سے ٹکا دیا اور دوسرے ہاتھ سے لیمپ اٹھا لیا۔

جونی کو روشنی حرکت کرتی دکھائی دی۔ پھر روشنی کا دھبا اوپری منزل پر آ گیا۔ ایک کھڑکی روشن ہوئی اور اس کے بعد بتی بجھ گئی۔

جونی سانس روکے وہیں کھڑا رہا۔ اس کے اعصاب میں کھنچاؤ پیدا ہونے لگا۔

ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ اچانک عورت کی تیز چیخ گونجی پھر ایسا معلوم ہوا جیسے اس کا منہ سختی سے بند کر دیا گیا ہو!

جونی کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ گیلری کے نیچے چلا گیا۔ گیلری کی دوسری طرف سے دوڑتے قدموں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر کوئی ہوٹل سے نکل کر باہر چلا گیا اور سمندر کی طرف سے چھپاکے سنائی دیے۔ جو بھی اس طرف سے بھاگ کر گیا تھا، وہ یقیناً سمندر کی طرف چلا گیا تھا۔

دس منٹ بعد پھر سناٹا چھا گیا اور جونی کو اپنی ہی سانسوں کی آواز سنائی دی۔ وہ گیلری سے نکل کر ہوٹل میں داخل ہوا۔ وہاں موم بتیاں جل رہی تھیں۔ اس نے شیشے کا ایک شمع دان اٹھا لیا۔ جب وہ اوپر پہنچا تو اسے اندازہ تھا کہ وہ کیا دیکھنے والا ہے۔

شمع کی روشنی میں وہ منظر اس قدر ہولناک تھا کہ جونی جیسا سفاک قاتل بھی تھرا کر رہ گیا۔ ایک تیز دھار تلوار نے ہاورڈ کی گردن اڑا دی تھی۔ اس لیے جس تکیے پر اس کا سر رکھا تھا وہ خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بے ہنگم زاویوں پر پھیلے ہوئے تھے اور چہرے سے شدید کرب کا اظہار ہو رہا تھا۔ عورت اس کے پہلو میں تھی اور اس کی گردن بھی کٹی ہوئی تھی۔

جونی نے سوچا، ہاورڈ کو آج نہیں تو کل مرنا تھا، لیکن عورت کا کیا قصور تھا؟ اس کی گردن کس سنگ دل نے کاٹ دی؟

چھوٹی تلوار عورت کی گردن میں ہی اٹکی ہوئی تھی۔ جونی فرش پر بہتے ہوئے خون سے بچتا ہوا عورت کی لاش کے قریب پہنچا۔ اس نے تلوار اس کی گردن سے نکالی اور اپنی تلوار اس کی گردن میں اٹکا دی تا کہ وہ تنظیم کے لوگوں پر یہ ظاہر کر سکے کہ ان دونوں کا قتل اسی نے کیا ہے۔ یہ دیکھ کر اسے حیرت ہوئی اور اس کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا کہ جس تلوار سے ان دونوں کو قتل کیا گیا تھا، وہ وہی تھی جو البرٹ نے اسے لانچ پر دکھائی تھی!

وہ ہوٹل سے نکل آیا اور قدموں سے آواز پیدا کیے بغیر ساحل پر پہنچ گیا پھر اس نے سمندر میں غوطہ لگایا اور اندازے سے اپنی موٹر بوٹ کی طرف تیرنے لگا۔ جب وہ نصف فاصلہ طے کر چکا تو اس نے تلوار پھینک دی۔ اپنی سیاہ جرسی اور جوتے بھی اتار پھینکے۔ جوتوں کو اس نے جرسی میں باندھ دیا تھا اس لیے وہ تہ میں بیٹھ گئے تھے۔

جونی نے فوراً ہی بوٹ کی طرف جانا مناسب نہیں سمجھا، اس لیے وہ پہلے آبادی کی طرف چلا گیا۔ ساحل پر چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ کئی عورتیں اور مرد مٹر گشت کر رہے تھے۔ وہ ان میں شامل ہو گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد وہ تیرتا ہوا بوٹ پر چلا گیا۔ اس نے اپنی سانسیں درست کیں پھر کیبن کے دروازے پر دستک دی۔

''کون ہے؟'' اندر سے ایک سہمی ہوئی آواز آئی۔

''جونی!''

دروازہ کھلا اور البرٹ کی شکل دکھائی دی۔ ''اوہ چیف... میں تو سمجھا تھا کہ...''

جونی نے دروازے پر لات ماری۔ وہ اندر جا کر البرٹ سے ٹکرایا اور البرٹ دھکا کھا کر لکڑی کی بنچ پر گر گیا۔

جونی نے پلٹ کر کیبن کا دروازہ بند کیا اور پھر البرٹ کی طرف مڑ کر دھیمی آواز میں کہا۔ ''میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تم اتنے کمینے اور حیوان صفت ہو گے۔''

البرٹ نے بند دروازے اور پھر جونی کی طرف دیکھا اور سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''چیف! میں تو تمہاری مدد کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے تم سے پہلے چھوٹا راستہ اختیار کر کے ہوٹل پہنچ گیا۔ پھر تاریکی میں مجھے اس کے کمرے تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ جب وہ لوگ اوپر آئے تو میں رہ نہیں رہ سکا اور میں نے اپنی تلوار سے ان پر...''

جونی نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کیا۔ البرٹ کا چہرہ دوسری طرف گھوم گیا۔ جونی نے اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور اس کے جبڑے پر ایک مکا مارا۔ البرٹ اچھل کر فرش پر چاروں خانے چت گرا۔

''میں حقیقت معلوم کرنا چاہتا ہوں لڑکے! اپنی زبان سے ساری بات تم سچ سچ اگل دو۔'' اس نے البرٹ کو ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ شاید وہ چیخنا چلانا چاہتا تھا لیکن خود پر قابو پائے ہوئے تھا۔

البرٹ لکڑی کے فرش پر بیٹھ گیا۔ اس نے چہرہ گھما کر خون تھوکا پھر ہانپتی آواز میں کہا۔ ''کینٹینو نے کہا تھا کہ اس بات کا یقین کر لینا کہ ہاورڈ کا کام تمام ہو جائے... میں نے سوچا کہ میں ہی کیوں نہ یہ... کام کر ڈالوں۔''

''تم نے ایک مکروہ کام کیا ہے اور مجھے پھنسوانے کی پوری کوشش کی ہے۔ تم آلۂ قتل وہیں چھوڑ آئے۔''

''وہ تلوار؟'' البرٹ چونک کر بولا۔ ''وہ اس سے پہلے کسی نے میرے پاس نہیں دیکھی۔ میں نے لانچ پر ہی اسے اپنی ٹانگ سے باندھ لیا تھا۔''

''اے زینیا سے چوری کیا گیا تھا تو کیا لانچ کے عملے نے اس کی رپورٹ درج نہیں کرائی ہو گی؟ پھر کیا انہیں یہ یاد نہیں رہے گا کہ تم دونوں جگہوں پر موجود تھے؟''

البرٹ کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ ''یسوع مسیح کا واسطہ... تمہیں میری مدد کرنا پڑے گی چیف! اس لیے کہ اگر میں گرفتار ہو گیا تو وہ تمہیں بھی گرفتار کر لیں گے۔ ہم دونوں ہر موقع پر ساتھ دیکھے گئے ہیں۔''

جونی نے اس کے چہرے پر ایک گھونسا اور مارتے ہوئے کہا۔ ''اپنا چہرہ صاف کرو، حلیہ درست کرو... اور اس سے پہلے کہ وہ ہم تک پہنچیں، یہاں سے نکلنے کی فکر کرو۔''

البرٹ نے نہایت سعادت مندی سے اس کی ہدایات پر عمل کیا اور اپنا منہ دھونے کے بعد کیبن کی صفائی کر دی۔

تھوڑی دیر بعد کیبن کے دروازے پر کسی نے دستک دی۔

''کون ہے؟'' جونی نے بلند آواز میں پوچھا۔

''پولیس!''

جونی کا سانس جیسے اس کے سینے میں رکنے لگا۔ اس نے سرگوشی میں البرٹ سے پوچھا۔ ''کسی نے تمہیں ہوٹل کی طرف جاتے تو نہیں دیکھا تھا؟''

''میرا خیال ہے کہ...'' البرٹ نے کہنا چاہا۔

''تم کوئی بات یقین سے نہیں کہہ سکتے۔'' جونی نے بیزاری سے کہا۔ ''جا کر اسٹیئرنگ پر بیٹھو اور یہاں سے چلنے کے لیے تیار رہو۔''

دروازے پر ایک بار پھر تیز دستک دی گئی۔

''ٹھہرو، میں اپنی پتلون پہن رہا ہوں۔'' جونی نے کہا۔ ''کیا بات ہے؟''

''ہوٹل میں ایک قتل ہو گیا ہے جناب! میں اس سلسلے میں آپ سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔''

جونی نے خود کو کوسا۔ ہاورڈ کی لاش پولیس کو اتنی جلدی کیسے مل گئی؟ اس نے کپڑے تبدیل کیے اور دروازہ کھول دیا۔ پولیس والے کے چہرے پر نرمی تھی... مگر کون کہہ سکتا تھا کہ وہ نرمی کب سختی میں بدل جائے؟

''آپ کو زحمت دینے کی معافی چاہتا ہوں۔'' پولیس آفیسر نے خوش اخلاقی سے کہا اور ہلکے سے مسکرایا۔ ''کسی نے ہوٹل میں مسٹر ہاورڈ اور ایک ملازمہ لینا زکو قتل کر دیا ہے۔''

''اوہ میرے خدا!'' جونی نے حیرت ظاہر کی۔

''انہیں ایک مقامی تلوار سے قتل کیا گیا ہے۔''

''اوہ!''

پولیس آفیسر بنچ پر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک پیڈ اور بال پوائنٹ اپنی جیب سے نکالتے ہوئے کہا۔ ''کیا میں آپ کا پاسپورٹ دیکھ سکتا ہوں؟''

جونی نے اپنے سوٹ کیس میں سے پاسپورٹ نکال کر اس کے حوالے کر دیا۔

''آپ کے بوٹ مین کا پاسپورٹ بھی دیکھنا ہے۔''

البرٹ ابھی وہیں کھڑا تھا۔ اس نے اپنے سفری بیگ سے پاسپورٹ نکال کر اسے دیا۔ پولیس آفیسر نے اس میں سے چند اندراجات اپنے پیڈ پر نقل کر لیے۔

''مسٹر جونی!'' اس نے پاسپورٹ واپس کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ اور آپ کا بوٹ مین دن میں کسی وقت اپنی بوٹ سے اتر کر ساحل کی طرف گئے تھے؟''

''البرٹ تو بوٹ پر ہی رہا تھا۔ البتہ میں نے شام کے وقت پیراکی کی تھی اور ساحل پر چہل قدمی کرنے لگا تھا۔''

''اگر میں یہ پوچھوں کہ تم نے کسی غیر معمولی شخص کو تو نہیں دیکھا... یا کوئی ایسا واقعہ جسے غیر معمولی کہا جا سکے تو تم یہی کہو گے کہ مجھے تو سارے مقامی لوگ عجیب اور غیر معمولی لگ رہے تھے۔ اس لیے میں یہ سوال نہیں کروں گا۔ یہ بتاؤ کہ تم کس وقت ساحل پر گئے تھے؟''

''ساڑھے آٹھ بجے کے قریب... دس بجے تک میں وہاں رہا تھا۔''

''آپ بہت دور نکل گئے ہوں گے؟''

''نہیں، مجھے ایک لڑکی مل گئی تھی۔ میں نے اس کے

ساتھ گپ شپ کرتے ہوئے وقت گزارا۔''

اس نے نوٹ بک میں یہ بات بھی درج کرلی پھر کہا۔

''اب میں آپ لوگوں سے درخواست کروں گا کہ جزیرہ چھوڑ کر نہ جایئے گا۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

''تمہیں اندازہ ہے کہ یہ کام کس کا ہوسکتا ہے؟''

''ابھی تک ایک ہی تھیوری قائم ہوسکی ہے کہ وہ کوئی اجرتی قاتل تھا اور امریکا سے آیا تھا۔''

پولیس آفیسر کا جملہ جونی کے پیٹ میں گھونسے کی طرح لگا۔ وہ پلکیں جھپکاتا ہوا اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

''یہ تھیوری مسٹر ہاورڈ یعنی مقتول کی بیوہ نے پیش کی ہے جنہوں نے اپنے شوہر کی لاش کو شناخت کیا ہے۔'' وہ بولا۔

کوئی چیز جونی کے دماغ میں ہیجان پیدا کرنے لگی۔ ہاورڈ کی بیوہ وہی عورت تھی جو اس سے ٹرینی ڈاڈ میں ملی تھی... مگر وہ اتنی جلدی یہاں کیسے پہنچ گئی؟

''تمہارا خیال ہے کہ وہ درست کہہ رہی ہے؟''

''وہ اس وقت چیخ چلا رہی تھی اور ہسٹیریا کا شکار تھی اس لیے کوئی حتمی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ وہ بہرحال ایک سمندری جہاز کے ذریعے ٹرینی ڈاڈ سے یہاں تک نہایت تیز رفتاری سے آئی تھی۔ مگر جب وہ یہاں پہنچی تو اس نے اپنے شوہر کی لاش دیکھی۔ اس کا کہنا ہے کہ جن لوگوں نے اسے قتل کیا ہے وہ اس کی بھی جان لے لیں گے۔''

''اوہ! مگر کیوں؟'' جونی چونکا۔

''اس کے شوہر نے اس کے نام ایک خط لکھا تھا جو اسے بستر کے گدے کے نیچے سے مل گیا۔'' پولیس آفیسر نے انکشاف کیا۔

جونی کو ایک بار پھر اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔ اسے خود پر غصہ آرہا تھا کہ ہاورڈ کی لاش دیکھتے ہی وہ وہاں سے بھاگ کیوں آیا؟ اسے کم از کم اس جگہ کی تلاشی لے لینا چاہیے تھی۔ اب لازماً اسے نورما سے بات کرنا پڑے گی۔

جب پولیس آفیسر نے کیبن کا دروازہ کھول کر عرشے پر قدم رکھا تو جونی نے پیچھے سے پوچھا۔ ''اب وہ عورت... یعنی مقتول کی بیوی کہاں ہے؟''

''وہ مسز گینڈی کے ساتھ ہے۔'' اس نے سر گھما کر جواب دیا۔ پھر پیشانی پر شکنیں ڈال کر کہا۔ ''مگر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''ممکن ہے میں اس کی مدد کرسکوں۔'' جونی نے گول مول سا جواب دیا۔ اسے احساس تھا کہ عورت میں اسے زیادہ دلچسپی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔

''ہاں، اس کے ملک کا کوئی آدمی اس کے نزدیک رہے گا تو اسے اطمینان رہے گا۔ مسز گینڈی پیلے رنگ کے مکان میں ہوٹل کے نزدیک ہی رہتی ہے۔'' اس نے سر ہلا کر اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

جب وہ چلا گیا تو جونی نے دروازہ بند کردیا اور اپنی قمیص اتارنے لگا۔ اس نے جلدی میں ایک نامناسب سی قمیص پہن لی تھی۔

''اب تم کیا اس کی حفاظت کرو گے؟'' البرٹ نے پوچھا۔

''اس جزیرے پر؟ احمق کہیں کے! میں یہ ظاہر اس سے ہمدردی کروں گا اور پولیس اسٹیشن والے یہ تاثر لیں گے کہ ہم وطن ہونے کی بنا پر میں اس کا خیال کررہا ہوں۔'' اس نے دوسرے جوتے پہنتے ہوئے کہا۔ ''میں اس خط کے لیے عورت کے پیچھے جارہا ہوں۔ پھر میں اس سے کہوں گا کہ وہ ان معاملات میں اپنی زبان بند رکھے۔''

''کینٹینو اس سے مطمئن نہیں ہوگا۔''

''کینٹینو جہنم میں جائے۔'' جونی نے ناک سکیڑ کر کہا۔ پھر وہ البرٹ کے قریب پہنچ کر بولا۔ ''اور تم! تم نے مجھے یہ کیوں نہیں بتایا کہ ہم جس جہاز سے آئے تھے اس کے علاوہ بھی کوئی جہاز آچکا ہے؟''

''چیف! مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔'' اس نے بے چارگی سے کہا۔

''بکواس بند کرو۔ تم یہ جانتے تھے کہ وہ لیپوری آرہی ہے اور اپنے شوہر سے ملاقات کرنے والی ہے۔ تم نے سوچا تھا کہ تم اس موقع پر ان دونوں کا خاتمہ کردو گے... کیوں یہی بات تھی نا؟''

البرٹ کی نگاہیں جھک گئیں۔ گویا وہ اعتراف جرم کررہا ہو۔ اس کے چہرے پر معصومیت تھی مگر جونی اس حقیقت سے واقف تھا کہ وہ اندر سے کس قدر کریہہ اور زہریلا ہے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ لڑکے کی گردن پر ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالے اور اس کا قصہ ہمیشہ کے لیے ختم کردے۔ مگر ابھی اسے اور بھی بہت سے کام نمٹانے تھے، اس لیے البرٹ کی ہلاکت اس نے التوا میں ڈال دی۔

''سنو لڑکے! میں سوچ رہا ہوں کہ اس عورت کو میں موٹر بوٹ پر لے آؤں۔ اگر تمہیں اس پر کوئی اعتراض ہے تو پھر میں پہلے تمہیں قتل کردوں گا۔''

البرٹ اپنے منہ سے کچھ نہ بولا اور ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

☆☆☆

وہ پیلی عمارت اسے آسانی سے مل گئی۔ جب اس نے مسز گینڈی سے اپنا تعارف کرایا تو وہ نورما سے اس کی ملاقات کرانے پر تیار ہوگئی۔

اس نے ایک کیریڈین لیمپ اٹھایا اور جونی کو لے کر مکان کے اندرونی حصے کی طرف گئی۔ ایک خواب گاہ کے دروازے پر اس نے دستک دی تو نورما نے دروازہ کھول دیا۔

''تم کون ہو؟'' نورما نے چونک کر پوچھا۔

معلوم نہیں وہ اسے پہچاننے سے قاصر رہی تھی یا پھر جس طور پر اتنے الجھاؤ کا شکار تھی کہ جونی اس کے لیے اجنبی ہی رہا تھا۔

''مجھے جونی قوئل کہتے ہیں اور میں شکاگو سے آیا ہوں۔ قتل کی تحقیقات کرنے والے پولیس آفیسر کا خیال ہے کہ میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں۔''

''اوہ، تم تو وہی ہو جو مجھے طیارے پر ملے تھے۔'' اس نے سر کو جھٹک کر کہا۔ ''مجھے اس بات پر یقین نہیں آیا تھا کہ تم بزنس مین ہو۔''

وہ اس وقت شب خوابی کے لبادے میں تھی اس لیے اس کے شیب و فراز عیاں تھے۔

مسز گینڈی وہاں سے چلی گئی۔

''میں یہ بات ثابت کرسکتا ہوں۔'' اس نے اپنی ہپ پاکٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''رہنے دو۔'' نورما نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''تمہارے دلائل میرے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ میں جانتی ہوں کہ تنظیم کیسے کام کرتی ہے۔'' وہ ٹھوس لہجے میں گفتگو کررہی تھی لیکن اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ نہ جانے کیوں جونی کو محسوس ہونے لگا کہ وہ حقیقت میں اس کی مدد کرے۔

اس نے ایک طرف ہٹ کر اسے راستہ دیا تو جونی اندر داخل ہوگیا۔ وہاں ایک بیڈ کے علاوہ دو کرسیاں اور ایک میز تھی۔ دائیں جانب فرش پر اس کے اتارے ہوئے کپڑوں کا ڈھیر تھا۔

''تم اتنی خوف زدہ کیوں ہو؟'' جونی نے کہا۔ ''کیا تمہارا خیال ہے کہ میں تمہیں قتل کرنے آیا ہوں؟''

اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ ''تم نیویارک سے آنے والی فلائٹ پر میرے ساتھ تھے۔ پھر تم نے سان جوآن تک میرا پیچھا کیا اور اب ہم دونوں اس جزیرے لیپوری پر ہیں۔ میرے شوہر کو تھوڑی دیر پہلے قتل کردیا گیا ہے۔ اب کیا تم یہ توقع کرتے ہو کہ یہ ساری باتیں جن میں ایک گہرا تعلق ہے اور جو ایک تسلسل سے پیش آرہی ہیں، میں انہیں محض اتفاق سمجھ لوں؟''

''ہاں... یہ محض اتفاق ہے۔'' جونی نے کہا۔ ''ابھی تم نے جس تنظیم کا تذکرہ کیا ہے، میں اس سے بالکل واقف نہیں ہوں۔''

وہ اس کے سامنے بیڈ پر بیٹھی تھی اور اس کے اعصاب پوری طرح سے اس کے قابو میں نہیں آئے تھے۔ گاہے گاہے وہ کانپ اٹھتی تھی۔

''میں اس مکان کے مرکزی دروازے سے آیا ہوں۔ کیا کسی قاتل کا انداز ایسا ہوتا ہے؟'' جونی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

نورما نے جھک کر بستر کے نیچے سے لمبے پھل کا ایک چاقو نکال لیا۔ ''میرے نزدیک نہ آنا۔'' اس نے مرتعش آواز میں کہا۔ جونی نے اندازہ لگایا کہ وہ چاقو نورما نے مسز گینڈی سے خریدا ہوگا۔

''تم واقعی یہ سوچ رہی ہو کہ میں تمہیں قتل کرنے آیا ہوں؟'' جونی نے ہنس کر کہا۔ ''اگر تم نے چاقو اٹھا ہی لیا ہے تو ٹھیک ہے، مجھے قتل کردو۔''

نورما کی پیشانی پر پسینا جھلملانے لگا۔ اس کا شب خوابی کا لبادہ اس کے جسم سے چپکنے لگا تھا۔

جونی نے اس کی کلائی تھام کر چاقو اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ نورما نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ جونی نے وہ چاقو دوبارہ بستر کے نیچے ڈال دیا۔

''اور اب میں تمہیں قتل کرسکتا ہوں۔'' جونی نے اس کا گال تھپکتے ہوئے کہا۔

''مسٹر جونی! کیا تم یہاں مجھ سے محبت جتانے آئے ہو؟'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''نہیں۔ میں تو اپنے سفر کو خوش گوار بنانا چاہتا ہوں۔''

''مگر میں ایسا نہیں کرنا چاہتی۔'' وہ بولی۔ ''مجھے تم پر اعتماد نہیں ہے۔ کیا تمہارے پاس کوئی گن ہے؟''

''ہاں۔ بوٹ پر ایک اسپیئر گن ہے۔ کیوں؟''

''میں خود کو یہاں محفوظ نہیں سمجھتی۔ میرے شوہر کا قتل کوئی معمولی بات تو نہیں ہے۔ میرے اعصاب شکستہ سے ہورہے ہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ میں تمہیں لے کر جزیرے سے کچھ

دور چلا جاؤں تا کہ کوئی تم تک نہ پہنچ پائے۔'' وہ بولا لیکن نورما تذبذب میں مبتلا تھی۔ ''بوٹ میں تمہیں آرام نہیں ملے گا۔ اس کے کیبن میں لکڑی کی بنچیں ہیں۔''

''اس وقت تو میں کیلوں کے تختے پر بھی سو سکتی ہوں لیکن یہاں نہیں۔'' وہ بولی۔ ''یہ ایک منحوس جزیرہ ہے۔''

جونی نے اندازہ لگایا کہ وہ گو مگو... کیفیت کے باوجود بوٹ تک چلنے پر آمادہ ہے۔ ''افسوس کہ بوٹ پر صرف دو ہی کمبل ہیں۔''

''کوئی بات نہیں۔ میں مسز گینڈی سے ایک کمبل لے لوں گی۔ میرا خیال ہے کہ تمہاری بوٹ پر ہی میں محفوظ رہوں گی۔'' وہ بولی۔ ''اب ذرا دیر کے لیے اپنی پیٹھ میری طرف کرلو تا کہ میں لباس تبدیل کرلوں۔''

جونی نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔

''میرا خیال ہے کہ تم پولیس آفیسر کو اس بات سے ضرور آگاہ کردینا کہ تم میرے ساتھ جارہی ہو، ورنہ وہ یہ سمجھے گا کہ میں تمہیں اغوا کررہا ہوں۔''

''میں اسے بتادوں گی۔'' وہ بولی۔

جونی کو اس کے کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی اور اس کے جسم کی بھینی خوشبو اس کو مائل بہ دیوانگی کررہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ نورما کو وہ اپنی بوٹ پر لے جارہا ہے لیکن اس کے بعد کیا ہوگا؟ اس کا یہ قدم تنظیم کی مخالفت میں تو نہیں اٹھ رہا ہے؟

☆☆☆

نورما کی آنکھ اچانک کھل گئی۔

وہ بوٹ کے کیبن میں تھی اور کیبن کا دروازہ کھلا تھا اس لیے وہ جونی اور البرٹ کو عرشے پر چادر اوڑھے لیٹے دیکھ سکتی تھی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا کیونکہ اسے گمان ہورہا تھا کہ ان دو میں سے کوئی ایک اس کے قریب کھڑا تھا۔

ان میں سے کون ہوسکتا ہے... البرٹ یا جونی؟

وہ ان میں سے کسی پر اعتبار نہیں کرسکتی تھی تاوقتیکہ ہاورڈ کے خط کو پوسٹ نہ کردیتی۔

اس نے اپنے پیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ خط اس کے اونی اسکرٹ کے نیچے موجود تھا۔ وہ اسے محسوس کرسکتی تھی۔

ہاورڈ نے لکھا تھا: ''یہ خط تمہیں میری موت کے بعد ملنے کا امکان ہے اس لیے کہ میری زندگی کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ میں ہر صبح جب بیدار ہوتا ہوں تو خود کو زندہ پاکر مجھے حیرت ہوتی ہے۔ میں نے اس خط میں تنظیم کے بارے میں ساری تفصیل لکھ دی ہے۔ اس کا طریقۂ کار اور اس کے کارکن، یہ کہاں کہاں پھیلی ہوئی ہے، وغیرہ وغیرہ... اس خط کو حکام بالا تک لے جاؤ لیکن جزیرے کی پولیس سے رابطہ نہ کرنا۔ اسے امریکا لے جانا...''

اس خط میں تنظیم کے تقریباً پچاس کارکنوں کے نام درج تھے۔ اگر حکام کے سامنے ان کی نشان دہی کردی جاتی اور وہ گرفتار ہوتے یا مار دیے جاتے تو تنظیم کا شیرازہ بکھر جاتا۔

وہ خط جو پیٹ سے چپکا ہوا تھا، کتنا خطرناک اور کس قدر اہمیت کا حامل تھا کہ وہ ہر لمحہ یہ محسوس کررہی تھی جیسے کوئی گرہنیڈ اس کے پیٹ سے بندھا ہو اور کسی بھی لمحے دھماکے سے پھٹ کر اس کے چیتھڑے اڑانے والا ہو!

اس وقت نورما کا سانس رکنے لگا جب اس نے البرٹ کو کہنی کے بل اٹھتے دیکھا۔ وہ تھوڑی دیر تک نورما کی طرف دیکھتا رہا پھر دوبارہ لیٹ کر خراٹے لینے لگا۔

نورما اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے کمبل ایک طرف پھینک دیا اور عرشے پر جاکر جونی سے قدرے فاصلے پر لیٹ گئی۔ جونی اس کی آہٹ پر جاگ گیا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ نورما کی کمر کے گرد حمائل کردیا۔

''اوہ، پلیز... نہیں۔'' اس نے کمزور لہجے میں کہا۔

''تم کیبن چھوڑ کر یہاں کیوں آگئیں؟''

''تمہارا بوٹ میں میری نگرانی کررہا ہے۔''

''البرٹ! اپنا کمبل اٹھاؤ اور جاکر انجن کی دوسری طرف لیٹو۔'' جونی نے اٹھ کر اسے حکم دیا۔

البرٹ وہاں سے اٹھ کر دوسری طرف چلا گیا۔

''اب ٹھیک ہے؟'' جونی نے کہا۔

''اسے سمندر میں دھکا دے دو۔''

''پھر ہمیں یہاں سے واپس کون لے جائے گا؟ جیسے بوٹ مین آج کل کہاں ملتے ہیں۔'' اس نے ہنس کر کہا۔ ''آؤ، یہاں میرے قریب آکر بیٹھو۔''

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے قریب چلی گئی۔ پھر سوچنے لگی کہ میں بھی کتنی بے ہودہ عورت ہوں... ابھی مجھے بیوہ ہوئے چند ہی گھنٹے گزرے ہیں اور میں ایک غیر مرد کی بانہوں میں جارہی ہوں۔

جب سورج نکل آیا اور اس کی پہلی کرن اس کے چہرے پر پڑی تو نورما کی آنکھ کھل گئی۔ عرشے پر لیٹنے کی وجہ سے اس کا جسم دکھ رہا تھا۔

تاہم اس نے محسوس کیا کہ تین برسوں سے جو

MEDICAM SHAMPOO
9 مختلف قسم کے شیمپو

اضطراب اس کے دل و دماغ کو جکڑے ہوئے تھا، وہ آج ختم ہو گیا تھا۔ اس نے گردن گھما کر گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ جونی کچھ فاصلے پر بیٹھا اسٹو و جلا رہا تھا۔

''البرٹ کہاں ہے؟''

''وہ کسی کام سے قصبے تک گیا ہوا ہے۔''

''اوہ!'' اس نے آہستہ سے کہا۔ پھر یہ محسوس کر کے وہ سراسیمہ ہو گئی کہ کمبل کے نیچے اس کے جسم پر لباس نہیں۔ وہ اپنا ہاتھ پیٹ تک لے گئی۔ خط غائب تھا۔

اس نے کمبل میں جھانک کر دیکھا۔ معلوم نہیں کیسے اسکرٹ ڈھیلا ہو کر پیروں میں چلا گیا تھا اور وہ خط مڑا تڑا سا اسکرٹ کے نزدیک پڑا تھا۔ اس نے اسکرٹ کو کھینچ کر اوپر کر لیا اور خط کو جیب میں رکھ لیا۔

''میرا خیال ہے کہ تم اس طرف جا کر غسل کر لو تو پھر ہم ساتھ ناشتا کریں۔'' جونی نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

نورما نے اس کی ہدایت پر عمل کیا پھر کیبن میں جا کر کپڑے تبدیل کر لیے۔ اس بار اس نے ہاورڈ کا خط اپنے گریبان میں رکھ لیا تھا۔ جب وہ جونی کے ساتھ بیٹھی خاموشی سے ناشتا کر رہی تھی تو البرٹ قصبے کی طرف سے روزمرہ کے استعمال کا کچھ سامان اٹھائے آ گیا۔ ''چیف! پولیس آفیسر کا کہنا ہے کہ تم شک و شبہے سے بری قرار دیے جاتے ہو... لہٰذا تمہاری نقل و حرکت پر کوئی پابندی نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے، تو پھر ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے۔'' جونی نے کہا۔

نورما ایک بار پھر خوف زدہ ہو گئی۔ وہ جونی کے ساتھ تنہا وہاں سے نہیں جانا چاہتی تھی۔ ''جونی! تم کہاں جا رہے ہو؟''

''ایسے ہی... جزیرے کا ایک چکر کاٹ کر ہم واپس آ جائیں گے۔ تمہیں یہ سفر پسند آئے گا۔''

''لیکن وہ قتل...؟''

''اس کی فکر پولیس کو کرنے دو۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔

اس سے پہلے کہ نورما کچھ کہہ پاتی، موٹر بوٹ کا انجن اسٹارٹ ہو گیا۔ البرٹ نے انجن کے پاس سے کہا۔ ''پولیس آفیسر کا خیال ہے کہ یہ قتل کچھ محبت وغیرہ کے معاملے میں ہوا ہے۔''

''مگر میں نے اسے بتایا تھا کہ...''

''اس کا کہنا ہے کہ کسی پیشہ ور نے تلوار سے نہیں بلکہ اسے ریوالور سے ہلاک کیا ہے۔'' اس نے اپنا جملہ مکمل کیا۔

''اگر ایسی بات ہے تو ہمیں پولیس اسٹیشن پہنچ کر ان سے گفتگو کرنی چاہیے۔ ممکن ہے قتل پر کسی نئے زاویے سے روشنی پڑ سکے۔'' نورما نے کہا۔ ''جونی! کیا تم مجھے قصبے کے قریب اتار دو گے؟''

''میرا خیال ہے کہ تم ہم لوگوں کے ساتھ رہو۔''

''بکواس بند کرو۔'' وہ ناگواری سے بولی اور البرٹ کے قریب گئی لیکن اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہوا اور وہ بوٹ کو چلانے میں مصروف رہا۔

تب اسے احساس ہوا کہ وہ کسی سازش کا شکار ہو چکی ہے۔

اس نے کھلے عرشے پر جا کر ایک تیز چیخ ماری مگر وہ دوسری بوٹس اتنے فاصلے پر تھیں کہ کسی نے اس کی چیخ سنی ہی نہیں۔

وہ چند قدم بڑھا کر بوٹ کے کنارے پر پہنچ گئی تاکہ اندازہ لگا سکے کہ اگر اس نے سمندر میں چھلانگ ماری تو کیا وہ تیرتی ہوئی کنارے تک پہنچ سکے گی؟ اس سے پہلے کہ وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنا پاتی، دو مضبوط ہاتھوں نے پیچھے سے اسے گرفت میں لے لیا۔

''یہاں سے تیر کر ساحل تک جانا بہت دشوار ہے۔'' جونی نے کہا۔

نورما کا غصہ ساتویں آسمان کو چھونے لگا۔ پہلے تو اس نے بوٹ کی ریلنگ پر پاؤں رکھ کر پیچھے کو دھکا دیا تاکہ وہ جونی کی گرفت سے چھوٹ جائے لیکن اس کا یہ حربہ کامیاب نہ ہو سکا تو وہ بری طرح سے مچلی۔ اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس کے بلاؤز کا ایک بٹن ٹوٹ گیا اور خط اس کے گریبان سے نکل کر ریلنگ پر گر گیا۔ اس کے بعد جب ہوا کا ایک جھونکا آیا تو وہ اڑ کر سمندر میں گر پڑا۔

''نورما! اس سے پہلے کہ قانون کے ہاتھ ان آدمیوں تک پہنچ سکیں جن کے نام تمہارے شوہر نے اس خط میں لکھے تھے، ان میں سے تقریباً نصف زیرِ زمین چلے جائیں گے لیکن روپوش ہونے سے پہلے تمہاری تکا بوٹی کر دیں گے۔'' جونی نے سرگوشی میں کہا۔ ''اس لیے جدوجہد ترک کر دو۔''

نورما کو معلوم ہو گیا کہ اس کا کھیل ختم ہو گیا ہے۔ اس نے مزاحمت ختم کر دی اور پھولے ہوئے سانس کے ساتھ بولی۔ ''تمہارا نام اس میں نہیں تھا جونی! میں نے وہ خط پڑھا تھا۔''

''ویسے لوگ مجھے اکیولا کہتے ہیں۔''

اکیولا! اسے یاد آ گیا۔ ہوانا، میامی، شکاگو اور لاس

...میں یہ نام بہت مشہور تھا۔ وہ کئی لوگوں کا قاتل تھا۔

...اس کی جدوجہد ماند پڑ گئی۔ ہاتھ پیر ڈھیلے پڑنے ...البرٹ نے اس کی حالت دیکھ کر کہا۔ ''چیف! اگر ہم ...سمندر میں پھینک دیں تو شارک مچھلیاں اس کا گوشت تو ...ناخن تک چبا لیں گی۔''

''میرا خیال ہے کہ اسے ہلاک کرنے کی ضرورت نہیں ...کیونکہ اس کے پاس جو خطرناک راز تھا، وہ ضائع ہو گیا۔''

''چیف! تمہیں بتایا نہیں گیا تھا، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ...کے شوہر کے ساتھ اسے بھی ٹھکانے لگانے کا حکم دیا گیا ...تھا۔'' البرٹ نے ہنس کر کہا۔ وہ نورما کی بے چارگی سے پوری ...طرح محظوظ ہو رہا تھا۔ ''میں نے رات ہی سینٹ ونسنٹ سے ...تنظیم کے بڑوں کو پیغام بھیج دیا تھا۔ انہوں نے حکم دیا ہے کہ ...اسے ختم کر دیا جائے اور اگر تم آڑے آؤ گے تو تمہیں بھی ختم ...کر دیا جائے گا۔''

''تم اسٹیئرنگ پر جاؤ، میں اس کی حفاظت کروں گا۔'' ...وہ اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔

''کیا تم یہ کر سکتے ہو؟ کیا تم مجھے ہلاک کر سکتے ہو جونی؟'' اس نے کانپتی آواز میں پوچھا۔

''اب اس کا انحصار البرٹ پر ہے۔ اگر میں نے اسے ...سمجھا بجھا دیا تو ممکن ہے تم بچ جاؤ۔''

...نورما نے سوچا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ جونی مجھے ...ہلاک نہیں کرنا چاہتا۔ یہ سب البرٹ کی خباثت ہے۔ وہی ...تنظیم کے عہدے داروں کے احکامات کی پیروی کر رہا ہے۔

''اس کو ختم کر دو۔'' نورما نے پھنکارتے ہوئے کہا۔ ...''اسے قتل کر کے ہم یہاں سے فرار ہو سکتے ہیں۔ میں ...تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔ چاہے تم دنیا کے آخری حصے ...میں ہی کیوں نہ چلے جاؤ۔''

''اپنی ایک کوشش کے بعد وہ خاموش نہیں بیٹھیں گے ...نورما!'' اس نے اپنا ایک ہاتھ اس کے شانے پر رکھتے ہوئے ...کہا۔

''ہم یہاں سے بھاگ جائیں گے۔''

''بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ ان کے ہاتھ بہت لمبے ...ہیں۔ ہر طرف ان کے آدمی پھیلے ہوئے ہیں۔ کبھی تمہیں مجمع ...میں سرگوشی سنائی دے گی، کبھی خواب گاہ کے شیشے پر صابن ...سے کوئی دھمکی لکھی دکھائی دے گی اور کبھی رات کو تین بجے ...پراسرار فون آنا شروع ہو جائیں گے۔ ہم زیادہ سے زیادہ ...ایک سال تک مزید زندہ رہ سکیں گے۔''

''لیکن یہ ابھی مرنے سے تو بہتر ہوگا۔''

''کوئی فائدہ نہیں ہے۔'' جونی نے سرگوشی میں کہا۔ ''ایک کارکن نے تنظیم کو چھوڑ دیا اور پیٹرول پمپ پر ملازمت کر لی۔ ایک سال بعد اس کا بڑا لڑکا ٹرک کے نیچے آ کر کچل گیا، اس سے اگلے مہینے اس کی سات سالہ بچی ایک گٹر میں گر کر ہلاک ہو گئی۔ بالآخر اپنی بیوی اور باقی دو بچوں کو بچانے کی خاطر اس نے خودکشی کر لی۔''

''جونی! تم کیسی باتیں کر رہے ہو، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

''تم ٹھہرو میں آتا ہوں۔'' وہ بولا۔

البرٹ بوٹ کو سمندر میں گھما رہا تھا۔ جونی اس کے پاس پہنچ گیا۔ ''دوپہر ہونے والی ہے چیف... اور یہ نہ بھولو کہ میں نے رات کو رپورٹ بھیجی تھی۔''

''میں تھوڑی دیر بعد اس کا قصہ ختم کرنے والا ہوں۔''

''آدھے سے زیادہ چھوٹے جزیرے گزر چکے ہیں۔ کیا تم یہاں کوئی محل تعمیر کرنا چاہتے ہو جس کی پلاننگ میں اتنی دیر لگ رہی ہے؟''

''وہ جزیرہ کیسا رہے گا؟'' اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ وہ ایک ویران سا جزیرہ تھا جس کا رقبہ کوئی ایک مربع میل ہوگا۔ اس پر ناریل کے درختوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

''وہ ٹوباگوم ہے۔''

''کیا وہاں کوئی رہتا ہے؟''

''نہیں، کوئی نہیں رہتا۔ ویسے یہ ایک کروڑپتی کی ملکیت ہے۔''

''وہاں چلو۔'' جونی نے ہدایت کی۔

''ہر جمعے کو مچھیرے یہاں بازار لگاتے ہیں۔ پھر مچھلیوں کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں یہاں فروخت ہوتی ہیں۔''

''اوکے! مجھے یہاں اتار دو اور آدھے گھنٹے کے بعد آ کر لے جانا۔''

''ایک عورت کو ٹھکانے لگانے کے لیے آخر اتنا اہتمام کیوں؟'' البرٹ نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم اسے مار کر سمندر میں کیوں نہیں پھینک دیتے؟ شارک مچھلیاں آ کر سارا گوشت چٹ کر لیں گی۔''

''میں اپنے مخصوص انداز میں کام کرنے کا عادی ہوں۔''

''یہ بات فراموش نہ کرنا کہ آج رات مجھے پھر رپورٹ کرنا ہوگی۔''

''اوکے! اب یہاں سے دفع ہو جاؤ۔''

اس نے نورما کا سوٹ کیس اٹھالیا اور اسے ساتھ لے کر جزیرے پر چلا گیا۔ البرٹ نے بوٹ آگے بڑھادی۔ پھر اس نے پلٹ کر کہا۔ ''میں اس کی لاش دیکھنے ضرور آؤں گا چیف!''

''یہاں آنے کی کیا ضرورت ہے؟ تم دوربین لے کر بوٹ سے اس کی ہلاکت کا منظر دیکھ لینا۔ اس کے بعد یہ بھی دیکھ لینا کہ میں اسے قبر میں کیسے دفن کرتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے لیکن میری نگاہ سے اوجھل نہ ہوجانا۔''

جونی، نورما کا ہاتھ تھامے کافی آگے چلا گیا۔ ریت کے ایک ٹیلے کے قریب بیٹھ کر اس نے کہا۔ ''اب تم اپنی پیٹھ بوٹ کی طرف کر کے بیٹھ جاؤ۔'' نورما نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔

جونی نے ایک نکیلا پتھر لے کر ریت میں قبر کھودنا شروع کردی۔ ''اب میری بات غور سے سنو۔'' اس نے کہا۔ ''تھوڑی دیر بعد میں تمہیں اس قبر میں دفن کردوں گا۔''

''جونی! ایسی ہولناک باتیں مت کرو۔''

''اوہ! یہ تو میں تمہیں بتانا بھول ہی گیا تھا کہ میں تمہیں قتل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔'' وہ بولا۔ ''مگر ظاہر یہ کرنا چاہتا ہوں جیسے میں نے تمہیں قتل کردیا ہے۔''

''مگر...''

''تمہارے سوٹ کیس میں پیراکی کا لباس اور سانس لینے والا ایک ماسک ہے جس میں ٹیوب لگی ہوئی ہے۔ تم قبر میں لیٹ کر سانس لیتی رہنا۔''

''اوہ! ہاں۔'' نورما نے کہا پھر وہ رونے اور ہنسنے لگی۔ اس پر متضاد کیفیات طاری ہونے لگیں۔

''تمہارا اسٹری بیگ میں ساتھ ہی دفن کروں گا۔ اس میں دو روز کا کھانا ہے۔ تم بھوکی نہیں رہو گی۔ دو روز بعد مچھیرے یہاں آکر بازار لگائیں گے اور قرب و جوار سے لوگ یہاں آئیں گے۔ ان میں سے کسی کے ساتھ یہاں سے نکل جانا۔''

''یہاں سے نکلنے کے بعد میں کیا کروں گی؟''

''پھر تم جنوبی امریکا یا یورپ چلی جانا۔ اپنا حلیہ تبدیل کرلینا۔ بال بڑھالینا، موٹی یا دبلی ہوجانا۔ مگر پھر بھول کر بھی امریکا کی طرف نہ آنا۔''

''اوہ خدایا! تو کیا میں تمہیں دوبارہ نہیں دیکھ سکوں گی؟'' نورما نے مایوسی سے کہا۔

''اگر میں نے تم سے فوری ملاقات کی کوشش کی تو ہم دونوں ہی مارے جائیں گے۔ ہمارا یہ ڈراما کامیاب رہتا ہے تو پھر میں البرٹ کے ساتھ لگا رہوں گا۔ پھر جب وہ تنظیم کو یہ رپورٹ دے گا کہ تم ختم ہوچکی ہو، تب اس کا امکان ہے کہ میں تم سے ملاقات کرلوں۔'' جونی نے اسے سمجھایا۔

اس نے نورما کو قبر نما گڑھے میں دھکا دے کر گرادیا پھر کہا۔ ''اب میں تمہارا گلا گھونٹنے جارہا ہوں۔ تمہیں رونا، چیخنا، لاتیں چلانا اور میری کلائیوں پر ناخن مارنا ہیں تاکہ اس ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرا جاسکے۔''

''ٹھیک ہے، میں تیار ہوں۔'' اس نے آمادگی ظاہر کی۔

موت کے ڈرامے کا وہ حصہ کامیابی سے ادا کرنے کے بعد جب نورما نے اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا تو جونی نے اسے کمبل میں لپیٹا۔ پھر اس کے منہ پر ماسک لگانے کے بعد گڑھے کو مٹی سے پُر کردیا۔

نلکی کا ایک سرا اس قبر سے باہر نکلا ہوا تھا اور نورما اب منہ سے گہرے گہرے سانس لے رہی تھی جس کی آواز اسے سنائی دے رہی تھی۔ یہ کام کرنے کے دوران جونی پسینا پسینا ہوگیا تھا۔ اس نے چہرہ اور گردن صاف کی اور ساحل کی طرف پلٹا۔ پھر یہ دیکھ کر جیسے اس کا دل دھڑکنا بھول گیا کہ بوٹ ساحل پر کھڑی ہے اور البرٹ اس میں سے اتر رہا ہے۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''ہوں... بالآخر تم نے اسے ختم کر کے قبر میں لٹادیا۔ میں یہاں اس لیے آگیا کہ اس کی قبر دیکھ سکوں۔'' اس نے بوٹ میں سے تیر پھینکنے والی گن اٹھاتے ہوئے کہا۔

جونی نے محسوس کیا جیسے کوئی سرد سی چیز اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرسرا رہی ہو۔ ''تم نے دیکھ لیا ہوگا کہ میں نے اس کی گردن دبا کر اسے ہلاک کیا ہے۔ کیا تمہارے لیے یہ کافی نہیں ہے؟ اس کی قبر کا معائنہ کر کے کیا کرو گے؟''

''تم کینٹینو کو نہیں جانتے چیف! وہ آخری چیز چیک کیے بغیر مطمئن نہیں ہوتا۔'' اس نے کہا اور اسپیئر گن کا ایک سرا اپنے شانے سے ٹکا کر اس طرف بڑھنے لگا۔

جونی ٹھٹک کر کھڑا ہوگیا اور البرٹ کے نزدیک آنے کا انتظار کرنے لگا۔ نورما کی جان بچانے کا اب ایک ہی طریقہ رہ گیا تھا کہ وہ البرٹ کو ہلاک کردے۔

البرٹ جب اس سے دس فٹ کے فاصلے پر رہ گیا تو اس نے اسپیئر گن جونی کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''بس چیف! اس سے آگے بڑھنا اور نہ پیچھے ہٹنا۔ اپنی جگہ پر کھڑے رہو ورنہ تم مجھ پر اچانک حملہ بھی کرسکتے ہو۔''

مایوسی سے جونی کا دل ڈوبنے لگا۔ اس سے پہلے کہ البرٹ اس قبر کو کھودتا، اسے دوڑ کر اس پر حملہ کردینا تھا!

البرٹ اس قبر کے قریب پہنچ گیا۔ ایک جگہ اسے نلکی نکلی دکھائی دی۔ اس نے ٹھوکر ماری تو مٹی ہٹ گئی اور ٹیوب ٹیڑھی ہو کر باہر آگئی۔ ''ہاہا... بہت خوب! تو یہ سب ڈراما تھا۔ چیف! تم نے مجھے خوب بے وقوف بنایا۔''

اس نے اسپیئر گن کی نال کو اس مقام سے کچھ نیچے رکھ دیا جہاں ٹیوب لگی تھی جیسے وہ نورما کی گردن کا نشانہ لے رہا ہو۔

فیصلہ کن لمحہ آن پہنچا تھا۔

جونی کو معلوم تھا کہ نورما کے منہ کے قریب مٹی کی مقدار کم ہے اس لیے اسپیئر گن کا فولادی تیر نورما کی گردن میں پیوست ہوجائے گا اور اس کی موت میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔

''ٹھہرو البرٹ! اس اسپیئر گن میں صرف ایک تیر ہوتا ہے۔''

''ہاں... تو پھر؟''

جونی نے اس کی طرف ایک قدم بڑھا کر کہا۔ ''اس کے بعد میں اپنے ہاتھوں سے تمہاری گردن دبا کر تمہیں ہلاک کردوں گا۔''

البرٹ نے گن کی نال اس کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ ''اوہ، چیف! کیا تم چاہتے ہو کہ یہ تیر میں تمہارے سینے میں اتار دوں؟''

جونی نے اس کی طرف ایک قدم اور بڑھایا۔ اس کی گردن پسینے سے بھیگنے لگی تھی۔ ''مگر اس صورت میں بھی ایک ہی بار فائر کرسکو گے۔ میرا مطلب ہے کہ اس میں ایک ہی تیر استعمال ہوتا ہے۔''

''ہاں... اور یہ ایک ہی تیر تمہیں موت کی نیند سلا دے گا۔'' اس نے تحقیر آمیز انداز میں ہنس کر کہا اور ٹریگر پر دباؤ ڈالا۔

جونی اس کے لیے تیار تھا، وہ فوراً بیٹھ گیا۔ اسپیئر گن سے تیر زناٹے کے ساتھ نکلا اور آکر اس کے شانے میں پیوست ہوگیا۔ جونی کے شانے سے درد کی ایک شدید لہر اٹھی۔ آسمان اسے گھوم کر اپنے سر پر گرتا معلوم ہوا۔ ساری چیزیں اچانک تاریک ہونے لگیں۔ وہ آگے کو گر رہا تھا۔ البرٹ کی طرف دیکھنے میں اسے دشواری ہو رہی تھی۔

''یہ... یہ تمہارا پہلا اور... آخری فائر تھا... اب تم... مرنے کے لیے تیار ہوجاؤ۔'' اس نے یہ وقت کہا اور چوپایوں کی طرح چاروں ہاتھوں پاؤں سے اس کی طرف بڑھنے لگا۔

البرٹ نے اسپیئر گن کو کسی لاٹھی کی طرح اٹھالیا مگر پھر قبر میں سے دو ہاتھ نکل آئے اور بہت سی مٹی ہٹ گئی۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی البرٹ نے گن پھینک دی اور دوڑنے لگا۔

جونی نے اٹھنا چاہا مگر لڑکھڑا کر گر گیا۔ اس کی آنکھوں کے آگے تاریکی کی چادر گرتی جارہی تھی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ریت پر پڑے پایا۔ اس کے شانے سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے اسے چھوا تو معلوم ہوا کہ شانے کی ہڈی کے اوپر ایک سوراخ ہوگیا ہے۔ اسپیئر گن کی نکیلی سلاخ نکل چکی ہے اور زخم سے خون نکل رہا ہے۔

''اسے نہ چھوؤ جونی!'' ایک نسوانی آواز اس سے مخاطب ہوئی۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ نورما اس پر جھکی ہوئی تھی۔ اس نے اپنا بلاؤز پھاڑ کر پٹیاں بنالی تھیں اور انہیں تہ کر کے اس کے شانے کے زخم پر رکھ رہی تھی۔

''کک... کیا... البرٹ بوٹ لے کر فرار ہوگیا؟'' اس نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔

''وہ بوٹ کو لہروں کی طرف دھکیل رہا تھا کہ وہ الٹ گئی۔ البرٹ بدحواسی میں تیرنے لگا۔ یقیناً شارک مچھلیاں وہاں تیر رہی ہوں گی۔ اس لیے کہ پھر اس کی کرب ناک چیخیں سنائی دینے لگیں۔''

''اوہ! اس کا مطلب ہے کہ بوٹ ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔'' وہ بولا۔

''میں تیر کر اس تک جاؤں گی اور اسے لے آؤں گی۔''

''نہیں، اسے وہیں رہنے دو۔'' جونی نے نحیف آواز میں کہا۔ موٹر بوٹ کو الٹا دیکھ کر اور البرٹ کا ادھڑا ہوا جسم دیکھ کر وہ خود کچھ کہانیاں تراش لیں گے اور اس کے ساتھ یہ ضرور سوچیں گے کہ جونی اور نورما فرار ہوگئے۔ یہاں سے دس بارہ میل کے فاصلے پر ایک جزیرہ ہے جہاں گائے بھینسوں اور بکریوں کی بہتات ہے۔ وہاں دودھ کا کاروبار ہوتا ہے۔ اگر ہم اس کاروبار میں شریک ہوجائیں اور چند سال سادگی سے زندگی بسر کرلیں تو زندگی بچ سکتی ہے... وہ زندگی جس میں سفید چمکیلے بادل، خوش گوار دھوپ، خوش رنگ پھول اور مہکتی ہوا ہوتی ہے۔ نورما! کیا تم نیویارک کے ہنگاموں سے دور ایسی زندگی گزارنا پسند کرو گی؟''

''ہاں، اب میں ایسی ہی زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔'' نورما نے کہا اور اس کا سر اٹھا کر اپنے زانو پر رکھ لیا۔

بے سمت

کاشف زبیر

تیز نگاہ، چست، تیز رفتار، قوت سے بھرپور یہ اشارے اور استعارے اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ ان تمام خوبیوں کے حامل افراد سے بسا اوقات کوئی نہ کوئی غلطی یا سقم سرزد ہو جاتا ہے ..... فراڈ کرنے والے ایک ایسے ہی شخص کا ماجرا جس نے انتہائی ذہانت اور باریک بینی سے منصوبہ ترتیب دیا تھا۔

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا... کی عملی تفسیر... ایک سبق عنان کا کارنامہ

میک اونیل اپنے کمرے سے نکلا اور باہر جانے لگا۔ بینک کے دروازے سے نکلتے ہوئے گارڈ میسن نے اسے سلام کیا۔ ''کل ملاقات ہوگی مسٹر اونیل۔''

اونیل نے سر ہلایا۔ وہ جانتا تھا کہ اب ان میں کبھی ملاقات نہیں ہوگی۔ اس نے اپنے بے ترتیب ہو جانے والے سنہری بال ہاتھ سے درست کیے اور بینک سے نکل آیا۔ فرسٹ ویسٹ بینک ایک انویسٹ منٹ بینک تھا اور اونیل اس کی .... ہیڈ کوارٹر برانچ کا منیجر تھا۔ یہ دس منزلہ عمارت بینک کی اپنی تھی۔ صرف اس عمارت کی مالیت مولیکن ڈالرز سے زیادہ تھی۔ اونیل اچھی طرح جانتا تھا کہ بینک کی اس حسین نظر آنے والی عمارت میں دنیا کے کون کون سے مکروہ دھندے ہوتے تھے۔

سترہ سال پہلے جب اس نے یہاں کام شروع کیا تھا تو اسے اسی وقت سے اس کام اور اس عمارت سے نفرت ہوگئی تھی۔ لیکن وہ اس وجہ سے اسے چھوڑ کر نہیں جا رہا تھا۔ باہر آ کر اس نے ایک ٹیکسی روکی اور اسے ایک ہوٹل کا نام بتایا۔ دس منٹ بعد ٹیکسی نے اسے ہوٹل کے سامنے اتارا مگر وہ اندر نہیں گیا۔ جیسے ہی ٹیکسی وہاں سے روانہ ہوئی، وہ سڑک عبور کر کے دوسری طرف آیا اور اس نے ایک اور ٹیکسی پکڑی اور اسے ایک نواحی بستی کا پتا بتایا۔ راستے میں اس نے اپنی عینک بدل لی اور ایک کسی قدر موٹے فریم کی سستی نظر آنے والی عینک لگا لی۔ سر پر اس نے ایک معمولی سی پی کیپ پہن لی اور کوٹ اتار دیا۔ اس کے نیچے اس نے سستی سی شرٹ پہن رکھی تھی۔ جب وہ ایک معمولی سی عمارت کے سامنے ٹیکسی سے نکلا تو اس کا حلیہ بالکل بھی قابل توجہ نہیں تھا۔ اس نے کرایہ ادا کیا اور ٹیکسی کے جانے کے بعد اس عمارت کے بجائے ایک اور بلڈنگ کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے دوسرے فلور پر ایک فلیٹ کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوا اور اس نے سب سے پہلے اپنا لباس اتارا۔ نہانے کے بعد اس نے ایک جدید قسم کے ہیئر کلر سے اپنے بالوں کا رنگ تبدیل کیا۔ اپنی نفیس قسم کی مونچھیں صاف کیں اور آنکھوں میں سرمئی رنگ کے کونٹیکٹ لینس لگائے۔ اس کی آنکھوں کا اصل رنگ ہلکا نیلا تھا۔ ان تبدیلیوں کے بعد وہ ایک مکمل بدلا ہوا انسان نظر آنے لگا تھا۔ اس کے سنہری بال اب سرخی مائل سنہری ہو گئے تھے۔ اس کے نزدیکی شناسا بھی اسے آسانی سے نہیں پہچان سکتے تھے۔

فلیٹ میں صرف اس کا ایک سوٹ کیس تھا۔ اس نے سوٹ کیس میں سے ٹی شرٹ اور جینز نکال کر پہنی اور اپنے اتارے جانے والے کپڑے اور چند چھوٹی موٹی چیزیں ایک شاپر میں ڈالیں اور سامان سمیت فلیٹ سے باہر آ گیا۔ کچھ دور ہی ایک بس اسٹاپ تھا۔ شاپر اس نے بس اسٹاپ کے راستے میں آنے والے گاربیج کنٹینر میں پھینک دیا۔ اب اس کے پاس صرف سوٹ کیس تھا۔ بس اسٹاپ پر اسے دس منٹ انتظار کرنا پڑا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد بس نے اسے نیویارک کے بس ٹرمینل کے سامنے اتار دیا۔ اس کے پاس ایک گرے ہاؤنڈ بس کا ٹکٹ پہلے سے موجود تھا اور وہ سیدھا اس شیڈ میں چلا گیا جہاں مطلوبہ بس آ کر لگتی۔ بس کے آتے ہی وہ اس میں سوار ہو گیا۔ اس کا سوٹ کیس بہت بڑا نہیں تھا۔ وہ آسانی سے اوپر بنے خانے میں آ گیا۔ اس کی نشست وسط میں تھی۔ مقررہ وقت پر بس روانہ ہوئی اور اس نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا آئی فون نکالا اور اس کی مدد سے انٹرنیٹ آن کیا۔ اس نے ایک سائٹ کھولی اور اس میں کچھ کوڈز داخل کیے۔ فوراً ہی ایک آف شور بینک کا مین پیج کھل گیا۔ اس نے آئی

ڈی اور پاس ورڈ کی مدد سے اپنا اکاؤنٹ کھولا اور بیلنس چیک کیا۔ اس کے سامنے رقم آگئی تھی۔ یہ پچیس ملین ڈالرز تھے۔ وہ مسکرانے لگا۔ اس کا ماضی ختم ہوگیا تھا اور وہ ایک نئے مستقبل کی طرف جارہا تھا، پچیس ملین ڈالرز کے ساتھ!

☆☆☆

کرسٹینا اینجل نے اپنے چھ سالہ بیٹے تھامس کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے دوڑنے لگی۔ اسے آنے میں کچھ دیر لگی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ اس کی بس نہ چھوٹ جائے۔ ایک بھاری بیگ اس کے نازک شانے پر تھا اور دوسرے ہاتھ میں ایک سوٹ کیس بھی تھا۔ وہ ہانپتے کانپتے شیڈ میں داخل ہوئی تو بس کا دروازہ بند ہورہا تھا۔ اس نے بے تابی سے ہاتھ ہلایا تو ڈرائیور نے دروازہ کھول دیا۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کیونکہ یہ بس نکل جاتی تو اگلی بس اسے بارہ گھنٹے بعد ملتی۔ اسے ایلی نوائز کے دارالحکومت اسپرنگ فیلڈ کے پاس ایک قصبے تک جانا تھا۔

اس کے جاننے والے اسے کرسٹی کہتے تھے اور وہ کچھ عرصے پہلے تک ایک بہت اچھی کمپنی میں بہت اچھے عہدے پر کام کررہی تھی۔ اس نے اپنی تنخواہ کے بل پر نہ صرف ایک شان دار کار قسطوں پر لے لی تھی بلکہ ایک مکان بھی قسطوں پر حاصل کرلیا تھا۔ اس سے پہلے وہ کرائے کے مکان میں رہ رہی تھی۔ دونوں چیزوں کی قسطیں ادا کرنے میں اس کی نصف تنخواہ نکل جاتی تھی۔ اس کے باوجود وہ خوش تھی۔ پھر اچانک ہی حالات نے پلٹا کھایا اور کمپنی کی پروڈکشن گرنے لگی۔ نوبت یہاں پہنچی کہ کمپنی نے لوگوں کو فارغ کرنا شروع کردیا۔ اگر کرسٹی اس وقت نکالی جاتی تو فائدے میں رہتی کیونکہ اسے کچھ نہ کچھ واجبات مل جاتے لیکن جب کمپنی اچانک ہی دوالیا ہوگئی اور اس کے دفتر پر تالا لگ گیا تو ظاہر ہے کرسٹی یا کسی اور ملازم کو کچھ نہیں ملا اور وہ خالی ہاتھ کمپنی سے رخصت ہوئے تھے۔ مزید بدقسمتی یہ کہ کمپنی نے آخری دنوں میں تالا بندی کی تھی اس لیے وہ مہینے کی تنخواہ سے بھی گئے تھے۔

کرسٹی کے پاس خاص جمع پونجی بھی نہیں تھی کہ وہ گھر میں بیٹھ کر کھاتی۔ اس نے دوسری جاب کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کیے تو اس پر انکشاف ہوا کہ اول تو کوئی جاب نہیں ہے اور جو ہے اس میں تنخواہ اتنی بھی نہیں تھی کہ وہ مکان اور کار کی قسطیں دے سکتی۔ اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ یہ دونوں چیزیں واپس کردے۔ ان کی رقم اسے چھ مہینے بعد ملتی۔ ان حالات میں اسے اب صرف صبر کرنا تھا۔ یہ وقت گزارنے کے لیے اس نے ایک ملازمت کرلی۔ اس کا ارادہ تھا کہ رقم ملے گی تو وہ کوئی چھوٹا اپارٹمنٹ خرید لے گی مگر اس کی مزید بدقسمتی کہ اسے اس ملازمت سے بھی جواب مل گیا۔ حالات کچھ زیادہ ہی خرابی کی طرف جارہے تھے۔ کوششوں کے باوجود اسے کوئی جاب نہیں ملی تھی۔

ان دنوں کرسٹی کے باپ جیو اینجل کا فون آیا اور اس کے حالات جان کر جیو نے اسے اپنے پاس آنے کو کہا۔ ”تم یہاں آجاؤ۔ جب تک حالات ٹھیک نہیں ہوتے، تم میرے پاس رہو۔“

”ڈیڈی! ٹام کا مسئلہ ہے۔ اس کا اسکول...“

”اسکول یہاں بھی ہیں۔“ جیو اینجل نے اس کی بات کاٹی۔ ”بس تم آجاؤ۔“

کرسٹی ہچکچائی۔ ”ڈیڈی! آپ کو تکلیف ہوگی۔“

”میری بچی! میں اکیلا آدمی ہوں۔“ جیو نے ملائمت سے کہا۔ ”تم سے مجھے کبھی تکلیف نہیں ہوگی اور ویسے بھی یہ سب کچھ تمہارا ہی تو ہے۔ ابھی نہیں تو کچھ عرصے بعد تمہیں یہ سب سنبھالنا ہی پڑے گا۔“

”پلیز ڈیڈی! ایسی باتیں نہ کریں۔“ کرسٹی نے کہا۔ ”اچھا میں اور ٹام آرہے ہیں۔“

اس نے اپنی ساری چیزیں فروخت کردیں اور اسپرنگ فیلڈ جانے کی تیاری کرنے لگی۔ گھر سے نکلنے میں دیر ہوگئی تھی اور اس کی بس مس ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ اغوا سے اس کی اور ٹام کی نشست الگ الگ تھی۔ ٹام کو ایک آدمی کے ساتھ جگہ ملی تھی جبکہ کرسٹی اس سے دو سیٹ پیچھے تھی۔ اس نے اپنے ساتھ موجود عورت سے درخواست کی کہ وہ آگے چلی جائے تاکہ وہ اپنے بیٹے کو اپنے پاس لے آئے مگر اس نے انکار کردیا۔

”سوری! میں کھڑکی کے پاس بیٹھنا پسند کروں گی۔“

ٹام کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس نے دلچسپی سے اس شخص کو دیکھا۔ وہ سیٹ کی پشت سے سر ٹکائے ہوئے تھا مگر سو نہیں رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ آنکھیں کھول کر باہر دیکھ لیتا تھا۔ ٹام ذرا آگے ہو کر باہر کے مناظر دیکھنے کی کوشش کررہا تھا۔ اچانک اس آدمی نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور مسکرایا۔

”ہیلو... کیا تم باہر دیکھنا چاہتے ہو؟“

”یس سر!“ ٹام نے شائستگی سے کہا۔ ”میرا نام تھامس ہے۔ مما مجھے پیار سے ٹام کہتی ہیں۔“

”مما؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”وہ پیچھے ہیں۔“ ٹام نے عقبی نشست کی طرف اشارہ کیا۔

اس نے سر گھما کر دیکھا تو کرسٹی مسکرادی۔ وہ ان کی باتیں سن رہی تھی اور اس امید میں تھی کہ وہ آدمی اس سے اپنی نشست بدل لے گا۔ اس کی توقع پوری ہوئی۔ وہ آدمی فوراً کھڑا ہوگیا۔ ”میرا خیال ہے کہ تم اپنی مما کو اپنے پاس بلالو۔ میں اس کی نشست پر چلا جاتا ہوں۔“

”تھینک یو سر۔“ ٹام خوش ہوگیا۔

کرسٹی بھی فوراً کھڑی ہوگئی تھی۔ ”شکریہ مسٹر...“ اس نے کہا۔

”سلور مین۔“ اس آدمی نے تعارف کرایا۔

”مجھے کرسٹینا کہتے ہیں۔ ہم اسپرنگ فیلڈ جارہے ہیں۔“

”میں آگے جاؤں گا۔“ اس نے کہا لیکن اپنی منزل کی وضاحت نہیں کی۔ جیسے ہی وہ کرسٹی کی... نشست پر آنے لگا تو کرسٹی کے برابر میں بیٹھی عورت نے اعتراض کیا۔

”میں کسی مرد کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتی۔“

”یہ سیٹ کسی مرد کو بھی مل سکتی تھی۔“ کرسٹی نے اسے سمجھانا چاہا۔

”ہاں لیکن ابھی تو تم یہاں ہو اس لیے میرا حق ہے کہ میں کسی اور کے ساتھ بیٹھنے سے انکار کردوں۔“ عورت ہٹ دھرمی سے بولی۔

”کیا مطلب... تم چاہتی کیا ہو؟“ کرسٹی کو اس پر غصہ آگیا۔

اس بات پر ذرا سا ہنگامہ ہوا مگر اس آدمی اور دوسروں کی کوشش سے جلد رفع ہوگیا۔ ویسے یہ اس عورت کا حق تھا کہ وہ اپنے برابر میں مرضی کے شخص کو بٹھائے۔ ٹام نے ماں کو تسلی دی۔

”میں ٹھیک ہوں مام۔ مسٹر مین بہت اچھے آدمی ہیں۔“

”او کے!“ کرسٹی نے بادل ناخواستہ کہا۔ ”لیکن تم انہیں تنگ مت کرنا۔“

”کوئی بات نہیں، مجھے بچے اچھے لگتے ہیں۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔ وہ پھر سے اپنی نشست پر آگیا۔ اس نے کھڑکی والی نشست ٹام کو دے دی تھی۔ ٹام اس کے بارے میں جستجو تھا۔ اس نے کچھ دیر بعد ہی سوالات شروع کردیے تھے مگر اس آدمی نے بڑی مہارت سے اس کے سوالات کا رخ اس کی دلچسپی کی چیزوں کی طرف موڑ دیا تھا۔ رات کے آثار شروع ہوچکے تھے۔ کچھ دیر بعد ٹام کو نیند آنے لگی۔ اس نے نشست پیچھے کرکے سر ٹکالیا۔

کرسٹی تھوڑی دیر بعد اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے ٹام سے کھانے کا پوچھا مگر اس نے انکار کردیا۔ اس نے بھی اپنی سیٹ پیچھے کرنی اور آنکھیں بند کرکے اونگھنے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ پتا نہیں وہ دیہاتی طرزِ زندگی میں رہ پاتی ہے یا نہیں۔ اسے گھر سے نکلے ہوئے پندرہ سال ہوچکے تھے۔ اس کے بعد وہ چند دن سے زیادہ باپ کے گھر نہیں رکی تھی۔ نیویارک جیسے شہر میں رہنے کے بعد اس کا وہاں دم گھٹتا تھا۔

☆☆☆

سینڈلر ریگون ایک کروڑ پتی شخص تھا لیکن اس کی دولت کا بیشتر حصہ بلیک منی کی صورت میں تھا اور یہ دولت اس نے جعلی ناموں سے مختلف بینکوں میں جمع کرا رکھی تھی۔ اس کے کچھ مالی مشیر تھے جو اس کی دولت کو ہمہ وقت سفید کرنے کی کوششوں میں مصروف رہا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک مشیر میگر ڈگنگ تھا جو اس کا سرمایہ مختلف میوچل فنڈز میں لگاتا تھا۔ اس کے پاس ایک اکاؤنٹ تھا جس میں تقریباً تیس ملین ڈالرز تھے۔ یہ ساری بلیک منی تھی جو سرمایہ کاری کے ذریعے سفید کی جاتی تھی۔ میگر ڈیہ کام خود بھی کرتا تھا اور سینڈلر کی ہدایات پر بھی کرتا تھا۔ وہ صبح سے شام تک کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا مختلف کمپنیوں کے اسٹاک چیک کرتا اور جن میں سے اسے نفع کی خوشبو آتی تھی، وہ ان میں معمولی سی رقم لگا دیتا تھا۔ شام کو اس نے کام ختم کرنے سے پہلے اکاؤنٹ چیک کیا۔ جب بیلنس سامنے آیا تو وہ اچھل پڑا۔ اکاؤنٹ میں پانچ ملین ڈالرز تھے۔ اس نے پھر اکاؤنٹ چیک کیا، سہ

ڈاکٹری

اپنے غیر معمولی اثر کے باعث ایک ڈاکٹر اپنی خواب گاہ میں سونے ہی والا تھا کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ڈاکٹر نے اپنی بیوی سے کہا۔ ”ڈارلنگ! ذرا سننا کون ہے۔ اور اس سے میرے موجود نہ ہونے کا کوئی بہانہ بنا دینا۔“ بیوی نے فون پر کہہ دیا کہ ڈاکٹر صاحب اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔

دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”میں مسز اکبر بول رہی ہوں۔ میرے گھٹنوں میں درد ہورہا ہے۔“ ڈاکٹر نے سرگوشی میں بیوی کو کچھ ہدایتیں سنا دیں جو ڈاکٹر کی بیوی نے مسز اکبر کو بتا دیں۔ مسز اکبر نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

”ذرا ایک بات اور بتا دیجیے یہ جو کوئی بی صاحبہ آپ کے ساتھ ہیں کیا یہ بھی ڈاکٹری پڑھے ہوئے ہیں؟“

بار چیک کیا اور بار بار چیک کرتا چلا گیا۔ ہر بار ایک ہی جواب آرہا تھا۔ اس کی پیشانی پسینے سے بھیگنے لگی۔ پچیس ملین ڈالرز کی رقم اکاؤنٹ سے غائب تھی۔ آج صبح تک یہ رقم موجود تھی۔

اس نے جھپٹ کر فون اٹھایا اور بینک کے سسٹم منیجر سے رابطہ کیا۔ مخصوص پاس ورڈ دہرانے پر اس کا رابطہ بینک کے مین سرور کمپیوٹر سے ہوگیا تھا۔ اس نے اکاؤنٹ بیلنس کی تصدیق چاہی تو اس بار بھی جواب وہی تھا۔ اکاؤنٹ میں پانچ ملین ڈالرز کی رقم تھی۔ اس بار اس نے بینک کے ایک ڈائریکٹر کو کال کی۔ صورتِ حال جان کر وہ بھی بدحواس ہو گیا۔ اس نے میگرڈ سے کہا۔

''تم دس منٹ انتظار کرو، میں ابھی بتاتا ہوں۔''

دس منٹ بعد ڈائریکٹر کی کال آئی۔ ''رقم آج شام پانچ بجے ٹرانسفر ہوئی ہے۔''

''کہاں ٹرانسفر ہوئی ہے۔''

''ایک مقامی بینک کے اکاؤنٹ میں۔''

''کس نے کی ہے؟'' میگرڈ بولا۔ ''میں نے ایسی کوئی ٹرانزیکشن نہیں کی ہے۔''

''ٹرانزیکشن تمہارے اکاؤنٹ سے ہوئی ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ سو فی صد قانونی ہے۔''

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟'' میگرڈ چراغ پا ہوگیا۔ ''تم مجھے اس معاملے میں بیوقوف نہیں بنا سکتے۔ تمہارا سسٹم بریک ہوا ہے۔''

ڈائریکٹر نے انکار کیا مگر میگرڈ نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ اس نے سینڈلر سے رابطہ کیا اور تمام صورتِ حال اس کے علم میں لے آیا۔ بے شک سینڈلر کروڑ پتی تھا لیکن پچیس ملین ڈالرز کی رقم معمولی نہیں ہوتی۔ وہ اچھل پڑا۔ اس نے فوری طور پر بینک کے صدر سے بات کی اور اس کے ایک گھنٹے بعد وہ میگرڈ کے ساتھ بینک کی عمارت کے آخری فلور پر موجود تھا۔ میٹنگ میں بینک کا صدر اور اس کے بعض ڈائریکٹرز بھی شامل تھے۔ میگرڈ نے معاملہ اس کے سامنے رکھا۔

''یہ ٹرانزیکشن ہماری طرف سے نہیں ہوئی ہے۔''

''ہمارے ماہرین اس معاملے کو دیکھ رہے ہیں۔'' صدر نے کہا۔ ''کیونکہ بہ ظاہر کوئی بریک نہیں ہے۔ رقم کی منتقلی قانونی طریقے سے ہوئی ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ یہ کام میں نے یا میگرڈ نے کیا ہے؟'' سینڈلر کا لہجہ سرد تھا۔

''تب تم بتاؤ کہ کیا ہوا ہے۔ اتنی حفاظت کے ساتھ آپریٹ کیے جانے والے اکاؤنٹ کو کوئی کیسے بریک کر سکتا ہے؟'' صدر نے ہاتھ پھیلائے۔

''میں یہ سب نہیں جانتا۔'' سینڈلر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے صرف اتنا پتا ہے کہ میرے پچیس ملین ڈالرز غائب ہیں اور مجھے بہرصورت یہ واپس چاہئیں۔'' اس کا لہجہ دھمکی آمیز ہوگیا۔

''ہم کوشش کر رہے ہیں۔'' صدر کی پیشانی بھی پسینے سے بھیگ گئی۔ اسے معلوم تھا کہ اگر یہ اسکینڈل منظرِ عام پر آگیا تو اس کا کیریئر ختم ہو جائے گا اور اسے جیل جانے سے بھی کوئی نہیں بچا سکے گا۔ ''اس میں کچھ وقت لگے گا۔ اس قسم کے فراڈز میں رقم کبھی ایک اکاؤنٹ میں ٹرانسفر نہیں کی جاتی بلکہ پیرالل اکاؤنٹس استعمال کیے جاتے ہیں۔ ہر ایک اکاؤنٹ کی معلومات حاصل کرنے میں دو دن کا وقت لگتا ہے۔''

میگرڈ جانتا تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے مگر اپنے باس کی خوشنودی کے لیے اس نے تند لہجے میں کہا۔ ''مسٹر پریزیڈنٹ ہم یہ سب نہیں جانتے۔ ہمیں ہر صورت میں اپنی رقم چاہیے۔''

''مجھے رقم کے ساتھ وہ شخص بھی چاہیے جس نے یہ حرکت کی ہے۔'' سینڈلر نے اچانک نیا مطالبہ کر دیا۔ بینک والے جانتے تھے کہ ان کے لیے بہت مشکل وقت آگیا ہے۔ سینڈلر مافیا مین تھا اور وہ اس کی کالی دولت سفید کر رہے تھے۔ وہ دونوں طرف سے گھر گئے تھے۔

☆☆☆

رات کا وقت تھا اور تقریباً سب ہی سو رہے تھے۔ سابق میک اونیل اور اب سلور... واش روم سے آیا تو نام کھڑکی سے سر لگائے بے خبر سو رہا تھا۔ اس نے اسے سیدھا کیا اور اس کی سیٹ بیلٹ باندھ دی اور اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک بار پھر اپنا آئی فون نکالا اور اس کی مدد سے انٹرنیٹ پر لاگ ان ہوا۔ اس نے اپنا آف شور اکاؤنٹ کھولا اور اس میں موجود رقم باری باری چند مقامی بینکوں کے اکاؤنٹ میں منتقل کرنے لگا۔ اس نے ساری رقم پانچ پانچ ملین ڈالرز کر کے پانچ مختلف اکاؤنٹس میں منتقل کر دی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ چھپا نہیں رہے گا لیکن بینک کو اپنی رقم تلاش کرنے میں کم سے کم بیس دن درکار ہوں گے اور اس دوران میں وہ یہ ساری رقم کیش کرا چکا ہوگا۔ اس کے بعد وہ غائب ہو جائے گا۔

میک اونیل تقریباً چالیس برس کا متوسط قد و قامت کا خوش رو شخص تھا۔ اس نے شادی نہیں کی تھی اور نہ ہی اس کی کوئی گرل فرینڈ تھی۔ اس کی چند خواتین سے دوستی رہی تھی لیکن یہ بہت عارضی نوعیت کی تھی۔ جس وقت اس نے بینکنگ کا پیشہ اختیار کیا تھا، اسی وقت اپنا مقصد طے کر لیا تھا۔ اس نے بہت سکون سے اپنا کام کیا تھا اور وہ آج کامیاب ہو گیا تھا۔

نیویارک سے روانہ ہونے والی گرے ہاؤنڈ کمپنی کی یہ بس سان فرانسسکو تک جا رہی تھی۔ وہاں سے میک ساحل کے ساتھ ساتھ میکسیکو کی طرف روانہ ہو جاتا اور راستے میں آنے والے اے ٹی ایمز سے کیش لیتا جاتا۔ پچیس ملین ڈالرز کی رقم اے ٹی ایم سے نکلوانا آسان نہیں تھا۔ اسے کئی دفعہ اے ٹی ایمز پر جانا پڑتا لیکن اس کا ارادہ میکسیکو جانے کا نہیں تھا۔ وہ میامی کا رخ کرتا اور اس رقم کا ایک بڑا حصہ لا کر میں محفوظ کرنے کے بعد وہ کینیڈا کی پرواز پکڑتا اور اس ملک سے نکل جاتا۔ کینیڈا سے وہ یورپ اور وہاں سے وہ روس چلا جاتا۔ ان پچیس ملین ڈالرز کی مدد سے وہ وہاں ٹھاٹ سے زندگی بسر کر سکتا تھا۔ یہ اس کا مکمل منصوبہ تھا اور اس نے اس کا پہلا حصہ کامیابی سے مکمل کر لیا تھا۔ وہ سوچوں میں گم تھا کہ عقب سے کرسٹی نے اسے آہستہ سے پکارا۔ ''مسٹر کین! کیا نام سو رہا ہے؟''

''ہاں۔'' وہ چونکا۔ ''وہ سکون سے سو رہا ہے۔ تم بھی سو جاؤ۔''

''مجھے بس کے سفر میں نیند نہیں آتی۔'' اس نے کہا۔

میک اس کی طرف مڑا۔ ''مجھے بھی بس میں نیند نہیں آتی ہے۔''

کرسٹی تقریباً بتیس برس کی دل کش عورت تھی۔ اس کا جسم کسی قدر بھاری لیکن چہرے پر تازگی اور تیکھا پن تھا۔ ''تم کہاں جا رہے ہو؟'' اس نے کسی قدر تردد سے اس سے پوچھا۔

''سان فرانسسکو۔'' اس نے بھی ہچکچا کر جواب دیا۔ ''اور تم؟''

''میں اسپرنگ فیلڈ کے پاس ایک قصبے ڈیری ڈن تک جا رہی ہوں۔ وہاں میرے ڈیڈی رہتے ہیں۔''

''تم ان سے ملنے جا رہی ہو؟''

''نہیں، میں کچھ عرصے کے لیے ان کے پاس رہنے جا رہی ہوں۔''

''تمہارا شوہر...''

''میں اکیلی ہوں۔'' اس نے بات کاٹ کر کہا۔ ''میرا شوہر چار سال پہلے عراق میں مارا گیا تھا۔''

''اوہ، مجھے افسوس ہے۔ وہ میرین تھا؟''

''نہیں وہ کنٹریکٹر تھا اور فوج کو سپلائی کرتا تھا۔''

پھر وہ خاموش ہو گئے۔ دونوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مزید کیا بات کریں۔ میک نے کہا۔ ''نام بہت پیارا بچہ ہے۔''

''ہاں اور مجھے حیرت ہے کہ وہ تم سے اتنی جلدی فری ہوگیا۔ حالانکہ یہ مردوں کو پسند نہیں کرتا ہے۔''

''اس نے شہر میں پرورش پائی ہے، کیا یہ گاؤں میں رہ لے گا؟'' میک نے نام کی طرف دیکھا۔

''یہ خوش ہے۔'' کرسٹی نے کہا۔ ''البتہ مجھے مشکل ہو گی کیونکہ گاؤں میں رہنے کی عادت نہیں رہی ہے۔''

''ایسا ہوتا ہے، میں خود ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا اور میں اسکول کی عمر تک گاؤں میں ہی رہا تھا۔''

''پھر تم شہر آگئے؟'' کرسٹی نے سوال کیا۔

''نہیں، میں حب الوطنی کے نام پر فوج میں چلا گیا تھا اور خلیج کی پہلی جنگ لڑی تھی۔ وہاں ایک گولہ قریب پھٹا تو میرا پاؤں زخمی ہو گیا۔ مجھے فوج سے ڈسچارج کر دیا گیا۔'' اس کا لہجہ تلخ ہوگیا۔

''پھر تم نے کوئی کام کیا؟'' کرسٹی نے پوچھا تو وہ چونک گیا۔ سے پہلی بار احساس ہوا کہ وہ کسی کو اپنے بارے میں کچھ زیادہ ہی بتا چکا ہے۔ اس نے گول مول سے انداز میں کہا۔

''مختلف کام کرتا رہا۔ کسی جگہ ٹک کر کام نہیں کیا۔''

کرسٹی اس میں زیادہ ہی دلچسپی لے رہی تھی۔ ''تم کام کی تلاش میں سان فرانسسکو جا رہے ہو؟''

''ہاں، کچھ ایسی ہی بات ہے۔'' اب وہ اس موضوع کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ کسی کا اس کے بارے میں زیادہ جاننا اس کے لیے نقصان دہ ہو سکتا تھا۔ اس نے اونگھنے کی اداکاری کرتے ہوئے نشست سے سر ٹکا لیا۔ ابھی اسپرنگ فیلڈ تک پہنچنے میں کئی گھنٹے باقی تھے۔ یہ ایکسپریس بس تھی جو نیویارک سے اسپرنگ فیلڈ چودہ گھنٹے میں پہنچا دیتی تھی۔ یعنی وہ صبح آٹھ بجے اسپرنگ فیلڈ میں ہوتے۔ پھر اسے سچ مچ نیند آگئی۔ اسے خبر نہیں کہ کتنی دیر گزری تھی۔ اچانک ہی اسے لگا جیسے بس میں زلزلہ آگیا ہو۔ وہ ہوا میں اچھلا تھا اور اس کا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا تو تکلیف کی شدت سے اس کی جان نکل گئی۔

دراصل بس تیز رفتاری میں تھی کہ کسی جانور کے

اچانک سڑک پر آجانے کی وجہ سے ڈرائیور نے فل بریک لگایا۔ باقی سب نے سیٹ بیلٹ باندھ رکھی تھی مگر بدقسمتی سے میک بھول گیا تھا۔ اس لیے وہ زور میں آگے گیا تو اس کا گھٹنا آگے والی نشست کے معدنی حصے سے ٹکرایا۔ وہ نیچے گر پڑا۔ اس دھچکے نے سب کو بیدار کر دیا تھا۔ بس رکی تو سب سے پہلے ٹام اس کے پاس آیا اور اسے اٹھانے کی کوشش کی۔ وہ خود بھی اٹھ رہا تھا۔ اسے لگا کہ جیسے اس کے گھٹنے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ کرسٹی بھی آگئی تھی۔ اس نے سہارا دے کر اسے نشست پر بٹھایا۔

''تمہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی ہے؟'' وہ پریشان ہو گئی تھی۔

''مجھے لگ رہا ہے کہ میرا گھٹنا ٹوٹ گیا ہے۔'' اس نے درد کی شدت کو برداشت کرتے ہوئے کہا۔ کرسٹی نے احتیاط سے اس کی پتلون کا پائنچہ اوپر کیا۔ اس کا گھٹنا سوجنا شروع ہو گیا تھا۔

''تمہیں اسپتال لے جانا ہوگا۔'' کرسٹی نے فکرمندی سے کہا۔

بس ڈرائیور لوگوں کو وضاحت پیش کر رہا تھا کہ اس نے کس وجہ سے اچانک بریک لگایا تھا۔ جب اسے میک کی چوٹ کا پتا چلا تو اس نے ایمبولینس کے لیے کال کر دی تھی۔ اس وقت وہ ایپرنگ فیلڈ کے پاس ہی تھے۔ جیسے ہی بس شہر میں داخل ہونے لگی ایمبولینس آگئی تھی۔ عملے نے احتیاط سے میک کو اس میں منتقل کیا۔ اترنے سے پہلے اس نے اپنا سوٹ کیس کرسٹی کے سپرد کر دیا تھا۔ ''مجھے نہیں معلوم کہ مجھے کتنے عرصے اسپتال میں رہنا ہوگا، اس لیے یہ چیزیں تم رکھو۔ میں وہاں سے نکل کر لے لوں گا۔'' اس نے فکرمند لہجے میں کرسٹی سے درخواست کی۔

''تم فکر مت کرو، یہ میرے پاس محفوظ رہے گا۔'' کرسٹی نے اسے اپنا سیل نمبر دیا۔ ''تم اس پر مجھ سے رابطہ کر لینا۔ میں خود تمہیں لینے آؤں گی۔''

''نہیں، تم زحمت مت کرنا۔'' میک نے اسے منع کیا۔ ''جب میں اسپتال سے فارغ ہو جاؤں گا تو خود تمہیں کال کر دوں گا۔''

وہ بس سے اتر کر اس کے ساتھ ایمبولینس تک آئی۔ ٹام بھی ساتھ تھا۔ عملے نے اسے ایمبولینس میں شفٹ کیا۔ ساتھ آنے والے ڈاکٹر نے احتیاطاً اس کے گھٹنے پر سخت پٹی باندھ دی تھی۔ ایمبولینس چلی گئی تو کرسٹی اور ٹام بس میں واپس آگئے۔ بس آگے روانہ ہو گئی اور کچھ دیر کے بعد وہ بس ٹرمنل پر تھے۔ وہاں اتر کر کرسٹی نے ٹیکسی لینے کا سوچا تھا کہ اسے جیو نظر آیا۔ وہ اسے لینے آیا ہوا تھا۔ ٹام اس کی طرف دوڑا اور اس سے لپٹ گیا۔

''گرینڈ پا۔''

''میرا بیٹا۔'' جیو نے بے تابی سے اسے گود میں لے لیا۔ کرسٹی آکر اس کے بازو سے لگ گئی۔ جیو نے اسے بازو میں لے کر ماتھے پر پیار کیا۔

''آپ کیوں آئے، میں آجاتی ڈیڈی۔''

''میں نے گھر میں انتظار کی زحمت برداشت کرنے کے بجائے یہاں آنا مناسب سمجھا۔'' جیو نے اس کا سامان اٹھا لیا۔ اس کی کار ٹرمنل کی پارکنگ میں کھڑی تھی۔ یہ پرانے ماڈل کی بڑی شیورلیٹ تھی۔ وہ ٹرمنل سے نکلے تو کرسٹی راستے میں باپ کو اپنے بارے میں بتانے لگی۔ پھر اس نے میک کے بارے میں بتایا۔ جیو چونک گیا۔

''کرسٹی! تم ہر کسی پر اعتماد کر لیتی ہو۔ نہ جانے وہ کون ہے۔''

''وہ کوئی بھی ہو ڈیڈی، مجھے اس سے کیا لینا ہے۔ بس وہ اسپتال سے نکل کر اپنا سامان لے گا اور چلا جائے گا۔'' کرسٹی نے باپ کو تسلی دی۔

''سامان اس کا اسپتال والے بھی رکھ سکتے تھے۔ پھر اس نے تمہیں کیوں دیا؟'' جیو نے سوال کیا۔

''یہ تو میں نے نہیں سوچا۔ ہو سکتا ہے کہ اسے اسپتال والوں پر اعتماد نہ ہو۔'' کرسٹی نے وضاحت پیش کی۔

''اور تم پر اس نے اعتماد کر لیا... جس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا؟''

''ڈیڈی! وہ ہمیں کیا نقصان پہنچا سکتا ہے؟ ہمارا تو اس کے پاس کچھ نہیں ہے، اسی کا سامان ہمارے پاس ہے۔''

جیو، بیٹی کی بات سن کر چپ رہا لیکن اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ مطمئن نہیں تھا۔

☆☆☆

بینک والوں کو یہ جاننے میں ایک دن لگا تھا کہ اس واقعے کے پیچھے میک اوینل کا ہاتھ تھا اور وہ غائب ہے۔ اس نے اپنی رہائش گاہ ایک ہفتہ پہلے چھوڑ دی تھی۔ اس دوران میں اس نے کسی طریقے سے میگزڈ اور سینڈلر کا اکاؤنٹ حاصل کر کے پچیس ملین ڈالرز کی رقم اپنے ایک اور اکاؤنٹ میں منتقل کی تھی۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ دس منٹ بعد ہی رقم اس اکاؤنٹ سے دوسرے بینک کے اکاؤنٹ میں منتقل کر دی گئی تھی اور یہاں سے بینک والوں کے لیے پریشانی شروع ہوئی

تھی۔ اب دوسرے بینک کے اکاؤنٹ کے بارے میں معلوم کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا کیونکہ بینک اپنے اکاؤنٹ ہولڈرز کے بارے میں معلومات ممکن حد تک خفیہ رکھتے ہیں۔ سینڈلر کو ابھی رقم تو واپس نہیں ملی تھی لیکن اسے اس شخص کا پتا چل گیا تھا جس نے اس کے ساتھ دھوکا کیا تھا۔

سینڈلر کا تعلق زیر زمین دنیا سے تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ نیویارک آنے والی منشیات کا نصف اس کے توسط سے آتا تھا۔ اس کا تعلق کسی مافیا سے نہیں تھا مگر اپنی جگہ وہ خود کسی مافیا سے کم نہیں تھا۔ جیسے ہی اسے میک اونیل کے بارے میں معلوم ہوا، اس نے اپنے سب سے آزمودہ آدمی راکی کو کال کی۔ ''میرے دفتر آجاؤ۔''

''میں آرہا ہوں باس۔'' اس نے مستعدی سے کہا۔

دس منٹ بعد وہ اس کے سامنے تھا۔ سینڈلر نے میک اونیل کی تصویر اور اس کے بارے میں معلومات پر مشتمل ایک کاغذ اس کے سامنے رکھ دیا۔ ''مجھے ہر قیمت پر یہ شخص درکار ہے۔''

راکی نے تصویر دیکھی۔ ''کیا یہ شخص نیویارک میں ہے؟''

''یہ شخص اس دنیا میں ہے۔'' سینڈلر نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اور یہ مجھے زندہ چاہیے۔''

''میں سمجھ گیا باس۔'' راکی مستعد ہو گیا۔

''اس کام کے لیے تمہارے پاس صرف دس دن ہیں، اس کے بعد یہ شاید کبھی نہ ملے۔''

راکی باس کے دفتر سے نکلا... اور اس نے سب سے پہلے اونیل کے بارے میں معلومات والا کاغذ دیکھا۔ اس پر اس کا نام پتا اور چند دوسری معلومات تھیں۔ ان کے مطابق وہ دنیا میں اکیلا تھا۔ خلیج کی جنگ کے بعد اس نے بینکنگ میں قدم رکھا اور سولہ سال کے مختصر عرصے میں وہ برانچ میں بینک منیجر کے عہدے تک پہنچ گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے یہ کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ اس نے کسی طرح سینڈلر کے اس اکاؤنٹ کے کوڈز اور پاس ورڈ حاصل کر لیے تھے اور اس کے اکاؤنٹ سے پچیس ملین ڈالرز غائب کر دیے۔ بینک ریکارڈ میں اس کا جو سیل نمبر تھا، وہ بند جا رہا تھا۔

راکی نے کام کا آغاز سیل نمبر سے کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا ایک واقف کار پولیس میں اس شعبے میں تھا جو سیل نمبروں کے بارے میں تفتیش کرتا ہے۔ اس نے اس سے رابطہ کیا اور اسے اونیل کا سیل نمبر دیا۔

''یہ نمبر بند جا رہا ہے۔ مجھے اسی شخص کے نام پر موجود کوئی دوسرا سیل نمبر درکار ہے۔'' راکی نے کہا۔

''مجھے ایک گھنٹا لگے گا۔'' اس کے واقف کار نے کہا۔ ان کی واقفیت کی بنیاد وہ لفافہ تھا جو راکی ہر مہینے اسے باقاعدگی سے پہنچاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ راکی اسے جو کام کہتا تھا، وہ لازمی کر کے دیتا تھا۔ راکی نے ایک گھنٹے میں جا کر اونیل کی سابقہ رہائش کے بارے میں معلوم کیا لیکن وہاں سے اسے کچھ نہیں معلوم ہو سکا تھا۔ اس نے پھر اپنے واقف کار کو کال کی۔ اس نے راکی کو ایک اور نمبر دیا۔ ''یہ نمبر اسی نام اور اسی ڈرائیونگ لائسنس کے تحت دیا گیا ہے۔''

''شکریہ دوست!'' راکی نے نمبر نوٹ کر کے فون بند کر دیا۔

راکی نے معمولی درجے سے آغاز کیا تھا لیکن اس کے پاس ذہانت تھی اس لیے اسے اوپر آنے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ اس کا مطمح زندگی دولت تھی اور وہ اس کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ کچھ عرصے آزاد کام کر کے پھر وہ سینڈلر سے منسلک ہو گیا اور اس نے سینڈلر کے لیے کچھ ایسی خدمات انجام دیں کہ وہ اس کے لیے ناگزیر ہو گیا تھا۔ اب وہ اس کا سب سے اہم آدمی تھا۔

راکی نے میک اونیل کا نمبر حاصل کر لیا تھا۔ اس کے بعد وہ ایک کمپنی کے دفتر پہنچا جو چیزوں کی پبلسٹی کرتی تھی اور یہ کام سیل فون پر کرتی تھی، یعنی لوگوں سے فون پر رابطہ کرتی تھی۔ اس کمپنی میں ایک تیز طرار لڑکی کسی زمانے میں راکی کی محبوبہ رہ چکی تھی۔ پھر راکی کا اس سے دل بھر گیا اور وہ الگ ہو گئے۔ اس کے باوجود دونوں میں اچھے تعلقات تھے۔ جینیفر اسے دیکھ کر کھل اٹھی۔ ''راکی! بہت دنوں بعد نظر آئے۔''

''ہاں جینی! لیکن ایک کام تھا۔'' راکی نے مسکرا کر کہا۔ ''اگر کر دیا تو آج رات جہاں کہو ڈنر کے لیے تیار ہوں۔''

جینیفر ذرا بجھ گئی مگر اس نے خود کو سنبھال لیا۔ ''بولو کام کیا ہے؟''

راکی نے سیل نمبر اس کے سامنے رکھا۔ ''یہ نمبر ملاؤ اور اس شخص کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ یہ کہاں ہے۔''

جینیفر نے نمبر دیکھا۔ ''اسے سیلز گرل بن کر کال کروں؟''

''بالکل... اسی لیے تو تمہارے پاس آیا ہوں۔ اس شخص کو شک نہیں ہونا چاہیے کہ تم کسی مقصد کے تحت کال کر رہی ہو۔ ورنہ یہ بھاگ جائے گا یا نمبر بند کر دے گا۔''

''تمہیں اس کی لوکیشن چاہیے نا؟'' جینیفر نے نمبر ملاتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔'' راکی نے سر ہلایا۔

بیل جانے لگی۔ خاصی دیر بعد کال ریسیو ہوئی۔ جینیفر نے شیریں لہجے میں کہا۔ ''زحمت دینے کی معذرت چاہتی ہوں سر! میں کینی کان کنزیومر سے بات کر رہی ہوں۔''

''مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔'' دوسری طرف سے مرد نے بے زاری سے کہا۔ راکی کی سہولت کے لیے جینیفر نے اپنے فون کا اسپیکر آن کر دیا تھا۔ اب وہ بھی ان کی باتیں سن رہا تھا۔

''سر! ہماری کمپنی نے ایک سہولت شروع کی ہے۔ آپ کو ایک کارڈ خریدنا ہو گا اور اس کی مدد سے آپ اپنے سیل فون کے بل سے لے کر کار کی گیس تک کی ادائیگی کر سکیں گے۔ آپ اپنا نام بتائیں گے سر!''

''سلور۔'' دوسری طرف سے کسی قدر توقف کے بعد کہا گیا۔

''مسٹر سلور! کیا یہ بتائیں گے کہ آپ کس کمپنی کا پے منٹ کارڈ استعمال کر رہے ہیں اور وہ آپ کو کتنا پے بیک کر رہی ہے؟''

''میرے پاس کسی کمپنی کا کارڈ نہیں ہے۔''

''سر! ہمارا یہ کارڈ پہلی بار آپ کو فری ملے گا۔ مہربانی کر کے اپنا پتا کنفرم کریں۔''

''میں نیویارک میں نہیں ہوں۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا سر... آپ ملک میں جہاں بھی ہوں، کوریئر آپ کو چوبیس گھنٹے میں یہ فری کارڈ پہنچا دے گا۔ اس پر آپ دو سو ڈالرز تک کی مفت خریداری یا ادائیگی کر سکتے ہیں۔''

سلور نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر بولا۔ ''مجھے یہ کارڈ نہیں لینا... شکریہ۔'' اس نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔ جینیفر نے راکی کی طرف دیکھا۔

''کیا خیال ہے؟''

راکی نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ''اس کا پتا تو معلوم ہی نہیں ہوا ہے۔''

''اگر میں یہ بتا دوں کہ یہ شخص کس شہر میں ہے تو مجھے کیا ملے گا؟'' جینیفر نے شوخی سے آنکھیں گھمائیں۔

''اگر تم یہ بتا دو تو ڈنر کی آفر برقرار رہے گی۔''

جینیفر نے سر ہلایا اور اس نے فون اٹھا کر کسی کا نمبر ملایا۔ اس نے اپنی کمپنی کا تعارف کرایا۔ اصل میں اس قسم کی کمپنیوں کو ایک خاص نمبر الاٹ ہوتا ہے اور اس کے سارے سیلز آپریٹر ایک ہی نمبر استعمال کرتے ہیں، اسی طرح جب یہ کسی کو کال کرتے ہیں تو ان کا یہی نمبر آتا ہے۔ اس سے بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ کال کرنے والا بیچ کمپنی کا نمائندہ ہے یا نہیں۔ جینیفر نے میک اونیل کا نمبر بتا کر پوچھا۔ ''میں نے ابھی اس نمبر پر بات کی ہے۔ یہ کس جگہ سے ایکسیز کر رہا ہے؟... شکریہ۔'' اس نے فون بند کر دیا اور راکی کی طرف دیکھا۔ ''نمبر اسپرنگ فیلڈ میں ہے۔''

''یہ تو خاصا دور جا چکا ہے۔'' راکی نے تشویش سے کہا اور جینیفر کو جھک کر پیار کیا۔ ''بنی! تمہارا شکریہ... ممکن ہے میں آج ڈنر کا وعدہ پورا نہ کر سکوں لیکن جیسے ہی میں نیویارک واپس آؤں گا تو سب سے پہلے یہی کام کروں گا۔''

''میں انتظار کروں گی۔'' جینیفر بولی۔

وہاں سے نکل کر کار میں بیٹھتے ہی راکی نے سینڈلر کو کال کی۔ ''وہ اسپرنگ فیلڈ پہنچ گیا ہے اور اس نے اپنا نام بدل کر سلور رکھ لیا ہے۔''

''مجھے تم سے اسی تیزی کی امید تھی۔'' سینڈلر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''تم کب تک وہاں پہنچ رہے ہو؟''

''میں ائرپورٹ جا رہا ہوں اور مجھے وہاں سے اسپرنگ فیلڈ کے لیے جو پہلی پرواز ملے گی، میں روانہ ہو جاؤں گا۔''

''تم ائرپورٹ پہنچو۔ وہاں میرے پرائیویٹ ہینگر میں سیسنا جیٹ تمہیں تیار ملے گا۔''

''شکریہ باس! اس طرح میں جلدی پہنچ سکوں گا۔'' راکی نے خوش ہو کر کہا۔

''تمہارے ساتھ جونی بھی جائے گا۔''

راکی جونی کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ سینڈلر کا ایک ایسا ہتھیار تھا جسے وہ بہت خاص موقعوں پر استعمال کرتا تھا۔ اس کے دشمن جونی کا نام سن کر لرز جاتے تھے۔ جب وہ ائرپورٹ پہنچا تو طیارہ اور جونی اس کے منتظر تھے۔

☆☆☆

سلور نے بے زاری سے اپنا فون بند کر دیا۔ اسے یاد نہیں رہا تھا ورنہ وہ اسے پہلے ہی بند کر دیتا۔ اگرچہ اس سیل نمبر کا کسی کو پتا نہیں تھا، اس کے باوجود وہ اسے احتیاط کے طور پر بند ہی رکھتا تھا۔ اگر یہ کال اس کمپنی کے مخصوص نمبر سے نہ آئی ہوتی تو وہ مشکوک ہو جاتا۔ اس کا گھٹنا سخت قسم کی پٹی سے باندھ دیا گیا تھا۔ اس کی ہڈی بچ گئی تھی لیکن یہ چوٹ پرانی تھی اس لیے اسے تکلیف بہت زیادہ تھی۔ یہاں بھی اس نے اپنا نام سلور کمین ہی بتایا تھا۔ ڈاکٹرز نے اسے چوبیس گھنٹے

آرام کا مشورہ دیا تھا۔ اس کے بعد وہ اسٹک کے سہارے چل سکتا تھا۔ وہ صبح سات بجے اسپرنگ فیلڈ کے مقامی اسپتال آیا تھا اور اب اسے اگلی صبح سات بجے یہاں سے رخصت ملتی۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ یہاں سے نکل کر ایک کار لے گا اور اس کی مدد سے اپنا سفر جاری رکھے گا۔ پہلے اس کا ارادہ سان فرانسسکو تک جا کر کار لینے کا تھا۔

ایسے فون دوپہر بارہ بجے آیا تھا اور وہ غنودگی میں تھا۔ کچھ تھکن تھی اور کچھ دواؤں کا اثر تھا۔ فون رکھ کر وہ سو گیا تھا۔ پھر اس کی آنکھ چار بجے کھلی تھی۔ اس کی دواؤں کا وقت ہو گیا تھا۔ ایک نرس نے آکر اسے دوائیں دیں۔ اس نے درخواست کی۔

''اس میں سے نیند کی دوا نکال دو، میں ابھی جاگنا چاہتا ہوں۔''

''اس صورت میں تمہیں درد برداشت کرنا ہوگا۔'' نرس نے اسے خبردار کیا اور ایک گولی الگ کر دی۔

☆☆☆

راکی اور جونی کو لے کر سینڈلر کا سیسنا جیٹ اسپرنگ فیلڈ کے ائیرپورٹ پر اترا تو شام کے پانچ بج رہے تھے۔ راکی اور جونی باہر آئے۔ لاؤنج سے گزرتے ہوئے اچانک راکی رک گیا۔ ٹی وی پر ایک خبر آرہی تھی۔ وہ لفظ سلور سن کر رکا تھا اور پھر جلدی سے ٹی وی کے قریب آیا تھا۔

''رک کیوں گئے؟'' جونی نے پوچھا۔

''شش!'' راکی نے اسے چپ کرایا۔

ٹی وی پر نیوز کاسٹر ایک معمولی سے بس ایکسیڈنٹ کے بارے میں بتا رہا تھا جس میں کسی جنگلی جانور کو بچاتے ہوئے اچانک بریک لگانے سے بس میں سوار سلور مین نامی شخص زخمی ہو گیا تھا جسے اسپتال میں داخل کرا دیا گیا تھا۔ یہ صرف رپورٹ تھی، اس میں کوئی فوٹیج یا مووی نہیں تھی۔ راکی نے جونی کی طرف دیکھا۔ ''ممکن ہے یہی ہمارا مطلوبہ شخص ہو؟''

''اگر ایسا ہے تو ہمیں تو کچھ کرنا ہی نہیں پڑا۔'' جونی نے مایوسی سے جواب دیا۔

راکی نے ایک فون بوتھ سے فون انکوائری والوں سے اس ٹی وی چینل کا نمبر لیا اور پھر وہاں کال کی۔ اس نے خبر کا حوالہ دے کر اس رپورٹر سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی جس نے یہ خبر دی تھی۔ چند منٹ بعد وہ رپورٹر لائن پر تھا۔ راکی نے اس سے کہا۔ ''یہ سلور مین ممکنہ طور پر میرا رشتے دار ہے۔ کیا تم اس اسپتال کا نام بتا سکتے ہو جہاں وہ داخل ہے؟ میں اسے ایک نظر دیکھ لوں۔''

''کیوں نہیں۔'' رپورٹر نے کہا اور اسے اسپتال کا نام بتا دیا۔ ''اس کے گھٹنے پر چوٹ آئی تھی اس لیے وہ آرتھو پیڈک وارڈ میں ملے گا۔''

''ویسے بس کہاں سے آرہی تھی؟''

''نیویارک سے۔''

''شکریہ!'' راکی نے فون بند کر دیا اور جونی سے بولا۔ ''چلو دیکھتے ہیں کہ یہ وہی آدمی ہے یا نہیں۔ ویسے وہ نیویارک سے ہی آرہا تھا۔''

☆☆☆

میک بستر پر لیٹے لیٹے بے زار ہو گیا تھا اس لیے وہ اٹھ کر وہیل چیئر پر بیٹھا۔ ابھی اس کی نقل و حرکت اس تک محدود تھی۔ اس پر وہ کہیں بھی جا سکتا تھا لیکن پیروں پر کھڑا ہونے سے سختی سے منع تھا۔ وہ وہیل چیئر چلاتا ہوا باہر لابی میں آیا۔ اس کا کافی کا موڈ ہو رہا تھا۔ اس نے کافی مشین سے اپنے لیے کافی نکالنا چاہی۔ مشین استقبالیہ کے قریب تھی۔ اسی لمحے دو افراد وہاں آئے اور انہوں نے کاؤنٹر پر موجود نرس سے کہا۔ ''سسٹر! ہمیں سلور مین نامی آدمی سے ملنا ہے۔ ہم اس کے رشتے دار ہیں۔''

میک کافی مشین سے کافی نکالتے نکالتے رک گیا۔ اس نے کن انکھیوں سے انہیں دیکھا۔ ان میں سے ایک لمبا تڑنگا اور صورت سے ہی خطرناک نظر آنے والا شخص تھا جبکہ دوسرا متوسط قسم کا اور عام نظر آنے والا شخص تھا۔ نرس سے وہی بات کر رہا تھا۔ نرس اسے بتا رہی تھی کہ سلور مین آگے آرتھو پیڈک وارڈ کے کمرا نمبر سترہ میں ہے۔

''شکریہ سسٹر!'' عام سے نظر آنے والے شخص نے کہا۔

میک کی چھٹی حس پہلے ہی الارم بجا رہی تھی، اسے یہ عام سا شخص بہت خطرناک لگ رہا تھا۔ اس نے سوچا، مجھے جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ اس نے وہیل چیئر موڑی اور ایک دوسری لابی میں گھس گیا۔ یہ کارڈیو وارڈ تھا۔ وہ دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔ پھر اسے ایک کمرے کا بند دروازہ نظر آیا تو وہ اسے کھول کر بے دھڑک اندر گھس گیا۔ کمرے میں بستر پر ایک مریض لیٹا تھا اور اس کے جسم سے مختلف مشینیں لگی تھیں۔ وہ دل کا مریض تھا۔ میک کو معلوم تھا کہ وہ اسے کچھ دیر میں پورے اسپتال میں تلاش کرنا شروع کر دیں گے اور وہ یہ کام نہ بھی کریں تو اسپتال والے خود اسے تلاش ضرور کریں گے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے؟ اس نے اپنا آئی فون نکالا۔ اچانک اسے کرسٹی کا خیال آیا۔ اس نے احتیاطاً باتھ روم میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اس نے کرسٹی کا دیا ہوا نمبر ملایا۔ اس نے کال ریسیو کی۔ ''ہیلو... کون بول رہا ہے؟''

''کرسٹی! میں ہوں سلور۔''

''سلور! اب تمہاری حالت کیسی ہے؟'' کرسٹی نے سرت سے کہا۔ ''میں نے تمہیں نمبر دیا تھا لیکن تمہارا نمبر لینا بھول گئی تھی۔''

''میں اب ٹھیک ہوں۔'' اس نے ہچکچا کر کہا۔ ''کرسٹی! میں مشکل میں ہوں اور مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

''کیا ہوا ہے؟''

''میں اسپتال میں ہوں۔ یہاں کچھ ایسے لوگ آگئے ہیں جن کا میں سامنا نہیں کر سکتا اور وہ مجھے تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ اگر تم آکر مجھے یہاں سے نکال لے جاؤ تو...؟''

''سلور! یہ کیا معاملہ ہے؟''

''یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ بس تم مجھے کسی طرح اس اسپتال سے نکال لو۔'' اس نے التجا کی۔

کرسٹی کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے کہا۔ ''اوکے! میں آتی ہوں لیکن ممکن ہے مجھے ذرا دیر ہو جائے۔ میں ڈیڈی سے چھپ کر آؤں گی۔''

''میں اس وقت کارڈیو سیکشن کے ایک کمرے کے باتھ روم میں چھپا ہوں، تم اسپتال کے پاس آکر مجھے کال کرنا۔'' میک نے اسے اسپتال کا نام بتایا۔ فون بند کر کے اس نے باہر جھانکا۔ مریض بدستور اکیلا تھا۔ شاید کبھی کوئی اسے دیکھنے آئے اس لیے اس نے بہتر سمجھا کہ کرسٹی کے آنے تک اسی باتھ روم میں رہے۔ اسے امید تھی کہ یہاں کوئی نہیں جھانکے گا۔

☆☆☆

کرسٹی پریشان ہو گئی تھی۔ سلور نے اسے مشکل میں ڈال دیا تھا۔ وہ اپنے باپ کو بتاتی تو وہ کسی صورت اسے اجازت نہیں دیتا۔ اس لیے اس نے جیو سے کہا۔ ''ڈیڈی! مجھے اپنی ایک فرینڈ سے ملنے جانا ہے۔''

''تو چلی جانا، اتنی جلدی کیا ہے؟'' جیو نے حیرت سے کہا۔

''ڈیڈی! اس کا فون آیا ہے، اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے ورنہ وہ خود آجاتی۔''

''حیرت ہے، اب تک تمہاری کوئی ایسی فرینڈ بھی نہیں ہے۔''

''میری اس سے فون پر بات ہوتی رہتی تھی۔'' کرسٹی نے جھوٹ بولا۔ ''مجھے آپ کی کار کی چابی چاہیے۔''

''لے جاؤ... لیکن جلدی آنا۔ آج میں تمہارے اعزاز میں بار بی کیو کر رہا ہوں۔'' جیو نے اس سے کہا۔

جیو ایک کسان تھا اور اس کی زمین پر اس وقت بھی مکئی پک رہی تھی۔ اس کے پاس کوئی دو سو ہیکٹر زمین تھی جسے وہ اپنے دو ملازموں کی مدد سے کاشت کرتا تھا۔ وہ اچھا خاصا کھاتا پیتا شخص تھا۔ اکیلا آدمی تھا اس لیے خرچ بھی خاص نہیں تھا۔ اس نے جو کمایا تھا، اس کا بیشتر حصہ اس نے جمع کیا تھا اور اس کا ارادہ مزید زمین لینے کا تھا۔ وہ زمین کی کمائی شہروں میں لگانے کے خلاف تھا اس لیے اس کی ساری دولت ایسے مقامی بینکوں میں تھی جو کسانوں کو قرض دیتے تھے۔

کرسٹی کار لے کر روانہ ہو گئی..... ڈیری ڈن اسپرنگ فیلڈ سے تیس کلومیٹر آگے مغرب میں تھا۔ یہ سارا علاقہ زرعی تھا اور یہاں کی زمین زرخیز تھی۔ بہترین ہائی وے نے اسے صرف تیس منٹ میں شہر پہنچا دیا۔ اس نے اسپتال کا رخ کیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اچانک ہی سلور کے دشمن کہاں سے آگئے جو اسے تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ اسے لگا کہ اس کے باپ کی بات درست ثابت ہونے والی تھی۔ سلور مشکوک آدمی تھا اور وہ اس وجہ سے بھی پھنس رہی تھی کہ اس کا سامان اس کے پاس تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اگر اسے معاملہ اپنی حد سے باہر لگا تو وہ سلور سے معذرت کر لے گی اور اسے اسپتال سے نکال کر جہاں وہ کہے گا، چھوڑ دے گی۔

اس نے اسپتال کی پارکنگ میں کار روکی اور سلور کو کال کی۔ ''میں آگئی ہوں۔''

''تم استقبالیہ سے اندر آؤ اور الٹے ہاتھ کی لابی کی طرف مڑ جانا۔ آگے کارڈیو وارڈ ہے۔ میں اس کے کمرا نمبر بائیس میں ہوں۔ تم بنا دستک دیے اندر آجانا۔''

''اوکے! میں آرہی ہوں۔'' اس نے کہا اور کار سے باہر آگئی۔ اندر استقبالیہ سے اس نے الٹے ہاتھ والی لابی کا رخ کیا اور کچھ آگے جا کر وہ کارڈیو وارڈ میں داخل ہو گئی۔ وہ لابی میں دائیں طرف کے دروازے دیکھ رہی تھی۔ جیسے ہی اسے بائیس نمبر نظر آیا، وہ جلدی سے اندر داخل ہو گئی مگر کمرے میں سوائے ایک مریض کے کوئی نہیں تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

''سلور! تم کہاں ہو؟''

فوراً باتھ روم کا دروازہ کھلا اور وہیل چیئر پر موجود میک باہر آیا۔ ایک لمحے کو کرسٹی ڈر گئی۔ اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔

''تم نے تو مجھے ڈرا دیا۔''

''تمہارا شکریہ کہ تم آ گئیں۔'' میک نے آہستہ سے کہا۔

''تمہارے پیچھے کون لوگ ہیں؟''

''وہ لوگ میرے پیچھے بلاوجہ پڑ گئے ہیں۔'' اس نے مبہم انداز میں بتایا۔ ''کیا تمہیں باہر دو افراد نظر آئے ہیں؟ ایک لمبا تڑنگا کالی لیدر جیکٹ میں اور دوسرا متوسط قد کا... اس نے نیلی جیکٹ پہنی ہے۔''

''نہیں، مجھے ایسے لوگ نظر نہیں آئے۔''

''شاید وہ چلے گئے ہوں۔'' میک نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔

''بس نکل چلو۔'' کرسٹی نے کہا۔ وہ باہر لابی میں آئے۔ ابھی تک اسے کوئی آثار نظر نہیں آئے تھے جس سے پتا چلتا کہ اسپتال والوں کی طرف سے اس کی تلاش جاری ہو۔ وہ استقبالیہ تک آئے۔ اچانک میک نے ان دونوں کو آتے دیکھا۔ وہ عجلت میں آ رہے تھے۔ اسے کچھ اور نہیں سوجھا تو اس نے کرسٹی کو اپنی طرف کھینچا اور اس کے چہرے سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے دو محبت کے متوالے پیار کر رہے ہوں۔ اس نے سرگوشی کی۔

''وہ پیچھے آ رہے ہیں... پلیز! ہلنا مت۔''

کرسٹی ہچکچائی لیکن پھر اس نے خود کو میک کے سپرد کر دیا۔ اس کی گھنی زلفیں اس پر پوری طرح سایہ فگن ہو گئیں۔ میک ایک لمحے کے لیے اس طرح کھویا کہ اپنے دشمنوں کو بھی بھول گیا۔ اس دوران میں راکی اور جوبی ان کے پاس سے گزر کر چلے گئے۔ انہیں ایک اکیلے شخص کی تلاش تھی۔ کسی ایسے شخص کی نہیں جس کے ساتھ محبت کرنے والی عورت بھی ہو۔ وہ استقبالیہ کے دروازے سے باہر گئے تو کرسٹی جلدی سے میک سے الگ ہو گئی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ارد گرد کے لوگ دلچسپی سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ وہ نوعمر نہیں تھے اس لیے سب نے فرض کر لیا کہ وہ پیار کرنے والے میاں بیوی تھے۔ میک نے آہستہ سے کہا۔

''اب نکلو یہاں سے۔''

''نہیں، پہلے مجھے ان لوگوں کو دیکھنے دو کہ وہ کہاں ہیں۔'' کرسٹی نے جواب دیا اور باہر نکل گئی۔ میک ایک طرف ہو گیا کہ کسی کی اس پر بلاوجہ نظر نہ پڑے۔ کرسٹی کچھ دیر بعد واپس آئی تھی۔ اس نے کہا۔ ''چلو، وہ دونوں چلے گئے ہیں۔''

وہ میک کی وہیل چیئر لے کر باہر نکلی۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اسے سیر کرانے لے جا رہی ہے مگر پارکنگ کے پاس پہنچتے ہی اس نے عجلت میں وہیل چیئر کا رخ کاری کی طرف کر دیا اور اس سے پہلے کہ کوئی ان کی طرف متوجہ ہوتا، میک کو کار میں بٹھا کر وہاں سے نکل آئی۔ وہیل چیئر اس نے پارکنگ میں چھوڑ دی تھی۔ اسپتال سے دور آتے ہوئے میک نے سکون کا سانس لیا۔ ''شکر ہے ہم وہاں سے نکل آئے۔'' کرسٹی نے اس کی طرف دیکھا۔ ''اب تم بتاؤ کہ یہ کیا چکر ہے؟''

''یہ میرے پیچھے آئے تھے۔''

''ہاں... تو کیوں آئے تھے؟''

میک ہچکچایا۔ وہ اسے کسی صورت سچ نہیں بتا سکتا تھا اور وجہ بھی کوئی ایسی ہونی چاہیے تھی جس پر کرسٹی یقین کر سکے۔ کچھ دیر بعد اس نے گہری سانس لی۔ ''میں تمہیں بتا رہا ہوں لیکن تم اسے خود تک محدود رکھو گی۔''

''مجھے کسی کو بتانے کی کیا ضرورت ہے؟'' کرسٹی نے رکھائی سے کہا۔

''دراصل میں ایک بینکر ہوں اور جس بینک میں بوم کرتا تھا وہ بعض مجرموں کی سیاہ دولت کو سفید کرنے کا کام کرتا ہے۔''

''ٹھیک ہے لیکن اس معاملے سے تمہارا کیا تعلق ہے؟''

''میں اسی شعبے میں ہوں جو بلیک منی کو مختلف اسٹاکس میں لگا کر سفید کرتا ہے۔ مجھے اس کام سے نفرت تھی لیکن میں مجبور تھا، میں صرف ملازم تھا۔''

''میک! تم وضاحت مت کرو، مجھے وجہ بتاؤ۔'' کرسٹی نے کہا۔

''مجھ سے غلطی ہوئی اور میں نے ایک بڑے شخص کی دولت ایسے اسٹاک میں لگا دی جس کا کوئی حقیقی وجود نہیں تھا۔ نتیجے میں اس کے کئی ملین ڈالرز ڈوب گئے اور اب وہ میرے پیچھے پڑا ہے۔ میں کسی طرح اس کے نقصان کی تلافی نہیں کر سکتا اور اس کے آدمیوں سے بچتا پھر رہا ہوں کیونکہ میں ان کے ہاتھ آیا تو وہ مجھے مار ڈالیں گے۔''

''یہ اتنے خطرناک لوگ ہیں؟'' کرسٹی پریشان ہو گئی۔ ''اس صورت میں، میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔''

''میں تمہیں پریشان کرنا بھی نہیں چاہتا۔'' اس نے کہا۔ ''تم میرے لیے کچھ کپڑے لے لو، یہ اسپتال کا لباس مجھے نمایاں کر رہا ہے اور مجھے ہائی وے کے کسی ہوٹل تک چھوڑ دو۔ پھر مجھے میرا سوٹ کیس لا دینا۔''

کرسٹی نے اطمینان کا سانس لیا۔ ''میں بھی یہی چاہتی ہوں کیونکہ میرا ایک چھوٹا بیٹا اور بوڑھا باپ ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی خطرہ ان تک آئے۔''

''میں بھی یہی چاہتا ہوں اور تم نے میرے لیے جو کیا ہے اس پر میں ساری عمر تمہارا احسان مند رہوں گا۔''

اسی لمحے میک کی نظر عقبی آئینے کی طرف گئی اور اس نے ایک سیاہ سیڈان کو تیزی سے آتے دیکھا۔ اس نے ترشی سے کہا۔ ''کیا وہ دونوں تمہاری نظروں کے سامنے چلے گئے تھے؟''

''نہیں لیکن میں باہر نکلی تو وہ نہیں تھے۔''

''مجھے شبہ ہے کہ عقب میں آنے والی سیاہ کار میں وہی لوگ ہیں۔ تم رفتار تیز کرو۔'' کرسٹی نے ایسا کیا تو عقب سے آنے والی کار کی رفتار بھی بڑھ گئی۔ سلور نے اس سے کہا۔ ''دائیں طرف موڑ لو۔''

کرسٹی نے اچانک ہی کار کو لین سے نکال کر دائیں طرف والی سائڈ سڑک پر اتار لیا۔ اس نے سارا ٹریفک متاثر کیا لیکن اس کی حرکت نے سیاہ کار والوں کو کھل کر سامنے آنے پر مجبور کر دیا۔ وہ بھی ٹریفک کی پروا کیے بغیر ان کے پیچھے آئے تھے۔ کرسٹی نے رفتار تیز رکھی تھی۔ سیاہ کار اسی رفتار سے ان کے پیچھے تھی۔ کرسٹی نے پریشان ہو کر میک کی طرف دیکھا۔

''اب کیا کریں؟ یہ تو پیچھے لگ گئے ہیں۔''

''ان سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرو۔'' اس نے کہا۔

''کیسے؟'' کرسٹی بولی۔ اس کے ہاتھ لرز رہے تھے اور اس سے صحیح سے ڈرائیونگ نہیں ہو رہی تھی۔

میک نے اسے دیکھا اور کہا۔ ''تم ادھر آ جاؤ۔''

کرسٹی بڑی مشکل سے دوسری نشست پر آ گئی اور میک نے پاؤں میں تکلیف کے باوجود ڈرائیونگ سنبھال لی۔ اس دوران میں سیاہ کار اتنی قریب آ چکی تھی کہ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا شخص صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ وہی عام سا نظر آنے والا شخص تھا۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پر لمبا تڑنگا شخص بیٹھا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ انہوں نے بہت مہارت سے انہیں بے وقوف بنایا تھا۔ وہ اسپتال سے یوں عجلت میں نکلے جیسے جا رہے ہوں۔ لیکن وہ باہر نکل کر آرام سے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ جیسے ہی وہ باہر نکلے، وہ ان کے پیچھے لگ گئے۔

کرسٹی کی شیورلیٹ کا انجن طاقتور تھا لیکن سیاہ سیڈان بھی کم نہیں تھی اس لیے وہ مستقل ان کے پیچھے لگی تھی۔ میک نے رفتار تیز کی اور اچانک ہی آنے والی گلی میں مڑ گیا۔ اگرچہ... یہ خطرناک بھی ہو سکتا تھا۔ گلی آگے سے بند بھی ہو سکتی تھی اور وہ پھنس سکتے تھے۔ لیکن سیاہ کار سے پیچھا چھڑانے کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔ اس کے بعد میک آنے والی ہر گلی میں کار موڑتا چلا گیا لیکن سیاہ کار مستقل پیچھے تھی۔ گلیوں میں مستقل مڑنے سے صرف اتنا فائدہ ہوا کہ سیاہ کار ذرا پیچھے ہو گئی تھی۔

ایک گلی سے گزرتے ہوئے میک نے ایک عمارت کا گیٹ کھلا دیکھا، اندر خاصی بڑی جگہ تھی۔ اس نے چکر لگایا اور دوبارہ اس گلی میں آیا۔ ابھی تک سیاہ کار نہیں آئی تھی۔ اس نے گاڑی اندر داخل کر دی اور اسے دروازے سے ممکنہ حد تک دور لے گیا۔ کچھ دیر بعد سیاہ کار کے گزرنے کی آواز آئی۔ میک نے اندازے سے کار باہر نکالی، اس وقت تک سیاہ کار گزر کر گلی سے نکل چکی تھی۔ میک نے سامنے والی لائن پکڑی اور وہاں سے نکلتا چلا گیا۔ ذرا دیر بعد وہ ایک ہائی وے پر تھے۔ یہ شہر سے باہر جاتی تھی۔ ڈرائیونگ کرنے سے میک کا جسم خراب ہو گیا تھا۔ اس کے گھٹنے میں رہ رہ کر ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ ہائی وے پر آتے ہی اس نے ڈرائیونگ کرسٹی کے سپرد کر دی۔

''مجھے راستے میں آنے والے کسی موٹیل میں اتار دینا۔'' اس نے اپنا گھٹنا سہلاتے ہوئے کہا۔

کرسٹی کچھ اور سوچ رہی تھی۔ اس نے ہچکچا کر کہا۔ ''تم میرے ساتھ کیوں نہیں چلتے؟''

''میں تمہیں اور تمہارے بیٹے کو خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ دوسرے میرا خیال ہے کہ تمہارے ڈیڈی میری آمد پسند نہیں کریں گے۔''

''یہ تو ہے لیکن میں ڈیڈی کو منا لوں گی۔''

میک سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے سر ہلایا۔ ''او کے! میں تیار ہوں لیکن میں زیادہ دیر نہیں رکوں گا۔ میں کل تک یہاں سے نکل جاؤں گا۔''

''تمہارا جلد از جلد یہاں سے چلے جانا ہی بہتر ہے۔'' کرسٹی نے سر ہلایا۔ ''لیکن ابھی تمہیں آرام اور علاج کی ضرورت ہے اس لیے تم میرے ساتھ چلو۔''

میک، جیوانجیل کا فارم دیکھ کر متاثر ہوا۔ اس نے کرسٹی سے کہا۔ ''میری خواہش بننے میرا بھی ایسا فارم ہو۔''

''تمہارا تعلق بھی دیہاتی علاقے سے ہے۔'' کرسٹی کار سے اترتے ہوئے بولی۔

وہ اندر آئے جہاں جیو، ٹام کو اپنا فارم دکھا رہا تھا۔ اس نے میک کو دیکھا تو اس کی طرف دوڑا ہوا آیا۔ ''انکل سلور! کیسے ہیں آپ؟''

''ٹھیک ہوں۔'' اس نے کہا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ

جیو کا موڈ خراب ہوگیا تھا۔ کرسٹی نے ٹام سے کہا۔
''ٹام! تم اندر جاؤ۔''
ٹام ذہین بچہ تھا، وہ سمجھ گیا کہ بڑے اس وقت اس کی موجودگی یہاں نہیں چاہتے۔ وہ اندر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی کرسٹی نے جیو سے کہا۔
''ڈیڈی! میں سلور کو یہاں لائی ہوں۔ یہ کل تک یہاں رکے گا۔''
جیو نے سرد لہجے میں کہا۔ ''جب تم نے فیصلہ کرلیا ہے تو مجھ سے کیا کہہ رہی ہو؟''
''ڈیڈی! سلور اچھا آدمی ہے۔ اسے راستے میں ٹام کی وجہ سے حادثہ ہوا تھا۔ اس لیے یہ میرا فرض ہے کہ میں اس کی دیکھ بھال کروں۔ اسے مدد کی ضرورت ہے۔''
''ٹھیک ہے۔'' اس بار جیو کے لہجے میں سرد مہری نہیں تھی۔ اس نے میک سے پوچھا۔ ''ویسے تمہیں چوٹ کہاں لگی ہے۔''
''گھٹنے میں... یہ گھٹنا جنگ کے دوران میں زخمی ہوا تھا اس لیے معمولی سی چوٹ بھی تکلیف دے جاتی ہے۔''
''اچھا اچھا۔'' جیو نے سر ہلایا۔ ''تم خود سے چل کر غلطی کررہے ہو۔ تمہیں سہارے کے ذریعے چلنا چاہیے۔ رکو... میرے پاس اسٹک ہے، میں لے کر آتا ہوں۔''
باپ کے جانے کے بعد کرسٹی مسکرائی۔ ''تم نے دیکھا ڈیڈی کتنی جلدی پگھل جاتے ہیں۔''
میک کے پاؤں میں شدید تکلیف ہورہی تھی، اس میں مسکرانے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ اس بھاگ دوڑ نے اب تک کے علاج کا اثر زائل کردیا تھا۔ جیو اندر سے اس کے لیے اسٹک لے کر آیا۔ وہ اسے اندر لے آیا۔ ذرا سی دیر میں وہ میک کے ساتھ خاصا گھل مل گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''میرے پاس ایک مرہم ہے، اسے لگانے سے درد میں فوراً آرام آجاتا ہے۔''
''اس وقت مجھے کسی درد کش ہی کی ضرورت ہے۔''
میک نے پائنچہ اوپر کیا۔ وہ اسپتال کے لباس میں تھا لیکن اس کے پاس اس کا سارا سامان تھا۔ جیو اس کے لیے مرہم لے آیا۔ مرہم نے حیرت انگیز اثر دکھایا تھا۔ چند منٹ میں اس کا درد بہت کم رہ گیا تھا۔ پھر جیو اس کے لیے مقامی طور پر تیار کی ہوئی مکئی کی شراب لے آیا۔ میک کو بھی کسی ایسی چیز کی طلب محسوس ہورہی تھی۔ شراب بڑے سے جگ میں تھی۔ اس لیے دونوں پیتے گئے اور باتیں کرتے رہے۔ میک اسے اپنے جنگ کے زمانے کے قصے سنا رہا تھا اور جیو اسے اپنی جوانی کے قصے سنا رہا تھا۔ ایک گھنٹے بعد سلور کا سر بھاری ہونے لگا۔ اچانک اسے ایک خیال آیا اور اس نے جیو کی طرف دیکھا۔ اس نے سوال کیا۔ ''یہ کار جس میں کرسٹی مجھے لائی ہے تمہارے نام پر ہے؟''
''نہیں، میں نے اسے یہیں سے خریدا تھا۔''
''یعنی وہیکل آفس میں یہ سابقہ مالک کے نام پر ہے؟''
''ہاں لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''
''کچھ نہیں۔'' میک نے سکون کا سانس لیا۔
جیو نے اس سے کہا۔ ''چلو، میں نے باربی کیو کا انتظام کیا ہے۔''
وہ باہر آئے۔ میک کے لیے کھڑے رہنا مشکل تھا اس لیے اس نے ایک کرسی سنبھال لی۔ کوئلے دہک رہے تھے اور گوشت تیار تھا۔ ذرا دیر بعد فضا میں باربی کیو کی خوشبو پھیلنا شروع ہوگئی۔ ایک طرف ٹام ماں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ وہ اسے پکڑنے کی کوشش کررہی تھی اور فضا ان کی ہنسی سے گونج رہی تھی۔ میک خود کو بہت عرصے بعد خوش اور گھر کے ماحول میں محسوس کررہا تھا۔ کرسٹی اور ٹام بھی خوش تھے۔ کچھ دیر بعد میک نے جیو سے کہا۔ ''میں بھی باربی کیو بنا سکتا ہوں؟''
''کیوں نہیں۔'' جیو نے اسے جگہ دی اور وہ تکے بنانے لگا۔
کرسٹی اس کے پاس آئی اور آہستہ سے بولی۔ ''ڈیڈی تو تم سے زیادہ ہی فری ہوگئے ہیں۔''
''اصل میں وہ سادہ دل آدمی ہیں۔'' میک نے وضاحت کی۔ ''وہ کسی سے فریب نہیں کرسکتے۔ جو کچھ ان کے اندر ہے، وہ اوپر سے بھی ایسے ہی نظر آتے ہیں۔''
کرسٹی اس کے اور قریب آئی تو اس کے وجود سے آتی خوش گوار سی مہک میک کے اعصاب پر طاری ہونے لگی۔ اس نے پُرامید نظروں سے کرسٹی کی طرف دیکھا مگر اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''میں تم سے مطمئن نہیں ہوں سلور۔ تم نے مجھے پورا سچ نہیں بتایا ہے۔''

☆☆☆

راکی جھنجلا رہا تھا۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ مطلوبہ آدمی اس کے سامنے آکر یوں اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ کچھ دیر وہ اسی علاقے میں گھومتے رہے تھے۔ پھر اس نے کار روک دی۔ اسپتال میں اس نے میک کو دیکھ لیا تھا۔ اگرچہ اس نے حلیہ بہت زیادہ بدل لیا تھا لیکن راکی کی عقاب جیسی نگاہ نے اسے پہچان لیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک عورت تھی اور اس نے مناسب نہیں سمجھا کہ اسپتال میں ان لوگوں کو چھیڑا جائے اس لیے وہ اور جونی اسپتال کے باہر ان کا انتظار کرنے لگے۔ جیسے ہی وہ باہر نکلے، وہ ان کے پیچھے لگ گئے۔ لیکن اب وہ تقریباً ان کے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ جونی نے اس کی طرف دیکھا۔ ''نمبر پلیٹ کے بارے میں کیا خیال ہے؟''
''وہ پرانے ماڈل کی شیورلیٹ ہے اور یہاں پر عام طور پر رجسٹریشن کا اتنا خیال نہیں رکھا جاتا۔ اوپن پر گاڑی بک جاتی ہے۔'' راکی کے لہجے میں تشویش تھی۔
''یعنی یہ آئیڈیا بے کار ہے؟''
''نہیں آئیڈیا تو ٹھیک ہے لیکن ہم اس پر تکیہ نہیں کر سکتے۔'' اس نے کہا اور کار آگے بڑھا دی۔ یہ کار انہوں نے ائر پورٹ سے رینٹ اے کار سے لی تھی۔ ''پہلے اسے دیکھتے ہیں۔''
انہیں وہیکل آفس سے مطلوبہ معلومات کے حصول میں خاصا وقت لگ گیا تھا۔ اس لیے انہوں نے رات گزارنے کے لیے ایک ہوٹل کا رخ کیا۔ اگلی صبح انہوں نے اس پتے کو تلاش کرنا شروع کیا جو اس کار کی رجسٹریشن میں لکھا تھا۔ کار کا مالک اسٹیورٹ جین نامی شخص تھا اور اس کا ہائی وے پر گیس اسٹیشن تھا۔ اس کی رہائش گیس اسٹیشن کے ساتھ تھی۔ راکی اور جونی پہلے اس کے دفتر پہنچے۔ وہ انہیں دفتر میں ہی مل گیا۔
''میں تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں؟'' اس نے غور سے ان دونوں کو دیکھا۔ ''ہاں، اسٹیورٹ جین میں ہی ہوں۔''
''یہ کار تمہاری ہے؟'' راکی نے اس کے سامنے نمبر رکھا۔
''تھی۔'' اس نے تصحیح کی۔ ''میں نے فروخت کردی تھی۔''
''کب اور کس کو؟''
اس نے سوچا۔ ''مجھے صحیح سے یاد نہیں ہے۔ اصل میں، میں نے اسے برائے فروخت کا اسٹیکر لگا کر گیس اسٹیشن پر کھڑا کردیا تھا اور کوئی اسے لے گیا تھا۔ شاید کوئی مقامی کسان ہے۔''
''تمہیں یاد نہیں ہے کہ وہ کون ہے؟'' راکی نے غور سے اسے دیکھا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے نفی میں سر ہلایا۔
''مجھے بالکل یاد نہیں ہے۔ اصل میں کار بہت پرانی ہو گئی تھی اور میں نے بس جان چھڑالی۔ مجھے خریدار کا نام اور پتا لینے کا خیال ہی نہیں رہا۔ اب تو وہ کسی جنک یارڈ میں پہنچ گئی ہوگی۔ ویسے تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''
''ہمیں اس کار کے موجودہ مالک کی تلاش ہے۔''
''افسوس کہ میں اس معاملے میں تمہاری کچھ مدد نہیں کر سکتا۔'' اس نے معذرت کی۔ ''اپنا کوئی نمبر ہو تو دے دو۔ مجھے یاد آیا تو میں تمہیں کال کرکے بتادوں گا۔''
راکی نے اسے اپنا سیل نمبر دیا اور وہ باہر آگئے۔ کار میں بیٹھتے ہی جونی بولا۔ ''یہ جھوٹ بول رہا ہے۔''
''مجھے معلوم ہے۔ اب یہ ہمیں خود اس تک پہنچائے گا۔'' راکی نے کہا اور کار کا ایف ایم ریڈیو آن کرکے اسے ٹیون کرنے لگا۔ اچانک ہی اسٹیورٹ کی آواز گونجی، وہ کسی سے فون پر بات کررہا تھا۔
''جیو، میں بات کررہا ہوں... ابھی کچھ دیر پہلے دو افراد آئے تھے... وہ تمہاری شیورلیٹ کے بارے میں پوچھ رہے تھے... ہاں وہی جو میں نے بیچی تھی تمہیں... اور کتنی کاریں بیچی ہیں تمہیں میں نے... مجھے وہ لوگ صحیح نہیں لگ رہے تھے... کیا تم نے کار کسی اور کو دی ہے کیونکہ وہ تم سے واقف نہیں ہیں... اچھا اچھا.. محتاط رہو... وہ پھر میرے پاس آئے تو میں ان کو ٹہلا دوں گا۔''
''جیو۔'' راکی نے ریڈیو بند کردیا۔ اس نے دفتر سے نکلتے ہوئے میز کے نیچے ایک چھوٹا سا مائکروفون چپکا دیا تھا۔ وہ کار سے اتر کر واپس اسٹیورٹ کے دفتر میں آیا۔ وہ اسے دیکھ کر چونکا۔ راکی نے ایک سوال کا بہانہ کیا اور میز کے نیچے سے مائکروفون نکال کر رخصت ہوگیا۔ وہ کار میں آیا تو جونی بے چین تھا۔
''یہ تم کیا کررہے ہو؟ اس بڈھے کی گردن پکڑ کر اس سے معلوم کرلو۔''
''نہیں دوست... اس صورت میں کام خراب ہو جائے گا اور ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے۔ ہمارا مطلوبہ آدمی ابھی سفر کے قابل نہیں ہے اور ہم آرام سے اسے پکڑ سکتے ہیں لیکن ہوشیار ہوگیا تو پھر اس تک رسائی مشکل ہوجائے گی۔'' اس نے کہا۔
''یہ جیو کون ہے؟'' جونی نے کہا۔
''اس کا جواب گیس اسٹیشن پر کام کرنے والا لڑکا دے گا۔'' راکی نے اشارہ کیا۔ ''ہم سڑک پر اس کا انتظار کریں گے۔''

☆☆☆

باربی کیو کے انگارے بجھ گئے تھے۔ جیو رات گیارہ بجے تھکن کا کہہ کر سونے چلا گیا تھا۔ ٹام بھی غنودگی میں تھا اس لیے کرسٹی نے اسے اندر جانے کو کہا۔ میک ایک طرف بیئر کا گلاس تھامے بیٹھا تھا۔ کرسٹی نے اس کی طرف دیکھا۔ ''تمہارا اصل نام کیا ہے؟''

وہ چونکا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا کہ یہ میرا اصل نام نہیں ہے؟''

''تم اس نام کے عادی نہیں ہو تمہیں پکارا جائے تو تم دیر سے ردِعمل ظاہر کرتے ہو۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''میرا اصل نام میک اونیل ہے۔''

''تم نے نام کیوں بدلا؟''

''مجھے اپنے دشمنوں سے خوف تھا۔ وہ میرا پیچھا کرتے اس لیے میں نے نام بدل دیا۔''

''دشمن تو پھر بھی آ گئے۔''

''کرسٹی! مجھے یہاں سے جانا ہے۔ اگر میں زیادہ دیر یہاں رہا تو مجھے ڈر ہے کہ وہ یہاں بھی آ جائیں گے۔''

''انہیں کیسے پتا چلے گا؟''

''کار کے نمبر سے... اگرچہ تمہارے ڈیڈی نے جس سے کار لی ہے، یہ اسی کے نام پر ہے اس لیے وہ فوری طور پر تو یہاں نہیں آ سکتے لیکن اس بات کا امکان ہے کہ وہ جیو کے بارے میں معلوم کر لیں۔''

''تم کب جانا چاہتے ہو؟''

''ہو سکے تو کل ہی۔'' اس نے کہا۔ ''مجھے ایک کار چاہیے جو اچھی حالت میں ہو اور طویل سفر کے لیے موزوں ہو۔''

''کار تو مل جائے گی لیکن تمہاری حالت...''

''کل تک میں بہتر ہو جاؤں گا۔'' اس نے کہا اور کھڑا ہوا تو بے ساختہ کراہ نکل گئی۔ مرہم کا اثر کم ہو رہا تھا اور درد پھر سے اٹھ گیا تھا۔ وہ لڑکھڑایا تو کرسٹی نے اسے سہارا دیا۔

''آؤ، میں تمہیں تمہارے کمرے تک چھوڑ آؤں۔''

اس کو نچلے حصے میں گیسٹ ہاؤس والا کمرا ملا تھا۔ جیو اور کرسٹی کے بیڈ رومز اوپر تھے۔ وہ اسے کمرے تک لائی، وہ جب جانے لگی تو میک نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ رک گئی اور پھر میک نے اسے اپنی طرف کھینچا تو وہ کھنچتی چلی گئی۔ دو گھنٹے بعد جب میک کی آنکھ کھلی تو وہ جا چکی تھی۔ وہ چت لیٹ کر چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا تھا کہ ان دونوں میں سے کسی کو سنبھلنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے اتنے قریب آئے کہ ایک ہی ہو گئے تھے۔

''کیا میں اب یہاں سے جا سکوں گا؟'' اس نے خود سے سوال کیا۔

لیکن اسے جانا ہی تھا۔ وہ یہاں نہیں رک سکتا تھا۔ وہ اس راستے پر بہت آگے نکل آیا تھا اور اس کے لیے واپسی یا کسی جگہ رک جانا ممکن نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر کرسٹی کو اس کی اصلیت کا علم ہو گیا تو وہ اس سے نفرت کرنے لگے گی۔ وہ اس کی نفرت برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر تک جاگنے کے بعد اسے نیند آئی تھی۔ وہ صبح دیر سے جاگا تھا۔ اس کی ٹانگ کے درد میں بہت حد تک کمی آ گئی تھی۔ واش روم سے آ کر اس نے کمرے میں چلنے کی مشق کی۔ اسٹک کے ساتھ اسے خاص مشکل پیش نہیں آ رہی تھی۔

''ہیلو۔'' کرسٹی نے کمرے میں جھانکا۔ اسے چلتے دیکھ کر اس کی مسکراہٹ بجھ گئی۔ ''تم جانے کی تیاری کر رہے ہو؟'' وہ اندر آ گئی۔

''ہاں۔'' میک اونیل نے سرد آہ بھری۔ ''جانا میری مجبوری ہے۔''

''سنو، تم اس معاملے کو پولیس تک کیوں نہیں لے جاتے؟''

''اس کا فائدہ نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''کیونکہ ہم جو کرتے تھے، اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ خود بینک والے انکار کر دیں گے تو سوچو پھر پولیس میرے الزام کو کیا اہمیت دے گی؟''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' کرسٹی نے کہا تو اس کی آواز بھیگنے لگی تھی۔

میک نے اسے بازوؤں میں لے لیا۔ ''مجبوری ہے جان ورنہ میں تمہیں کبھی چھوڑ کر نہ جاتا۔ لیکن تمہیں اور اس گھر کے لوگوں کو بچانے کے لیے میرا جانا ضروری ہے۔''

دروازے کی طرف سے جیو کے کھنکھارنے کی آواز آئی تو وہ جلدی سے الگ ہو گئے۔ جیو نے میک سے کہا۔ ''باہر آنا... مجھے تم سے بات کرنی ہے۔''

میک نے کرسٹی کی طرف دیکھا، دونوں نے محسوس کیا کہ جیو اس سے کوئی خاص بات کرنا چاہتا ہے۔ کرسٹی نے کہا۔ ''جلدی بات کر لینا، میں ناشتا بنانے جا رہی ہوں۔''

میک جیو کے ساتھ باہر آیا۔ سورج بلند ہو چکا تھا اور خوش گوار خنک ہوا چل رہی تھی۔ جیو نے اچانک کہا۔ ''کچھ لوگ تمہاری تلاش میں ہیں؟''

وہ چونکا پھر سنبھل کر بولا۔ ''تم سے کس نے کہا؟''

''میرے سوال کا جواب دو۔ کیا کل کچھ لوگ تمہارے پیچھے لگے تھے؟''

''ہاں، کچھ لوگ میرے پیچھے ہیں۔'' اس نے اعتراف کیا۔

''انہوں نے کار کے نمبر کی مدد سے تمہیں تلاش کرنا شروع کر دیا ہے۔'' جیو نے اسے آگاہ کیا۔ ''اب بتاؤ یہ کیا ہے؟ میں پولیس کو کال کرنے کی سوچ رہا ہوں۔''

''بالکل بھی نہیں، میں پولیس کے چکر میں نہیں پڑ سکتا۔'' اس نے جلدی سے کہا اور پھر جیو کو بھی وہی کہانی سنانی پڑی جو کرسٹی کو سنا چکا تھا۔ اس نے شک سے کہا۔

''کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟''

''میں تمہیں کس طرح یقین دلا سکتا ہوں؟'' اس نے ہاتھ پھیلائے۔

''اس صورت میں تمہارا جلد از جلد یہاں سے چلے جانا ہی بہتر ہے۔ وہ میرے دوست تک پہنچ گئے ہیں جس سے میں نے یہ کار لی تھی۔ اس نے انہیں ٹال دیا ہے لیکن امکان ہے کہ وہ خاموش نہیں بیٹھیں گے۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں لیکن مجھے ایک کار چاہیے۔''

''مل جائے گی۔ ہم ناشتا کر کے چلتے ہیں۔ میں تمہیں کوئی اچھی گاڑی دلوا دوں گا۔''

وہ اندر آئے۔ کرسٹی نے ناشتا لگا دیا تھا۔ ناشتے کے دوران میک نے اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔ کرسٹی اداس ہو گئی لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔ ناشتے کے بعد میک اور جیو باہر نکلے۔ جیو اسے ایک شو روم تک لایا۔ وہاں وہ کار پسند کرنے لگے۔

☆☆☆

گیس اسٹیشن کے باہر انہیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا تھا کیونکہ لڑکا رات کی شفٹ میں کام کرتا تھا اور صبح کے وقت وہ چھٹی کر کے چلا جاتا تھا۔ جیسے ہی اس کی بائک ان کی کار کے پاس سے گزری، وہ اس کے پیچھے لگ گئے اور ایک سنسان جگہ انہوں نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ لڑکا سہم گیا۔ خاص طور سے جونی کو دیکھ کر اس کی حالت خراب ہو گئی تھی۔

راکی نے کار سے اترتے ہوئے اسے بائک سے نیچے آنے کو کہا۔ وہ گھبرا کر بولا۔ ''کیا بات ہے... کون ہو تم؟''

''گھبراؤ مت برخوردار۔'' راکی نے نرم لہجے میں کہا۔ ''ہمیں کچھ معلومات درکار ہیں اور اس کے ساتھ ہی تمہاری بندوبان بھی۔''

''کک... کیسی معلومات؟''

''تمہارے پاس دو آپشن ہیں۔'' راکی نے پرس نکالا اور اس میں سے سو سو ڈالرز کے کچھ نوٹ نکالے۔ ''ایک یہ ہے اور دوسرا...'' اس نے جونی کی طرف دیکھا تو وہ آگے بڑھ کر لڑکے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''تم کیا معلوم کرنا چاہتے ہو؟'' لڑکے نے تھوک نگل کر پوچھا۔

''ہمیں اسٹیورٹ کے دوست جیو کا پتا چاہیے۔''

''جیو اسٹیل کا؟'' وہ بولا۔

''ہاں جس کے پاس پرانے ماڈل کی شیورلیٹ ہے۔''

لڑکے نے نوٹ دیکھے تو اس کی آنکھوں میں حرص کی چمک نمودار ہوئی۔ اس نے نوٹوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ راکی نے اسے نوٹ دے دیے۔ لڑکے نے اسے پتا سمجھا دیا۔ راکی نے اچانک اس سے نوٹ واپس چھین لیے تو وہ روہانسا ہو گیا۔

''تم میرے ساتھ دھوکا کر رہے ہو؟''

''نہیں۔'' راکی نے نوٹ پھر اسے دے دیے۔ ''میں نے صرف یہ سمجھایا ہے کہ اگر کبھی ہمیں دھوکا دینے کا خیال آیا تو تمہاری جان ان نوٹوں کی طرح اُچک کر لے جائیں گے۔''

''میں کسی سے نہیں کہوں گا۔'' لڑکے نے خوف زدہ ہو کر کہا۔ ''اب میں جاؤں؟''

راکی نے اس کا پرس نکال کر اس کے ڈرائیونگ لائسنس پر لکھا ہوا پتا دیکھا اور بولا۔ ''برخوردار! اگر تمہارا بتایا ہوا پتا غلط نکلا تو ہم اس پتے پر ضرور آئیں گے۔''

''میں نے سچ کہا ہے۔'' لڑکے نے جواب دیا اور اس سے اپنا پرس لیا اور وہاں سے بھاگ نکلا۔ جونی اور راکی بھی کار میں آ گئے تھے۔ انہوں نے مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھا اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔ منزل رفتہ رفتہ قریب آ رہی تھی۔

☆☆☆

کرسٹی اداس تھی۔ اس نے ناشتے کے برتن دھوئے۔ اس دوران نام ناشتا کر کے کھیلنے کے لیے باہر چلا گیا تھا۔ جب تک اسے اسکول میں داخل نہیں کرایا جاتا، اسے آزادی ملی ہوئی تھی۔ اسے ویسے بھی نانا کا گھر اور فارم بہت اچھا لگتا تھا۔ کرسٹی اس سے پہلے جتنی بار بھی یہاں آئی تھی، اسے گھٹن کا احساس ہوتا تھا۔ حالانکہ وہ یہیں پلی بڑھی تھی لیکن اس بار اسے اچھا لگا تھا۔ شاید اس لیے کہ میک بھی اس کے ساتھ آیا تھا۔ اسے گزشتہ رات کے لمحات یاد آئے تو وہ شرما گئی۔ شوہر کے مرنے کے بعد پہلی بار کوئی اس کے قریب آیا تھا۔

کچن کا کام ختم کر کے وہ باہر آئی۔ کچن عقبی طرف تھا۔ چھوٹا سا لان تھا اور اس کے بعد دور تک فارم پھیلا ہوا تھا۔

اس نے ٹام کو آواز دی لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ ذرا آگے تک گئی۔ اس نے پھر آواز دی۔ اس بار بھی جواب نہیں آیا۔ اس کا دل کسی نامعلوم خوف سے جکڑنے لگا۔ وہ مکان کے سامنے والے حصے میں آگئی۔ ٹام یہاں بھی نہیں تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح سارے فارم میں چکرانے لگی۔ دس پندرہ منٹ میں اس نے فارم کا ایک ایک گوشہ چھان مارا۔ ٹام کو آواز دے دے کر اس کا گلا بیٹھ گیا تھا۔

جب اسے یقین ہو گیا کہ ٹام فارم میں نہیں ہے تو وہ باہر کی طرف بھاگی۔ اتفاق سے جیو کا کوئی ملازم بھی نہیں آیا تھا۔ اس لیے وہاں کوئی نہیں تھا جس سے وہ مدد طلب کرتی۔ اسے باہر بھی دور تک ٹام یا کوئی اور نظر نہیں آیا تھا۔ وہ ہانپتے کانپتے واپس آئی اور فون کی طرف لپکی تھی کہ ایک جھٹکے سے رک گئی۔ فون کے اوپر ایک بڑا سا کاغذ لگا تھا جس پر کسی نے ٹیڑھے میڑھے الفاظ میں لکھا تھا۔

"بچہ ہمارے پاس ہے۔ پولیس کے بجائے میک اونیل کو کال کرو۔"

کرسٹی کے منہ سے چیخ نکل گئی اس نے جلدی سے فون اٹھایا اور کانپتے ہاتھوں سے نمبر ملانے لگی۔

☆☆☆

میک اونیل کو ایک سفید ڈاٹسن پسند آئی تھی۔ اس کا سولہ سو سی سی کا انجن بہترین حالت میں تھا اور وہ کم قیمت پر مل رہی تھی۔ اس نے نقد ادائیگی کر کے کار لے لی۔ اس سے پہلے وہ ٹرائل لے چکا تھا۔ مکمل طور پر آٹومیٹک ہونے کی وجہ سے اس کے پاؤں پر زیادہ زور بھی نہیں آتا۔ جیو نے بھی اسے پسند کیا تھا۔ وہ کار لے کر نکلے تھے کہ جیو کے سیل فون پر کرسٹی کی کال آئی۔ وہ یک دم پریشان ہو گیا۔

"کرسٹی! کیا بات ہے... رو کیوں رہی ہو؟"

"کیا بات ہے؟" میک اونیل بھی پریشان ہو گیا۔

جیو نے اسے اشارے سے چپ رہنے کو کہا اور کرسٹی سے بولا۔ "تم رو مت اور پریشان بھی مت ہو، ہم آ رہے ہیں۔"

"کیا ہوا ہے؟" اس کے فون بند کرنے کے بعد میک نے پوچھا۔

"ٹام غائب ہے اور فون کے ساتھ ایک پرچہ ملا ہے۔ اس پر کسی نے لکھا ہے کہ بچہ ان کے پاس ہے اور تم انہیں کال کرو۔"

میک سمجھ گیا۔ اس نے کار جیو کی کار کے پاس روکی۔ وہ اپنی کار میں آتا۔ اس کے بعد دونوں ہی طوفانی رفتار سے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ بیس منٹ بعد وہ گھر کے سامنے تھے۔ کرسٹی گاڑیوں کی آواز سن کر دوڑتی ہوئی آئی تھی۔ وہ باپ کے گلے لگ کر رونے لگی۔ میک نے اسے الگ کیا۔

"کرسٹی! میری بات سنو۔" اس نے کہا۔

"کیا سنوں؟" اس نے اچانک میک کو تھپڑ مار دیا۔ "یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔"

"مجھے اعتراف ہے لیکن تم فکر مت کرو... ٹام کو کچھ نہیں ہوگا۔ وہ مجھ سے رابطہ کریں گے۔"

وہ اندر آ کے فون کے پاس بیٹھ گئے۔ کرسٹی بتانے لگی کہ کس طرح ٹام باہر گیا اور پھر غائب ہو گیا۔ جیو نے کھوئے لہجے میں کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ وہ یہاں تک آئے ہیں۔"

"انہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں گھر میں نہیں ہوں؟" میک نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ٹام سے۔" جیو نے کہا۔ "انہوں نے باہر کھیلتے ٹام کو قابو کر کے اس سے پوچھ لیا ہوگا۔"

"تم درست کہہ رہے ہو۔" میک نے تائید کی۔ اس کے ذہن میں تھا کہ وہ اس سے کس طرح رابطہ کریں گے؟ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے جلدی سے کال ریسیو کی۔ "ہیلو۔"

"میک اونیل۔" دوسری طرف سے کسی نے کہا۔ "بچہ ہمارے پاس ہے اور ہم تم سے کیا چاہتے ہیں یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔"

"یہ اتنا آسان نہیں ہے۔" اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا۔

"مشکل کو آسان بنانا ہمیں آتا ہے۔ اگر تم بچے کی صحیح سلامت واپسی چاہتے ہو تو ہمارے کہے پر عمل کرو۔"

"کہو، مجھے کیا کرنا ہے؟"

"تم گھر سے نکل کر ہائی وے کی طرف آؤ اور اسپرنگ فیلڈ کی طرف گیارھویں سنگِ میل پر رک جانا۔"

"او کے، میں آ رہا ہوں۔" اس نے کہا۔

"گڈ... باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔" اس شخص نے رابطہ ختم کر دیا۔ میک نے ان دونوں کو بتایا۔

"میں بھی چلوں گی۔" کرسٹی نے فوراً کہا۔

"نہیں، میں تمہیں لے جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔"

"ٹام میرا بیٹا ہے، تمہارا نہیں۔" کرسٹی بولی تو میک نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیا تمہارا خیال ہے، میں بھاگ جاؤں گا؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

کرسٹی نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "میں نہیں جانتی لیکن مجھے اپنا بچہ ہر صورت میں واپس چاہیے۔"

"او کے، چلو۔" اس نے کہا۔

"میں بھی ساتھ رہوں گا۔" جیو نے کہا۔

"نہیں، تم پیچھے رہو اور اگر میں اور کرسٹی ایک گھنٹے تک نہ آئیں تو تم پولیس سے رابطہ کر کے انہیں سب بتا دینا۔"

"کیا بتا دوں جبکہ میں کچھ جانتا ہی نہیں ہوں۔"

اونیل نے سوچا اور ایک کاغذ پر لکھ کر اسے دیا پھر بولا۔ "یہ سب نیویارک کے ایک مافیا مین سینڈلر کے آدمی ہیں اور معاملہ فرسٹ ویسٹ بینک کا ہے، میں وہاں منیجر تھا۔ تم پولیس کو یہ سب بتا سکتے ہو لیکن ایک گھنٹے سے پہلے کسی صورت پولیس سے رابطہ مت کرنا، ورنہ سب سے پہلے نقصان ٹام کو ہو گا۔"

وہ باہر آیا۔ اس کے پاؤں میں رہ رہ کر ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اس نے اپنی سفید کار لی تھی۔ کرسٹی کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ میک نے اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں اپنی مصیبت میں شامل کر لیا۔"

کرسٹی دوسری طرف دیکھ رہی تھی پھر اس نے کہا۔ "سوری... میں جذباتی ہو گئی تھی۔"

"کوئی بات نہیں۔" میک نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

انہیں ہائی وے کے مطلوبہ سنگِ میل تک پہنچنے میں بیس منٹ لگے تھے۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ البتہ گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ کرسٹی نے اضطراب سے کہا۔ "یہاں تو کوئی نہیں ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ آس پاس ہوں گے۔" میک نے چاروں طرف دیکھا۔ "وہ اپنا اطمینان کر کے ہی سامنے آئیں گے۔"

اس کا اندازہ درست نکلا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک طرف درختوں کے عقب سے وہی سیاہ کار نکلی جس میں ان کا تعاقب کیا گیا تھا۔ کار ان کے قریب آ کر رکی اور اس میں سے راکی اور جونی اترے لیکن ٹام ان کے ساتھ نہیں تھا۔ میک آگے آیا۔ "لڑکا کہاں ہے؟"

"آرام سے مسٹر اونیل۔" راکی نے سرد لہجے میں کہا۔ "لڑکا بھی مل جائے گا، پہلے تم باس سے بات کرو۔" راکی نے سیل فون سے کال کی۔ "باس! آدمی مل گیا ہے، اس سے بات کریں۔" اس نے سیل فون میک کی طرف بڑھا دیا۔

"ہیلو۔" میک نے مرتعش لہجے میں کہا۔

"میک اونیل! میرے پچیس ملین ڈالرز کہاں ہیں۔"

"ایک آف شور بینک اکاؤنٹ میں۔" اس نے بلا جھجک کہا۔ "تم اسے وہاں سے حاصل نہیں کر سکتے۔"

"لیکن میں نے تمہیں اور اس بچے کو حاصل کر لیا ہے۔"

"ان لوگوں کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ مجھے راستے میں ملے تھے۔ اپنے آدمیوں سے کہو، بچے کو چھوڑ دیں اور مجھے تمہارے پاس لے آئیں۔"

"تمہیں بچے کی اتنی فکر ہے، اپنی فکر نہیں ہے؟" سینڈلر نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے کسی صورت معاف نہیں کرو گے لیکن یہ غیر متعلقہ لوگ ہیں۔"

"اگر تم میری رقم دے دو تو میں تمہیں معاف کر دوں گا۔"

"مسٹر سینڈلر ریگون۔" اس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں اس لیے تم مجھے بے وقوف مت بناؤ۔"

"اس صورت میں تم، یہ عورت اور اس کا بچہ بھی میرے پاس آئیں گے اور ان کے انجام کے بارے میں، میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"مسٹر ریگون! میں پیچھے اس عورت کے باپ کے پاس کچھ ایسی معلومات چھوڑ آیا ہوں جو اس کے لیے تو اہم نہیں ہیں لیکن اگر ایک گھنٹے کے اندر ہم یا کم سے کم یہ عورت اور بچہ واپس نہ گئے تو بات پولیس تک پہنچ جائے گی اور وہ معلومات پولیس کے لیے یقیناً بہت اہم ہوں گی۔"

"تم مجھے بلیک میل کر رہے ہو؟" سینڈلر کا لہجہ سرد ہو گیا۔

"نہیں، میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ اس معاملے کو پھیلانے سے گریز کرو۔ یہ غیر متعلقہ لوگ ہیں۔ ابھی تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتے، اس لیے تمہیں ان سے کوئی خطرہ بھی نہیں ہے۔"

سینڈلر کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے میرے آدمی اس عورت اور بچے کو جانے دیں گے۔"

''میں تمہارا شکر گزار رہوں گا۔'' میک نے کہا۔

''میرے آدمی کو فون دو۔'' سینڈلر نے کہا۔

''تمہارا باس۔'' میک نے راکی کی طرف فون بڑھا دیا۔

''یس باس۔'' راکی نے کہا اور دوسری طرف سے آنے والی ہدایات سننے لگا۔ پھر اس نے سیل فون بند کیا اور جونی سے کہا۔ ''بچے کو نکالو۔''

جونی نے کار کی ڈکی سے بند بچے کو نکالا۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور منہ ٹیپ سے باندھ دیے گئے تھے۔ کرسٹی تڑپ کر اس کی طرف بڑھی اور اس نے بے تابی سے اس کے منہ سے ٹیپ اتار دیا۔ ''میرا بچہ۔'' وہ بولی اور بپھر کر کہا۔ ''تم لوگ نہایت ذلیل ہو۔ معصوم بچے کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہیں۔''

''اسے لے کر چلی جاؤ۔'' راکی نے پستول نکال لیا۔ ''اگر تم ایک منٹ بھی یہاں نظر آئیں تو میں تمہیں اور اس بچے کو شوٹ کر دوں گا۔''

''کرسٹی! جاؤ یہاں سے۔'' میک نے پریشان ہو کر کہا۔ اسے معلوم تھا کہ مافیا کے آدمی کتنے سفاک ہوتے ہیں۔ وہ سچ مچ کرسٹی اور ٹام کو شوٹ کر سکتے تھے۔ کرسٹی نے سر ہلایا۔

''اور تم...؟''

''میری فکر مت کرو... جاؤ تم۔'' میک نے اسے اپنی کار کی طرف دھکیلا۔ کرسٹی نے جلدی سے ٹام کو اگلی نشست پر بٹھایا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر آ گئی۔ اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور میک کی طرف دیکھتے ہوئے کار آگے بڑھا دی۔ ایک منٹ کے اندر وہ یوٹرن لے کر مخالف سمت میں جا چکی تھی۔ راکی نے پستول سے اشارہ کیا۔

''چلو، کار میں بیٹھو۔''

ان کے پاس رینٹ اے کار تھی اور یہ کار اسی ریاست کی حد تک استعمال ہو سکتی تھی۔ اس لیے جانے سے پہلے کار واپس کر کے ان کے لیے دوسری کار لینا ضروری تھا۔ انہوں نے میک کو عقبی نشست پر بٹھایا تھا اور جونی اس کے ساتھ تھا۔ اس نے میک پر واضح کر دیا تھا کہ اگر اس نے کوئی غلط حرکت کی تو وہ اس کا گھٹنا توڑ دے گا اور وہ پھر ساری عمر اسٹک کے سہارے چلے گا۔

''بشرطیکہ تم زندہ رہے۔'' راکی نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

''مجھے معلوم ہے کہ سینڈلر مجھے معاف نہیں کرے گا۔'' اس نے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

راکی کو معلوم نہیں تھا کہ سینڈلر اور میک کے درمیان اصل میں کیا بات تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے تجسس سے پوچھا۔ ''یہ کس آف شورا کاؤنٹ کا ذکر ہو رہا تھا؟''

''کیا تمہارے باس نے تمہیں نہیں بتایا؟'' اس بار میک نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

''ہم اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔''

''تو اب بھی اپنے کام سے کام رکھو۔''

راکی نے اسے مڑ کر دیکھا۔ ''تم یہ مت بھولو کہ ابھی خاصی دیر تک تم ہمارے پاس رہو گے۔''

''مجھے یہ بات یاد ہے۔'' میک نے بے نیازی سے کہا۔ ویسے وہ اندر سے پریشان تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ سفاک لوگ اسے کسی صورت نہیں بخشیں گے۔ اگر اس نے اپنی جان بچانی ہے تو اسے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ فی الحال وہ خاموش تھا اور ان کو ایسا تاثر دے رہا تھا جیسے وہ ہتھیار ڈال چکا ہے۔ کچھ دیر بعد وہ اسپرنگ فیلڈ میں داخل ہو گئے۔ وہ ائرپورٹ پہنچے۔ وہاں انہوں نے کار واپس کی اور ایک اور کار کرائے پر حاصل کی جسے وہ نیویارک میں بھی واپس کر سکتے تھے اور اس میں سفر کرتے ہوئے انہیں ریاست کی سرحد پر نہیں روکا جاتا۔

اس دوران میں وہ میک کی طرف سے پوری طرح ہوشیار رہے تھے اور جونی نے اسے بتایا تھا کہ اس کے پاس سائیلنسر لگا پستول ہے۔ اگر میک نے کوئی غلط حرکت کی تو وہ اسے مار کر نکل جائیں گے۔ میک جانتا تھا کہ وہ اسے نہیں مار سکتے تھے لیکن کسی ایسی جگہ وہ بھی کوئی حرکت نہیں کرنا چاہتا تھا جہاں پولیس کی مداخلت کا امکان ہو۔ اس لیے وہ سکون سے انتظار کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اسے جان بچانے کا ایک موقع ضرور ملے گا۔ وہ دوسری کار لے کر روانہ ہوئے تو شام ہو چکی تھی۔ میک نے صبح ناشتے کے بعد کچھ نہیں کھایا تھا اور اسے بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے راکی سے کہا۔ ''مجھے بھوک لگ رہی ہے۔''

''فکر مت کرو، راستے میں کچھ لے لیں گے۔'' راکی نے کہا۔

''تم بھوک سے نہیں مرو گے دوست۔'' جونی نے معنی خیز انداز میں کہا۔ میک سمجھ رہا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے۔ وہ بھوک سے نہیں ان لوگوں کے ہاتھوں مرے گا۔ ایک بات طے تھی کہ یہ لوگ اسے اس وقت تک نہیں مار سکتے تھے جب تک سینڈلر کی رقم اسے نہ مل جاتی۔ اس نے جان بوجھ کر دونوں کو رقم کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ ممکن ہے ان کی نیت خراب ہو جاتی اور وہ اس سے رقم حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ پچیس ملین ڈالرز معمولی رقم نہیں تھی۔ اس کے لیے وہ دس بار اس کی جان لینے پر راضی ہو جاتے۔ ایک بار وہ اس سے رقم حاصل کر لیتے تو ان کے لیے اسے مار کر اپنے باس کے سامنے وضاحت پیش کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

اس کا خیال تھا کہ وہ رات گزارنے کے لیے کسی ہوٹل میں رکیں گے۔ یہ سفر بہت طویل تھا۔ انہیں کم سے کم بھی نیویارک پہنچنے میں بارہ گھنٹے لگتے اور وہ اتنی دیر تک سفر نہیں کر سکتے تھے۔ دو گھنٹے بعد انہوں نے کار ایک سپر اسٹور کے سامنے روکی۔ راکی نے جونی سے کہا۔ ''اس کا خیال رکھنا، میں سامان لے کر آتا ہوں۔''

وہ اندر چلا گیا اور جونی نے پستول نکال کر میک کی پسلی سے لگا دیا۔ ''تم نے سن لیا دوست... کوئی غلط حرکت مت کرنا۔''

''میں ایک شریف آدمی ہوں اور میرا آج تک تم جیسے لوگوں سے واسطہ نہیں پڑا ہے۔'' میک نے جواب دیا۔

مگر جونی اس کی طرف سے پوری طرح چوکنا رہا۔ اسے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ میک اس کے باس کے لیے نہایت اہم ہے اور اگر وہ کسی طرح ان کے ہاتھ سے نکل گیا تو ان کی شامت آ جائے گی۔ اس نے بھی میک کو کریدنے کی کوشش کی کہ باس کو اس کی تلاش کیوں تھی؟ مگر میک نے اس سوال پر دم سادھ لیا تھا۔ کچھ دیر بعد راکی کئی تھیلے اٹھائے ہوئے آیا اور اس نے انہیں ڈکی میں رکھ دیا۔ وہ دوبارہ ہائی وے پر روانہ ہوئے۔ اس وقت رات کے نو بج رہے تھے۔

اچانک میک کا موبائل بجا۔ راکی چونکا۔ ''تم نے اس کی تلاشی نہیں لی تھی؟''

جونی نے جلدی سے اس کی جیب سے موبائل نکال لیا اور پھر باقی لباس کی تلاشی بھی لی۔ اس کے پاس ایک پرس تھا۔ موبائل کی گھنٹی مستقل بجے جا رہی تھی۔ جونی نے موبائل میک کو دکھایا۔ ''یہ کس کی کال ہے؟''

نمبر اس کے لیے بھی اجنبی تھا لیکن اس کا دل کہہ رہا تھا کہ یہ کرسٹی کی کال تھی۔ اس نے جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے کہ کرسٹی کی کال ہے۔''

''اس سے بات کرو اور اسے خبردار کرو کہ اس معاملے سے دور رہے ورنہ وہ، اس کا بچہ اور باپ تینوں مارے جائیں گے۔''

جونی سے سیل فون لے کر میک نے کال ریسیو کی۔

''ہیلو۔''

''میک! تم ٹھیک ہو نا؟'' دوسری طرف سے کرسٹی کی آواز آئی۔

''ہاں... اور تم گھر پہنچ گئیں؟''

''ہاں، میں محفوظ ہوں۔ کیا تم ان لوگوں کے ساتھ ہو؟''

''ہاں۔'' میک نے جواب دیا۔ ''کرسٹی! تم اور جیو پولیس سے بات نہیں کرنا۔ یہ میری سلامتی کے لیے ضروری ہے۔''

''میں نے ڈیڈی کو منع کر دیا ہے لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ یہ لوگ تمہیں چھوڑ دیں گے؟''

جونی نے اسے فون دینے سے پہلے اس کا اسپیکر آن کر دیا تھا۔ اس لیے وہ دونوں بھی گفتگو سن رہے تھے۔ ''کوئی ضمانت نہیں ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اگر تم نے چوبیس گھنٹے میں ایک بار مجھ سے رابطہ نہیں کیا تو میں پولیس کے پاس چلی جاؤں گی اور تم نے جو بتایا تھا، وہ سب پولیس کو بتا دوں گی۔'' کرسٹی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''تم ایسی کوئی حرکت نہیں کرو گی۔'' میک نے سخت لہجے میں کہا۔ ''تم اور جیو اس معاملے سے الگ رہو۔''

''کیوں؟'' کرسٹی نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''کیا مجھ سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے؟''

''تعلق ہے اسی لیے تو تمہیں الگ رہنے کو کہہ رہا ہوں۔'' میک نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''تم اور جیو فی الحال یہاں سے کہیں دور چلے جاؤ۔''

''میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی۔''

''کرسٹی! مجھے بھول جاؤ۔ تم میرے ماضی سے واقف نہیں ہو۔''

''مجھے تمہارے ماضی سے کوئی سروکار نہیں ہے۔''

''تمہیں ٹام کی فکر کرنی چاہیے۔ اسے خطروں سے دور رکھنا چاہیے۔ تم ماں بن کر سوچو اور پلیز مجھے پھر فون مت کرنا۔'' اس نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔ راکی نے تعریفی انداز میں کہا۔

''گڈ... تم نے اسے اچھا سمجھایا ہے ورنہ ممکن ہے مجھے یہیں سے گاڑی موڑنا پڑتی۔''

''لگتا ہے وہ تم سے محبت کرنے لگی ہے۔'' جونی نے اس سے فون واپس لے لیا اور اسے آن کرنے کی کوشش کی مگر اس میں سیکیورٹی کوڈ لگا تھا۔ ''کیا اس کے اور تمہارے

درمیان کچھ اور تعلق بھی تھا؟''

''تم اس چکر میں مت پڑو۔'' میک نے بے زاری سے کہا۔ ''اسے کھولنے کی کوشش مت کرو، اس میں کوڈ لگا ہے۔''

''کوڈ کیا ہے؟''

''اس میں تمہارے مطلب کی کوئی چیز نہیں ہے۔''

راکی نے جونی سے فون لیا اور معنی خیز انداز میں بولا۔ ''یہ آئی فون ہے، اس سے انٹرنیٹ بھی استعمال کیا جاسکتا ہے نا؟''

''ہاں۔''

''میرا خیال ہے کہ یہ کام کی چیز ہے۔'' اس نے آئی فون جیب میں رکھ لیا۔ ''ممکن ہے باس کے کام آئے۔''

میک کے کانوں میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ اس میں اس کا بینک اکاؤنٹ نمبر اور اس کے پاس ورڈ موجود تھے۔ اگر سینڈلر اسے کسی طرح کھول لیتا تو وہ آرام سے اس کے اکاؤنٹ تک رسائی حاصل کر کے اپنی رقم واپس حاصل کر لیتا۔ اگرچہ اس کا کوڈ معلوم کرنا بہت دشوار تھا لیکن ناممکن نہیں تھا۔ وہ اس سے اگلوانے کی کوشش بھی کر سکتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ مافیا والوں کے تشدد کے سامنے پتھر بھی بول پڑتے ہیں، وہ تو ایک انسان تھا۔ وہ پچھتانے لگا کہ وہ آئی فون کیوں لے کر آیا تھا مگر اسے خیال نہیں رہا تھا۔

رات بارہ بجے کے قریب انہوں نے کار سڑک کے کنارے سے اتار دی اور اسے جنگل کے اندر لے گئے، یہ جگہ سڑک سے کوئی دو سو گز دور تھی۔ ایک کسی قدر کشادہ جگہ راکی نے کار روکی اور ڈکی سے سامان نکالنے لگا۔ تب میک کو پتا چلا کہ وہ کھانے پینے کے سامان کے علاوہ بھی بہت کچھ لایا تھا۔ اس میں بیٹری سے چلنے والی سرچ لائٹیں اور کیڑے مکوڑے بھگانے والا پاؤڈر اور اسپرے بھی تھا۔ اس کے علاوہ وہ سخت قسم کا ٹیپ بھی لایا تھا۔ شاید اس کا ارادہ میک کو باندھ کر رات آرام سے گزارنے کا تھا۔ اس نے پہلے ٹارچیں جلا کر مختلف جگہوں پر رکھیں۔ کھانے میں وہ مختلف طرح کی چیزیں لے آیا تھا۔ اس نے میک کو کار سے نکالا اور اسے ایک بیگ پر کر دیا۔ میک نے برگر کھاتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم رات یہاں گزارنا چاہتے ہو؟''

''ہاں تو کیا تمہیں کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں لے جائیں؟''

''نہیں اگر تم لوگ تکلیف میں رات گزارنا چاہتے ہو تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔''

وہ بھی کھانے میں لگ گئے تھے۔ کھانے کے بعد راکی نے ٹیپ اٹھایا اور جونی سے بولا۔ ''اسے قابو میں رکھو۔''

جونی نے اسے پکڑ لیا اور راکی نے پہلے پشت پر اس کے ہاتھ باندھے اور پھر ٹخنوں سے اس کے پاؤں بھی باندھ دیے۔ آخر میں اسے دھکا دے کر زمین پر بٹھا دیا۔ میک نے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم میرے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟''

''میرا خیال ہے کہ تم سمجھ گئے ہو گے۔'' راکی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''مجھے پوری کہانی سننی ہے۔''

''وہ تم اپنے باس سے سن لینا۔''

''باس سے نہیں، مجھے تم سے سننی ہے۔'' اس نے کہا۔

''میرے پاس کوئی کہانی نہیں ہے۔''

راکی نے ایک سگریٹ سلگایا اور اس کا ایک کش لے کر اچانک اس کا جلتا سرا میک کے گال پر لگا دیا۔ باوجود ضبط کے اس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔ راکی ہنسا۔ ''تم سے تو یہ بھی برداشت نہیں ہوا۔ میرا پہلا سوال یہ ہے کہ تم کس آف شور بینک اکاؤنٹ کی بات کر رہے تھے؟''

میک کو خاموشی کے بدلے اس بار اپنی گردن پر سگریٹ برداشت کرنا پڑی تھی۔ راکی نے اگلا سوال کیا۔ ''اور تم کس رقم کی بات کر رہے تھے جو سینڈلر کو واپس نہیں ملے گی؟''

''ذرا آرام سے۔'' میک نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ ''ابھی تو تمہیں پہلے سوال کا جواب بھی نہیں ملا ہے۔''

اس بار جونی نے اسے گھونسا مارا۔ اس کا سر گھوم گیا اور اس نے منہ میں خون کا ذائقہ محسوس کیا۔ ''ایسی کوئی رقم نہیں ہے اور نہ اکاؤنٹ ہے۔'' اس نے کہا۔ ''کم سے کم میرے قبضے میں نہیں ہے۔''

''پھر کس کے قبضے میں ہے؟'' راکی نے سوال کیا۔

''اصل میں مجھ سے ایک اکاؤنٹ میچ کرنے میں غلطی ہوئی تھی، تمہارے باس نے اسی لیے مجھے طلب کیا ہے۔''

''لگتا ہے تم اس طرح زبان نہیں کھولو گے۔'' راکی نے کہا۔ اس نے ایک عدد چاقو نکال لیا تھا۔ ''اگر میں تمہاری ایک آنکھ نکال دوں۔''

''یہ بھی کر کے دیکھ لو۔'' میک نے دل کڑا کر کے کہا۔ ''لیکن یہ سوچ لو کہ اپنے باس کو کیا جواب دو گے کیونکہ اگر میں مر گیا تو اس کا بہت بڑا نقصان ہو جائے گا اور اس صورت میں وہ تمہیں بھی معاف نہیں کرے گا۔''

''بکومت۔'' راکی غرایا اور جونی سے کہا۔ ''اسے پکڑ لو۔''

جونی نے کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ راکی کے کہنے پر عمل کیا۔ راکی نے چاقو سے اس کے سینے سے شرٹ کاٹ دی اور نوک اس کے سینے پر بھیرتے ہوئے بولا۔ ''اب بھی وقت ہے بتا دو ورنہ ایسا نہ ہو کہ کوئی بڑا نقصان کر کے بتاؤ۔''

''تم جو معلوم کرنا چاہتے ہو، وہ میں صرف تمہارے باس کو بتا سکتا ہوں اور میں نے اسی وجہ سے اتنی آسانی سے خود کو تمہارے حوالے کیا تھا۔''

''بکومت۔'' راکی نے اس کے سینے پر چاقو سے کٹ لگایا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں نے صرف کرسٹی اور اس کے بیٹے کی خاطر خود کو تمہارے حوالے کیا ہے۔ ورنہ تم خود سوچو کہ کون اس طرح سے خود کو موت کے حوالے کرتا ہے۔''

''یعنی تمہیں پتا ہے کہ تمہیں مرنا ہوگا۔''

''ہاں اور اگر میں نے تمہیں وہ سب بتا دیا تو تم اس سے خود فائدہ اٹھاؤ گے اور مجھے مار دو گے۔ اس کے بعد سینڈلر سے کوئی جھوٹ بول دو گے لیکن وہ یقین نہیں کرے گا اور اگر کر بھی لے گا تو کرسٹی کی شامت آئے گی۔ اس لیے میں تمہیں نہیں بتا سکتا، چاہے تم میرے ٹکڑے کر دو۔''

جونی نے راکی کی طرف دیکھا۔ ''جب یہ باس کو بتانے کے لیے راضی ہے تو یہ سب کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''تم چپ کرو۔'' راکی نے اسے بھی جھڑک دیا۔

''ہاں، تم اپنے باس سے غداری کر کے سب خود کھانے کے چکر میں ہو۔'' میک نے جونی کو اکسانے کے لیے کہا۔

''میں یہ سب باس کے لیے ہی معلوم کر رہا ہوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' جونی بولا۔ ''ہمارا کام اسے باس کے حوالے کرنا ہے۔ اس کے بعد وہ خود اس سے سمجھ لے گا۔''

''اس معاملے میں، میں تمہارا باس ہوں اور جیسا میں کہہ رہا ہوں ویسا ہی کرو۔'' راکی نے جونی کو حکم دیا۔

''جونی کو کوئی حکم نہیں دے سکتا سوائے باس کے۔'' جونی تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے میک کو چھوڑ دیا تھا۔

''کیا تم میرے سامنے کھڑے ہو گے... راکی کے سامنے۔'' راکی غرایا۔ جونی حقارت سے ہنسا۔

''تم ہو کیا؟''

''میں اس سے پوچھ رہا ہوں... اگر تم نہیں سن سکتے تو کہیں اور چلے جاؤ۔''

جونی کی آنکھوں میں خطرناک چمک آ گئی۔ ''کیا تم باس سے بغاوت کر رہے ہو؟''

''میں کچھ بھی کر رہا ہوں، تم میرے معاملے میں مداخلت نہیں کر سکتے۔'' راکی نے کہا۔

''میں کر سکتا ہوں۔'' جونی بولا اور اس نے اپنی جیب سے سیل فون نکال لیا۔ ''میں باس کو کال کر رہا ہوں۔ اگر اس نے بھی مجھے یہی حکم دیا کہ تمہارے معاملے میں مداخلت نہ کروں ...تو میں نہیں کروں گا۔''

راکی ذرا آگے بڑھا تھا کہ جونی نے پھرتی سے پستول نکال لیا۔ ''اپنی جگہ کھڑے رہو۔'' وہ غرایا اور سینڈلر سے رابطہ کرنے لگا۔ اس کی آنکھیں راکی پر مرکوز تھیں۔ رابطہ ہوتے ہی اس نے کہا۔ ''باس! یہ راکی اس آدمی سے اپنے طور پر معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کیا آپ نے اسے اجازت...''

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا تھا۔ یہ میک بھی نہیں دیکھ سکا تھا کہ راکی نے کس وقت چاقو کھینچ مارا تھا جو جونی کی گردن میں اتر گیا تھا۔ بات کرتے ہوئے اس کی توجہ ایک لمحے کے لیے راکی سے ہٹی تھی اور اس نے موقعے سے فائدہ اٹھا لیا۔ جونی کے منہ سے خرخراہٹ نکلی اور اس نے سیل فون پھینک کر گردن سے چاقو نکالنے کی کوشش کی لیکن اس سے پہلے راکی نے چاقو پکڑ لیا اور پھر اسے ایک جھٹکے سے اس طرح کھینچا کہ وہ جونی کا نرخرا کاٹتا ہوا باہر نکل آیا۔ وہ پیچھے جا گرا... اور نزع کے عالم میں ہاتھ پاؤں مارنے لگا..... راکی نے خون آلود چاقو ایک طرف پھینک دیا... اور جھک کر جونی کے ہاتھ سے پستول نکالنے کی کوشش کی تھی کہ اس نے اچانک ہاتھ اوپر کر کے گولی چلا دی۔ راکی الٹ کر گرا۔ گولی اس کے شانے میں لگی تھی۔ جونی کو دوسری گولی چلانے کا موقع نہیں ملا۔ اس کا وقت پورا ہو گیا تھا اور اس نے دم توڑ دیا۔

میک تیزی سے کھسکا... اور جب تک راکی سنبھل کر اٹھتا، وہ کار کے پاس چلا گیا تھا۔ راکی کی حالت خراب تھی۔ اس نے رومال نکال کر زخم پر رکھا اور جونی کے ہاتھ سے پستول نکال لیا۔ ''بس، اب تم حرکت مت کرنا ورنہ تمہیں بھی مار دوں گا۔'' اس نے سفاک لہجے میں کہا تو میک ساکت ہو گیا..... راکی نے زخم کا معائنہ کیا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ گولی شانہ ادھیڑتی ہوئی نکل گئی تھی اور خون بھی اب اتنا نہیں نکل رہا تھا۔ اس نے کسی نہ کسی طرح زخم پر پٹی باندھ لی۔ پھر

میک کی طرف متوجہ ہوا اور پستول اس کی طرف کر کے ...میرے پاس وقت نہیں ہے۔ اس لیے اگر تم نے دو ...کے اندر مجھے اس آئی فون کا کوڈ نہیں بتایا تو میں تمہیں ...گولی مار دوں گا۔''

''اس کے بعد اس کا کوڈ کس طرح معلوم کرو گے؟''

''میرے پاس ہو گا تو کسی نہ کسی طرح معلوم کر ہی ...گا ورنہ تم اپنی جان سے جاؤ گے۔'' راکی جلدی جلدی کہہ ...رہا تھا۔ ''ڈیڑھ منٹ رہ گیا ہے۔''

میک خاموش رہا۔ راکی بے چین ہو رہا تھا۔ اس نے ...اعلان کیا۔ ''ایک منٹ رہ گیا ہے اور تم اس خوش فہمی میں ...مت رہنا کہ میں تمہیں آسانی سے مار دوں گا۔ میں پہلے ...تمہارے سیدھے ہاتھ پر گولی ماروں گا۔ اس کے ایک منٹ ...بعد الٹے ہاتھ پر، مزید ایک منٹ بعد سیدھے گھٹنے پر اور پھر ...الٹے گھٹنے کی باری آئے گی۔ آخری گولی میں تمہارے سر میں ...ماروں گا۔ اب آدھا منٹ رہ گیا ہے۔''

''اگر میں تمہیں بتا دوں، تب بھی تم مجھے گولی مارو ...گے۔'' میک نے کہا۔

''چانس کی بات ہے۔ جلدی فیصلہ کرو۔ دس سیکنڈ رہ ...گئے ہیں۔ پانچ، چار، تین، دو... ایک۔''

''اوکے! میں بتا رہا ہوں۔'' میک نے ہار مان لی۔ ''لیکن صرف اس کا کوڈ کھول لینے سے تم کوئی فائدہ نہیں ...اٹھا سکتے۔''

''وہ میں دیکھ لوں گا۔ پہلے تم کوڈ بتاؤ۔''

میک نے کوڈ بتایا تو راکی نے اسے انٹر کر کے آئی فون ...کو کھول لیا۔ اس نے بے تابی سے اسے دیکھنا شروع کیا۔ ...اسی وقت اس کی توجہ میک سے ہٹ گئی تھی۔ وہ اسی لمحے کا منتظر تھا۔ دراصل وہ کھسک کر چاقو پر آ گیا تھا اور اس نے اس ...سے بلیڈ سے اپنی کلائی پر بندھا ٹیپ کاٹ ڈالا تھا۔ اب اس ...کے ہاتھ آزاد تھے۔ اس نے چاقو بلیڈ سے پکڑا جو خون سے ...تر بتر ہو رہا تھا۔ پھر اچانک ہی اس نے ہاتھ گھما کر چاقو پھینک ...دیا۔ اسے آرمی میں چاقو پھینک کر مارنا بھی سکھایا گیا تھا۔ اس ...نے راکی کے سینے کا نشانہ لیا تھا مگر خون سے چکنا ہونے کی وجہ ...سے میک کا نشانہ خطا گیا اور چاقو راکی کے پستول والے ہاتھ ...پر پیوست ہو گیا۔ اس کے حلق سے چیخ نکلی اور پستول اس ...کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے چاقو نکالنا ...چاہا لیکن اس دوران میں میک نے اٹھ کر اس پر جست لگا ...دی۔ وہ اسے لے کر گرا۔ میک نے اس کا چاقو بھی نکال لیا ...اس سے دور ہونے کی کوشش کی مگر وہ اس سے لپٹ گیا تھا۔ راکی کو معلوم تھا کہ میک اٹھ گیا تو وہ ہار جائے گا اور موت اس کا مقدر بن جائے گی۔ میک کے ہاتھوں نہ سہی، وہ سینڈلر کے ہاتھوں لازمی مارا جائے گا۔ اس لیے شدید زخمی ہونے کے باوجود وہ لڑ رہا تھا۔ میک اس سے خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا اور اسی کشمکش میں چاقو راکی کے پیٹ میں اتر گیا اور اس بار اس کی ہمت جواب دے گئی۔ میک خود کو چھڑا کر کھڑا ہو گیا۔

اس نے پستول اٹھایا اور راکی سے بولا۔ ''اب حرکت مت کرنا ورنہ میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔''

راکی اب حرکت کرنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ میک نے چاقو سے پاؤں پر بندھا ٹیپ بھی کاٹ دیا۔ پھر اس نے راکی کی تلاشی لی۔ اس نے بروقت اس کے پاس سے پستول نکال لیا ورنہ وہ موقع پا کر میک کو گولی مار سکتا تھا۔ راکی کے جسم سے خون بہت تیزی سے بہہ رہا تھا۔ خاص طور سے پیٹ پر لگنے والے چاقو نے کوئی نس کاٹ دی تھی۔ راکی خون روکنے کی کوشش کر رہا تھا مگر ذرا سی دیر میں زمین پر خون کا اچھا خاصا تالاب بن گیا تھا۔ جونی مر چکا تھا۔

''پلیز! مجھے اسپتال لے چلو۔'' راکی نے نحیف آواز میں کہا۔

''نہیں، میں پولیس کے چکر میں نہیں پڑ سکتا۔'' اس نے کہا۔ ''اگر تم کسی طرح ہائی وے تک جا سکو تو تمہیں مدد مل سکتی ہے۔''

''تم مجھے ہائی وے تک چھوڑ سکتے ہو؟'' راکی نے امید سے پوچھا۔

''سوری... میرے پاس وقت نہیں ہے۔'' میک نے اس کی جیب سے کار کی چابی نکال لی۔ ''یہ کام تمہیں خود کرنا ہو گا۔''

''تم مجھے یہاں مرنے کے لیے چھوڑ کر جا رہے ہو؟'' راکی نے بے یقینی سے کہا۔

''ہاں کیونکہ تمہارا مر جانا بہت سارے لوگوں کے لیے اچھا ہو گا۔'' میک کار میں بیٹھتے ہوئے بولا اور پھر اس نے راکی کے چلانے کی پروا کیے بغیر کار آگے بڑھا دی۔ راکی زمین سے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے پکار رہا تھا۔ میک نے اپنا دل سخت کر لیا تھا۔ کرسٹی اور اس کا خاندان اسی صورت میں محفوظ ہو سکتا تھا جب راکی مر جاتا۔ ہائی وے پر آنے کے بعد اس نے کار کی رفتار بڑھا لی تھی۔ وہ جلد از جلد کرسٹی کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ بیس منٹ بعد جب وہ جیو کے فارم سے کچھ ہی دور رہ گیا تھا تو اس نے کار سڑک سے اتار کر ایک

طرف کھڑی کر دی اور اس پر موجود اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کر کے پیدل ہی آگے روانہ ہو گیا۔

جیو کے مکان میں تاریکی تھی لیکن اسے اوپر کی ایک کھڑکی میں ایک ہیولہ نظر آ رہا تھا۔ یہ کرسٹی تھی جو کھڑکی میں کھڑی تھی۔ میک نے آہستہ سے اسے پکارا تو وہ چونکی۔ اس نے نیچے دیکھا۔ ''کرسٹی! نیچے آؤ۔'' میک نے کہا۔

کرسٹی جیسے اڑتی ہوئی آئی اور پوری جان سے اس سے لپٹ گئی۔ ''میک! تم ٹھیک ہو نا؟''

''ہاں، میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے کرسٹی کو پیار کیا۔

''لیکن یہ خون...'' کرسٹی اس کے لباس پر لگا خون دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

''میرا نہیں ہے۔'' میک نے اسے تسلی دی۔ پھر اسے مختصر الفاظ میں خود پر گزرنے والی بپتا سنائی۔ جونی اور راکی کے انجام نے کرسٹی کو خوف زدہ کر دیا تھا۔

''وہ اور لوگ نہ بھیج دے۔''

''میرا خیال ہے کہ وہ اب ایسا نہیں کرے گا۔ پھر بھی تم اور ٹام کچھ عرصے کے لیے کہیں اور چلے جاؤ۔'' میک نے اسے مشورہ دیا۔ ''اگر میں مشکل میں نہیں ہوتا تو تم دونوں کو لے جاتا۔''

کرسٹی اسے اندر لے آئی۔ اس نے پہلے میک کے زخموں کو صاف کر کے ان پر دوا لگائی۔ اس کے گال پر آبلہ پڑ گیا تھا اور سینے پر چاقو سے آنے والی خراش تھی۔ منہ ہاتھ صاف کر کے میک نے دوسرے کپڑے پہن لیے۔ کرسٹی نے جلدی میں اس کے لیے سینڈوچز تیار کیے کیونکہ میک نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ کچھ دیر میں یہاں سے چلا جائے گا تاکہ صبح ہونے سے پہلے اس ریاست کی حدود سے باہر نکل جائے۔

''تم کہاں جاؤ گے؟'' کرسٹی نے اس کے سامنے تیار سینڈوچز رکھے۔

''اپنے پلان کے مطابق میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔'' میک نے اسے حسرت سے دیکھا۔ ''کاش کہ میں تمہارے پاس رہ سکتا۔''

کرسٹی کا دل ڈوبنے لگا۔ ''تم اب کبھی نہیں آؤ گے؟''

''نہیں، میں آؤں گا لیکن کب، یہ نہیں کہہ سکتا۔'' میک نے کہا۔

''میں تمہارا انتظار کروں گی۔''

''کرسٹی! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں تمہیں کسی اور ملک بلاؤں اور تم وہاں آ جاؤ؟''

''کسی اور ملک؟'' اس نے ہچکچا کر کہا۔ ''میں تمہارے لیے کہیں بھی آ سکتی ہوں لیکن ٹام...''

''تم ابھی مت سوچو۔'' میک نے کہا۔ ''ابھی میرے سامنے بہت طویل سفر ہے۔ ممکن ہے مجھے کئی سیٹ ہونے میں کئی سال لگ جائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ میں یہاں سے نکل نہ سکوں لیکن جب میں کہیں سیٹ ہوا اور میری ذات کی وجہ سے تمہیں کوئی خطرہ نہ ہوا تو میں تمہیں ضرور کال کروں گا۔ اس وقت تم اپنے حالات کے مطابق اپنا فیصلہ سنانا۔''

کرسٹی اس کے لیے کافی بنا کر لائی اور اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ پھر اچانک وہ ہنس دی۔ ''میں بھی کتنی احمق ہوں۔ اس بات کا سوگ منا رہی ہوں کہ تم مجھ سے دور چلے جاؤ گے اور اس پر خدا کا شکر ادا نہیں کر رہی کہ اس نے تمہیں زندہ رکھا۔ وہی آگے بھی تمہاری حفاظت کرے گا۔ جب تم کسی محفوظ جگہ چلے جاؤ، تب مجھ سے رابطہ کرنا۔''

میک نے کافی کا مگ اٹھا لیا۔ ان کی زبان بند تھی لیکن وہ چپ نہیں تھے۔ کرسٹی بار بار آنکھوں میں آنے والے آنسو پی رہی تھی۔ آخر میک کھڑا ہو گیا۔ ''اب میں جاؤں گا۔''

''رکو، میں نے تمہارے لیے کچھ کپڑے لیے تھے لیکن دینے کا موقع ہی نہیں ملا۔''

وہ اس کے لیے کپڑے لائی اور اس کے سوٹ کیس میں رکھ دیے۔ پھر میک نے اسے نرمی سے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ وہ چپ چاپ ایک دوسرے کے دل کی دھڑکن سنتے رہے۔ پھر کرسٹی اس سے الگ ہو گئی۔ اس نے میک سے کہا۔ ''ایک چیز اور بھی ہے۔''

اس نے میک کو ایک چھوٹا سا سیل فون لا کر دیا۔ ''اب تم اپنا سیل فون مت استعمال کرنا۔ اس سے تم پکڑے جاؤ گے۔ میں اس پر تم سے رابطہ کروں گی۔''

''شکریہ!'' میک نے فون لے لیا۔

وہ باہر آئے۔ کار میں بیٹھنے سے پہلے میک نے ایک بار پھر اسے سینے سے لگایا اور پھر دل پر جبر کر کے الگ ہو گیا۔

''خدا حافظ۔''

''خدا حافظ۔'' کرسٹی نے بھیگی آواز میں کہا۔

ہائی وے کی طرف جاتے ہوئے میک نے عقبی آئینے میں کرسٹی کو کھڑے دیکھا، وہ ہاتھ ہلا رہی تھی اور پھر کار ہائی وے کی طرف مڑ گئی۔ میک نے گہری سانس لی۔ وہ کرسٹی سے پھر مل سکے گا یا نہیں، اس کا فیصلہ آنے والے وقت کو کرنا تھا...

انمول اور قیمتی چیزیں ہی کارآمد نہیں ہوتیں..... کبھی کبھی بیکار..... بے ضرر اشیا وہ کام کر جاتی ہیں جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا..... دوستی اور دولت کے امتحان کی کہانی جس میں کسی ایک کو کامیابی حاصل کرنی تھی۔

ان افراد کی عکاس تحریر جو وقت کو بہت قیمتی سمجھتے تھے

مریم کے خان

اصل اہمیت

جیسن جانسن اس وقت جانسن انٹرپرائز کا مالک تھا۔ جانسن خاندان اور اس فرم کی ایک ساکھ تھی، وہ ارب پتی تھے مگر ان کے خاندان میں دولت سے زیادہ انسانوں کو اہمیت دی جاتی تھی۔ اگرچہ یہ عجیب بات تھی اور امریکا جیسے ملک میں تو بہت ہی عجیب بات تھی کیونکہ یہاں انسان کے بجائے اس کی دولت یا اس کی صلاحیت کو دیکھا جاتا ہے۔ مگر جانسن خاندان میں ایسا نہیں تھا۔ یہ انسان کو صرف انسان سمجھتے تھے۔ ان کو دولت کے لحاظ سے خانوں میں نہیں بانٹتے تھے۔ وہ ملنے جلنے اور رشتوں میں اس چیز کو درمیان میں نہیں لاتے تھے۔ جیسن ابھی نوجوان تھا اور اسے فرم سنبھالے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا مگر اس نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا تھا کہ وہ اپنے خاندان کے دوسرے لوگوں سے مختلف نہیں ہے۔ اس نے جس لڑکی کو پسند کیا اور اسے شادی کے لیے پرپوز کیا، اس کا تعلق ایک عام سے گھرانے سے تھا۔

مشل کالج میں پڑھ رہی تھی اور اس کا گریجویشن مکمل ہونے میں سال باقی تھا۔ وہ اٹلانٹا سٹی میں رہتی تھی جبکہ جیسن

میامی میں رہتا تھا۔ مشل سے اس کی دوستی دو سال پہلے ہوئی تھی۔ ایک سال پہلے انہوں نے منگنی کر لی تھی اور اس سال مشل کالج کی گرما کی چھٹیاں اس کے پاس گزارنے میامی آ رہی تھی۔ مشل صورت و شکل کے لحاظ سے حسین تو تھی ہی، ساتھ ہی وہ بہت اچھا ذہن اور سوچ بھی رکھتی تھی اور اسی بات نے جیسن کو اس کے قریب کر دیا تھا۔ جب جیسن نے محسوس کیا کہ اس میں ایک اچھی بیوی بننے کی تمام خصوصیات موجود ہیں تو اس نے مشل کو پرو پوز کر دیا تھا۔ اسے اس بات کی ذرہ برابر پروا نہیں تھی کہ مشل ایک متوسط امریکی گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔

جیسن مشل کے آنے سے بے حد خوش تھا۔ اس نے مشل کے لیے ایک پروگرام بنایا کہ وہ اسے پورے میامی اور اس کے آس پاس تمام تفریحی جگہوں کی سیر کرائے گا۔ پھر وہ آنے والی بہار میں اپنی شادی کا منصوبہ مکمل کریں گے۔ اس نے مشل سے کہا تھا کہ وہ شادی کے بعد فرم کے کاموں میں اس کا ساتھ دے گی۔ وہ اس کی شریک حیات ہی نہیں شریک کاروبار بھی ہو گی۔

مشل طیارے سے ائر پورٹ لاؤنج میں آئی تو وہاں جیسن اس کا منتظر تھا۔ وہ گرم جوشی سے اس سے ملا۔ ''میں نے تمہارے آنے کا ایک ایک دن گن گن کر گزارا ہے۔''

''میں بھی تو بے تاب تھی۔'' مشل بولی۔ ''نہ جانے کب میرا گریجویشن مکمل ہو گا اور میں ہمیشہ کے لیے تمہارے پاس آ جاؤں گی۔''

''... وقت بھی زیادہ ... نہیں ہے۔'' جیسن نے اس کا بیگ اٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ ائر پورٹ سے جیسن کے شاندار ولا کی طرف روانہ ہوئے جو میامی کے مہنگے ترین علاقے میں تھا۔ اس ولا کا اپنا ساحل اور ایک بوٹ ہاؤس بھی تھا۔ جیسن نے مشل کے لیے ولا کا سب سے اچھا بیڈ روم چنا تھا۔ اسی شام اس کے اعزاز میں ایک پارٹی کا اہتمام بھی کیا تھا جس میں شہر کے منتخب لوگ شریک ہوئے تھے۔

تیسرے دن مشل پہلی بار جانسن انٹرپرائز کے دفتر گئی تھی جہاں جیسن نے تمام اسٹاف کو جمع کر کے اس کا تعارف کرایا اور یہ بھی اعلان کیا کہ شادی کے بعد مشل بھی فرم کی مالکان میں سے ہو گی۔ مشل اس پذیرائی پر بہت خوش تھی اگرچہ اس نے جیسن کو پسند کیا تھا اور اسے دولت کی خاص پروا نہیں تھی مگر یہ انسان کی فطرت ہوتی ہے کہ وہ اس قسم کی توجہ پا کر خوش ہوتا ہے۔ تعارف کے بعد وہ جیسن کے دفتر میں آئی تو اس نے جیسن سے سنجیدگی سے کہا۔

''سچ کہوں تو مجھے یہ سب چیزیں نہیں چاہئیں، مجھے تو بس تمہارا ساتھ چاہیے۔''

''میں جانتا ہوں۔'' جیسن نے کہا۔ ''یہ تو میری خوشی ہے کہ میری بیوی میری ہر شے میں شریک ہو۔''

''اور مجھے تمہاری خوشی عزیز ہے۔'' مشل بولی ... میں اس کی نظر جیسن کی میز پر رکھے ایک ہیرے نما پتھر پر گئی ... بے حد شفاف اور ہلکے نیلگوں رنگ کا تھا، دیکھنے میں بالکل ... ہیرا لگ رہا تھا، مگر اصلی ہیرے کو کون اس طرح سے ... سے میز پر رکھتا ہے۔ ''یہ کیا ہے؟'' اس نے جیسن سے پوچھا۔

''تمہیں کیا لگ رہا ہے؟'' جیسن نے الٹا سوال کیا۔

مشل ہچکچائی۔ ''مجھے تو ہیرا لگ رہا ہے۔''

جیسن مسکرایا۔ ''یہ میامی کے مشہور جوہری ریان اسمتھ کی ملکیت تھا۔ وہ اسمتھ جیم کا بانی بھی تھا۔''

''اوہ... پھر تو یہ بہت قیمتی ہیرا ہو گا۔'' مشل نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔ ''جان اسمتھ تو بہت مشہور جوہری تھا، اس کی فرم آج بھی قائم ہے۔''

''ہاں اب اس کی چوتھی نسل اس فرم کو چلا رہی ہے۔ جیسے جانسن خاندان کی چوتھی نسل کاروبار کے میدان میں ہے۔''

''کیا ان دونوں خاندانوں میں کوئی مطابقت ہے؟'' مشل نے اس کی بات پر غور کیا۔

''مجھے یقین تھا تم یہ سوال ضرور کرو گی۔'' جیسن نے تعریف کرنے کے انداز میں کہا۔ ''تم سچ مچ ذہین ہو۔''

''واقعی، کیا اسمتھ اور جانسن خاندان میں کوئی تعلق ہے؟'' مشل نے تعجب سے کہا۔

''ہمارا کوئی کاروباری تعلق نہیں ہے... مگر اس سے ہٹ کر ایک اور تعلق ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے تمہیں ایک کہانی سننا پڑے گی تب تم اس بات کو درست طور پر سمجھ سکو گی۔''

''میں ضرور سنوں گی۔ ویسے کیا کہانی کا تعلق ... ہیرے سے بھی ہے؟''

''بالکل اسی سے ہی ہے۔'' جیسن بولا۔ ''اس نے ان دو خاندانوں کو باری باری تباہ ہونے سے بچایا تھا اور آج ان دونوں کاروباری اداروں کو جس بلندی پر دیکھ رہی ہو اس کا سہرا اس کے سر ہی جاتا ہے۔''

''حیرت انگیز۔'' مشل بولی۔ ''یہ کہانی یقیناً بہت دلچسپ ہو گی۔''

''یہ کہانی ہمارے خاندان کا ورثہ ہے اور اب تم اس خاندان کی ایک فرد بننے جا رہی ہو اس لیے تمہارا اس کہانی سے واقف ہونا بہت ضروری ہے۔ تمہیں اندازہ ہو گا کہ ہم چیزوں سے زیادہ انسانوں کو کیوں اہمیت دیتے ہیں۔''

☆☆☆

بشپ جانسن ایک اعلیٰ درجے کا بڑھئی تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایسی مہارت تھی کہ اس کی تیار کی ہوئی چیزیں ... زبان سے بولتی تھیں کہ ان کو بشپ نے تیار کیا ہے۔ ویسے تو وہ لکڑی کا سارا کام ہی کرتا تھا مگر اسے فرنیچر بنانے میں کمال مہارت حاصل تھی۔ دور دور سے لوگ اس سے خاص طور سے فرنیچر بنوانے آتے تھے۔ یہ 1899ء کی بات تھی۔ اس زمانے میں میامی ایک چھوٹا سا مگر ترقی کرتا شہر تھا۔ ابھی صنعتیں قائم ہو رہی تھیں اور ہوٹلوں کی تعمیر جاری تھی۔ اس لیے بشپ کے پاس کام کی کمی نہیں تھی بلکہ اسے تو سر کھجانے کی فرصت بھی نہیں تھی۔ لوگ اس سے کام کرانے کے لیے انتظار کرنے کو بھی تیار رہا کرتے تھے۔

بشپ تقریباً پینتیس برس کا مضبوط جسامت کا چہرے سے باوقار نظر آنے والا شخص تھا۔ اس کی بیوی اور تین بچے تھے، اس کا اپنا ذاتی مکان تھا جسے اس نے بڑی چاہت سے خود بنایا تھا۔ اس مکان کے ساتھ اس کی ورکشاپ تھی جس میں اس زمانے کے لحاظ سے ساری سہولتیں موجود تھیں۔ بشپ بہت دولت مند تو نہیں تھا، مگر اسے مالی لحاظ سے کبھی کوئی مسئلہ نہیں رہا تھا۔ اس کی آمدنی اتنی تھی کہ وہ سارے خرچ پورے کر کے بھی کچھ نہ کچھ بچا لیا کرتا تھا۔ اس کے بچے اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ وہ سال میں دو بار تفریح کرنے جاتے تھے۔

اس کی زندگی بہت آرام سے گزر رہی تھی کہ اچانک ہی اس پر مصیبتوں اور پریشانیوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ سب سے پہلے اس کا جوان بیٹا روڈی بیمار ہوا اور چل بسا۔ اس کے اور اس کی بیوی جینٹ کے لیے یہ بہت بڑا سانحہ تھا۔ ڈاکٹرز اس کی بیماری سمجھ نہیں پائے تھے۔ بشپ کا صدمے سے برا حال تھا۔ وہ روڈی سے بہت پیار کرتا تھا، اس کی بیوی نے اس کا اتنا صدمہ لیا تھا کہ بیمار ہو گئی اور پھر اس کی بیماری اتنی بڑھی کہ بشپ بیٹے کا صدمہ بھول کر بیوی کی فکر میں پڑ گیا۔

جب جینٹ کی بیماری حد سے بڑھی تو اس نے اسے اسپتال میں داخل کرا دیا۔ ان پریشانیوں کی وجہ سے اس کے کام پر بھی اثر پڑ رہا تھا۔ وہ کام وقت پر نہیں کر پا رہا تھا۔ اس کے لوگوں سے جھگڑے بھی ہونے لگے تھے۔ ان میں ایک ریان اسمتھ بھی تھا وہ میامی کا واحد جیولر تھا اور بہت دولت مند آدمی تھا۔ اس کے پاس بے حساب دولت تھی اور وہ لوگوں کو سود پر قرض بھی دیا کرتا تھا۔ ریان نے اس سے ایک الماری بنوائی تھی، مگر بشپ بیٹے کی وفات اور پھر بیوی کی بیماری کی وجہ سے اسے الماری وقت پر بنا کر نہیں دے سکا۔ اس پر ریان نے اسے سخت سست کہا اور اپنا آرڈر منسوخ کر دیا۔ اس سے بشپ کو دہرا نقصان ہوا۔ اس نے الماری کی تیاری پر خاصی رقم اپنے پاس سے خرچ کر دی تھی۔ دوسرے ریان نے اس کے چند اور آرڈر بھی منسوخ کرا دیے۔ بشپ بہت خوش مزاج اور ٹھنڈے دماغ کا آدمی تھا مگر اس وقت وہ ریان سے جھگڑ پڑا تھا اور اسے بہت کچھ کہہ گیا تھا۔

ڈاکٹروں نے جینٹ کو ٹی بی تشخیص کی تھی اور اس زمانے میں ٹی بی کا کوئی علاج نہیں تھا۔ اگر مریض کی زندگی باقی ہوتی تھی تو ٹھیک تھا ورنہ اس مرض کا انجام موت ہوتی تھی۔ ڈاکٹرز نے جینٹ کو کسی دور دراز جگہ لے جانے کو کہا کیونکہ سمندری آب و ہوا مریض کی زندگی کو اور بھی مختصر کر دیتی اس لیے بشپ نے اسے جارجیا ریاست کے ایک سینی ٹوریم میں داخل کرا دیا۔ سینی ٹوریم ایک پر فضا اور خشک مقام پر تھا۔

جینٹ اس کا پورا گھر سنبھالتی تھی۔ اس کے سینی ٹوریم جانے سے گھر اور بچوں کو دیکھنے کی ذمے داری بھی بشپ کے سر آ گئی تھی اس کے ساتھ ہی اسے کمانا بھی ہوتا تھا کیوں کہ جینٹ کے علاج پر خاصی رقم صرف ہو رہی تھی۔ اس کی دو چھوٹی بیٹیاں تھیں۔ ماں کو یاد کر کے وہ روتی تھیں تو بشپ کا دل بھی پھٹنے لگتا تھا۔ وہ بار بار ورک شاپ سے آ کر ان کو دیکھا کرتا تھا۔ ان کی دیکھ بھال اور کھانا بنانا بھی اس کی ذمے داری تھی۔ اس وجہ سے وہ اپنے کام پر پوری طرح توجہ نہیں دے پاتا تھا، اس کا کاروبار متاثر ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے، اس کا کوئی ایسا رشتے دار نہیں تھا جو

خوشخبری

طلسماتی انگوٹھی ایک عظیم تحفہ ہے۔ ہم نے سورۂ یاسین کے نقش پر فیروزہ، یمنی عقیق، پکھراج، لاجورد، نیلم، زمرد، یاقوت پتھروں سے تیار کی ہے۔ انشاء اللہ جو بھی یہ طلسماتی انگوٹھی پہنے گا اس کے تمام بگڑے کام بن جائیں گے۔ مالی حالات خوب سے خوب تر اور قرضے سے نجات مل جائے گی۔ پسندیدہ رشتے میں کامیابی، میاں بیوی میں محبت، ہر قسم کی بندش ختم، رات کو تکیے کے نیچے رکھنے سے لاٹری کا نمبر، جادو کس نے کیا، کاروبار میں فائدہ ہو گا یا نقصان معلوم ہو جائے گا۔ آفیسر اپنی طرف مائل، نافرمان اولاد نیک، میاں کی عدم توجہ، جج یا حاکم کے غلط فیصلے سے بچاؤ، مکان، فلیٹ یا دکان کسی قابض سے چھڑانا، معدے میں زخم، دل کے امراض، شوگر، یرقان، جسم میں مرد و عورت کی اندرونی بیماری، مردانہ کمزوری، ناراض کو راضی کرنے یہ سب کچھ اس انگوٹھی کی بدولت ہو گا۔ یاد رکھو سورۂ یاسین قرآن پاک کا دل ہے۔

رابطہ: صوفی علی مراد

0333-3092826 , 021-2446647

M-20A الرحمان ٹریڈ سینٹر بالمقابل سندھ مدرسہ کراچی

اس کے گھر اور بچیوں کو سنبھال لیتا تو وہ کام پر توجہ دے سکتا۔ جینٹ کے ماں باپ نے اس سے کہا تھا کہ وہ بچیوں کو ان کے پاس بھیج دے، وہ جارجیا میں رہتے تھے مگر اس کی اب یہی دو بیٹیاں تھیں اور وہ ان کو خود سے دور نہیں کر سکتا تھا۔

مصیبت ابھی پوری نہیں ہوئی تھی، یہ تو آغاز تھا۔ ایک رات وہ گھر میں سو رہے تھے تو نہ جانے کیسے ورک شاپ میں آگ لگ گئی۔ ممکن تھا یہ کسی کی شرارت ہو کیونکہ لمحوں میں آگ نے پوری ورک شاپ کو لپیٹ میں لے لیا۔ جب تک بشپ بیدار ہو کر باہر آیا تو آگ نے مکان کے کچھ حصے کو بھی لپیٹ لے لیا تھا۔ وہ ورک شاپ بھول کر پہلے مکان کو بچانے کی فکر میں پڑ گیا۔ اس نے سب سے پہلے بچیوں کو پھر اپنا ضروری سامان باہر نکالا۔ اس دوران میں اس کے پڑوسی بھی مدد کو آ گئے اور ان کی مدد سے وہ آگ بجھانے کی کوشش کرنے لگا، مگر بدقسمتی سے اس روز ہوا بہت تیز تھی اور اس وجہ سے آگ پھیلتی چلی گئی۔ جب صبح کا سورج طلوع ہوا تو اس کے مکان اور ورک شاپ کی جگہ سوائے راکھ کے ڈھیر کے اور کچھ نہیں تھا۔ اس کے پاس سوائے تن کے کپڑوں اور دو بچیوں کے کچھ نہیں رہا تھا۔

ورک شاپ میں کئی افراد کے لیے تیار کی جانے والی اشیا رکھی تھیں۔ وہ بھی جل کر خاکستر ہو گئی تھیں، یہ بہت بڑا نقصان تھا، جن کی رقم اس کے ذمے تھی وہ اپنی رقم کا مطالبہ کرنے لگے تھے اور جن کی چیزیں جل گئی تھیں وہ اپنی چیزیں مانگنے لگے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس نقصان کو کس طرح پورا کرے۔ اس کے پاس تو کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ اس کے ایک دوست نے عارضی طور پر اس کی بچیوں اور اسے اپنے گھر میں پناہ دے دی تھی مگر وہ خود بھی غریب آدمی تھا اسے زیادہ مدت کے لیے اپنے پاس نہیں رکھ سکتا تھا۔ ان حالات میں اسے ایک ہی راستہ دکھائی دیا کہ بچیوں کو ان کے ننھیال چھوڑ آئے اور خود کسی طرح نئے سرے سے کام کا آغاز کرنے کی کوشش کرے۔ اسے اعتماد تھا کہ اس کے پاس ہنر ہے، وہ پھر سے اپنا کام شروع کر سکتا ہے۔ اس نے کچھ رقم ادھار لی اور بچیوں کو ان کے ننھیال چھوڑنے جارجیا چلا گیا۔

اس کا سسرال بھی عام سا تھا۔ وہ اس کی مالی لحاظ سے مدد نہیں کر سکتے تھے مگر اس کے سسر نے اسے کہا کہ جب تک اس کے حالات نہیں سنبھل جاتے اس کی بچیاں ان کے پاس رہیں گی اور وہ اپنی بیٹی کے علاج کے لیے بھی رقم سینی ٹوریم بھیجتے رہیں گے۔ اتنے دنوں کی پریشانی میں یہ پہلا اطمینان کا سانس تھا جو بشپ کو ملا تھا، ورنہ اسے لگ رہا تھا کہ جیسے مشکلات نے اس کا گھر دیکھ لیا ہے۔ وہ اکیلا کسی نہ کسی طرح گزارہ کر ہی لیتا۔ وہ واپس آیا تو اس کے دوست جوزیو نے اس سے کہا۔

''تم اپنا کام شروع کرو کیونکہ کسی کے پاس ڈکری کرنے سے تمہیں کچھ نہیں ملے گا اور تم ہمیشہ کے لیے اس چکر میں پھنس جاؤ گے۔''

''اپنا کام کرنے کے لیے بہت ساری رقم کی ضرورت ہو گی اور تم جانتے ہو کہ میرے پاس چند دن گزارنے کے لیے بھی کچھ نہیں ہے، نہیں دوست میرے پاس ملازمت کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔''

''بشپ تم کسی سے قرض لے سکتے ہو، اس شہر کے لوگ تمہیں پسند کرتے ہیں کوئی نہ کوئی تمہیں اتنی رقم دے دے گا جس سے تم اپنا کام شروع کر سکو۔''

''واقعی۔'' بشپ کے اندر امید جاگی تھی۔ ''کوئی مجھے قرض دے دے گا؟''

''میرے دوست میرے پاس اتنی رقم ہوتی تو میں بلا جھجک تمہیں دے دیتا، مگر تم جانتے ہو میں خود مشکل سے اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالتا ہوں۔''

''میں جانتا ہوں جوزیو، اور تم نے میرے لیے جو کیا ہے اس کا احسان میں ساری عمر نہیں بھول سکتا۔'' بشپ نے شکر گزاری سے کہا۔ ''تم نے اپنی بساط سے بڑھ کر میری مدد کی ہے۔''

''کاش میں اس سے زیادہ کچھ کر سکتا۔'' جوزیو نے سرد آہ بھری تھی۔

اگلے دن سے بشپ نے تمام جاننے والوں سے قرض کی امید میں ملنا شروع کر دیا، مگر جلد اسے اندازہ ہو گیا کہ اسے قرض ملنا بہت مشکل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ لوگ اسے بہت پسند کرتے تھے اور اس کی دیانت پر بھی اعتبار تھا، مگر مسئلہ یہ تھا کہ وہ دیوالیا ہو چکا تھا اور لوگ اس خوف سے اس کو قرض دینے کے لیے تیار نہیں تھے کہ ان کی رقم ڈوب جائے گی۔ ان کا خوف بھی درست تھا کیونکہ بشپ کے ساتھ پے در پے سانحات پیش آئے تھے اور لوگوں کو اس کے بارے میں یقین ہو گیا تھا کہ وہ جس کام میں ہاتھ ڈالے گا اس میں ناکام ہو گا۔

بشپ کئی دن تک کوشش کرتا رہا، لوگوں سے مایوس ہو کر وہ بینک گیا مگر وہاں تو حالات اور بھی سخت تھے۔ بینک والے اس سے کسی کی ضمانت مانگ رہے تھے، جبکہ وہ بالکل قلاش تھا اس کی ضمانت کون دیتا۔ اب اس نے لوگوں سے ضمانت کے لیے منت سماجت شروع کر دی، مگر جو ضمانت دینے کے لیے تیار تھے بینک ان کی ضمانت نہیں مان رہا تھا اور جن کی ضمانت بینک مان سکتا تھا، انہوں نے بشپ کو ضمانت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے سسر نے چلتے وقت اسے پچاس ڈالرز دیے تھے۔ وہ بھی تیزی سے خرچ ہو رہے تھے اور ایسا لگ رہا تھا کہ اسے ملازمت کرنا ہی پڑے گی۔ اس کے کام میں ملازمت غلامی سے کم نہیں تھی۔ جان توڑ مشقت کے بعد اسے صرف اتنا ملتا جس سے وہ گزارہ کر سکتا تھا۔ جبکہ اسے اپنی بیوی کا علاج بھی جاری رکھنا تھا اور اپنی بچیوں کو بھی پالنا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ جب وہ شام کو تھکا ہوا جوزیو کے گھر آتا تو وہ اسے تسلی دیتا تھا، اس کا حوصلہ بڑھاتا تھا۔ اسے نت نئی ترکیبیں اور مشورے دیتا تھا۔ وہ اگلے دن کے لیے اسے پھر سے تازہ دم کر دیا کرتا تھا۔

مگر رفتہ رفتہ بشپ کی مایوسی بڑھتی جا رہی تھی، اسے کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا۔ ایک شام اس نے جوزیو سے کہا۔ ''میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں ملازمت کر لوں گا۔ کم سے کم اپنا بوجھ تو اٹھا لوں۔''

''نہیں دوست، میں تمہیں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔'' جوزیو نے شدت سے مخالفت کی۔ ''اور جہاں تک تمہارا تعلق ہے تو تم میرے دوست ہو اور جب تک چاہو میرے پاس رہو۔''

''مگر میں ہمیشہ تو تمہارے پاس نہیں رہ سکتا اور سوال صرف میری ذات کا نہیں ہے، بلکہ میرے بیوی بچے بھی ہیں وہ میری ذمے داری ہیں۔ میں ان کو ہمیشہ کے لیے کسی کے پاس نہیں چھوڑ سکتا ہوں۔''

''تم نے کیا ہر جگہ کوشش کر لی ہے؟''

''ہر ہر جگہ دوست... کوئی در ایسا نہیں چھوڑا جہاں سے مجھے قرض کی ذرا سی بھی امید ہو۔''

''تم جیولر ریان اسمتھ کے پاس کیوں نہیں جاتے ہو؟'' جوزیو نے اسے ایک نیا مشورہ دیا۔ ''وہ لوگوں کو قرض بھی دیتا ہے۔''

''ہرگز، نہیں۔'' بشپ بھڑک اٹھا۔ ''اس شخص کے پاس جانے سے بہتر ہے میں بھوکا مر جاؤں۔ تم جانتے ہو اس نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ اس کی وجہ سے مجھے پانچ سو ڈالرز سے زیادہ کا نقصان ہوا ہے۔''

''بے شک اس نے تمہارے ساتھ برا کیا مگر تم اس سے بھیک مانگنے نہیں جا رہے ہو بلکہ اس سے قرض لو گے اور جب تمہارے پاس رقم ہو گی تو اس کا قرض لوٹا دینا۔''

''میں اس سے قرض بھی نہیں لینا چاہتا۔'' بشپ نے صاف انکار کر دیا مگر جوزیو اس کو قائل کرنے کوشش کرتا رہا اور آخر کار اس نے بشپ کو قائل کر لیا کہ وہ ایک بار ریان سے بات کر کے دیکھے، ممکن ہے وہ اس کو قرض دے دے۔

''تم کہتے ہو تو میں اس سے بات کرتا ہوں مگر مجھے یقین ہے وہ مجھے ایک سینٹ بھی نہیں دے گا اور بے عزت کر کے اپنے دفتر سے نکال دے گا۔'' بشپ نے بادل ناخواستہ آمادہ ہوتے ہوئے کہا۔

''نہ جانے مجھے لگ رہا ہے یہاں تمہارے لیے کچھ نہ کچھ ہو گا۔'' جوزیو نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

بشپ ہمت کر کے جیولر ریان کے دفتر گیا۔ اس نے اندر اس کے پاس اپنے نام کی پرچی بھیجی تو پہلے ریان نے خاصی دیر تک اسے بلایا نہیں۔ وہ صبر سے نشست گاہ میں اپنی باری کا انتظار کرتا رہا، وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے بعد آنے والے اس سے پہلے جا کر ریان سے مل رہے تھے اور اس کی باری نہیں آ رہی تھی۔ اسے بیٹھے بیٹھے دو گھنٹے ہو گئے اور رفتہ رفتہ اس کی قوت برداشت جواب دیتی جا رہی تھی۔ اس وقت جبکہ دفتر خالی ہو گیا اور وہ بھی جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اندر سے اس کا بلاوا آ گیا۔

''خوش آمدید مسٹر جانسن۔'' ریان نے اپنے پُرآسائش کمرے میں اس کا استقبال کرتے ہوئے کہا، مگر یہ استقبال محض زبانی تھا اس نے نہ تو بشپ سے ہاتھ ملایا اور نہ ہی اس کے لیے اٹھا۔ اس کے لہجے سے بھی استہزا جھلک رہا تھا۔ ''کہو کس سلسلے میں مجھ کو شرف ملاقات بخشا ہے تم نے؟''

''مسٹر اسمتھ!'' بشپ نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ مجھے کچھ رقم قرض چاہیے۔''

''اچھا۔'' اس نے اسی انداز میں پوچھا۔ ''کتنی رقم مسٹر جانسن اور کس مقصد کے لیے؟''

''مجھے دو ہزار ڈالرز کی ضرورت ہے۔''

''دو ہزار ڈالرز۔'' ریان اسمتھ نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔ ''کیا تمہیں اندازہ ہے کہ یہ کتنی بڑی رقم ہے مسٹر جانسن؟''

''ہاں مسٹر اسمتھ کیونکہ مجھے پھر سے اپنا کاروبار شروع کرنا ہے۔''

''اوہ، اچھا... تم پھر سے اپنا کام شروع کرنا چاہتے ہو۔'' ریان کا لہجہ اور بھی استہزائیہ ہو گیا۔ ''کیا تمہیں یقین ہے کہ تم اس بار کامیاب ہو جاؤ گے؟''

''مسٹر اسمتھ! میرے پاس ہنر ہے اور مجھے یقین ہے کہ میں کامیاب ہوں گا۔'' اس نے اعتماد سے کہا۔

''اور اگر تم ناکام رہے تو؟''

اس سوال کا بشپ کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے بے بسی سے ریان کی طرف دیکھا جو طنزیہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ دیکھ کر بشپ کو غصہ آ گیا، اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے مسٹر اسمتھ! تم مجھے قرض مت دو مگر تمہیں میرا مذاق اڑانے کا کوئی حق نہیں ہے۔'' وہ کھڑا ہو گیا۔ ''میں نے غلطی کی جو تمہارے پاس آیا۔ مجھے پہلے ہی سمجھ لینا چاہیے تھا کہ تمہارے پاس میرے لیے کچھ نہیں ہوگا۔''

ریان اسمتھ کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ بشپ جانسن کی زبوں حالی سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا ہے۔ جب بشپ جانے لگا، تو اسے اچانک جیسے کوئی خیال آیا اور اس نے عقب سے بشپ کو آواز دی۔ ''ایک منٹ مسٹر جانسن... میرے پاس تمہارے لیے ایک چیز ہے۔''

بشپ رک گیا اور ریان اسمتھ کی طرف گھوما۔ ''کیا چیز ہے مسٹر اسمتھ؟'' اس کے انداز میں شک تھا۔

ریان اسمتھ ذرا آگے کی طرف جھکا اور اس نے اپنا ہاتھ اس کی طرف پھیلایا، اس پر کبوتر کے انڈے سے ذرا چھوٹا اور نیلگوں مائل بے حد قیمتی ہیرا تھا۔ ''یہ ہے... اگر تمہیں قبول ہو تو...''

''یہ ہیرا ہے... مسٹر اسمتھ؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''تو تمہارے خیال میں میرے پاس جعلی ہیرے بھی ہوتے ہیں؟'' ریان اسمتھ ہنسا۔

''نن... نہیں مسٹر اسمتھ۔ میں نے یہ تو نہیں کہا... لیکن یہ تو بہت قیمتی ہے۔'' بشپ نے ہکلا کر کہا۔ ''مجھے تو صرف دو ہزار ڈالرز کی ضرورت ہے۔''

''بات یہ ہے کہ ان دنوں میرے پاس رقم نہیں ہے۔ بس یہی ہیرا ہے اگر تمہیں چاہیے تو لے جاؤ ورنہ تمہاری مرضی۔'' ریان نے بے پروائی سے کہا اور ہیرا واپس دراز میں رکھنے لگا۔ بشپ نے جلدی سے کہا۔

''ایک منٹ... مسٹر اسمتھ... میں اس کا مطلب نہیں سمجھا۔''

''کس کا؟''

''کہ تم یہ ہیرا مجھے دے رہے ہو...''

''اس میں نہ سمجھنے والی کون سی بات ہے۔ میں یہ ہیرا تمہیں اُدھار دے رہا ہوں۔''

''مگر کس شرط پر... مجھے اس کے بدلے تمہیں کیا دینا ہوگا؟''

''کچھ بھی نہیں۔''

''کچھ بھی نہیں۔'' اس نے حیرت سے ریان کی بات دُہرائی۔

''ہاں... تمہیں اس کے بدلے کچھ نہیں دینا ہوگا... بس میری ایک شرط ہے۔''

''یعنی کوئی شرط ہے۔'' بشپ مرجھا گیا۔

''ہاں بہت معمولی سی شرط ہے۔'' ریان اسمتھ ڈرامائی انداز میں بولا۔ ''اور وہ یہ ہے کہ تم مجھے ہیرا ہی واپس کرو گے۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' اس نے پریشانی سے کہا۔

''دیکھو۔ میں تمہیں ہیرا دے رہا ہوں اور مجھے ہیرا ہی واپس چاہیے۔''

''تب میں اس ہیرے کا کیا کروں گا؟'' وہ بولا۔

''مجھے تو رقم چاہیے، ہیرے کے بدلے میں کیا لے سکتا ہوں اور اسے فروخت کر دوں گا تو تمہیں واپس کیسے کروں گا۔''

''یہ تم جانو... میں نے اپنی شرط تمہیں بتا دی ہے... اب تم چاہو تو ہیرا لے سکتے ہو۔''

''تم مجھ سے... سود نہیں لو گے؟''

''ایک سینٹ کا بھی نہیں... بس میری واحد شرط یہی ہے کہ تم مجھے یہ ہیرا واپس کرو گے۔''

''مگر یہ کیسے ممکن ہے؟ مجھے رقم کی ضرورت ہے اور مجھے ہیرا فروخت کرنا پڑے گا۔''

''یہ بھی تمہارا مسئلہ ہے، تم اس ہیرے کا جو چاہے کرو، مجھے یہی ہیرا واپس کرو گے۔''

''فرض کرو میں ایسا ہی کوئی اور ہیرا تمہیں واپس کرنا چاہوں تو؟''

''کوئی اور نہیں، یہی ہیرا۔'' ریان اسمتھ نے قطعی لہجے میں کہا۔

بشپ نے اسے بے بسی سے دیکھا۔ ''نہ جانے تم میرے ساتھ کیا کھیل، کھیل رہے ہو؟''

''کیا تم ڈرتے ہو؟'' ریان اسمتھ کے لہجے میں چیلنج تھا۔

''نہیں میں ڈرتا نہیں ہوں لیکن مجھے ڈر ہے میں اسے کھو نہ بیٹھوں۔''

''اس کا مطلب ہے تم ڈر رہے ہو اور جو ڈرتا ہے وہ کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا ہے۔''

اس کے انداز پر بشپ کو غصہ آ گیا۔ اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے مجھے تمہارا یہ چیلنج قبول ہے۔'' بشپ نے ہیرا اس کے ہاتھ سے لینا چاہا تو اس نے مٹھی بند کر لی۔

''ابھی تم نے ایک بات تو طے کی نہیں۔''

''کون سی بات؟''

''یہی کہ تم ہیرا واپس کب کرو گے؟''

''تم مجھے کتنی مہلت دو گے؟''

"میرا خیال ہے ایک سال کی مہلت کافی ہے؟"

بشپ کے بھی خیال میں یہ معقول مدت تھی، اس نے سر ہلایا۔ "مجھے منظور ہے مسٹر اسمتھ! میں ایک سال بعد یہ ہیرا تمہیں واپس کردوں گا۔"

ریان نے اسی وقت معاہدے کے کاغذات تیار کر کے اس پر بشپ کے دستخط لے لیے اور ہیرا اس کے حوالے کردیا۔

"اب تم سے ایک سال بعد ملاقات ہوگی مسٹر جانسن۔"

بشپ اس کے دفتر سے نکلا تو اسے لگا جیسے اس نے کوئی خواب دیکھا ہے مگر اس کے کوٹ کی جیب میں ہیرا اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا۔ اس نے سچ مچ ایک سودا کیا تھا۔ اس نے جوزیو کے گھر جا کر جب اسے اس بارے میں بتایا تو اس نے ماننے سے انکار کردیا۔

"ریان اسمتھ تو کسی کو ایک ڈالر نہیں دیتا۔ اتنا قیمتی ہیرا کیسے دے سکتا ہے؟"

"اس نے دیا ہے... یہ دیکھو۔" بشپ نے اسے ہیرا جیب سے نکال کر دکھایا۔ "یہ اصل ہے۔"

"واقعی۔" جوزیو سحر زدہ سا رہ گیا۔ "یہ تو اصلی ہی لگ رہا ہے۔"

جب بشپ نے اسے شرط بتائی تو وہ بھی پریشان ہوگیا۔ "اگر تم اسے بیچو گے نہیں تو اس سے فائدہ کیسے اٹھاؤ گے؟"

"یہی تو سوچنا ہے۔"

"ایسا کرو اسے کسی بینک میں گروی رکھ دو۔"

بشپ نے نفی میں سر ہلایا۔ "میرے پاس اس کے ملکیتی کاغذات نہیں ہیں۔ کسی اور کے پاس گروی رکھوانے کا خطرہ نہیں لے سکتا۔"

"ایسا کرو تمہیں اس کی ضمانت پر اپنے کام کے لیے جو چیزیں لینی ہیں وہ لے لو۔" جوزیو نے ایک اور تجویز دی۔

"ہاں یہ ہوسکتا ہے۔" بشپ نے سوچا۔

ورک شاپ بنانے کے لیے بشپ کو سب سے پہلے عمارت کی ضرورت تھی۔ اس نے ایک تعمیراتی فرم سے بات کی اور اسے ہیرا دکھایا۔ یہ بھی بتا دیا کہ ہیرا اسے ریان اسمتھ نے دیا ہے۔ اس نے فرم سے وعدہ کیا کہ جیسے ہی ہیرا مناسب قیمت پر بکا وہ اسے ادائیگی کردے گا۔ فرم مان گئی اور اس کے لیے ورک شاپ کی تعمیر شروع ہوگئی۔ اس کامیابی نے بشپ کو پُرامید کردیا۔ اس نے ورک شاپ کے لیے اوزار اور مشینیں فراہم کرنے والے ایک ادارے سے بات کی اور اس سے بھی اسی شرط پر چیزیں لے لیں، ادھر جیسے جیسے ورک شاپ بن رہی تھی، وہ مشینیں لگواتا جا رہا تھا۔ خام مال کے لیے اسے ایک بینک سے قرض مل گیا تھا۔ ہیرا ہاتھ میں آتے ہی جیسے اس کے لیے بند دروازے کھل گئے تھے۔ مزید خوش قسمتی کہ اسے ٹاؤن ہال کی از سر نو تعمیر میں لکڑی کے کام کا ٹھیکا مل گیا۔ یہ خاصا بڑا کام تھا اور اس میں اسے خاصی بچت ہوسکتی تھی۔ جب لوگوں کو پتا چلا کہ اس نے پھر سے ورک شاپ کھول لی ہے تو بشپ کے پاس ان کی طرف سے بھی کام آنے لگے۔ ہیرا ملنے کے چھ مہینے بعد اس نے پھر سے کام شروع کردیا تھا۔ ابھی اس کے پاس ہیرا جوں کا توں رکھا تھا اسے کہیں بیچنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اس کی ایک جھلک کوئی بھی بند دروازہ کھولنے کے لیے کافی ہوتی تھی۔ جب اسے ٹاؤن ہال کے کام کی ادائیگی ہوئی تو اس نے اپنا قرض ادا کرنا شروع کردیا۔ اس کے پاس اتنا کام آنے لگا جو پہلے کبھی اس کے پاس نہیں آیا تھا۔ ورک شاپ کے کام کے لیے اس نے دو ملازم بھی رکھ لیے، کیونکہ اکیلے اتنا کام کرنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ بینک کا قرض ادا کرنے کے بعد اس نے اپنے مکان کی تعمیر شروع کر دی اور چند مہینے میں دو کمرے تیار کرلیے۔ اس کے بعد وہ جا کر اپنی بچیوں کو لے آیا تھا۔ وہ بیوی کے علاج کے اخراجات بھی دے سکتا تھا، اس نے سسر سے کہا کہ وہ سینی ٹوریم کا بل خود دے گا۔ پریشانی کے دنوں میں وہ برابر بیوی کو خط لکھتا رہا تھا، اس سے رابطے کا یہی ذریعہ تھا۔ حالات اور پھر کام کی وجہ سے وہ بار بار جینٹ سے ملنے نہیں جاسکتا تھا۔ ایک سال سے ذرا پہلے اس نے تعمیراتی فرم اور مشینیں فراہم کرنے والی فرم کی ادائیگی بھی کردی۔

اس کے پاس رقم آگئی تھی لہٰذا اس نے تعمیراتی فرم کو اپنے مکان کی بقیہ تعمیر کا ٹھیکا بھی دے دیا تھا۔ جب اس کا مکان بن رہا تھا تو وہاں سے ریان اسمتھ کا گزر ہوا۔ اتفاق سے بشپ موجود تھا، ریان نے اس سے کہا۔ "لگتا ہے تم نے ہیرا فروخت کردیا ہے۔"

"ممکن ہے... مسٹر اسمتھ... مگر ابھی نہیں۔ ہیرا واپس کرنے کی تاریخ میں دو مہینے باقی ہیں۔" بشپ نے مسکرا کر کہا۔

"مجھے حیرت ہے وہ ہیرا تم سے کس نے خریدا۔" ریان اسمتھ نے کسی قدر پریشانی سے کہا۔

"یہ میں تمہیں اس وقت بتاؤں گا جب میں ہیرا واپس کرنے آؤں گا مسٹر اسمتھ۔"

"ٹھیک ہے... دو مہینے بعد ہی سہی... پھر دیکھیں گے۔" ریان اسمتھ یہ کہہ کر چلا گیا۔

پورے ایک سال کے بعد بشپ اپنی بیوی سے ملنے گیا اور اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس کی بیوی خاصی حد تک صحت یاب ہوگئی تھی اور ڈاکٹروں نے امید ظاہر کی تھی کہ وہ چھ مہینے میں بالکل صحت یاب ہو جائے گی۔ بشپ نے بیوی کو خوش خبری سنائی کہ اس کا کام پھر سے شروع ہوگیا ہے اور اس نے جل جانے والی ورک شاپ بھی بنوالی ہے... ان کا مکان بھی تکمیل کے مرحلے میں تھا... اور جب تک وہ آئے گی ان کا مکان مکمل ہو چکا ہوگا۔

"جینٹ! جب تم واپس آؤ گی تو بہت حد تک پہلے جیسا ہو چکا ہوگا۔"

واپس آ کر بشپ مقررہ دن ریان اسمتھ کے دفتر میں گیا اور اس نے ہیرا ریان اسمتھ کے سامنے رکھا اور بولا۔ "مسٹر اسمتھ! معاہدے کا کاغذ میرے حوالے کرو اور مجھے رسید لکھ کر دو کہ میں نے تمہارا ہیرا تمہارے حوالے کردیا ہے۔"

"کیوں نہیں۔" اس نے کہا۔ "مگر مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے ہیرا کس کو فروخت کیا تھا اور اسے واپس کیسے حاصل کیا؟"

"میں نے ہیرا کسی کو فروخت نہیں کیا تھا۔" بشپ بولا پھر اس نے ریان اسمتھ کو بتایا کہ اس نے کس طرح ہیرا دکھا کر سب سے اُدھار حاصل کیا اور جب اس کے پاس رقم آئی تو اس نے سب کی ادائیگی کردی۔ ریان اسمتھ دم بہ خود رہ گیا۔

"تم نے محض ہیرا دکھا کر سب حاصل کرلیا؟"

"یہ سچ ہے مسٹر اسمتھ... مجھے ہیرا بیچنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی اور میرا سارا کام ہوگیا۔ آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ میرے پاس اس وقت ایک لاکھ ڈالرز مالیت کے ٹھیکے ہیں اور میں عنقریب اپنی ورک شاپ کو فیکٹری میں بدل دوں گا۔"

ریان اسمتھ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا پھر اس نے ہیرے کی رسید لکھ کر بشپ کے حوالے کردی۔ بشپ نے درست کہا تھا۔ اس کے پاس اس سے بھی زیادہ مالیت کے ٹھیکے تھے اور اس نے مزید ملازم رکھ لیے تھے۔ اس کے علاوہ وہ فرنیچر سازی کا کارخانہ قائم کرنا چاہ رہا تھا۔ چھ مہینے بعد وہ اپنی بیوی کو سینی ٹوریم سے لے آیا تھا اور اس کے گھر کی بہاریں پھر سے لوٹ آئی تھیں اگرچہ وہ روڈی کی کمی محسوس کرتے تھے مگر اس کے غم کی شدت کم ہوگئی تھی۔ پھر خدا نے ان کو دو بیٹے اور دیے تو وہ روڈی کا غم بھول ہی گئے، انہوں نے بڑے بیٹے کا نام روڈی ہی رکھا تھا۔

بشپ کے کاروبار نے اتنی ترقی کی کہ محض پانچ سال میں وہ شہر کے دولت مندوں میں شامل ہوگیا تھا۔ اس کا شمار معززین شہر میں ہونے لگا۔ اسے نجی اور سرکاری تقریبات میں مدعو کیا جانے لگا تھا۔ دوسری طرف ریان اسمتھ کی قسمت نے اچانک پلٹا کھایا اور اس کے دفتر میں ڈاکا پڑا اور ڈاکو نہ صرف اس کے سارے جواہرات لے گئے بلکہ اس کے پاس کسی کے رکھے قیمتی جواہر جو تراش اور پالش کے لیے آئے تھے وہ بھی لے گئے۔ جب اسے ان کی ادائیگی کرنا پڑی تو وہ دیوالیا ہوگیا۔ اس کے سارے اثاثے بک گئے اور وہ محل سے فٹ پاتھ پر آگیا۔ بشپ نے سنا تو اسے افسوس ہوا کیونکہ بہرحال اس نے بشپ کو ہیرا دے کر اس کی مدد کی تھی اور اس ہیرے کی وجہ سے بشپ دوبارہ سے اپنے پیروں پر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر ریان اسمتھ نے اس کی مدد چاہی تو وہ ضرور اس کی مدد کرے گا۔ لیکن ریان اسمتھ نے اس سے رابطہ نہیں کیا۔ حالانکہ بشپ کا خیال تھا کہ وہ اس سے رابطہ کرے گا۔ شاید وہ شرمندگی کی وجہ سے اس کے پاس نہیں آرہا تھا کیونکہ اس نے ہیرا دے کر ایک طرح سے اس کے ساتھ مذاق ہی کیا تھا۔ بشپ نے سوچا کہ وہ خود جا کر ریان اسمتھ سے مل لے۔ وہ اس کے دفتر آیا، اب اس کے پاس اپنے عالی شان دفتر کا ایک چھوٹا سا حصہ رہ گیا تھا۔ اس میں بھی معمولی سا فرنیچر تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ اس کے سامنے میز پر وہی ہیرا رکھا تھا جو اس نے بشپ کو اُدھار دیا تھا۔

"کہو مسٹر جانسن! میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں۔" ریان نے افسردہ انداز میں کہا۔

"کچھ نہیں... میں تمہارے پاس کسی اور مقصد سے آیا ہوں۔"

ریان نے سر ہلایا۔ "شاید تم بھی دوسروں کی طرح میرا تماشا دیکھنے آئے ہو۔"

"نہیں، میں اس فطرت کا شخص نہیں ہوں... میں ایک اور وجہ سے آیا ہوں۔ لیکن پہلے میں تم سے کچھ پوچھنا چاہوں گا؟"

"پوچھو؟"

"کیا تم سچ مچ دیوالیا ہو چکے ہو؟"

"ہاں یہ درست ہے، میں مکمل طور پر دیوالیا ہو چکا ہوں اور اب میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ دفتر جو تم دیکھ رہے ہو یہ بھی نئے مالک کی مہربانی ہے۔ میرا ذاتی مکان تک نیلام ہو چکا ہے... اب ایک چھوٹے سے کرائے کے مکان میں رہ رہا ہوں۔"

"جب تمہیں اتنی پریشانی ہے تو تم نے اس ہیرے کو کیوں رکھا ہے جبکہ اسے فروخت کر کے تم اپنی ساری مشکلات دور کر سکتے ہو؟" بشپ نے میز پر سجے ہیرے کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ... ہیرا۔" ریان اسمتھ نے چونک کر ہیرے کی طرف دیکھا، پھر اس کے ہونٹوں پر ایک کھسیانی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "بات یہ ہے کہ یہ اصلی ہیرا نہیں ہے۔"

''یہ ہیرا اصلی نہیں ہے!'' بشپ حیرت سے چلا اٹھا۔ ''مگر تم نے تو یہ کہہ کر دیا تھا کہ یہ اصل ہیرا ہے؟''

''وہ... میں... نے تم سے مذاق کیا تھا۔ میرا خیال تھا تم کسی جوہری کے پاس لے کر جاؤ گے تو اس کی حقیقت سامنے آجائے گی اور اس وقت تم مایوس ہو جاؤ گے۔''

''تم نے میرے ساتھ مذاق کیا تھا مگر کسی نے بھی اس ہیرے کو نقلی قرار نہیں دیا تھا۔''

''اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ کسی نے اسے غور سے دیکھا نہیں ہوگا اور اسے میں نے خود تراشا ہے، اس وجہ سے بھی یہ اصلی لگتا ہے۔ کیا تم اسے کسی جوہری کے پاس لے گئے تھے؟''

''نہیں میں نے اسے عام لوگوں کو دکھایا تھا۔ اگر مجھے پتا ہوتا کہ یہ نقلی ہیرا ہے تو میں کبھی بھی ایسی جرأت نہ کرتا، میں تو ہر جگہ اسے پورے اعتماد سے ہیرا کہتا رہا تھا اور لوگوں کو یہ بتاتا تھا کہ ہیرا اصل میں تم نے دیا ہے تو وہ اسے فوراً ہیرا مان لیتے تھے۔''

''اور تم نے اس کے بل بوتے پر اتنا بڑا بزنس قائم کر لیا کیونکہ تم اسے ہیرا سمجھتے تھے اور میں اسے ایک ڈالر کے عوض بھی نہیں بیچ سکتا کیونکہ میں اس کی حقیقت سے اچھی طرح واقف ہوں۔''

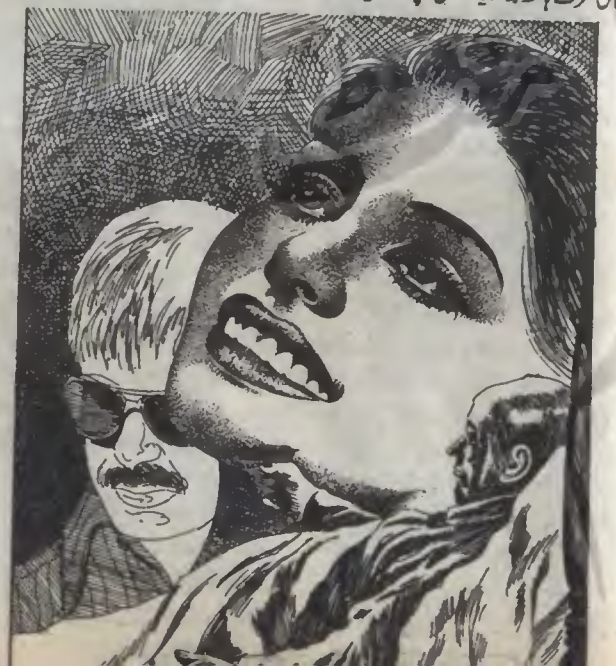

''مسٹر اسمتھ! تم نے میرے ساتھ واقعی بہت بھونڈا مذاق کیا تھا۔'' بشپ کو غصہ آگیا۔ مگر یہ زیادہ دیر برقرار نہیں رہا تھا، جب اس کا ذہن ٹھنڈا ہوا تو اسے ایک خیال آیا۔ ''تمہارا مذاق میرے لیے اچھا ثابت ہوا تھا اس لیے میں بھی تمہیں ایک موقع دوں گا کہ تم پھر سے اپنی زندگی بنا سکتے ہو۔''

''وہ کیا مسٹر جانسن؟'' ریان اسمتھ نے امید سے پوچھا۔

''میں تم سے یہ ہیرا ایک قیمت پر لینے کے لیے تیار ہوں۔''

''لیکن یہ ہیرا نہیں ہے... یہ محض کانچ کا ایک ٹکڑا ہے۔'' ریان نے جلدی سے کہا۔

''میں جانتا ہوں لیکن فرض کرلو یہ ہیرا ہے اور میں تم سے اس کا سودا کر رہا ہوں تو تم مجھے اسے کس قیمت پر بیچنا پسند کرو گے؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' وہ ہچکچایا۔

''چلو میں تمہاری آسانی کے لیے اپنے پاس اس کی ایک امکانی قیمت لکھ لیتا ہوں اگر تم نے اس کے آس پاس جواب دیا تو تم ایک بڑی رقم مجھ سے لے سکتے ہو۔''

''وہ کیسے؟''

''وہ ایسے کہ فرض کرو میں نے قیمت سوچی ہے سو ڈالرز اور تم نے سوچی پچاس ڈالرز تو فرق ہوا پچاس ڈالرز کا۔ میں تمہاری سوچی قیمت کا آدھا یعنی پچیس ڈالرز تمہیں دوں گا۔ اگر تم نے سوچا دو سو ڈالرز تو فرق آیا پھر پچاس فیصد اور میں تمہیں اپنی سوچی قیمت کا نصف یعنی پچاس ڈالرز دوں گا۔ اسی طرح تم میری سوچی قیمت سے جتنا دور ہٹتے جاؤ گے تمہیں اتنا ہی کم ملے گا۔''

''یہ تو بہت مشکل طریقہ کار ہے۔'' ریان نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

''میں تمہیں قرض نہیں دے رہا ہوں۔ میں تمہیں اُدھار دے رہا ہوں، تم جتنی رقم مجھ سے لو گے اتنی ہی واپس کرو گے اس لیے مجھے حق ہے کہ میں کوئی شرط عائد کردوں۔''

''مجھے منظور ہے۔'' ریان اسمتھ نے سر ہلایا۔

بشپ نے اپنی سوچی رقم ایک کاغذ پر لکھ کر اسے تہہ کر کے اس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ ''اب تم قیمت سوچ لو۔''

ریان اسمتھ سوچتا رہا۔ خاصی دیر تک اس نے کوئی جواب نہیں دیا آخر بشپ نے گھڑی دیکھی۔ ''مسٹر اسمتھ! میرا وقت بہت قیمتی ہے اس لیے تم ذرا جلدی سوچو۔''

''میرا خیال ہے وہ قیمت پچاس ہزار ڈالرز ہے۔'' اس نے دل کڑا کر کے کہا۔ اس کا انداز جوا کھیلنے والا تھا۔

بشپ نے اپنی لکھی قیمت اس کے سامنے کردی۔ اس پر بھی پچاس ہزار ہی لکھا تھا۔ ریان اسمتھ خوشی سے اچھل پڑا۔ ''مسٹر جانسن! اب تم مجھے پچیس ہزار ڈالرز اُدھار دو گے۔''

''کیوں نہیں مسٹر اسمتھ۔'' بشپ نے اپنی جیب سے چیک بک نکالی اور اس پر پچیس ہزار ڈالرز کا چیک لکھ دیا۔ ''مگر اس کے بدلے مجھے یہ ہیرا چاہیے مسٹر اسمتھ۔''

''تم اسے شوق سے لے جا سکتے ہو مسٹر جانسن۔'' ریان اسمتھ نے نقلی ہیرا فوراً اس کے حوالے کردیا اور اس سے پچاس ہزار ڈالرز کا چیک لے لیا۔ ان دونوں کے درمیان معاہدہ ہوا کہ ریان اسمتھ بشپ کو یہ رقم ایک سال کے اندر ادا کرے گا۔ ریان نے اس رقم سے پھر سے جیولری کا کام شروع کیا اور ایک سال کے اندر بشپ کا ادھار اسے واپس کر دیا۔

☆☆☆

''تو یہ کہانی ہے اس ہیرے کے پیچھے۔'' مشل نے غور سے اسے دیکھا۔ ''یہ تب سے تمہارے پاس ہے؟''

''ہاں... چار نسلوں سے ہمارے پاس ہے، اس کی کوئی قیمت نہیں ہے مگر ہمارے لیے یہ بہت قیمتی ہے کیونکہ یہ ہمیں یاد دلاتا رہتا ہے کہ اصل اہمیت انسان کی ہوتی ہے نہ کہ ان چیزوں کی۔'' جیسن نے سنجیدگی سے کہا۔

''ہاں ڈیئر واقعی اصل اہمیت انسان کی ہوتی ہے۔'' مشل نے اس کی تائید کی۔

تیرِ نیم کش

پروین زبیر

انہونی ہونے کا کوئی وقت مقرر نہیں...... یہ کبھی بھی کسی بھی وقت رونما ہوسکتی ہے...... ایک ایسی ہی انہونی سے شروع ہونے والی داستان جس کے کردار محبت کے جذبے سے سرشار تھے...... مگر اس محبت میں رقابت کا جذبہ بھی اتنی ہی شدت کے ساتھ موجود تھا۔

ایک پُرعزم نوجوان کے جذبات جو ایک سنسنی خیز اور پُرجوش زندگی کا خواہاں تھا

سیل فون دوبارہ گنگنایا۔ اس نے لیپ ٹاپ سے نظریں اٹھا کر فون کے چمکتی ہوئی اسکرین کو دیکھا جہاں وہ دشمنِ جاں ہوش ربا مسکراہٹ ہونٹوں پر لیے اسے شریر نظروں سے گھور رہا تھا اور نیچے اس کا نمبر بلنک کر رہا تھا۔ وہ بے ساختہ مسکرائی اور فون کی طرف ہاتھ بڑھایا... لیکن اچانک خیال آیا کہ وہ تو اس سے ناراض ہے... یک لخت مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے معدوم ہوگئی اور چہرے پر ناراضی کے تاثرات ابھر آئے۔ اس نے ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ ''نہیں کرنی تم سے بات...'' وہ زیرلب بڑبڑائی اور اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔ فون کی گھنٹی بجتی رہی اور آخر کار خاموش ہوگئی۔

☆☆☆

''یہ کیا پیالی میں طوفان اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ چائے گری تو یونیفارم کا بیڑا غرق ہو جائے گا۔'' سیف نے امتیاز کو چائے کا کپ گھماتے دیکھ کر کہا۔

انہوں نے درختوں کے سائے میں اپنی پٹرولنگ کار روکی تھی اور بہ قول ان کے وہ ٹی بریک کا مزہ لے رہے تھے۔

''ارے یار! میں بور ہو جاتا ہوں... یہ بھی کوئی زندگی ہے... سارا دن ہائی وے پر گھومتے رہو... بس اِدھر اُدھر دیکھتے رہو کہ سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے یا نہیں... بس اس چائے کی پیالی کی طرح ہے زندگی... جس میں نہ کوئی طوفان ہے... نہ کوئی تھرل... نہ ایکسائٹمنٹ اور نہ ہی کوئی ہلا گلا... وہی ایک جیسے مناظر... لگتا ہے زندگی ہمارے ساتھ آپا آپا کھیل رہی ہے... لعنت ہے۔''

دوپہر کا وقت تھا۔ ہائی وے پر ٹریفک بہت زیادہ نہیں تھا۔ کبھی کوئی بڑی کوچ گزر جاتی یا پھر ایک دو ٹرک سست رفتاری سے رینگتے دکھائی دیتے... کبھی کبھی کچھ چھوٹی گاڑیاں بھی تیز رفتاری سے دوڑتی نظر آجاتی تھیں، وہی روز کے سے مناظر!

اچانک ہی اسے..... دور سڑک کی دوسری جانب ..... کچھ نیا سا منظر نظر آیا۔ اس نے گلوو کمپارٹمنٹ سے دور بین نکال کر آنکھوں پر لگائی تو منظر واضح ہو گیا۔

''سیف! ادھر دیکھ... دوسرے ٹریک پر... وہ لال گاڑی کے آس پاس۔'' اس نے دور بین اپنے ساتھی کو تھمائی تو باقی سب بھی ادھر ہی دیکھنے لگے۔

لال رنگ کی گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔ دو تین لوگ اس کے آس پاس کھڑے نظر آئے جن کا انداز مشکوک تھا... اتنے میں ان میں سے ایک آدمی نے ڈرائیونگ سائڈ کا دروازہ کھول کر جھٹکے سے ڈرائیور کا کالر پکڑ کر اسے باہر کھینچا... وہ کوئی نوجوان لڑکا تھا۔ امتیاز نے دیکھا کہ لڑکے کو باہر کھینچنے والے آدمی کے ہاتھ میں پستول تھا۔

''سیف! چل... جلدی نکال گاڑی... مجھے لگتا ہے ان گاڑی والوں کو ڈاکوؤں نے گھیر لیا ہے۔'' امتیاز نے اپنی گن ہولسٹر سے نکالی اور پیچھے..... اپنے دونوں ساتھیوں کو بھی ہوشیار کیا۔ ان کی پٹرولنگ کار طوفانی رفتار سے نکلی۔

''ہوٹر ابھی آن مت کرنا... خاموشی سے ان کے سر پر پہنچنا ہے۔'' امتیاز نے سیٹ پر اپنا رخ بدلتے ہوئے سیف سے کہا۔ بہت جلد وہ اس جگہ پہنچ گئے جہاں سڑک کے دوسری جانب لال رنگ کی خیبر کو ڈاکوؤں نے گھیر رکھا تھا۔ وہ کوئی فیملی تھی... کیونکہ پسنجر سیٹ پر ایک بڑی عمر کا آدمی تھا اور پچھلی سیٹ پر دو خواتین تھیں... ایک بڑی عمر کی اور دوسری جوان العمر لڑکی... یعنی ماں باپ اور ان کی بیٹی اور بیٹا... بیٹا ڈرائیو کر رہا تھا جسے ڈاکوؤں نے باہر گن پوائنٹ پر کھڑا کر رکھا تھا۔

گاڑی رکتے ہی وہ چھلانگیں لگاتے باہر آئے اور اپنی گنیں لوڈ کرتے ہوئے تیزی سے سڑک کو پار کیا۔ انہیں آتے دیکھ کر ڈاکوؤں نے بھاگنے کی کوشش کی... نہ صرف انہوں نے خود بھاگنا چاہا بلکہ ان میں سے کسی کو شاید یرغمال کے طور پر ساتھ لے جانے کی بھی کوشش کی۔

ڈرائیونگ سیٹ سے اتارے جانے والے لڑکے کو ایک ڈاکو نے کالر پکڑ کر اپنے ساتھ گھسیٹنے کی کوشش کی تو اس نے نہ صرف اپنے آپ کو جھٹکا دے کر چھڑایا بلکہ ڈاکو کے منہ پر ایک زوردار گھونسا بھی جڑ دیا جس سے وہ تھوڑا سا لڑکھڑایا۔ لیکن پولیس کے سر پر پہنچ جانے کے خوف نے اسے خالی ہاتھ بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ امتیاز اور اس کے ساتھی دوڑتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے کہ ڈاکوؤں نے تیزی سے ہائی وے چھوڑ کر... خودرو کیکروں کے جھنڈ کی طرف دوڑ لگا دی۔

اچانک امتیاز کے کانوں سے کچھ سریلی چیخیں ٹکرائیں... اس نے دیکھا کہ دو ڈاکو تو تیزی سے دوڑتے چھلانگیں لگاتے کیکروں کے جھنڈ میں داخل ہو گئے تھے لیکن ایک ڈاکو نے گاڑی میں سے لڑکی کو کھینچ کر نکال لیا تھا اور اسے گھسیٹ کر اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ ڈاکو کے ایک ہاتھ میں گن تھی اور صرف ایک ہاتھ سے وہ لڑکی کو گھسیٹ رہا تھا جبکہ اس نے یہ خیال بھی رکھا ہوا تھا کہ اگر پولیس گولی چلائے تو نشانہ لڑکی بنے۔ اور وہ محفوظ رہے۔ سیاہ سوٹ اور سرخ دوپٹے میں ملبوس دبلی پتلی لڑکی بھرپور مزاحمت کر رہی تھی۔

سب سے پہلے امتیاز ہی ان کے نزدیک پہنچا تھا اور ایک نظر ڈالتے ہی ساری صورت حال اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ اس نے گن اٹھا کر ڈاکو کا نشانہ لینے کی کوشش کی لیکن مچلتی ہوئی لڑکی بار بار زد پر آرہی تھی۔ کچھ ہی لمحے گزرتے تو وہ لڑکی کو لے کر کیکروں میں داخل ہو جاتا۔ پھر اس کا ہاتھ آنا اور لڑکی کا ملنا مشکل ہو جاتا۔

''گیٹ ڈاؤن گرل!'' وہ زور سے چلایا اور شاید لڑکی نے بھی اپنی حواس باختگی کے باوجود اس کے کاشن کو سمجھ لیا اور مزاحمتی کوشش میں اپنے کمان کی طرح تنے ہوئے جسم کو اچانک بالکل ڈھیلا چھوڑ دیا۔ ڈاکو جس نے مضبوطی سے لڑکی کے بازو کو تھاما ہوا تھا، اس اچانک جھٹکے کو سہہ نہ سکا۔ لڑکی کا ہاتھ چھوٹا اور وہ زمین پر لڑھکتی چلی گئی۔ ڈاکو ایک لمحے کو رکا... بس یہی لمحہ اس کے لیے آخری ثابت ہوا... امتیاز کی گن سے نکلنے والی گولیوں نے اس کا بھیجا پاش پاش کر دیا اور جسم میں کئی سوراخ کر ڈالے۔ ان کے خون فواروں کی صورت میں ابلا اور وہ سنبھلتی ہوئی لڑکی کے بالکل نزدیک کھڑے کھڑے گرا... اس کی روح شاید اس کے زمین پر آنے سے پہلے ہی آسمان کی طرف پرواز کر گئی تھی۔ لڑکی سنبھل کر اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی اس پر اچانک خون کی بوچھاڑ ہوئی تو وہ ایک بار پھر حواس باختہ ہو گئی۔ وہ جھٹکے سے اٹھی اور اپنے اوپر خون دیکھتے ہوئے بری طرح چیخیں مارتی ہوئی سڑک کی طرف بھاگی... سامنے سے ہی پولیس کے جوان اس کی طرف دوڑتے ہوئے آرہے تھے... سب سے آگے امتیاز تھا۔ وہ دیوانوں کی طرح چیختی چلاتی گرتی پڑتی آرہی تھی کہ امتیاز اس تک پہنچ گیا۔

اس نے اس لڑکی سے کچھ کہنے یا..... پوچھنے کی کوشش کی لیکن الفاظ منہ میں ہی رہ گئے... اور وہ خود بھی کچھ حواس باختہ سا ہو گیا... کیونکہ لڑکی اس سے بری طرح چمٹ گئی تھی۔ وہ خوف کی انتہائی منزلوں پر تھی اور امتیاز کا وجود اس کے سامنے آنے والی پہلی پناہ گاہ تھا... لہٰذا وہ اپنی پوری قوت سے اس کی شرٹ دونوں ہاتھوں میں تھامے، اس سے چمٹ کر اپنے آپ کو محفوظ کرنے کی کوشش کر رہی تھی... ساتھ ساتھ بری طرح چلا چلا کر مدد کے لیے بھی پکار رہی تھی۔

امتیاز اچھا خاصا بھونچکا سا ہو گیا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ موجودہ سچویشن میں وہ کیا کرے؟ اس کے ساتھی کیکروں کے جھنڈ میں فائرنگ کر رہے تھے تاکہ ڈاکو یا تو زخمی ہوں... یا... یا پھر بھاگ جائیں۔ سیف نے پلٹ کر امتیاز پر ایک نظر ڈالی اور اس کی موجودہ حالت دیکھ کر بے ساختہ اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔ اس نے آنکھ سے کچھ اشارہ کیا اور پلٹ کر پھر کیکروں کے جھنڈ کی طرف بڑھ گیا۔

پھر امتیاز کے ہی کچھ ہوش ٹھکانے آئے تو اس نے لڑکی کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

''ایزی... ایزی... ناؤ ایوری تھنگ از آل رائٹ... وہ ڈاکو مر گیا ہے... اور باقی بھاگ گئے ہیں... یو آر سیف... کم آن گرل... یو آر سیف...'' اس نے لڑکی کو تسلی دینے کی کوشش کی لیکن اسے فوراً ہی احساس ہو گیا کہ لڑکی کی بجتوتا نہ گرفت کمزور پڑ رہی ہے اور آواز کے ساتھ ساتھ اس کا جسم بھی بالکل ڈھیلا پڑ گیا ہے... شاید وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔

امتیاز نے جلدی سے سہارا دے کر اسے زمین پر گرنے سے بچایا۔ اسی اثنا میں لڑکی کے گھر والے بھی دوڑتے ہوئے ان تک پہنچ گئے تھے... لڑکی کے بھائی نے لپک کر بہن کو تھاما اور بڑی تشویش سے اس کے خون میں بھیگے کپڑوں کو دیکھا۔

''نہیں... نہیں... شی از آل رائٹ... یہ خون اس ڈاکو کا ہے جو ان کے کپڑوں پر گر گیا ہے... انہیں کوئی گولی نہیں لگی ہے... یہ صرف دہشت سے بے ہوش ہو گئی ہیں۔'' امتیاز نے جلدی جلدی وضاحت کی۔

لڑکی کے باپ نے بھی اس کے گال تھپتھپا کر اسے آوازیں دیں... لیکن وہ بے ہوش ہی تھی۔

''یہ شاک میں ہیں... تھوڑی دیر میں ہوش آجائے گا... نہیں تو آگے ایدھی ایمرجنسی سینٹر ہے... وہاں چوبیس گھنٹے ڈاکٹر ہوتا ہے۔ ہم انہیں وہاں لے چلتے ہیں... آپ پریشان نہ ہوں، یہ ٹھیک ہو جائیں گی ابھی...''

امتیاز نے انہیں تسلی دی۔ وہ گاڑی کی طرف آئے تو وہاں لڑکی کی والدہ کھڑی تھیں۔ بے انتہا پریشان تو وہ پہلے ہی تھیں۔ بیٹی کو خون آلود کپڑوں میں بھائی کے ہاتھوں میں لٹکتے ہاتھ پیروں کے ساتھ دیکھا تو ان کا چہرہ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید ہو گیا اور وہ لڑکھڑا کر گرنے لگی تھیں کہ امتیاز نے آگے بڑھ کر انہیں سہارا دیا۔

''آنٹی! گھبرائیں نہیں... یہ صرف بے ہوش ہیں... وہ بھی خوف کی وجہ سے... ان کے کپڑوں پر خون ان کا نہیں... اس ڈاکو کا ہے جو انہیں لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے میں نے گولی ماری تو اس کا خون ان کے کپڑوں پر لگ گیا ہے۔'' امتیاز کی بات سن کر انہوں نے بے یقینی سے اس کو دیکھا پھر اپنی بیٹی کو دیکھا جسے بیٹا گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ڈال چکا تھا۔ آگے بڑھ کر انہوں نے بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر شاید اس کی نبض محسوس کرنے کی کوشش کی پھر گردن پر کان کے نیچے چھو کر دیکھا... پھر ان کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ وہ بیٹی کا ہاتھ چوم کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔ باپ کا حال بھی برا تھا۔ ان کا چہرہ ستا ہوا تھا اور پسینا پیشانی اور کنپٹیوں پر دھاروں کی صورت میں بہہ رہا تھا۔ بیٹے نے جلدی سے پانی کی بوتل نکالی۔ پہلے باپ کو گلاس میں پانی بھر کر اپنے ہاتھ سے پلایا۔ ٹشو سے ان کا پسینا پونچھا اور کاندھا تھپک کر تسلی دی پھر ماں کو پانی پلایا۔ بہن کے چہرے پر پانی کے چھینٹے دیے... اور اب وہ پریشانی کے عالم میں کھڑا ان تینوں کو دیکھ رہا تھا کہ کیا کرے۔

امتیاز نے محسوس کیا کہ اسے بھی تسلی اور مدد کی ضرورت ہے۔

''تم بھی پریشان ہو یار!'' اس نے اس کا کاندھا تھپکتے ہوئے تسلی آمیز انداز میں پوچھا تو وہ لڑکا خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ بولا کچھ نہیں۔

امتیاز نے اپنے ساتھیوں کو فون پر کچھ ہدایات دیں۔ پولیس کی مزید فورس بھی پہنچ گئی تھی، لہٰذا اس نے لڑکے کو گاڑی میں بیٹھنے کو کہا۔

''میں اپنی کار لے کر آرہا ہوں... تم میرے پیچھے

آؤ... تم سب کو فرسٹ ایڈ کی سخت ضرورت ہے۔"

پھر وہ کسی طرح انہیں لے کر ایمرجنسی سینٹر پہنچا۔ سب کو طبی مدد دلوائی اور کئی گھنٹوں میں جا کر وہ لوگ اس قابل ہو پائے کہ دوبارہ سفر کرتے۔

"آپ لوگ کہاں جا رہے تھے انکل؟" امتیاز نے پوچھا۔

"ہم حیدر آباد جا رہے تھے... لیکن اب ہم واپس اپنے گھر جائیں گے۔" انہوں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے... اگلے یوٹرن سے واپس موڑ لیتے ہیں گاڑی..." ذہنی اور اعصابی طور پر ان سب کی ناگفتہ بہ حالت تھی۔ لڑکی ہوش میں آ گئی تھی... لیکن گم صم سی تھی... لڑکا بھی خاموش تھا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات اس کے اندر ہونے والی کشمکش اور پریشانی کو صاف ظاہر کر رہے تھے۔ ان کے ماں باپ تھوڑی بہت باتیں بھی کر رہے تھے اور زیر لب کچھ دعائیں اور آیات وغیرہ بھی پڑھ رہے تھے۔ امتیاز کو محسوس ہوا کہ ان کے ساتھ کسی کا ہونا بہت ضروری ہے ورنہ راستے میں وہ کسی حادثے کا شکار نہ ہو جائیں۔

"انکل! آپ پیچھے بیٹھ جائیں... آؤ یار! تم ادھر آ جاؤ... میں ڈرائیو کرتا ہوں... میں چاہتا ہوں آپ لوگ سیفلی اپنے گھر پہنچ جائیں۔" امتیاز نے لڑکے کو پسنجر سیٹ پر جانے کا کہہ کر خود ڈرائیونگ سنبھال لی۔

آدھے پون گھنٹے میں وہ گھر پہنچ گئے۔ گلستان جوہر ہائی وے سے نزدیک ہی تھا۔ وہ ایک خوب صورت گھر تھا جس کا سرسبز و شاداب لان پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔

"آؤ بیٹے! اندر آؤ... چائے پی کر جانا۔" عمر رسیدہ خاتون نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔

"شکریہ آنٹی! چائے ادھار رہی... پھر کبھی آنا ہوا تو ضرور پیوں گا۔ اس وقت تو آپ لوگوں کو صرف آرام کی ضرورت ہے۔ آپ لوگ آرام کیجیے۔ اور ہاں... میں کوشش کروں گا کہ آپ لوگوں کا نام اس کیس میں آنے نہ پائے لیکن اگر ایسا نہ ہو سکا تو ممکن ہے آپ لوگوں کو اپنا بیان دینا ہی پڑے... آپ گھبرایئے گا نہیں۔"

وہ جانے کے لیے مڑنے ہی والا تھا کہ اچانک وہ لڑکی سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

"میری یہ نئی زندگی بلاشبہ آپ کی ہی مرہونِ منت ہے اور میں 'شکریہ' کا لفظ اس کے لیے انتہائی چھوٹا سمجھتی ہوں... اس لیے شکریہ نہیں کہوں گی لیکن تا حیات آپ کی زیر بار رہوں گی اور دعا کروں گی کہ اللہ تعالیٰ بھی مجھے اس قابل کرے کہ میں اس احسان کا کوئی معمولی سا بھی بدل کر سکوں۔" وہ شاید کچھ اور بھی کہنے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہی تھی کہ امتیاز نے اس کی بات اچک لی۔

"اور میں دعا کروں گا کہ ایسا ضرور ہو... اور جلد ہو۔"

وہ بھرپور نظر اس پر ڈالتے ہوئے مسکرایا۔ اس کے سنہرے بال گرد آلود ہو گئے تھے اور سنہری جلد پر زمین سے رگڑ کھانے کے باعث کہیں کہیں خراشیں آ گئی تھیں لیکن بڑی بڑی براؤن آنکھوں کا جادو اب بھی دل پر وار کر رہا تھا۔ سیاہ ملبوس میں اس کا دبلا پتلا سراپا اور نکلتا ہوا قد... اس کی شخصیت کو فسوں کار بنا رہا تھا... امتیاز کے احساس میں پھر میٹھی سی آگ کی لپٹیں اٹھیں جو اس وقت محسوس ہوئی تھیں جب وہ حواس باختہ سی ہو کر اس سے آ کر بری طرح چمٹ گئی تھی۔

اس نے مسکراتے ہوئے اپنے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر سنوارا... یا بگاڑا... اور سب کی طرف دیکھ کر الوداعی انداز میں ہاتھ ہلاتا ہوا رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

مکمل خاموشی میں جلترنگ بجنے لگا۔ اس نے لیپ ٹاپ ایک طرف کھسکایا اور سامنے پڑے فون کو گھورنے لگی۔ وہی تھا... مسکراتی شریر نظروں سے اسے دیکھے جا رہا تھا... نیچے اسی کا نمبر بلنک کر رہا تھا... وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اسے گھورے جا رہی تھی۔

گھنٹی بجے جا رہی تھی۔ مسلسل جلترنگ بج رہا تھا۔ وہ بھی شاید تُلا بیٹھا تھا کہ مسلسل بیل دیتا رہے گا۔ کب تک نہیں اٹھائے گی وہ...

"مجھے تم سے بات نہیں کرنی ہے... چاہے کچھ بھی ہو جائے... کرتے رہو فون... نہیں اٹھاؤں گی میں۔"

وہ شدید ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے بڑبڑائی اور اسی طرح بیٹھے بیٹھے آنکھیں موند کر پشت گاہ سے ٹک گئی۔ یہ شاید فرار تھا۔ ان نظروں سے جو تصویر کی شکل میں بھی اس کے دل میں کچھ کچھ کرنے لگتی تھیں۔ جیسے ہی اس کا فون آتا تھا تو نمبر کے ساتھ ساتھ اس کی تصویر بھی اسکرین پر چمکنے لگتی تھی... اور اسے لگتا تھا کہ وہ جب تک فون نہیں اٹھائے گی، وہ اسے اسی طرح مسکرا مسکرا کر دیکھتا رہے گا... اس کی یہ مسکراہٹ بڑی ہی جان لیوا تھی۔

☆☆☆

"عجیب بات ہے یار! مرنے والے کا ڈاکوؤں کے کسی گروہ سے کوئی تعلق نہیں ہے... ہماری قابل فخر پولیس نے ساری تاریخ جغرافیہ کو ادھیڑ کر رکھ دیا لیکن کسی نے نہیں بتایا کہ مرنے والا ان کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔" امتیاز الجھن آمیز لہجے میں سیف سے مخاطب تھا۔

"ارے بھائی! مرنے والا کس گروہ سے تعلق رکھتا تھا... گروہ پرانا ہے یا نیا... تجھے اس سے کیا لینا دینا ہے... تو صرف اپنی اوقات میں رہ بھائی! اور وہ یہ ہے کہ ہمیں صرف ہائی وے تک کے معاملات دیکھنے ہیں، باقی کام دوسری پولیس کا ہے... وہ جانیں اور ان کا کام۔" سیف نے اسے لتاڑنے کی کوشش کی۔

"ابے او... چیونٹیوں کی قطار میں سب سے پیچھے چلنے والے چیونٹے! کبھی کبھی ادھر ادھر دیکھ لینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے... تو دیکھ نہیں رہا ہے کہ پولیس اس سلسلے میں کتنی پریشان ہے کہ آخر یہ کون سا نیا گروہ پیدا ہو گیا جس کی انہیں خبر ہی نہیں ہے۔" امتیاز نے جواب میں اسے ڈانٹنے اور شرمندہ کرنے کی کوشش کی تو سیف کے ہونٹوں سے بے ساختہ قہقہہ پھوٹ نکلا اور وہ ہنستا ہی چلا گیا۔ جب وہ ہنستے ہنستے تھوڑا خاموش ہوا تو امتیاز نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ ہنسی کی ٹوٹ کر برسنے والی برسات کا سبب کیا ہے؟"

"ہاں ہاں... بالکل پوچھ سکتے ہو... بلکہ میں بتا ہی دیتا ہوں۔" سیف نے اپنی ہنسی کو بریک لگائے اور ایک نظر اس کے سوالیہ چہرے پر ڈالی۔

"یار! تو اتنے سال باہر گزار کر آیا ہے اس لیے شاید اپنے ملک کی پولیس کو بھول گیا ہے۔" اس نے کہا۔

"خیال رہے کہ میں اور تو بھی اسی پولیس کا حصہ ہیں۔" امتیاز نے گھورتے ہوئے اسے یاد دلایا۔

"ہاں لیکن کچھ خاص لوگ... بھیڑ میں بھی الگ ہوتے ہیں... خیر، تو یہ بتا کہ تیرے خیال میں پولیس کی پریشانی کی اصل وجہ کیا ہے؟" سیف نے ڈرائیو کرتے ہوئے رائٹ انڈیکیٹر دیا۔

"بھئی... کسی نئے مجرموں کے گروہ کا پیدا ہو جانا... جو دن دہاڑے سر عام وارداتیں کر رہے ہوں... کیا پریشانی کی وجہ نہیں ہو سکتی... پہلے سے موجود ڈاکوؤں کے گروہ کیا کم آفت ہیں جو ایک اور نئی دردسری پیدا ہو جائے... پریشانی تو ہو گی۔" امتیاز نے اپنی بات وضاحت سے کہی۔

"بس... یہیں آ کر تیری پاکستانیت مار کھا جاتی ہے۔ ارے بھائی! پریشانی اس بات کی نہیں ہے کہ کوئی نیا گروہ پیدا ہو گیا ہے اور وارداتیں کر رہا ہے... پریشانی اس بات کی ہے کہ وہ نیا گروہ لوٹ مار کر کے سب کچھ اکیلا ہڑپ کر رہا ہے... اور ہماری پولیس... ہمارے مائی باپ کو اس میں سے کچھ نہیں مل رہا ہے... ایسا کب تک چلے گا... یہ تو پولیس کا نقصان ہے نا۔" سیف نے بات وضاحت سے سمجھائی تو امتیاز کے منہ میں کڑواہٹ سی گھلنے لگی۔

"لعنت ہے... ہمارے لوگ کتنے بڑے بڑے عذابوں میں گرفتار ہیں... کوئی پوچھنے والا نہیں ہے... ذرا اس فیملی کے بارے میں سوچ... کس قدر شریف اور معزز لوگ تھے۔ اگر خدانخواستہ وہ ڈاکو ان کی بیٹی کو لے جانے میں کامیاب ہو جاتے تو ان کا کیا حال ہوتا... وہ مختصر سی فیملی پوری طرح تباہ و برباد ہو جاتی۔ ماں باپ تو شاید وہیں ختم ہو جاتے۔ لڑکا زندہ بھی رہتا تو نفسیاتی مریض بن کر... پتا نہیں بعد میں انتقامی جذبے میں وہ بھی کسی غلط راستے پر نکل پڑتا... ایک اچھا گھر برباد ہو گیا ہوتا نا..." امتیاز نے تاسف سے کہا۔

"ہاں یار! یہاں بہت سے معصوم اور بے گناہ لوگوں کے ساتھ ایسی زیادتیاں ہوتی رہتی ہیں... ہمارے اس کرپٹ سسٹم میں برے لوگوں کو کھلی چھوٹ ملی ہوئی ہے۔ خیر، چھوڑ یہ بے کار باتیں... یہ بتا تیری اس فیملی سے دوبارہ کبھی ملاقات ہوئی؟" سیف نے پوچھا۔

"ہاں... دو تین دفعہ میرا ان کے گھر جانا ہوا۔ دو مرتبہ تو ایس ایچ او کے ساتھ گیا تھا... ان لوگوں کے بیان لینے اور ایک مرتبہ ویسے ہی... دل چاہ رہا تھا ان لوگوں سے ملنے کو... تو چلا گیا تھا۔" یہ کہتے کہتے امتیاز کے ہونٹوں پر ایک نرم سی مسکراہٹ کھیلنے لگی... جسے سیف نے بڑی معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

"اچھا... دل چاہ رہا تھا... ان لوگوں سے ملنے... یا ان میں سے کسی خاص سے ملنے کا...؟" سیف نے سوال کیا تو امتیاز بے ساختہ ہنس پڑا۔

"ٹھیک کہہ رہا ہے تو... یار! وہ لڑکی بڑی عجیب ہے... درانہ وار میرے دل و دماغ میں گھستی چلی گئی۔ تو نے اسے جس حالت میں دیکھا تھا، وہ اس کا سہما اور ڈرا ہوا روپ تھا۔ اب جب وہ اپنے اصل رنگ میں آئی ہے تو اس نے میرے چھکے چھڑا دیے ہیں جس قدر چلبلی، تیکھی اور شوخ ہے، اتنی ہی باتونی اور بے پروا بھی ہے۔" امتیاز شاید بالکل ڈھیر ہو چکا تھا۔

"اوہو ہو ہو... مسٹر امتیاز! جو بڑے بڑوں کے چھکے چھڑا دینے کے لیے مشہور تھے، ان کے بھی کوئی چھکے چھڑانے والا مل گیا ہے... بلے بھئی بلے..." سیف زور سے ہنسا۔

"ہاں یار! پتا نہیں یہ کیسے ہو گیا؟ کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔" امتیاز نے سر کھجاتے ہوئے کچھ شرمندہ سے انداز میں کہا تو سیف اور ہنسا۔

"میں تو پہلے دن ہی سمجھ گیا تھا جب وہ ڈری ہوئی اور حواس باختگی میں جس طرح تیرے گلے کا ہار ہو گئی تھی، مجھے بڑی اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ لو بھئی! اپنے امتیاز صاحب تو کٹ گئے کنوں سے... بچیں گے نا..." سیف نے مسخرے انداز میں کہا تو دونوں ہی زور زور سے ہنسنے لگے۔

☆☆☆

اس نے ایک لمحے کو رک کر اس خوب صورت گھر پر

ایک نظر ڈالی۔ ستونوں پر چڑھی سرسبز بیلوں میں چھوٹے چھوٹے سرخ پھول کھلے ہوئے تھے۔ باہر گیٹ کے ساتھ ایک بڑے درخت سے سفید پھول ہوا کے جھونکے کے ساتھ آہستہ آہستہ خوشبو بکھیرتے ہوئے گر رہے تھے۔ اس نے جھک کر نارنجی ڈنڈی اور سفید پنکھڑیوں والا وہ نازک سا پھول اٹھایا اور سونگھ کر اس کی دل نواز خوشبو کو اپنی سانسوں میں اتارا... پھر آگے بڑھ کر بیل بجائی۔ خودکار کھلنے والے نظام سے گیٹ کھل گیا اور وہ اندر چلا گیا۔

''ایک بات مجھے سمجھ میں نہیں آرہی ہے... تم ہو ہائی وے ٹریفک پولیس میں... لیکن ہمارے کیس کی انویسٹی گیشن کے لیے بھی تم ہی نظر آتے ہو... یہ کیا دوغلا کردار ہے بھئی؟'' اس نے چائے کی پیالی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''ٹھیک ہے... آئندہ کے لیے کسی کھڑوس صورت حرام کو پوچھ گچھ کے لیے بھجوا دیا کروں گا۔'' امتیاز نے منہ بناتے ہوئے کہا تو وہ ہنسی۔

''اس کا مطلب ہے... تم کسی کھڑوس، صورت حرام کو رشوت دے کر یہاں آتے ہو۔'' صوفیہ نے قدرے بے پروائی سے کہا تو اسے اچھو لگ گیا اور چائے گرتے گرتے بچی۔ صوفیہ نے اس کی حالت دیکھی تو بے ساختہ ہنسی۔

''پکڑ لیا نا میں نے... یہی بات ہے نا...'' اس نے ہنستے ہوئے انگلی اس کی طرف اٹھاتے ہوئے پوچھا تو وہ اور بوکھلا گیا۔

''کک... کیا بات؟'' اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

''یہی بات... کہ تم ہائی وے پولیس کی نوکری سے خوش نہیں ہو اور اس کوشش میں ہو کہ کسی طرح تم ہماری روایتی پولیس کی نوکری پکڑ لو... کھانے، پینے اور پلانے والی... وہ کتنا عیش کرتے ہیں اور تم سوکھا سوکھا... سارا دن ہائی وے پر گھومتے رہتے ہو... نو پیدا گیری... نو رشوت... نو دہشت... کچھ نہیں... بالکل بے کار نوکری... تمہارا فرسٹریٹڈ ہونا صحیح ہے۔'' اس نے مصنوعی ہمدردی میں پکا سا منہ بنا کر کہا تو وہ بھنا گیا۔

''لاحول ولاقوۃ... مجھے ضرورت نہیں ہے حرام کھانے کی... مجھے اللہ نے اتنا دیا ہے کہ میں اگر کچھ بھی نہ کروں... تب بھی بہت اچھا وقت گزار سکتا ہوں... نہ صرف میں... بلکہ میری آئندہ دو تین نسلیں بھی۔'' اس نے غصے سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''اوکے اوکے... یہ سب بنانے والے یقیناً تمہارے والد صاحب ہوں گے... دولت مند... ٹھاٹ باٹ والے... کیا وہ بھی پولیس میں ہوتے تھے...؟ کوئی بڑے افسر!'' صوفیہ نے معصوم شکل بنا کر کہا تو اس نے غصے میں پیالی پٹخی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ واپسی کے لیے مڑنے والا تھا کہ اسی وقت آنٹی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے دونوں پیشانی تک لپیٹ کر اوڑھا ہوا تھا اور ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ وہ شاید نماز پڑھ کر آئی تھیں۔

''اوہو امتیاز آئے ہیں... بیٹھو بیٹا! کھڑے کیوں ہو؟'' وہ بیٹھتے ہوئے بولیں تو امتیاز کشمکش و پنج میں پڑ گیا کہ بیٹھے یا چلا جائے۔ اس نے گھور کر صوفیہ کو دیکھا جو چائے کے برتن اٹھا رہی تھی اور ایک شریر سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل رہی تھی۔

وہ آنٹی کے اصرار سے مجبور ہو کر بیٹھ گیا اور وہ آنٹی کی پرکالہ جاتے جاتے اسے اپنی مسکراہٹ سے اور چڑا تی گئی۔

''کیا بنا ہمارے کیس کا؟ کوئی پیش رفت ہوئی؟ کچھ پتا چلا کون لوگ تھے؟'' آنٹی نے کئی سوال کر ڈالے۔

''آنٹی! پوری کوشش میں لگے ہوئے ہیں ہم لوگ... لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کون لوگ ہیں وہ... مرنے والے کا بھی کوئی سراغ نہیں مل رہا ہے کہ وہ کون ہے... کس سے تعلق تھا اس کا... لیکن ان ساری کوششوں کے دوران کچھ تھوڑے بہت کلیوز ملے ہیں... ہم ان کے پیچھے ہیں... امید ہے انشاء اللہ جلد ہی کچھ نہ کچھ سراغ مل جائے گا۔'' امتیاز نے بہت تحمل سے انہیں بتایا۔

''ہمارا یہ کیس ہے کس کے پاس؟'' آنٹی نے پوچھا۔

''فی الحال تو میرے ہی پاس ہے۔'' امتیاز نے انہیں بتایا تو وہ کچھ حیران ہوئیں۔

''لیکن تم تو ہائی وے پولیس میں ہو... یہ تمہارا کام تو نہیں ہے... تو پھر...'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔

''میں ہائی وے پولیس میں تھا... اب کچھ عرصہ پہلے میں نے پولیس فورس جوائن کر لی ہے اور آپ لوگوں کا کیس میرا پہلا ٹرائل کیس ہے۔'' امتیاز نے بتایا تو وہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بولیں۔

''اچھا، یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے... تم بھی شاید وہاں سے زیادہ یہاں خوش ہو گے کیونکہ میں نے اندازہ لگایا ہے کہ تمہاری شخصیت میں ایک ایسا فیکٹر ہے جس کی وجہ سے تمہیں چیلنجز سے بھرپور زندگی زیادہ مزہ دیتی ہے۔ ایم آئی رائٹ؟'' انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو امتیاز نے مثبت انداز میں سر ہلایا۔

''یو آر ابسولیوٹلی رائٹ! مجھے ایسی ہی زندگی اچھی لگتی ہے... سیدھی سادی، ایک جیسے روٹین پر چلانے والی زندگی مجھے مرجانے کی حد تک بے زار کر دیتی ہے۔ اسی لیے بقول پاپا کے یہ للو پنجو نوکری کر رہا ہوں... ورنہ ان کے بزنس میں شامل ہو کر زندگی بھر ایک سجے سجائے آفس سے ایک شان دار گھر تک آتے جاتے ایک نہایت آرام دہ اور لگژری لائف گزار سکتا تھا... لیکن یہ قول پاپا کے میرے دماغ میں کوئی خناس ہے جو اس گھٹیا نوکری میں دھکے اور گالیاں کھا کر بھی بے مزہ نہیں ہوتا۔''

امتیاز کا موڈ ٹھیک ہو چکا تھا اور وہ آنٹی سے باتوں میں مصروف ہو گیا تھا اور صوفیہ کو آنٹی نے ہی آرڈر جاری کر دیا تھا۔

''امتیاز ہمارے ساتھ کھانا کھا کر ہی جائے گا... کھانے کا انتظام کرو۔''

ماں کی بات سن کر اس نے برا سا منہ بنا کر امتیاز کی طرف دیکھا تو وہ بول اٹھا۔

''جی آنٹی! تھینک یو... آج پتا نہیں کیوں بھوک بھی بہت لگ رہی ہے مجھے۔'' اس نے مسکرا کر کہا اور اپنا بدلہ لے لیا... صوفیہ اسے گھورتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

''آنٹی! کیا آپ کچھ اندازہ لگا سکتی ہیں اس بات کا... کہ وہ لوگ کون ہو سکتے ہیں؟ کوئی دشمنی... کوئی اختلاف... یا کچھ اور...؟'' امتیاز نے کوئی راستہ ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن آنٹی نے صاف منع کر دیا۔

''نہیں بیٹا! یہ سب تو بڑے لوگوں میں ہوتا ہے۔ خاندانی دشمنیاں، انا نیت پر اختلافات یا کسی کو نیچا دکھانے کی گھٹیا سازشیں... ہم تو عام سے لوگ ہیں... ہمارا ان سب معاملات سے کیا واسطہ... ہم تو ایک بہت سیدھی سادی زندگی گزارنے کے عادی ہیں اور ایسی زندگی میں اس قسم کی خرافات کی گنجائش کہاں ہوتی ہے؟''

''تو پھر یہ سب آپ لوگوں کے ساتھ کیوں ہوا؟'' امتیاز الجھن میں تھا۔

''بس قسمت کی بات ہے کہ وہاں جو کچھ ہونا تھا... اس کی زد میں ہم آ گئے... مگر اس اوپر والے کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے تمہیں فرشتہ بنا کر بھیج دیا... ورنہ ہم تو برباد ہو گئے تھے۔'' آنٹی کے لہجے میں نمی آ گئی۔

''نہیں آنٹی! ایسا نہ سوچیں... اس اوپر والے کا شکر ادا کریں کہ ایک بڑی آفت ٹل گئی لیکن بات یہ ہے کہ اگر ان مجرموں کو پکڑا نہ جا سکے اور انہیں سزا نہ ملے... تو وہ دوبارہ کسی اور کے ساتھ یہی کریں گے... اس لیے میں آپ سے کہہ رہا تھا کہ سوچیں... شاید کوئی ایسی بات یاد آ جائے کہ آپ کو اور ہمیں تھوڑا بہت اشارہ ہی مل سکے۔''

''بیٹا! اس دن سے لے کر آج تک میں یہی سوچتی رہی ہوں کہ آخر ان لوگوں کو ہم سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے اور ہم نے ایسا کیا کر دیا کہ وہ لوگ اس حد تک آ گئے... سوچ سوچ کر تھک گئی ہوں لیکن کوئی اشارہ تک نہیں ملتا۔''

''آپ نے کبھی صوفیہ سے معلوم کیا۔ شاید کالج، یونیورسٹی میں کسی سے کوئی لڑائی جھگڑا ہوا ہو... بعض بڑے گھروں کے بگڑے ہوئے لڑکے... لڑکیوں کی چھوٹی موٹی بات کو بھی انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں؟'' امتیاز نے نہ جانے کیا سوچتے ہوئے پوچھا۔

''پوچھا تھا... لیکن اس نے ایسی کوئی بات نہیں بتائی۔'' وہ کچھ اور کہنے ہی لگا تھا کہ کھانا لگ گیا۔ ان سب نے مل کر کھانا کھایا اور پھر وہ رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

''امتیاز! تیرے کیس سے متعلق تجھے ایک ٹپ دینا تھی۔'' یہ پولیس اسپیشل برانچ میں ایک پرانا کام کرنے والا تھا جس سے امتیاز کی تب سے ہی دوستی استوار ہو گئی تھی جب اس نے پہلے دن اسپیشل برانچ میں چارج سنبھالا تھا۔

''ارے یار! فوراً دے ٹپ... میں مرا جا رہا ہوں اس کیس کو سولو کرنے کی کوششوں میں... اور مجھے کوئی کلیو ہی نہیں مل رہا... ٹوٹل بلائنڈ چل رہا ہے یہ کیس... بتا، کیا بتا رہا ہے۔'' امتیاز نے پرجوش انداز میں جواب دیا۔

''ایک کرمنل ہے... انڈر ورلڈ سے تعلق ہے اس کا... ایک بہت بڑے ریکٹ کا چھوٹا سا حصہ... نام ہے شہزاد... لیکن اپنے حلقے میں شہزادے کے نام سے جانا جاتا ہے... بہ ظاہر بڑا کامیاب بزنس مین ہے۔ تعمیرات کی دنیا میں اس کا کام بہت پھیلا ہوا ہے... اور وہ ایک کامیاب بلڈر ہے... لیکن یہ کام صرف ایک اسموک اسکرین ہے... اصل میں وہ ایک لینڈ مافیا کا کرتا دھرتا... ڈرگ ڈیلر اور اسلحے کا اسمگلر ہے... اگر تو اسے ٹریس آؤٹ کر سکے تو ہو سکتا ہے تیرے کیس کا بھی کچھ سرپیر ہاتھ آ جائے... کوشش شرط ہے... کیونکہ یہ ایک مشکل ٹاسک ہے۔''

ذوالفقار... اس کے سینئر ساتھی نے اس کے کام شروع کرنے کے لیے ایک راہ کا تعین کر دیا۔

''وہ بلڈر کس نام سے کام کرتا ہے؟'' امتیاز نے پوچھا۔

''سائبان بلڈرز کے نام سے۔'' اس نے بتایا۔

''سائبان بلڈرز... یہ جو شہر کا ہر تیسرا چوتھا میگا بلڈنگ پروجیکٹ بنانے والے... انہی کی بات کر رہے ہو نا تم؟''

''ہاں یار! یہی ہے۔'' ذوالفقار نے پورے یقین سے کہا۔

''لیکن یار! یہ تو بہت بڑی فرم ہے اور اس کے کئی ڈائریکٹرز ہیں... لمیٹڈ کمپنی ہے اور بہت سے شیئر ہولڈرز ہیں۔'' امتیاز نے کچھ الجھتے ہوئے کہا۔

''تو ان سب کو چھوڑ... ڈائریکٹ اونر کو دیکھ... لیکن پہلے یہ سوچ لینا... یہ لوہے کا چنا ہے۔'' ذوالفقار نے بتایا۔

''اچھا... تو سمجھ لے میں نے آج سے... بلکہ ابھی سے لوہے کا یہ چنا چبانے کے لیے دانت تیز کر لیے ہیں... ویسے یار! تھینکس فار دس ٹپ۔'' امتیاز نے جواب دے کر فون بند کر دیا۔

اب اس نے باقاعدہ اس پلان پر کام کرنا شروع کیا۔ انٹرنیٹ پر ''سائبان بلڈرز'' کی پوری سائٹ چھان ماری۔ ان کے زیادہ تر میگا پراجیکٹس تجارتی تھے تاہم بہت سے رہائشی بھی تھے۔ اس نے اپنی توجہ رہائشی پراجیکٹس کی طرف مرکوز کر دی۔

پھر یہ ایک الگ اور لمبی کہانی ہے کہ کس طرح اس نے اپنے دوست سیف کو ان کے ایک رہائشی پروجیکٹ میں ایک لگژری فلیٹ خریدنے پر آمادہ کیا... پھر اس پر چھوٹی چھوٹی باتوں کی وجہ سے انتظامیہ سے جھگڑے شروع کیے اور انہیں کورٹ میں لانے کی دھمکی دی۔

انتظامیہ اپنی کچھ خامیوں کے سبب کورٹ سے ماورا معاملات طے کرنے میں دلچسپی لینے پر مجبور ہوئی تو انہوں نے کچھ بلیک میلنگ مواد حاصل کر کے آخرکار شہزاد تک رسائی حاصل کر ہی لی۔

☆☆☆

فون کی گھنٹی پھر بج اٹھی... اور پھر وہ مسلسل بجتی چلی گئی۔ لگ رہا تھا فون کرنے والا بہت بے چین ہے بات کرنے کے لیے... اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا... وہی چہرہ اسکرین پر نظر آ رہا تھا اور وہی نمبر بلنک کر رہا تھا۔ وہ پُرخیال انداز میں اسکرین کو گھورتی رہی۔ گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ جلترنگ کی آواز بھی جھنجھناہٹ میں بدل کر رہ گئی تھی اور اب وہ اس آواز کو جس قدر نظرانداز کرنے کی کوشش کر رہی تھی وہ اتنی ہی اس کے اعصاب کو منتشر کر رہی تھی۔ آخر بے زار ہو کر اس نے فون اٹھا ہی لیا۔

''ہیلو!''

''دیکھو پلیز! فون بند مت کرنا... میں یہاں سوات سے کچھ آگے کے علاقے میں ہوں... مجھے بہت ایمرجنسی میں آنا پڑا... اسی لیے میں تمہیں بتا نہیں پایا... میں...''

''میں جانتی ہوں... اطلاع دینے کا شکریہ... لیکن تم نہ بھی بتاتے تو مجھے معلوم تھا کہ تم وہاں ضرور جاؤ گے... کیونکہ جہاں آگ لگی ہو... وہاں تمہارا کودنا لازمی ہوتا ہے۔'' اس نے غصے میں کہہ کر فون بند کر دیا۔

☆☆☆

''ہم... تو تم ہو... شہزاد عرف شہزادے... جرم کی دنیا کے بہت بڑے لیڈر۔'' امتیاز نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کو گھورتے ہوئے کہا۔

''ہم م... اور تم ہو امتیاز علی درانی... آفیسر فرام اسپیشل برانچ... جس نے مجھے نیست و نابود کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔'' سامنے والے نے تضحیک آمیز انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

''اتنی بڑی مافیا کا ڈان... انڈرورلڈ کا مضبوط کھونٹا اور ایک بہت بڑا گینگسٹر... ایک کمزور اور معصوم لڑکی کو اغوا کروانے کا گھٹیا کام کروائے... کچھ سمجھ میں نہیں آتا... اس کے بدلے تو تاوان بھی کچھ زیادہ نہیں مل سکتا تھا... پھر تم نے یہ زحمت کیوں کی تھی؟'' امتیاز نے سنجیدگی سے پوچھا تو شہزادے کے ہونٹوں پر ایک نرم سی مسکراہٹ لہرائی۔

''کچھ کام صرف اپنے لیے بھی کیے جاتے ہیں... نفع اور نقصان کی پروا کیے بغیر... تم کہاں سمجھو گے اس بات کو... جانے دو... ویسے تم نے میرا ایک قیمتی بندہ مار دیا اس دن... اس کا حساب رہے گا تمہارے اور میرے درمیان... ہوشیار رہنا۔'' شہزادے نے بے پروائی سے ہنستے ہوئے امتیاز کو یاد دلایا۔

''وہ تمہارا ایک معمولی کارکن تھا۔ میں تو خود تمہیں چھاپنے کے چکر میں ہوں۔ تم بھی ہوشیار رہنا۔'' امتیاز نے ترکی بہ ترکی جواب دیا تو شہزادہ گلا پھاڑ کر ہنسا اور ہنستا ہی چلا گیا۔ امتیاز کی بات سن کر اور اپنے باس کو اس طرح بے تحاشا ہنستے دیکھ کر اس کے آس پاس کھڑے اس کے ساتھی بھی مسکرانے لگے... جیسے امتیاز نے کوئی لطیفہ سنایا ہو۔

''مجھے چھاپنے کے چکر میں ہو... مجھے؟'' اس نے ہنسی میں بہ مشکل بریک لگاتے ہوئے امتیاز سے پوچھا۔ اس کی انگلی اپنے سینے کی طرف تھی اور سوالیہ نگاہیں امتیاز پر مرکوز تھیں۔ ''مجھے پکڑنا چاہتے ہو؟ گرفتار کرنا چاہتے ہو؟ تو یہ لو... لگاؤ ہتھکڑی۔'' اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھائے۔ ''لیکن میری جان! یہ تو بتاؤ... کس جرم میں... میں نے کیا کیا ہے؟'' اس نے انتہائی معصومیت سے پوچھا۔ انداز مضحکہ اڑانے والا تھا جس پر اس کے ساتھی اب کھل کر مسکرا رہے تھے۔

امتیاز انتہائی اطمینان سے گہری نظروں سے اسے گھورتا رہا۔

''وہ وقت بھی آئے گا... بہت جلد... اور ہو سکتا ہے تمہاری ہتھکڑی پہننے کی آرزو میں ہی پوری کروں اور تم اپنے جرائم کی ایک لمبی فہرست کے ساتھ... کسی عدالت کے کٹہرے میں کھڑے نظر آؤ گے۔'' امتیاز نے نہایت سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو شہزادہ ہنستے ہنستے رک گیا اور اسے گھورتے ہوئے بولا۔

''تمہارے عزائم پورے ہوتے ہیں یا نہیں، یہ تو نہیں

...لیکن تمہاری جرأت اور بے خوفی کا میں قائل ہو گیا ہوں... پہلے کسی نے مجھ سے اتنا کچھ کہنے کی جرأت نہیں کی ...کوئی اور ہوتا... تو اتنا بولنے کے بعد یہاں سے باہر زندہ ...جا سکتا تھا۔''

شہزادے نے طنزیہ سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ...دو انگلیاں ہلائیں اور امتیاز سر ہلاتا ہوا واپسی کے لیے

...پہلے یہ صرف ذمے داری تھی لیکن اب یہ اس کے لیے ...بن گیا تھا۔ اس جیسے پُرجوش اور خطروں سے کھیلنے والے ...ی کی سی فطرت رکھنے والے نوجوان کے لیے اس سے ...پیچھے ہٹ نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ وہ دیوانوں کی طرح اس تگ و ...میں لگ گیا کہ یہ گورکھ دھندا کیا ہے اور پھر درمیان میں ...بھی جس کی ذات اس کے جذبوں کو اور بھی مہمیز کرنے کا ...بن رہی تھی۔

اس نے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے ایک ٹیم تشکیل ...جس کے ارکان کو الگ الگ ذمے داریاں سونپ دیں۔ ...لوگوں کو صرف شہزادے کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کی ذمے ...ی سونپی... اور باقی کو کچھ اور الگ الگ معاملات ...نے... اور پوری تن دہی سے معلومات جمع کرنے کا کام ...وع ہو گیا۔

اس کے آفس ٹیبل پر رکھے ہوئے پرائیویٹ فون کی ...ٹی بجی تو اس نے نظر اٹھا کر دیوار گیر کلاک میں ٹائم دیکھا۔ ...ت کے دس بجے تھے۔

''ہیلو... سر! ایک اہم اطلاع تھی۔'' اس کے ایک ...تھی کا فون تھا۔

''ہاں بولو۔'' امتیاز پوری طرح الرٹ ہو گیا۔

''شہزادہ ابھی ابھی رحمٰن خان کے گھر میں داخل ہوا ...زبردستی نہیں... بلکہ گیٹ پر کھڑے ہو کر اس نے گھنٹی ...ئی... دروازہ کھولا گیا اور وہ ایک مہمان کی طرح اندر داخل ...ہے۔'' بولنے والے نے اطلاع دی تو امتیاز حیران ہو گیا۔

''یہ کیسے ممکن ہے... رحمٰن خان گلستان جوہر والے نا... ...ی اور...؟'' اس نے پوچھا۔

''وہی سر! جن کی بیٹی کو آپ نے ڈاکوؤں سے بچایا ...'' بولنے والے نے تصدیق کر دی۔

''اچھا... تم کہاں ہو... اس گھر کے سامنے یا کہیں اور؟''

''یس سر! اس گھر کے بالکل سامنے سڑک پر ٹہل ...ہا ہوں۔''

''اچھا تم وہیں رہو... اور نظر رکھو کہ شہزادہ وہاں سے ...تنی دیر میں نکلتا ہے... میں آ رہا ہوں۔'' امتیاز جلدی سے

قارئین متوجہ ہوں

قرآنِ حکیم کی مقدس آیات و احادیثِ نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات اور احادیث درج ہوں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

اٹھا اور چیزیں سمیٹتا ہوا چند ہی منٹوں میں گلستان جوہر کی طرف اڑا جا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ اس علاقے میں پہنچ گیا۔ وہ موڑ مڑا ہی تھا کہ اسے اپنا ساتھی نظر آ گیا۔ امتیاز نے گاڑی روک کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''ہاں... کیا خبر ہے؟''

''سر! وہ ابھی ابھی گیا ہے... خان صاحب اسے چھوڑنے باہر تک آئے تھے... شہزادہ تو خوش گوار موڈ میں تھا لیکن خان صاحب کچھ ٹینشن میں لگ رہے تھے... شہزادے نے انہیں خدا حافظ کہنے کے لیے ہاتھ لہرایا، تب بھی وہ سنجیدگی سے کھڑے اسے دیکھتے رہے... پھر اندر چلے گئے۔''

''اچھا... عجیب بات ہے... خیر دیکھیں گے... تمہیں کہاں جانا ہے... میں ڈراپ کر دیتا ہوں۔'' امتیاز نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''بس سر! نیپا پر چھوڑ دیں... تھینکس...''

☆☆☆

''ہیلو صوفیہ! تمہارا لنچ ٹائم کب سے کب تک ہوتا ہے؟'' امتیاز نے صوفیہ کے آفس فون کر کے پوچھا۔

''کیوں خیریت؟ کیا مجھے لنچ پر انوائٹ کرنے کی کوشش کر رہے ہو؟'' صوفیہ نے چہکتے ہوئے پوچھا۔

''ہو سکتا ہے انوائٹ کر ہی لوں۔''

''ہاہاہا... پولیس والے... اور کسی کو کچھ اپنی جیب سے کھلا دیں... ناٹ پوسیبل... خیر، میرا لنچ ٹائم ایک سے دو بجے تک ہے۔''

''ایک بجنے میں تو دو تین منٹ ہی ہیں... میں تمہارے آفس کے باہر کھڑا ہوں... تم فوراً نیچے آ جاؤ... آج ایک پولیس والے کا دیا ہوا لنچ بھی ٹیسٹ کر کے دیکھ لو۔''

''آر یو سیریس؟''

''ہاں... فوراً آ جاؤ۔'' امتیاز نے کہا تو بے چینی اس کے لہجے سے صاف عیاں ہو رہی تھی۔

''مائی گاڈ! آج سورج کیا مشرق کے بجائے مغرب سے طلوع ہوا تھا... صبح میں تھوڑی دیر سے اٹھی تھی اس لیے دیکھ نہیں پائی لیکن تمہاری بات سن کے کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے... بات کیا ہے؟'' صوفیہ نے مزے سے پوچھا۔

''بات صرف اتنی ہے کہ مجھے تم سے کچھ بہت ضروری بات کرنی ہے... اور وہ بات گھر پر انکل آنٹی کے سامنے نہیں کر سکتا تھا اس لیے مجبوراً تمہیں لنچ پر انوائٹ کر رہا ہوں... اب آپ آئیں گی؟'' امتیاز نے الفاظ چباتے ہوئے کہا۔

''میں تو آ بھی گئی ہوں۔ اتنا چلا کیوں رہے ہو؟'' فون کے بجائے اس کی آواز کھڑکی سے سنائی دی تو امتیاز نے گردن موڑ کر اسے دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر دروازہ کھولا۔

''بارہ منزلیں اتنی جلد طے کر لیں تم نے... کمال ہے... حالانکہ میں سوچ رہا تھا کہ سب لڑکیوں کی طرح تم بھی کم از کم آدھا گھنٹا تو لگاؤ گی۔'' امتیاز نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میں لفٹ سے آئی ہوں۔'' صوفیہ نے چڑ کر کہا۔

''او کے او کے...'' امتیاز نے سیز فائر کر دیا۔ کچھ دیر بعد وہ کے ایف سی میں بیٹھے تھے۔ کھاتے پیتے... باتوں کے دوران اچانک امتیاز نے پوچھا۔

''شہزادے کو جانتی ہو؟''

''شہزادہ؟ نہیں تو...'' صوفیہ نے صاف جواب دیا تو امتیاز بڑا حیران ہوا۔

''اچھا... گھر میں کوئی جانتا ہے؟ امی، ابو یا تمہارا بھائی؟'' امتیاز نے پھر سوال کیا۔

''بھئی... اگر گھر میں کوئی اور کسی شہزادے کو جانتا ہوتا تو یقیناً میں بھی جانتی۔'' صوفیہ نے اطمینان سے چکن کا پیس منہ میں رکھتے ہوئے جواب دیا۔

''اچھا... تم کسی شہزادے کو نہیں جانتیں... اور نہ ہی تمہارے گھر میں سے کوئی اسے جانتا ہے... تو وہ کون تھا جو کل رات تمہارے گھر آیا تھا؟'' امتیاز نے کچھ تلخ سے لہجے میں پوچھا۔

''کل رات کو... اچھا ہاں، وہ تو شہزاد تھا... تم تو کسی شہزادے کی بات کر رہے تھے۔'' صوفیہ نے منہ چلاتے ہوئے کہا۔

''ایک ہی بات ہے۔'' امتیاز نے کہا۔

''ایک ہی بات کہاں ہے بھئی... تمہیں میں امتیاز کے بجائے اگر امتیازہ کہوں... تو کیا ٹھیک ہوگا... نہیں نا... بس اسی طرح وہ شہزاد ہے... شہزادہ نہیں... سمجھے۔'' صوفیہ نے زور دے کر آخری الفاظ کہے۔

''اچھا... تو یہ شہزاد کون ہے؟'' امتیاز نے ہلکی سی آواز میں پوچھا تو صوفیہ نے نظر اٹھا کر بہ غور اسے دیکھا۔

''کیا بتانا ضروری ہے؟'' اس نے دوبارہ کھانے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا تو امتیاز نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''شہزاد، پاپا کے بچپن کے دوست کا بیٹا ہے... جب میں چھوٹی تھی تو فیڈرل بی ایریا میں ہمارے گھر قریب قریب تھے۔ میں، بھائی اور شہزاد ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے۔ ہم تینوں میں بہت دوستی تھی اور دونوں گھروں میں اچھے تعلقات تھے پھر اچانک انکل شہروز کی نہ جانے کون سی لاٹری نکل آئی۔ ان کے پاس دولت آنے لگی... دولت آئی، اسٹیٹس بھی بڑھ گیا۔ انکل ڈیفنس میں شفٹ ہو گئے بہت بڑے بنگلے میں۔ تھوڑے دن تو بہت آنا جانا بھی رہا پھر آہستہ آہستہ کم ہوتا گیا... اسٹیٹس کا واضح فرق شاید اس کی ایک اہم وجہ بھی تھا۔ تاہم شہزاد نے ملنا جلنا جاری رکھا۔ وہ اکثر مہینے پندرہ دن میں ضرور آ جاتا تھا اور اب بھی آ جاتا ہے... یہ ہے اس کی ساری کہانی۔

''اب تم مجھے یہ بتاؤ... کہ تم اسے کیسے جانتے ہو؟ اور تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ کل وہ ہمارے گھر آیا تھا؟ اور یہ کہ تم اسے شہزاد کیوں کہہ رہے ہو؟'' اس نے اپنی بات ختم کر کے تابڑ توڑ سوال کیے اور پھر اطمینان سے کھانے میں مصروف ہو گئی۔

''ہاں، بتاؤں گا... پہلے یہ بتاؤ کہ کل وہ کسی کام سے آیا تھا... یا بس یونہی۔'' امتیاز نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

''بھئی... کل میرا برتھ ڈے تھا... میں تو مناتی نہیں لیکن اسے ضرور یاد رہتا ہے... کل بھی مجھے تو یاد بھی نہیں تھا اس نے آ کر وش کیا تو یاد آیا کہ میرا برتھ ڈے ہے۔ یہ دیکھو... یہ گفٹ بھی لایا تھا وہ میرے لیے۔'' صوفیہ نے ہاتھ اٹھا کر اپنی کلائی اسے دکھائی جس میں ایک بڑا خوب صورت بریسلیٹ جھلملا رہا تھا۔

''ہم... بہت اچھا اور بہت قیمتی گفٹ ہے۔'' امتیاز نے کہا۔

''ہاں... مجھے بھی لگتا ہے کہ شاید خاصا قیمتی ہے... مجھے اس کے ایسے تحفے لینا بالکل بھی پسند نہیں ہے... لیکن کیا کروں... پیچھے پڑ جاتا ہے۔ کل بھی زبردستی اس نے یہ میری کلائی میں پہنا دیا... میں کیا کرتی۔'' صوفیہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''تم نے بتایا نہیں کہ تم اسے کیسے جانتے ہو؟ اور تم اسے شہزادہ کیوں کہہ رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''بھئی وہ اپنے بے تکلف دوستوں میں اسی نام سے جانا جاتا ہے۔ میں اس کے دوستوں میں نہیں ہوں لیکن کسی کے حوالے سے جان پہچان ہے۔ اس لیے اسی نام سے جانتا ہوں۔ کل اتفاق سے میں بھی تمہارے گھر آیا تھا لیکن باہر شہزادے کو کھڑے دیکھا تو آنا کچھ مناسب نہیں سمجھا... کیونکہ وہ مجھے ایک پولیس افسر کی حیثیت سے جانتا ہے اور ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ کسی شریف گھر میں ہم لوگوں کی موجودگی کو اچھا

اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا... اس لیے میں چپ چاپ واپس چلا گیا۔'' امتیاز نے جواب دیا۔ ''کیا تم اس کے بارے میں جانتی ہو... کہ وہ کیا کرتا ہے... اس کا لائف اسٹائل کیا ہے اور اس کی معروفیات کیا ہیں؟'' اس نے بولتے بولتے ایک دم سوال کیا تو صوفیہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

''خیریت تو ہے... آج تو تم شہزاد کی کھال ادھیڑنے پر تلے ہوئے ہو... اتنے سوال کیوں بھلا؟'' اس نے پوچھا۔

''بس... مجھے کچھ بے چینی سی ہو رہی ہے... مجھے پتا نہیں کیوں ایسا لگتا ہے کہ اس کا تمہارے گھر آنا جانا کچھ صحیح نہیں ہے۔'' امتیاز نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''تم بھی پاپا اور بھائی کی طرح ہو... انہیں بھی اس کا آنا ناگوار لگتا ہے۔'' صوفیہ نے جواب دیا۔

''اور تمہیں؟'' امتیاز نے سوال کیا اور براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''میرے پاس کوئی چوائس نہیں ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ اس گھر میں آتا ہی صرف میرے لیے ہے۔ کچھ عرصہ پہلے بھائی اور اس کی اسی مسئلے پر کچھ تلخ بحث ہوگئی تھی۔ بھائی نے اسے کہا کہ آئندہ وہ ہمارے گھر نہ آئے۔ اس بات پر وہ بھی ناراض ہو گیا اور چلا گیا... انہی دنوں ہمارے ساتھ حیدرآباد جاتے ہوئے وہ ڈاکوؤں والا حادثہ ہوگیا... تمہاری بروقت کارروائی نے مجھے بچالیا۔ اس کے بعد سے بھائی بہت زیادہ ٹینشن میں رہنے لگے تھے کہ ایک دن وہ پھر آگیا... بھائی انتہائی غصے میں اس کی طرف شاید مارنے کے لیے بڑھے تھے کہ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ... دوڑ کر بھائی کے پاؤں پکڑ لیے... اور اس قدر گڑگڑا کر بھائی کی خوشامد کی کہ پاپا کو درمیان میں پڑ کر ان کی صلح صفائی کروانی پڑی... بس اس طرح وہ آجاتا ہے... کل بھی آگیا تھا۔'' صوفیہ نے اطمینان سے سب کچھ بتایا۔

''کیا تم اس سے محبت کرتی ہو؟'' امتیاز نے جیسے دھڑکتے دل سے یہ سوال کیا۔

''نہیں... وہ مجھ سے محبت کرتا ہے... دیوانوں والی... میں اسے نہ ملوں... یا اس کی دسترس سے نکل جاؤں... یہ وہ کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتا... بہ قول اس کے... اگر میں اسے نہ ملی تو وہ ساری دنیا کو تہس نہس کر کے آگ لگا دے گا۔'' صوفیہ نے بے پروائی سے کہا۔

''اور تم... تم کیا محسوس کرتی ہو اس کے بارے میں؟'' امتیاز نے پھر پوچھا۔

''یہ ملین ڈالر والا سوال ہے... میں بھی کوشش کرتی ہوں کہ اس کی اس بے انتہا محبت کی قدر کر سکوں... کوشش کرتی ہوں... لیکن... لیکن فی الحال کچھ کہہ نہیں سکتی... اس کے اندر میرے بارے میں ایک عجیب سا احساسِ ملکیت ہے جو محبت پر حاوی ہے... اور یہ چیز مجھے اچھی نہیں لگتی لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ میرا گھرانا... پاپا، ممی یا بھائی اس کے کسی پاگل پن کا شکار ہو جائیں... یا کوئی اور اس کی دیوانگی کی بھینٹ چڑھ جائے... اس لیے اسے برداشت کرتی ہوں... اور شاید آئندہ بھی برداشت کرتی رہوں گی... جب تک کہ قسمت کوئی فیصلہ نہ سنا دے۔'' صوفیہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''اس نے تم سے شادی کرنے کا ارادہ نہیں کیا اب تک؟'' امتیاز نے پوچھا۔

''نہیں... اس کا کہنا ہے کہ وہ اس دن کا انتظار کر رہا ہے... جب میں اس سے کہوں گی کہ مجھے بھی اس سے محبت ہے... بس جس دن میرے منہ سے یہ الفاظ نکلے... وہ اسی دن مجھ سے شادی کر لے گا... ایک دن بھی دیر نہیں ہوگی... لیکن جب تک میں اس سے محبت کا اقرار نہیں کروں گی... وہ شادی کے لیے کوئی زبردستی نہیں کرے گا۔'' صوفیہ کے لہجے میں تلخی سی آگئی۔

''عجب ڈرامے باز ہے... اور تمہارا بہت سچا چاہنے والا... تمہیں فخر ہونا چاہیے۔'' امتیاز نے پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا۔

''فخر... ہاں... باز کے پنجوں میں پھڑپھڑاتی ہوئی چڑیا کو واقعی فخر ہونا چاہیے کہ اسے دبوچنے والا کوئی کوا نہیں بلکہ باز ہے... گڈ... ویری گڈ...'' وہ تلخی سے ہنسی۔

''اچھا بھئی... دو بجنے والے ہیں... اگر تمہاری انویسٹی گیشن ختم ہوگئی ہو تو چلیں... میرا لنچ ٹائم ختم ہونے والا ہے۔'' اس نے ٹشو سے ہاتھ پونچھتے ہوئے اٹھنے کی تیاری کی تو امتیاز بھی کھڑا ہو گیا۔

پھر وہ اسے آفس چھوڑتا ہوا خود اپنے آفس چلا گیا۔ آج اسے اپنی کھوپڑی میں انگاروں کی تپش محسوس ہو رہی تھی۔

☆☆☆

وہ آفس پہنچا تو سیف اس کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ پرانے دوست خاصی گرم جوشی سے ملے۔

''اور سنا! تیرا وہ ٹیسٹ کیس کہاں تک پہنچا؟'' سیف نے اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد پوچھا۔

''ارے یار! وہ بڑا مشکل ٹاسک ہو گیا ہے... میں بری طرح الجھ کر رہ گیا ہوں... مجرم سامنے ہے لیکن میں فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوں کہ اس کا کروں کیا؟'' امتیاز نے الجھتے ہوئے کہا۔

''کیوں بھائی... اس میں مشکل کیا ہے؟ جب معلوم ہو گیا ہے کہ مجرم کون ہے تو پکڑتا کیوں نہیں اسے؟'' سیف کے لہجے میں حیرت تھی۔

''اصل مشکل یہی تو ہے؟'' امتیاز نے آہستگی سے کہا تو سیف کچھ سٹپٹا گیا۔

''کیوں؟ کیا کوئی بڑی مچھلی نکل آئی ہے جس پر ہاتھ ڈالنا مشکل ہو رہا ہے... تو ڈر رہا ہے؟''

''نہیں یار! یہ بات نہیں... تجھے اچھی طرح معلوم ہے میں کسی مچھلی یا مگرمچھ سے نہیں ڈرتا... اگر مجرم ہے تو پکڑنا ہے ٹھکانے لگانا ہے... میں سمجھوتے نہیں کرتا... مگر یہاں معاملہ کچھ ایسا ہو گیا ہے کہ میں بری طرح ذہنی انتشار کا شکار ہو گیا ہوں۔ تجھے شاید معلوم نہ ہو کہ یہ شہزادہ دراصل ہے کیا چیز؟'' امتیاز نے شاید کوئی انکشاف کرنے کی کوشش کی تو سیف نے ہاتھ اس کے چہرے کے سامنے ہلایا۔

''معلوم ہے... معلوم ہے... سائبان بلڈرز کے نام سے کنسٹرکشن کا کام کرتا ہے... لیکن ہے بہت بڑی لینڈ مافیا کا کرتا دھرتا... اور بھی بہت کچھ اس کے نامۂ اعمال میں لکھا ہوا ہے... انڈر ورلڈ کا ایک طاقت ور ڈان... پھر... تو ڈر گیا ہے اس سے؟''

''ارے نہیں یار! میں کچھ اور بات بتانا چاہ رہا تھا... تجھے معلوم ہے صوفیہ کو اسی نے اغوا کروانے کی کوشش کی تھی؟'' امتیاز نے سیف کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں معلوم ہے لیکن یہ نہیں معلوم کہ کیوں؟ کیونکہ اگر یہ اغوا برائے تاوان تھا تو بہت گھٹیا پلاننگ تھی کیونکہ ایک ریٹائرڈ آدمی کی بیٹی کو جو ایک ایمان دار افسر رہا ہو... اس سے کچھ زیادہ ملنے کی توقع تو ہو نہیں سکتی اور وجہ اگر اس کے علاوہ کچھ اور ہے تو وہ مجھے نہیں معلوم۔'' سیف نے بتایا۔

''وہی وجہ تو میں تجھے بتانا چاہ رہا تھا... وجہ یہ ہے کہ شہزادے کی صوفیہ کے بھائی سے کچھ ناراضی ہو گئی تھی اور وہ اس وجہ سے کہ اس نے شہزادے کو اپنے گھر آنے سے منع کیا تھا... سزا کے طور پر اس نے یہ حرکت کرنے کی کوشش کی تھی۔'' امتیاز نے تفصیل بتائی۔

''تو وہ اس کے گھر جانے پر بہ ضد کیوں ہے؟''

''اس لیے کہ وہ صوفیہ سے محبت کرتا ہے... جنون کی حد تک۔'' امتیاز نے شکستہ سے لہجے میں کہا تو سیف حیران رہ گیا۔

''صوفیہ سے محبت کرتا ہے... تو تیرا کیا بنے گا؟ تو بھی تو...'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔

''ہاں... مگر صوفیہ سے محبت کرتا ہے... صوفیہ اس سے محبت نہیں کرتی۔''

''تو اس کا مطلب ہے صوفیہ تجھ سے...؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' اس کی آواز میں اور شکستگی آگئی۔

''ارے یار! تو معلوم کرنا... اگر وہ بھی تجھ سے محبت کرتی ہے تو تیرے لیے ایک راستہ تو بن جائے گا کام کرنے کے لیے۔'' سیف نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

''میں ڈرتا ہوں... ڈرتا ہوں اس چیز سے... کہ میں اپنی محبت کا اظہار کر کے اس کی نظروں سے گر نہ جاؤں... وہ مجھے صاف جواب پکڑا دے... کہے... جاؤ میاں! اپنا راستہ پکڑو... میرے لیے شہزاد کیا برا ہے... تمہاری کیا اوقات ہے؟ دو کوڑی کے سرکاری ملازم... وردی پہن کر غبارے کی طرح پھولے رہتے ہو... کسی اچھے ہوٹل میں ڈنر کرانے تک کی اوقات نہیں ہے تمہاری... جاؤ... اپنا کام کرو۔ پھر میں کیا کروں گا؟'' امتیاز نے اپنے اندیشوں کا اظہار کیا۔

''ارے نہیں یار! میرا خیال ہے ایسا نہیں ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں تیرے لیے ستائش دیکھی ہے۔ وہ شہزادہ تیری جیسی شخصیت کے سامنے کیا اوقات رکھتا ہے۔ اس کے پیچھے بدمعاشی کی طاقت نہ ہو تو اس کی اوقات کیا ہے... تو ڈر مت... پوری ہمت سے ڈٹ جا... اگر تو صوفیہ کو جیت گیا تو سمجھ لے کہ تو نے آدھی جنگ جیت لی۔ باقی آدھی تو پھر حلوہ ہی حلوہ... وہ چوزہ صرف ایک ان کاؤنٹر کی مار ہے۔'' سیف نے اس انداز سے کہہ کر اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا کہ وہ بھی بے اختیار اس کے ساتھ ہنسنے لگا۔

''دشمن کو کبھی کمزور نہیں سمجھنا چاہیے میری جان! اور مجھے تو اپنے ایک دشمن سے دو دو محاذوں پر لڑنا ہے... پتا نہیں کیا بنے گا میرا؟'' امتیاز نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

''جو بھی بنے گا... اچھا ہی بنے گا... انشاء اللہ۔'' سیف اس سے باتیں کر کے رخصت ہو گیا اور وہ نئی سوچوں میں گم ہو گیا۔

☆☆☆

اس دفعہ گھنٹی بجنے پر اس نے فون کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی۔ اسے معلوم تھا کہ یہ اسی کا فون ہو گا۔ لیکن گھنٹی اس قدر تسلسل سے بج رہی تھی کہ محسوس ہوتا تھا، فون کرنے والے کو بہت بے چینی ہے اور وہ ہر قیمت پر اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔ وہ بہت دیر تک گھنٹی کی جلترنگ سنتی رہی۔ آخر جب وہ بند نہ ہوئی تو اس نے تنگ آ کر فون اٹھا ہی لیا۔ کان سے لگاتے ہی اس کی بے چین آواز سنائی دی۔

''سنو! اب فون بند مت کرنا... مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے... دیکھو! دو بینکوں میں میرے اکاؤنٹس ہیں اور ان دونوں میں ملا کر تقریباً کئی لاکھ روپے ہوں گے کیونکہ پچھلے دنوں میں نے ٹنڈو آدم والی زرعی زمین بیچ دی تھی۔ اس میں سے کچھ کے ریگولر انکم سرٹیفکیٹس خرید لیے تھے جن کی نومینیشن تمہارے نام ہے اور بچنے والی رقم بینک میں ڈال دی تھی... وہ بھی تقریباً پندرہ لاکھ کے آس پاس ہوگی... تم...''

''لیکن تم یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہو... تم اچھی طرح جانتے ہو مجھے یہ سب چیزیں نہیں چاہئیں... مجھے تم چاہیے ہو تم... اور تم شاید میرے ہوتے ہوئے بھی میرے نصیب میں نہیں ہو۔'' اس کے لہجے میں کھلی ناراضی تھی۔

''میں جانتا ہوں میری جان! لیکن میری مجبوریاں تم نہیں سمجھنا چاہتیں۔ میری پیشہ ورانہ ذمے داریاں ایسی ہی ہیں۔ تم جانتی ہو... اگر مجھے کوئی ٹاسک دیا جاتا ہے تو میں انکار نہیں کر سکتا... یہ ڈسپلن ہے... اور اس ٹاسک کو پورا کرنے میں کتنا وقت لگتا ہے، اس کا مجھے پتا تھوڑی ہوتا ہے... کئی کئی دن لگ جاتے ہیں اور تمہاری طرف موسم گرم سے گرم ہوتا جاتا ہے۔ اب تو کچھ رعایت کر دو میرے ساتھ۔'' اس نے کچھ شکستہ سے لہجے میں اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی تو اس کے دل میں بھی کچھ ہوا... لیکن وہ اپنے احتجاج کو کمزور ہونے نہیں دینا چاہتی تھی۔

''تمہارے ڈپارٹمنٹ میں تم ایک اکیلے نہیں ہو... اور بھی بہت سے ہیں لیکن آگے بڑھ کر مصیبت خود اپنے سر مول لینے کا پاگل پن کسی اور میں نہیں ہے... سوائے تمہارے۔'' اس نے جھنجلا کر پھر فون بند کر دیا۔

☆☆☆

رات ہیبت ناک اور اندھیری تھی۔ تیز ہوائیں درختوں کو جھنجوڑ رہی تھیں۔ یہ ایک کافی بڑا فارم ہاؤس تھا جو کئی بڑے بڑے باغوں میں گھرا ہوا تھا۔ شہر کی آبادی سے کافی دور یہ جگہ انسانوں کی غیر موجودگی میں ویرانہ محسوس ہوتی تھی۔

امتیاز اپنے تین اور ساتھیوں کے ساتھ بڑی خاموشی اور احتیاط کے ساتھ یہاں پہنچا تھا... صرف دور نظر آنے والے چھوٹے سے فارم ہاؤس میں روشنی نظر آ رہی تھی۔

وہ دو تین کمروں پر مشتمل ایک چھوٹی سی عمارت تھی جس میں سامنے کے رخ پر ایک بڑا برآمدہ تھا۔ ان کی منزل یہی فارم ہاؤس تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے وہاں تک جا سکتے تھے اگر برآمدے میں بیٹھے دو اسلحہ بردار وہاں نظر نہ آئے ہوتے۔

''سنو! تم دائیں جانب سے آگے بڑھنا... اور خاور تمہیں بائیں جانب سے نزدیک پہنچنا ہے۔ میں اور بابر پچھلی جانب جاتے ہیں... بی کیئرفل!'' امتیاز نے اپنے ساتھیوں کو ہدایات دیں اور وہ سب اپنے اپنے راستے پر چھپتے چھپاتے روانہ ہو گئے۔ ان سب کے پاس نائٹ ویژن گاگلز تھے۔

پچھلی جانب ایک کمرے کی کھڑکی روشن نظر آ رہی تھی اور وہیں سے باتیں کرنے کی مدھم آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ وہ دونوں جھکے جھکے محتاط قدموں سے بڑھتے ہوئے کھڑکی کے عین نیچے پہنچ گئے۔ اب آوازیں بھی صاف سنائی دے رہی تھیں۔

''تمہاری وہ زمین کم از کم پانچ کروڑ کی ہے جو میں نے خالی کروا کے دی ہے... اور تم پانچ دس لاکھ کی بات کر رہی ہو... حالانکہ اصولی طور پر سودا پچاس لاکھ پر ہوا تھا۔'' امتیاز نے شہزادے کی آواز صاف پہچان لی۔

''ہاں میں جانتی ہوں... لیکن میں بھی کیا کروں... اب ہر مرنے والے کو ایک ایک کمرے کا مکان بنوا کر دینے کی ذمے داری ڈال دی گئی ہے مجھ پر... تین مرد، پانچ عورتیں اور تین بچے جل کر مرے ہیں، ان جھونپڑیوں کی آگ میں... بچوں کو نکال بھی دیا جائے تو بھی آٹھ مکان تو بنوا کر دینے پڑیں گے... پھر پولیس کو کھلانا ہے... جتنے کی زمین نہیں ملے گی، مجھے اس سے زیادہ کا خرچہ آن پڑا ہے... مجھے فائدہ کیا ہوگا اس میں؟ اور پلے سے ہی جا رہا ہے۔'' عورت نے دہائی دی۔

''دیکھو! تم اگر میرے مرنے والے ساتھی کی بیوہ نہ ہوتیں... تو میں کبھی اس کام میں ہاتھ نہ ڈالتا۔ یہ ٹٹ پونجیوں والے کام میں کبھی نہیں کرتا... کروڑ سے کم کی ڈیل میرے شایانِ شان نہیں ہے... صرف اپنے ساتھی کا لحاظ ہے جو تمہارا کام کر دیا۔ اب کم از کم پچاس لاکھ تو چاہیے ہیں... زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہوں کہ مکان مانگنے والوں کو ڈرا دھمکا کر ان کے مطالبے سے دست بردار کروا دوں... تمہاری کافی بچت ہو جائے گی اور پولیس کو بھی بتا دینا کہ یہ شہزادے کا معاملہ ہے... آپ ہی ٹھنڈے پڑ جائیں گے۔'' شہزادے نے بڑے استغنا سے کہا۔

''ٹھیک ہے... اگر ان دونوں سے تم نمٹ لیتے ہو تو پچاس لاکھ تمہیں پہنچ جائیں گے۔'' عورت کے لہجے میں اطمینان آ گیا۔

''او کے! جلد سے جلد یہ رقم میرے اکاؤنٹ میں منتقل ہو جانا چاہیے... اب میں چلتا ہوں۔'' شہزادے کی آواز آئی۔

''مجھے یہاں کب تک پڑے رہنا ہوگا؟ اس ویرانے میں تنہا اکتا گئی ہوں میں۔'' عورت نے دہائی دی۔

''ارے بھئی! تم تو شارجہ میں ہو... بس اس فارم ہاؤس کو شارجہ سمجھو... دن بھر باغوں میں گھومو... پھل توڑو اور کھاؤ... ٹیوب ویل والے تالاب کو سوئمنگ پول سمجھ کر نہاؤ... پکنک مناؤ... پریشانی کیا ہے؟ ہاں اگر پولیس کو معلوم ہو گیا کہ تم شارجہ میں نہیں... بلکہ یہیں کراچی کے مضافات میں اس فارم ہاؤس میں چھپی ہوئی ہو... تو ایک منٹ نہیں لگائیں گے وہ تمہیں تھانے کے لاک اپ میں پہنچانے میں... کیونکہ بہر حال ان ساٹھ ستر جھونپڑیوں میں آگ لگوانے کا الزام تو تم ہی پر ہے۔ اسی لیے بہتر ہے کہ کچھ وقت یہاں گزار دو تاکہ معاملہ تھوڑا ٹھنڈا ہو جائے۔ گرما گرم معاملے کے مقابلے میں ٹھنڈے معاملے کو ہینڈل کرنا آسان ہوتا ہے اور وہ میں کر لوں گا... تم بے فکر ہو کر یہاں رہو۔''

شہزادے کی آواز آئی۔ پھر ایسی آہٹیں ہوئیں جیسے وہ اور اس کے ایک دو ساتھی اٹھ کر چلے ہوں۔ تھوڑی دیر میں گاڑی کی آواز آئی اور وہ لوگ شاید واپس چلے گئے۔ امتیاز کے ساتھی نے رپورٹ دی کہ اب برآمدے میں صرف ایک گارڈ رہ گیا ہے اور اندر غالباً ایک اکیلی عورت۔

رات زیادہ ہو چکی تھی۔ گارڈ نے اپنی گن دیوار سے ٹکا کر رکھی اور بیٹھے بیٹھے ہاتھ پاؤں پھیلا کر ایک لمبی انگڑائی لی اور ابھی اپنے ہاتھ گرا بھی نہ پایا تھا کہ اندھیرے نے ایک سیاہ پوش اگلا۔ وہ انتہائی خاموشی سے آیا اور اس نے اپنی گن کا بٹ اس کی کھوپڑی کے ایک مخصوص حصے پر بجایا۔ چوکیدار کی آنکھوں میں بے شمار ستارے جھلملائے اور یک لخت اندھیرا چھا گیا۔

سیاہ پوش نے ہاتھ سے سب ٹھیک ہے کا اشارہ دیا تو اندھیرے سے تین اور سیاہ پوش برآمد ہوئے اور وہ کمرے میں گھستے چلے گئے۔ اندر ایک نسوانی سریلی سی چیخ گونجی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

☆☆☆

اس نے گھڑی دیکھی۔ رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ 'کافی رات ہو گئی ہے، پتا نہیں جاگ رہی ہو گی یا سو گئی ہو گی... ویک اینڈ ہے، شاید جاگ رہی ہو۔' یہ سوچتے ہوئے اس نے او کے کا بٹن دبا دیا۔ رنگ جا رہی تھی۔ تیسری ہی گھنٹی پر اس نے کال ریسیو کر لی۔

''کیا بات ہے کوتوال صاحب! اتنی رات گئے آپ نے یاد کیا... خیریت تو ہے؟'' اس نے چہکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں بس... نیند نہیں آ رہی تھی، میں نے سوچا تمہیں دیکھوں... اگر جاگ رہی ہو تو دو چار باتیں ہی کر لوں۔'' امتیاز کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ ابھری جس کا اثر شاید اس کی آواز پر بھی پڑا تھا اور صوفیہ نے اسے صاف محسوس کر لیا۔

''اوہ! نیند نہیں آ رہی... یہ تو بڑی خطرناک بات ہے کوتوال صاحب! کہتے ہیں رات کے اس پہر یا تو عاشق جاگتے ہیں... یا پھر چور... آپ کا شمار کس میں کیا جائے؟'' اس نے ہلکے پھلکے لہجے میں سوال کیا۔

''ہم... مجھے اندیشہ ہے کہ شاید میں پہلی والی کیٹیگری میں یا تو شامل ہو گیا ہوں... یا عنقریب شامل ہونے جا رہا ہوں... رہی دوسری کیٹیگری... تو آپ مجھے ایسا چور سمجھ سکتی ہیں جس میں خود تو کچھ چرانے کی صلاحیت ہے نہیں... ہاں البتہ اس کی اپنی چیز کی چوری ہو گئی ہو۔'' امتیاز نے بھی شگفتہ لہجے میں جواب دیا تو وہ ہنس پڑی۔

''واہ واہ... کوئی کسی پولیس والے کی چوری کر لے... اور وہ کچھ نہ کر سکے تو میرا خیال ہے کہ چرانے والے کو تمغۂ جرأت ملنا چاہیے اور آپ کو چنے پکوڑوں کا ٹھیلا لگا لینا چاہیے... کیوں کوتوال صاحب؟''

''بجا ارشاد فرمایا آپ نے... میں کل ہی اپنے لیے ٹھیلے کا بندوبست کیے لیتا ہوں... آپ حکم کیجیے... تمغۂ جرأت لے کر کب حاضر ہو جاؤں آپ کی خدمت میں؟'' اس نے شوخی سے سوال کیا تو صوفیہ کو چپ لگ گئی۔

''میں نے کچھ پوچھا ہے آپ سے؟ آپ نے جواب نہیں دیا۔'' اس کی خاموشی نے امتیاز کی شوخی کو بڑھا دیا۔

''میں نے آپ کی کوئی چیز چوری نہیں کی ہے۔'' اس کی مدھم سی آواز سن کر امتیاز ہنسا۔

''کوئی بھی چور کہاں مانتا ہے... خیر، جانے دیجیے... میں ملنا چاہتا ہوں... آج لنچ پر ہم مل سکتے ہیں کیا... شاپنگ مال کے فوڈ کورٹ میں؟''

''امتیاز صاحب! اس طرح پبلک پلیسز پر میرا اور آپ کا ملنا شہزاد کو برافروختہ کر سکتا ہے... کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ آپ کے لیے مشکلات کھڑی کر دے۔'' صوفیہ نے توجہ دلائی۔

''وہ ایسا کچھ نہیں کر سکتا... کیونکہ فی الحال تو وہ مجھ سے چھپتا اور بھاگتا پھر رہا ہے... میں نے اس کے گلے میں گھنٹی باندھ دی ہے۔''

''اچھا، ایسا کیا کیا ہے آپ نے؟'' اس نے تجسس

میں پوچھا۔

''اس کہانی کی اگلی قسط کل کے اخبار میں دیکھیے... لنچ پر ٹھیک ایک بجے... اوکے... گڈ نائٹ۔'' اس نے مسکراتے ہوئے فون بند کیا اور تکیے پر سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

آج صبح سے ہی ایسے اپنے احساسات میں ایک جوش آمیز سنسنی سی محسوس ہو رہی تھی... اور وہ خود اپنی اس کیفیت پر خنداں تھا کہ آج کس قدر بے چینی سے... ایک بجنے کا انتظار کر رہا تھا۔

''حد ہو گئی... کیا بچپنا ہے؟'' اس نے آہستگی سے اپنے سر پر ہاتھ مار کر خود کو تنبیہ کی۔

آفس میں جلدی جلدی کچھ ضروری کام نمٹائے... کچھ رپورٹس دیکھیں... کچھ لوگوں کو مختلف ہدایات دیں اور ساڑھے بارہ بجے وہ اٹھ کر آفس سے نکل گیا۔

گاڑی شاپنگ مال کی پارکنگ میں کھڑی کر کے اس نے اپنی یونیفارم کی شرٹ اتار کر پچھلی سیٹ پر ڈال دی۔ اندر اس نے ایک خوب صورت ٹی شرٹ پہن رکھی تھی... پھر لفٹ کے ذریعے ٹاپ فلور پر پہنچا... مصنوعی جنگل کے ماحول میں بے شمار ٹیبلیں لگی ہوئی تھیں اور کچھ لوگ بیٹھے کھا پی رہے تھے... پھر دور ایک کونے میں اسے صوفیہ نظر آئی جو اسے دیکھ کر ہاتھ ہلا رہی تھی۔

''کیا بات ہے کوتوال صاحب! آج یونیفارم سے آزادی کا دن ہے... چھٹی پر ہیں کیا آپ؟'' صوفیہ نے اسے بغیر یونیفارم کے دیکھ کر پوچھا۔

''نہیں... میں تو شاید کبھی چھٹی پر ہوتا ہی نہیں ہوں... یونیفارم کی شرٹ اتار کر گاڑی میں ڈال آیا ہوں... ورنہ یہاں سب کھانا کھانے کے بجائے ہمیں دیکھ رہے ہوتے۔'' اس نے اطمینان سے بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھتی رہی... کھانا آنے تک وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔

''شہزاد کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے آپ؟'' صوفیہ نے ٹرے اپنی طرف کھسکاتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں... میں نے اس کے گرد جال پھیلا دیا ہے... اب وہ کہیں سے بھی آئے شکنجے میں کسا جائے گا۔'' امتیاز نے جواب دیا۔

''کیا اس کی کوئی غلط حرکت آپ نے دیکھ لی ہے... ثبوت و شواہد حاصل کر لیے ہیں؟ اتنے یقین سے کیسے کہہ رہے ہیں؟''

''تمہیں شاید اس کی حرکتوں کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں... تمہیں نہیں پتا کہ وہ کیا کیا کرتا ہے؟ لیکن اب وہ بچ نہیں سکتا۔'' امتیاز نے پورے یقین سے کہا۔

''آپ اس قدر یقین سے کہہ رہے ہیں جیسے آپ نے اسے نکیل ڈال دی ہے... اور جب چاہیں گے اسے گھسیٹتے ہوئے لا کر قانون کے حوالے کر دیں گے... کہیں ایسا تو نہیں کوتوال صاحب کہ آپ اس کے بارے میں کسی اوور کانفیڈنس کا شکار ہو گئے ہوں؟'' صوفیہ نے ڈرنک اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''ارے تم اس قدر مختصر سے آدمی سے ڈرتی ہو... پانچ فٹ کا وہ چوزہ ایسی کیا توپ چلا لے گا کہ بندہ خوامخواہ اس سے خوف کھائے۔'' امتیاز نے اس کی مختصر جسامت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''لوگ شیر اور ہاتھی سے زیادہ بچھو سے ڈرتے ہیں... کتنی چھوٹی سی چیز ہوتا ہے لیکن کتنا ظالم زہر رکھتا ہے... جس کو ڈنک مار دیا... وہ مرتا تو ہے... پر بے انتہا اذیت کے ساتھ!'' صوفیہ نے سنجیدگی سے کہا تو اس کے لہجے میں اندیشے بول رہے تھے۔

''تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں ہے کیا... یقین کرو میں اس بچھو کے ڈنک سے سارا زہر نکال دوں گا...'' امتیاز نے اسے تسلی دی تو وہ مسکرائی اور دونوں کھانے میں مصروف ہو گئے۔

☆☆☆

اسے اپنے اسپیشل فون پر بپ سنائی دی تو اس نے فوراً اٹھایا۔

''ہاں شاہد! بولو... کیا خبر ہے؟''

''صاب! ابھی ابھی وہ ڈیفنس کے ایک بنگلے میں داخل ہوا ہے۔'' پھر وہ اس بنگلے کا پتا دہرانے لگا۔

''ٹھیک ہے... اپنے ایک آدمی کی ڈیوٹی لگا دو... اس پر مستقل نظر رکھنا ہے... اور کوشش کرو کہ اس بنگلے میں رہنے والوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل ہو سکیں۔'' امتیاز نے اسے ہدایات دیں۔

''سر! تھوڑی دیر پہلے میں نے آپ کو فون کرنے کی کوشش کی تھی تو وہ بزی جا رہا تھا... میں ایسے ہی ٹہلتا ہوا اس بنگلے کے چوکیدار کے پاس چلا گیا... وہ میرا ہم قوم تھا... میں نے سگریٹ کے لیے اس سے ماچس مانگی تو اس نے مجھے چائے کی بھی آفر کر دی۔ میں وہاں بیٹھ کر اس کے ساتھ چائے پیتا رہا اور باتیں کرتا رہا۔ اس کی زبانی پتا چلا کہ ادھر کوئی بڑا صاب رہتا ہے جو فارن کا مارا ہے... بستر پر بیمار رہتا ہے... چھوٹا صاب ہے جو کاروبار چلاتا ہے... بہت کم گھر میں

رہتا ہے... کبھی کبھی کئی دنوں میں آتا ہے... گھر میں بڑا صاب کی بہن ہے جو گھر کو سنبھالتی ہے... اور سارے نوکروں پر وہی حکم چلاتی ہے... یہ قول اس کے وہ بہت بدمزاج کھوسٹ قسم کی ہے... سارے نوکروں کو ایک ٹانگ پر نچائے رکھتی ہے۔'' انفارمر نے امتیاز کو تفصیل بتائی۔

''ویری گڈ... شاباش شاہد خان... بس یہ جو چھوٹا صاب ہے نا... اس کو نظروں سے اوجھل نہیں ہونا چاہیے... ٹھیک ہے... الرٹ رہنا۔'' امتیاز نے ہدایات دیں اور دوبارہ کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہو گیا جس پر اس نے شہزاد عرف شہزادے کا ڈیٹا جمع کیا ہوا تھا۔ ڈیٹا میں کئی ایسی چیزیں تھیں جو خود اس کے لیے بھی حیران کن تھیں لیکن بہرحال اس نے کافی معلومات جمع کر لی تھیں۔

دوبارہ فون کی گھنٹی بجی تو لائن پر دوسرا آدمی تھا۔

''ہاں ریاض! کیا بات ہے؟'' اس نے فون کان سے لگاتے ہوئے پوچھا۔

''سر جی! عورت سب کچھ بتانے کے لیے تیار ہے... ہم نے اس کی خاطر خواہ مدارات کی ہے، ساری اکڑفوں رخصت ہو گئی ہے۔ آپ ابھی آ جاؤ تو یہ کام بھی نمٹ جائے گا۔'' ریاض نے اطلاع دی۔

''ٹھیک ہے... میں آدھے گھنٹے میں آ رہا ہوں۔'' امتیاز نے فون بند کر کے جیب میں ڈالا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

شاکرہ وہی عورت تھی جسے امتیاز اور اس کے ساتھی فارم ہاؤس سے اٹھا کر لائے تھے... وہ پہنچی ہوئی چیز تھی... اس کا بھی یہی کام تھا کہ یہ ادھر ادھر خالی پڑی زمینوں پر قبضے کروائی تھی اور پھر وہاں جن لوگوں سے جھونپڑیاں ڈلوائی تھی... جوڑ توڑ کر کے ان کے نام کے مالکانہ حقوق حاصل کرتی اور اس کے بعد ان سے یہ زمین خرید لیتی۔ صرف کاغذات کی حد تک... ورنہ حقیقتاً وہ ان جھونپڑی نشینوں کو ذرا دھمکا کر وہاں سے بھگا دیتی تھی یا کسی اور خالی قطعۂ زمین پر انہیں آباد کروا دیتی تھی۔ اس جرم میں اس کا شوہر بھی اس کے ساتھ تھا اور وہ شہزادے کا ساتھی تھا جو کچھ عرصہ پہلے ایک پولیس مقابلے میں مارا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ شہزادہ اس کی بیوہ ہونے کے ناتے شاکرہ کا خیال کرتا تھا۔

امتیاز اس کے بارے میں سوچتا ہوا تیزی سے کار ڈرائیو کر رہا تھا... رات کے اس پہر سڑکیں سنسان پڑی تھیں۔ اِکا دُکا گاڑیاں نظر آ جاتی تھیں۔

اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر وہ تیزی سے اندر پہنچا تو سیڑھیوں پر ہی اسے ریاض مل گیا۔

''آ جائیں سر!'' وہ اسے ساتھ لیے ہوئے تہ خانے میں اترتا چلا گیا۔ سیڑھیوں کے اختتام پر مضبوط لوہے کے دروازے کو اس نے چابی سے کھولا۔ سامنے ہی تیز روشنی سے جلنے والے بلب کے گرد نیچے لوہے کی کرسی پر بندھی ہوئی شاکرہ بیٹھی تھی۔

''ہاں بھئی! خاتون نے کچھ بتایا... یا ابھی تک منہ بند رکھا ہوا ہے؟'' امتیاز نے اس کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں سر جی! اب یہ ٹیپ ریکارڈر کی طرح بجے گی... آپ پوچھو جو پوچھنا ہے۔''... ریاض کی بات سن کر شاکرہ نے سر اٹھایا۔

''تم بہت پچھتاؤ گے آفیسر! شہزادے کو انڈر ایسٹی میٹ مت کرو... وہ کوئی ترنوالہ نہیں ہے جسے تم آسانی سے حلق سے اتار لو۔'' اس نے امتیاز کو گھورتے ہوئے سنجیدگی سے کہا تو اس کے الفاظ تو دھمکی آمیز لگے لیکن آواز اور چہرے کے تاثرات میں شکست اور ٹوٹ جانے کے آثار صاف ظاہر ہو رہے تھے۔

''تمہیں اس کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے... تم صرف اپنی فکر کرو... جو کچھ تم سے پوچھا جائے اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دو... یہ تمہاری صحت کے لیے کافی بہتر ہوگا۔'' امتیاز نے اطمینان سے جواب دیا۔

''اور اگر میں کچھ نہ بتاؤں یا غلط بتاؤں تو...؟'' شاکرہ نے نہ جانے کیا سوچ کر کہا تو ریاض ... آستینیں چڑھاتا ہوا غصے سے اس کی جانب بڑھا۔

''تیری تو...'' اس کے منہ سے نکلا۔

''بس... وہیں رک جاؤ... میرے ساتھ جتنا کچھ کر چکے ہو، تمہارے عبرتناک انجام کے لیے اتنا ہی کافی ہے... پوچھو آفیسر... کیا پوچھنا ہے۔'' شاکرہ نے کڑک کر دبنگ آواز میں ریاض کو روکا۔

''جس زمین پر وہ جلنے والی جھونپڑ بستی آباد تھی، اس کی مالک تم ہو؟'' امتیاز نے سوال کیا تو ریاض نے لپک کر پیچھے رکھا ہوا ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا۔

''ہاں... وہ میری زمین ہے... میرے مرحوم شوہر نے خرید کر میرے نام کر دی تھی۔''

''تم ان جھونپڑیوں کو وہاں سے ہٹوانا چاہتی تھیں؟''

''ہاں، کئی سال سے... لیکن وہ جھونپڑی والے کسی اسمبلی ممبر کی پشت پناہی کی وجہ سے جگہ خالی نہیں کر رہے تھے اور وہ اسمبلی ممبر میری اس زمین کو فروخت کر کے پیسا اپنی

جیب میں ڈال کر مجھے بہت بڑا نقصان پہنچانا چاہتا تھا۔''

''تم نے اس ممبر سے بات نہیں کی؟''

''کئی دفعہ کوشش کی لیکن وہ اپنی طاقت کے زعم میں ہے... میں نے شہزادے سے کہا کہ اس مسئلے کو حل کرے تو اس نے میری مدد کی درخواست قبول کرلی۔ وہ شاید جھونپڑی والوں کو کچھ لالچ دے کر... کچھ دھمکا کر جگہ خالی کروانے کی کوشش کررہا تھا کہ اچانک ان میں آگ لگ گئی... اور ساری جھونپڑیاں جل گئیں۔'' شاکرہ نے اطمینان سے جواب دیا۔

''ساری جھونپڑیاں جل گئیں... ان میں آگ لگ گئی... خود بہ خود؟'' امتیاز نے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

''ہاں... انہی میں سے کسی کی غلطی سے... شاید جلتی ہوئی سگریٹ پھینک دی تھی... جس سے آگ لگی...'' شاکرہ نے جواب دیا تو امتیاز زور سے چلایا۔

''بکواس... بالکل غلط... پولیس کی تحقیقات کے مطابق وہاں کوئی خاص کیمیکل یعنی فاسفورس پاؤڈر چھڑک کر آگ لگائی گئی تھی اور وہ آگ بہ یک وقت تمام جھونپڑیوں میں اس طرح بھڑکی کہ لوگوں کا جان بچانا مشکل ہوگیا... اور آٹھ لوگ جل کر مر گئے۔''

''یہ تفصیل مجھے نہیں معلوم... میں جو جانتی ہوں۔ میں نے تمہیں بتادیا... اگر کسی نے اس طرح کیمیکل سے آگ لگائی بھی ہے تو میں اس جرم میں شامل نہیں ہوں۔'' شاکرہ نے سنجیدگی سے کہا تو امتیاز نے اسے گھورتے ہوئے اپنی بات کہی۔

''خاتون! ماضی میں ایسی مثالیں ہیں کہ کئی لوگوں کو پھانسی کی سزا ایسے جرم میں دی گئی جو انہوں نے خود نہیں کیا... بلکہ کسی اور ذریعے سے کرایا۔''

''اگر تم نے بھی طے کرلیا ہے کہ مجھے پھانسی پر چڑھانا ہے... تو چڑھادو۔'' شاکرہ نے برا سامنہ بنا کر کہا۔

''تم نے اپنی زمین خالی کروانے کے لیے شہزادے سے مدد لی... اس نے اپنے آدمیوں سے وہاں آگ لگوا کر زمین خالی کروادی... وہاں جل کر مرنے والے آٹھ لوگوں کا قتل کس کے سر جائے گا... تمہارے یا شہزادے کے؟''

''کس کے سر جائے گا، یہ فیصلہ کرنا عدالت کا کام ہے... لیکن کسی کے بھی سر جائے... تم از کم میرے سر ہرگز نہیں جاسکتا۔ کیونکہ میں نے بھی کسی سے نہیں کہا کہ زمین خالی کروانے کے لیے کسی کو جان سے مار دو۔'' شاکرہ نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''شاکرہ بیگم! یہ تو تم مانتی ہو کہ تم نے شہزادے سے مدد مانگی تھی اور اس نے ہر قیمت پر یہ زمین خالی کروا کر تمہیں دینے کا وعدہ کیا تھا... کیوں؟ کس وجہ سے؟'' امتیاز نے سوال کیا۔

''پیسوں کی وجہ سے... اور کیوں؟ میں نے اسے پچاس لاکھ دینے تھے۔''

''صرف پچاس لاکھ... پچاس کروڑ کی زمین وہ تمہیں دلوا رہا تھا اور صرف پچاس لاکھ روپے کے عوض... یہ حساب کچھ ٹھیک نہیں لگتا۔''

''اگر تمہیں یہ حساب کتاب صحیح نہیں لگتا تو شہزادے سے پوچھو... میری تو اس سے جو ڈیل ہوئی ہے میں نے بتادی۔''

''اوکے! اس سے پوچھ لیں گے... فی الحال تو تمہیں ہم سے ڈیل کرنی پڑے گی اور وہ یہ ہے کہ عدالت میں بھی تم یہی بیان دو گی اور کچھ نہ کچھ پرانی باتوں کے حوالے سے بھی عدالت کے روبرو تمہیں کچھ کہنا ہے... اس بارے میں... میرا یہ ساتھی تمہیں بریف کردے گا۔'' امتیاز نے اوور کا اشارہ کرتے ہوئے اپنے ساتھی کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔

☆☆☆

وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی آفس پہنچا تھا اور جلدی جلدی ضروری کام نمٹا رہا تھا کیونکہ تھوڑی ہی دیر میں اسے پھر باہر نکلنا تھا۔ اپنے جن ساتھیوں کو اس نے مختلف ڈیوٹیز پر لگایا ہوا تھا ان کی تازہ ترین رپورٹس وہ جلدی جلدی دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس کے سیل فون نے گنگنانا شروع کردیا۔

اس نے اسکرین پر دیکھا تو صوفیہ کا نمبر دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک دل فریب سی مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔

''زہے نصیب! لگتا ہے آج اپنا مقدر عروج پر ہے کہ آپ نے اس ناچیز کو یاد فرمایا... فرمایئے؟'' امتیاز نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''افوہ... صبح صبح اس قدر ثقیل جملے سن کر مجھے کچھ خفقان سا ہونے لگتا ہے... اور ویسے بھی یونہی کسی کی خیر خیریت معلوم کرنے کے لیے اگر فون کرلیا جائے تو کچھ اتنا حیران کن بھی نہیں ہونا چاہیے کہ بندہ گھبرا کر جنتی زبان بولنے لگے۔'' صوفیہ نے روانی سے کہا۔

''کم آپ بھی نہیں... جوابی کارروائی میں آپ نے جو لفظ خفقان استعمال کیا ہے، ناچیز کے سر سے صاف گزر گیا۔ مگر کوئی بات نہیں... میرے لیے یہ بھی بہت ہے کہ آپ نے یاد فرمایا ہے اور وہ بھی بغیر کسی غرض کے... صرف خیریت پوچھنے کے لیے... واللہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کثرتِ انبساط سے یہ حقیر پُرتقصیر اپنی جان سے گزر جائے۔'' امتیاز نے پھر گاڑھی اردو کا تڑکا لگایا تو وہ ہنس پڑی۔

''جانے دیجیے کوتوال صاحب! اتنی گاڑھی اردو بول

آپ کی زبان میں اس قدر پیچ وخم پڑ جائیں گے کہ پھر شاید کبھی سیدھی نہ ہو پائے... اس لیے آسان آسان بولیے اور اپنی زبان کا مستقبل بچایئے۔''

''جی بہتر... آپ کے مشورے کے پیشِ نظر... میں کوشش کروں گا۔'' اس نے فوراً اس کی بات مان لی۔

''ایک بات پوچھنا تھی... رات میرے گھر کے آس پاس کچھ خفیہ قسم کی سرگرمیاں تھیں... کہیں اس کے ذمے دار آپ تو نہیں ہیں؟'' صوفیہ نے آخرکار فون کرنے کا مقصد بیان کر ہی دیا۔

''کیسی سرگرمیاں... کیا ہو رہا تھا؟'' امتیاز نے کچھ انجان بن کر سوال کیا تو صوفیہ نے اسے لتاڑا۔

''کپتان صاحب! اڑنے کی کوشش نہ کریں... صاف صاف بتائیں... اگر اس کے ذمے دار آپ ہیں تو میرا خیال ہے کہ مجھے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے... لیکن اگر آپ لاعلم ہیں تو میں اپنے گھر کے آس پاس ناپسندیدہ عناصر کی موجودگی کی رپورٹ پولیس میں لکھوانا چاہوں گی...''

''پاپا تو صبح ہی کہہ رہے تھے لیکن میں نے انہیں روکا کہ پہلے خود پولیس سے تو پتا کرلوں کہ اس قسم کی سرگرمیوں کی ذمے دار پولیس تو نہیں ہے؟'' اس نے شوخی سے پوچھا۔

''پہلے ناپسندیدہ عناصر کی سرگرمیوں کے بارے میں تو کچھ بتایئے... آپ کو کیا محسوس ہوا یا آپ نے کیا دیکھا؟'' امتیاز نے رسان سے پوچھا۔

''شاید تین اور چار بجے کے درمیان میری آنکھ کھلی اور مجھے ایسی آہٹیں سنائی دیں جیسے کچھ لوگ ہمارے گھر کے آس پاس چل پھر رہے ہیں... لیکن احتیاط کے ساتھ کہ زیادہ آہٹیں نہ ہوں... میرے بیڈ روم کی کھڑکی کیونکہ سڑک کی جانب کھلتی ہے تو مجھے کچھ نامعلوم سی آہٹوں کے ساتھ ساتھ سرگوشیاں بھی کبھی کبھی سنائی دے رہی تھیں... جیسے کچھ لوگ دبی دبی آوازوں میں کچھ ہدایات دے رہے ہوں... میں ابھی انہیں سمجھنے کی کوشش کر ہی رہی تھی کہ ایسا محسوس ہوا کہ اچانک کچھ نئے لوگ وہاں پہنچے... جن کے سبب پہلے والوں نے شاید بھاگنا چاہا اور نئے آنے والے انہیں یا تو پکڑنا چاہ رہے تھے یا خوف زدہ کرکے بھگانا چاہ رہے تھے... کچھ نسبتاً بلند آواز میں دیے گئے کاشنز بھی سنائی دیے جیسے فوجی لوگ دیتے ہیں... ایک چھوٹی موٹی بھگدڑ کی سی دبی دبی آوازیں سنائی دیں پھر دو فائرز کی آوازیں بھی آئیں... اس کے بعد خاموشی چھا گئی... میں خوف سے سو نہ سکی۔ صبح پتا چلا کہ ممی پاپا بھی یہ سب جان چکے تھے اور خاصے فکرمند تھے انہیں بھی یہی لگا تھا کہ کچھ لوگ شاید ہمارے گھر میں گھسنے کی کوشش کررہے تھے کہ اچانک کچھ لوگ مدد کے لیے آئے اور انہوں نے پہلے والوں کو مار بھگایا... اب یہ دونوں پارٹیاں کون تھیں اور کیا چاہتی تھیں... یہ پولیس ہی معلوم کرسکتی ہے... پاپا نے کہا تھا کہ میں علاقے کے تھانے میں رپورٹ کرواتا ہوں لیکن مجھے آپ کا خیال آگیا اور میں نے ان سے یہی کہا کہ ٹھہر جائیں... پولیس کی ایک بڑی توپ سے ہماری کچھ سلام دعا ہے... ان سے بات کرکے دیکھ لیتے ہیں... وہ کیا کہتے ہیں۔ تو آپ کیا کہتے ہیں کوتوال صاحب؟'' اس نے روانی سے بولتے ہوئے سوال پوچھ لیا۔

''میں کیا کہوں محترمہ! آپ کا خیال بالکل درست ہے... رات آپ کے شہزادے اور ہمارے شہزادے نے... آپ کے درِدولت پر حاضری دینی چاہی تھی... ہمیں اس نامعقولیت کی کافی پہلے سے توقع تھی اس لیے ہم نے وہاں کچھ لوگوں کو آپ کے گھر کی خفیہ نگرانی پر لگایا ہوا تھا... اب آپ دیکھیے کہ رات کو ساڑھے تین بجے کون نامعقول کسی کے گھر جاتا ہے مگر اس ناہنجار کو اس کا خیال کہاں... اور ہم یہ گوارا کر نہیں سکتے تھے کہ رات کے اس پہر... کوئی آپ کی میٹھے میٹھے خوابوں بھری نیند میں مخل ہو کر آپ کو بے خواب کرے... اس نے یہ جرأت کی... تو ہم نے توپ چلا دی...'' امتیاز نے اتنا ہی کہا تھا کہ صوفیہ نے اس کی بات کاٹ کر جلدی سے پوچھا۔

''تم نے اسے گولی مار دی... مر گیا وہ؟''

''ارے اتنا غیرت مند کہاں ہے وہ کہ ایک دو گولیوں سے مر جائے... اور ویسے بھی ہم نے گولی اس کی ٹانگ میں ماری تھی... اس نے بھی معمولی خراش کے سوا کچھ نہیں بگاڑا اس کا۔'' امتیاز نے پُرمزاح انداز میں کہا۔

''اب کہاں ہے وہ؟'' صوفیہ نے انگوائری کی۔

''ہمارا ہی مہمان ہے۔''

''اچھا... اب کیا کرو گے اس کا؟'' اس نے پھر پوچھا۔

''اسے نمک اور مرچ مسالا لگا کر دھوپ میں رکھیں گے اور پھر تیل میں تل کر اس کا اچار بنائیں گے... کیا اسٹوپڈ سوال ہے بھئی؟ ظاہر ہے وہ ایک جرائم پیشہ شخص ہے اور جرائم کی ایک طویل فہرست اس کے نام کے ساتھ ہے... پکڑا ہے تو اب اس سے اس کے گناہ قبول کروائیں گے... پھر عدالت میں پیش کریں گے جہاں یقینی طور پر اسے سزا سنادی جائے گی۔''

''تمہیں یقین ہے کہ تم جرائم کی جو فہرست عدالت کے سامنے پیش کرو گے وہ بغیر ثبوتوں کے عدالت بھی یان لے گی اور وہ خود بھی مان لے گا؟'' صوفیہ کچھ سنجیدہ سی ہوگئی تھی۔

''نہیں... بغیر ثبوتوں کے تو دونوں نہیں مانیں گے لیکن ثبوتوں کا انتظام ہم نے پکا کر رکھا ہے... ایک نہیں... کئی ثبوت ہیں ہمارے پاس... اس کا بچنا محال ہے۔'' امتیاز نے پورے یقین سے کہا۔

''تمہیں یقین ہے اسے سزا ہو جائے گی؟'' صوفیہ نے پھر پوچھا تو امتیاز کچھ حیران ہوا۔

''ہاں بالکل... لیکن تمہیں یقین کیوں نہیں ہو رہا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''امتیاز! وہ بہت شاطر ہے... اور اپنے پیچھے بڑی مضبوط پشت پناہی رکھتا ہے... تب ہی تو بہ قول تمہارے بہت سے جرائم میں ملوث ہونے کے باوجود آزادی سے دندناتا پھرتا تھا... اگر اس دفعہ وہ تمہارے چنگل میں پھنس بھی گیا ہے تو ضروری نہیں کہ مکافاتِ عمل تک پہنچے... ہو سکتا ہے اس سے پہلے ہی جوڑ توڑ کر کے وہ تمہارے جال کو توڑ کر آزاد ہو جائے۔'' صوفیہ کی آواز میں اندیشے تھے۔

''اس کا مطلب ہے تم مجھے نہیں جانتیں... اس کے انجام تک پہنچنے کے بعد ہی میں چین سے بیٹھوں گا... جب تک عدالت میں اس کا ٹرائل چلے گا... میں جنگی بنیادوں پر کام کرتا رہوں گا اور اس تک آنے والی ہر مدد کا راستہ روکتا رہوں گا... اس کو انجام تک پہنچانا اب میری زندگی کا اولین مقصد ہو گا... اور تم دیکھنا میں اس مقصد میں ضرور کامیاب ہوں گا۔'' امتیاز نے بھرپور اعتماد اور یقین سے کہا تو صوفیہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''انشاء اللہ!'' پھر امتیاز نے اس کی ایک اطمینان بھری سانس کی آواز سنی تو وہ مسکرایا۔

''کوتوال صاحب! یہ سب اتنا آسان نہیں۔'' صوفیہ نے اسے مشکلات کا احساس دلانے کی کوشش کی۔

''یہ تو ہم بہت پہلے سمجھ چکے تھے کہ
یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجیے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔''

امتیاز نے برمحل شعر سنایا تو وہ ہلکے سے ہنسی۔

''اوہ... پولیس والے اور شاعرانہ ذوق... ماننا پڑے گا کہ آپ حیران کر دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''ابھی آپ نے ہماری صلاحیتوں کو پرکھا ہی کب ہے... دیکھتی جائیے۔'' امتیاز کے موڈ میں خاصی روانی تھی۔

☆☆☆

رات کافی گزر چکی تھی لیکن نیند اس کی آنکھوں سے روٹھی ہوئی تھی۔ طبیعت میں ایک عجب طرح کا اضطراب تھا کہ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اسے کیا ہوا ہے... شاید پریشانی جھنجلاہٹ اور غصہ مل کر ایک عجب موڈ بنا رہے تھے اور اس کیفیت میں نیند آنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ وہ اپنی اس اضطرابی کیفیت کو بڑھنے سے بچانے کی خاطر اپنے آپ کو کام میں مصروف رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ٹیلی فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی... اسی کا فون تھا... اس نے پھر فون اٹھا کر کانوں سے لگایا تو اس کی ہیجان آمیز آواز کانوں سے ٹکرائی۔

''دیکھو پلیز! فون اب بند مت کرنا... میرے پاس مشکل سے دس پندرہ منٹ ہوں گے شاید... میری بات غور سے سن لو... میں تمہیں اپنے فنانشل معاملات کے بارے میں بتانا چاہ رہا تھا... اسے توجہ سے سن لو...

''دیکھو میری دو انشورنس پالیسیاں ہیں جو تمہارے نام ہیں... اور ان کے کاغذات الماری کے لاکر میں ہیں... مکان بھی میں نے تمہارے نام کر دیا تھا، اس کی ڈیڈ بھی وہیں رکھی ہوئی ہے۔ تیس لاکھ کے سیونگ سرٹیفکیٹس بھی ان کے ساتھ ہوں گے اور...'' وہ نہ جانے اور کیا کہنا چاہ رہا تھا کہ اس نے پھر بات کاٹ دی۔

''کیا ان سب چیزوں کے عوض... تم مجھے مل سکتے ہو؟ میں نے تم سے شادی تمہارے لیے کی تھی... ان چیزوں کے لیے نہیں... دو سال کے اس عرصے میں شاید سب ملا کر ساٹھ ستر دن ہم نے ساتھ گزارے ہوں گے... باقی تمام وقت تم ان چیلنجز سے لڑتے رہے جو تمہیں مجھ سے دور سے دور لے جاتے رہے۔'' اس کے لہجے میں بے مہری تھی۔

''وہ میری مجبوری تھی... میری پیشہ ورانہ زندگی کے تقاضے... میں کیا کرتا؟''

''تمہارے اور بھی ساتھی ہیں... ان کی زندگی میں نے دیکھی ہے۔ وہ تمہاری طرح پاگل نہیں ہیں... ان کی فیملی ان کی صورت کو ترستی نہیں رہتی۔ یہ صرف تم ہی ہو جو ہر کٹھن مہم میں رضاکارانہ طور پر کود پڑتے ہو۔''

''لیکن...''

''کچھ نہیں... اب میں نے بھی صبر کر لیا ہے... کیونکہ کب تک میں تمہاری زندگی کے تحفظ کی دعائیں مانگتی رہوں... کب تک انتظار کی سولی پر لٹکی رہوں... کب تک اس احساس سے لمحہ لمحہ مرتی رہوں کہ پتا نہیں تم اس وقت موت اور زندگی کی کس کشمکش میں گرفتار ہو گے اب میں نے یہ سب سوچنا چھوڑ دیا ہے... ابھی تک تو مجھے تمہاری ہر مہم کے اختتام پر... تم سے ملنے ہاسپٹل جانا پڑتا تھا... جہاں سے تم ہفتہ دس دن میں گھر آتے

ہیں میں جانتی ہوں کہ ایک نہ ایک دن مجھے تم سے ملنے ں نہیں... بلکہ مردہ خانے جانا پڑے گا۔ بس اب اس لمحے لیے اپنے آپ کو تیار کر رہی ہوں... کیونکہ تمہارے ارادے ی لگ رہے ہیں۔'' اس نے اداسی آمیز جھنجلائے..... ہیں جواب دیا اور فون رکھ دیا۔

☆☆☆

اور پھر ایسا ہی ہوا... امتیاز نے جی جان لگا کر ایسے امات کیے کہ شہزاد کے سلسلے میں کسی بھی مرحلے پر کوئی ر اثر انداز نہ ہو... پولیس ریمانڈ سے لے کر عدالتی رروائی تک!

چنانچہ بہت جلد اس کا کورٹ ٹرائل شروع ہو گیا۔ اس جو الزامات عائد کیے گئے، اس نے انہیں ماننے سے قطعاً ر کر دیا لیکن امتیاز کی محنت سے جو ثبوت اور شہادتوں کے و مضبوط گواہ عدالت میں پیش کیے گئے، ان کی موجودگی ں اس کے جرائم کی صحیح شکل عدالت کے سامنے پیش کر .. خصوصاً شاکرہ کی گواہی نے اس کے غبارے سے ساری نکال دی۔

زمین پر ناجائز قبضے اور اس کی غیر قانونی ید و فروخت، اسلحہ اور منشیات کی اسمگلنگ، اغوا برائے ان اور قتل و خون ریزی جیسے الزامات اس پر ثابت ہو گئے دالت کو فیصلہ سنانا کوئی مشکل نہ رہا۔

عمر قید کے علاوہ بھاری جرمانے اور جائداد کی قرقی کی سنائی گئی تھی۔ جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں مزید کئی ل قید بامشقت کا حکم دیا گیا تھا۔

فیصلہ سن کر امتیاز نے سکون کا سانس لیا اور بے ساختہ ں کے منہ سے نکلا۔ ''خس کم جہاں پاک!''

پولیس کی حراست میں شہزادہ اس کے قریب سے زرتے ہوئے رک گیا۔ اس نے امتیاز کو دیکھا تو اس کی خ آنکھیں اور چہرے کا سنگین تاثر بہت بھیانک تھا۔ اس نے سانپ کی سی پھنکار میں کہا۔

''آج وقت میرے ساتھ نہیں تھا لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہے گا... میں جیل میں سڑنے والا نہیں ہوں... یہ لکھ لو... ہاری موت میرے ہاتھوں ہی ہو گی... اور وہ بھی بہت جلد!''

نہ جانے کیوں اس کے لہجے اور اس کے الفاظ نے یاز کو ایک لمحے کے لیے سُن سا کر دیا لیکن دوسرے ہی لمحے سا نے اپنے آپ کو سنبھالا۔

''خواب دیکھتے رہو... جیل میں ساری عمر گزارنا ہے... ایسے خواب صحت اچھی رکھیں گے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ جھٹکے سے مڑ کر پولیس کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

اسے کچھ دوسرے معاملات نمٹانے میں کافی دیر ہو گئی... باہر نکلا تو گہرے سیاہ بادلوں نے آسمان کو ڈھک رکھا تھا اور ان میں رہ رہ کر بجلیاں کوند رہی تھیں... ابتدائی شام رات میں ڈھل گئی تھی۔ کچھ کامیابی کی خوشی... کچھ موسم کی خوب صورتی نے اس کی طبیعت میں جولانی اور سرشاری پیدا کر دی تھی۔ اس نے فون نکالا اور صوفیہ کا نمبر پنچ کیا۔

''جی کوتوال صاحب! کہیے کیسے یاد فرمایا اس ناچیز کو؟'' اس نے چہک کر پوچھا۔

''بس آج موسم بہت اچھا ہے... سب خوش ہیں۔ تو میں نے سوچا کیوں نہ آج اس خوشی میں تمہارے ساتھ ایک لانگ ڈرائیو اور اچھی سی چائے ہو جائے... تو تیار ہو جاؤ... میں دس منٹ میں تمہیں لینے آ رہا ہوں۔'' امتیاز نے جلدی جلدی کہا۔

''ارے ارے سرکار! میں ایک ادارے کی ملازمت کرتی ہوں... جہاں آمد و رفت کے اوقات مخصوص ہیں... وہاں ایسا نہیں ہوتا کہ جب جی چاہے آؤ اور جب جی چاہے اٹھ کر چلے جاؤ... میری چھٹی چھ بجے ہوتی ہے... اور ابھی صرف چار بجے ہیں۔''

''مجھے نہیں معلوم... میرے حساب سے دس منٹ میں تمہیں میرے ساتھ ہونا ہے... بہتر ہے کہ تم نیچے ہی مل جانا... ورنہ اگر میں بارہ منزلہ کی بلندی پر آیا تو میرا دماغ گھوم جائے گا... اور پھر تمہارے آفس کا وہ حشر ہو گا جیسے کراکری کی دکان میں بیل گھس آیا ہو۔'' امتیاز نے صاف دھمکی دی۔

''اچھا... دھمکی...؟ کوتوال صاحب! مانا کہ آپ کوتوالِ شہر ہیں اور سارا شہر آپ کی دھمکیوں سے کانپتا اور لرزتا رہتا ہے لیکن بہ خدا یہ جان لیجیے کہ ہمارے اوپر دھمکیوں کا الٹا اثر ہوتا ہے اور دھمکی دینے والے کو کان پکڑنا پڑتے ہیں۔''

''اوہ نو! اتنی محنت کر کے مشکل سے شہر میں کچھ دھاک جمائی ہے... اور تم نے دو منٹ میں عزت کا کچرا کر کے رکھ دیا... خدا کا واسطہ... کسی کے سامنے ایسی بات نہ کہہ دینا... ورنہ عزتِ سادات بھی چلی جائے گی... خیر، میں نے آدھا راستہ طے کر لیا ہے... تم بھی فوراً نیچے کا سفر شروع کر دو۔'' امتیاز نے چبا چبا کر کہا۔

''او کے باس!'' صوفیہ نے ہنستے ہوئے فون بند کر دیا۔

کچھ ہی دیر میں جب وہ دونوں وہاں سے نکلے تو بادلوں کی گھن گرج میں اور اضافہ ہو چکا تھا۔

''امتیاز! لگتا ہے بہت طوفانی قسم کی بارش آنے والی

ہے... ہم کہیں پھنس نہ جائیں۔" صوفیہ نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو کیا ہوا؟ پھنسے بھی تو کبھی نہ کبھی نکل ہی جائیں گے... میں اس موسم کا عاشق ہوں... تمہیں نہیں پسند...؟" اس نے پوچھا۔

"بہت... بہت زیادہ... مجھے بارش میں بھیگنا بہت اچھا لگتا ہے... اور اگر وہ بارش خوب دھواں دھار اور بادل ایسے ہی گھرے ہوں... تو میرا دل چاہتا ہے کہ کھلی سڑکوں پر دور تک دوڑتی رہوں۔" صوفیہ نے جھک کر ونڈ اسکرین سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو بس... آج ہم ایسی بارش میں... گاڑی میں بیٹھ کر کھلی سڑکوں پر دور تک دوڑیں گے۔" امتیاز نے خوش ہو کر گاڑی کو اگلے گیئر میں ڈالا اور شارع فیصل کے فاصلے سمٹنے لگے۔

تھوڑی دیر میں تیز بارش شروع ہو گئی اور سڑکوں پر پانی بھرنا شروع ہو گیا۔ بارش اتنی تیز ہو گئی کہ ڈرائیونگ مشکل ہو گئی۔ امتیاز نے گاڑی سڑک کے کنارے روک دی اور وہ دونوں گاڑی سے باہر نکل آئے... بارش کی تیز بوچھاروں نے دونوں کو سر سے پاؤں تک بھگو دیا۔ یہ صرف بارش کا پانی نہیں تھا... ایک عجب سرخوشی تھی جس میں وہ دونوں سر سے پاؤں تک بھیگ رہے تھے۔

راستے میں امتیاز نے صوفیہ کو شہزاد کے فیصلے کے متعلق بتا دیا تھا اور اب وہ دونوں ایک نامعلوم سی قید سے آزاد ہونے والے پنچھیوں جیسی خوشی محسوس کر رہے تھے... کافی دیر وہ دونوں اس کھلی سی جگہ پر بارش میں بھیگتے اور ٹہلتے رہے۔ پھر سامنے نظر آنے والے ایک بڑے پیٹرول پمپ کی اسٹاپ شاپ میں گھس گئے... اتفاق سے وہاں گرما گرم چائے بھی دستیاب تھی۔ کچھ اسنیکس اور چائے لے کر وہ اس مختصر سی ٹیبل اور کرسیوں پر آ کر بیٹھ گئے جہاں شیشے کی دیوار کے اس پار موسم اپنی پوری خوب صورتی کے ساتھ جلوہ گر تھا اور بارش ایک مختصر وقت کے لیے ہلکی ہو کر دوبارہ زور پکڑ چکی تھی۔ انہوں نے چائے ختم کر لی تھی اور ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے کہ امتیاز نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کوئی چیز نکالی اور بند مٹھی صوفیہ کے سامنے کر دی۔ "میں یہ ایک چیز بہت دن سے اپنی جیب میں لیے گھوم رہا تھا۔ آج کے دن کے انتظار میں... کیا تم اسے قبول کرنا پسند کرو گی؟" اس نے یہ کہہ کر مٹھی کھول دی... اس کی ہتھیلی پر ایک خوب صورت نازک سی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔

"یہ چیز تو میں بہت دن سے آپ کے پاس دیکھ رہی تھی کوتوال صاحب!" صوفیہ نے کہا تو وہ حیران رہ گیا۔

"کیسے؟ میں نے تو اس سے پہلے تمہیں کبھی نہیں دکھایا؟"

"آپ نے نہیں دکھایا... لیکن پھر بھی مجھے یہ نظر آتی رہی... کبھی آپ کی آنکھوں میں... کبھی چہرے پر... کبھی باتوں میں... کبھی مسکراہٹ میں... اور کبھی کبھی آپ کے ذومعنی جملوں میں... میں منتظر تھی کہ کب آپ یہ باقاعدہ طور پر مجھے دیں گے... تو آج آپ نے فیصلہ کر ہی لیا۔" اس کی مسکراہٹ میں ایک خوب صورت جذبے کی بھرپور جھلک محسوس ہو رہی تھی۔

"اوہ مائی گاڈ! تمہیں سب کچھ پتا تھا... لیکن تم نے کبھی اظہار نہیں کیا... کیوں؟" اس نے پوچھا۔

"اس لیے کہ مجھ پر جس آسیب کا سایہ تھا... کہیں وہ آپ پر حملہ آور نہ ہو جائے۔" صوفیہ نے ہلکی آواز میں کہا۔

"کیا تم مجھے اس قدر کمزور سمجھتی رہی ہو... افسوس... تف ہے تم پر امتیاز علی درانی... ہر جگہ بڑے پھنے خان بنے پھرتے ہو تم... اور جہاں پھنے خانی کا بھرم ہونا چاہیے تھا... وہاں بکری کی اوقات تھی تمہاری... لعنت ہے۔" امتیاز نے اپنا پنجہ اپنے منہ پر رکھ کر لعنت بھیجی تو وہ ہنس پڑی۔

پھر بہت جلد شہزاد باقاعدہ جیل میں پہنچا اور امتیاز اور صوفیہ بے شمار خوشیوں کے جلو میں قید عقد میں آ گئے۔ شادی کے بعد امتیاز کو اندازہ ہوا کہ صوفیہ کے دل میں اس کی محبت کا کتنا بڑا خزانہ چھپا ہوا تھا... اس کا ہر ہر انداز اس کی بے پناہ چاہت کا اظہار تھا... وہ بہت اونچی ہواؤں میں پرواز کر رہا تھا... اسے معلوم ہی نہیں ہوا کہ ایک ماہ کی چھٹیوں کے دن کیسے اتنی جلد گزر گئے۔

"کیا... کیا مطلب؟ تمہاری چھٹیاں ہیں بھئی! تم کیوں جاؤ گے کسی مہم کے لیے؟" صوفیہ نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"نادان لڑکی! تم اپنی نادانی میں ایک بہت غلط ملازمت کرنے والے بندے کے چنگل میں پھنس گئی ہو... جس کی کبھی کوئی چھٹی نہیں ہوتی... یعنی وہ ہمیشہ آن ڈیوٹی رہتا ہے... وہ تو شکر کرو کہ میرے باس نے ازراہ نوازش مجھے پورا ایک مہینا چھٹی کرنے کی عیاشی مرحمت فرما دی تھی... کیونکہ ان کے خیال میں... میرے جیسے بندے کی ایک ہی مرتبہ شادی ہو جائے تو غنیمت ہے، اب ہو گئی ہے... تو تھوڑا وقت دے دیا جائے... سو مائی ڈیئر! آج میری چھٹی کا آخری دن ہے... کل سے نوکری شروع... اس لیے وہ آٹے دال کی لسٹ مجھے پکڑا دو... میں بازار جاؤں تا کہ مجھے بھی آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے۔" امتیاز نے ایک پریشان حال شوہر کی

بھرپور اداکاری کی تو صوفیہ نے اس کے بازو میں زور سے چٹکی لی۔

"آٹے دال کا بھاؤ تو میں تمہیں یہیں بتا دیتی ہوں... بازار جانے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن امتیاز! اب تم چلے جاؤ گے تو میں سارا دن اکیلی کیا کروں گی؟" صوفیہ روہانسی ہو گئی۔

"وہی جو سب عورتیں کرتی ہیں... گھر کی صفائی کرو... کھانا پکاؤ... پھر میرا انتظار کرو۔" امتیاز نے اطمینان سے کہا۔

"لیکن تم تو کبھی کبھی لمبی مہم پر بھی چلے جاتے ہو... کئی کئی دن بعد آتے ہو۔" صوفیہ نے بے چارگی سے کہا۔

"ہاں... یہ تو ہے... اکثر ایسا ہوتا ہے..."

"لیکن میں... تمہارے بغیر... اچھا میں اپنی سروس جاری رکھوں... وقت بھی گزر جائے گا، پیسے بھی آتے رہیں گے۔" صوفیہ نے حل ڈھونڈنے کی کوشش کی۔

"صوفیہ! اگر وقت گزاری کے لیے کام کرنا چاہتی ہو تو ٹھیک ہے... پیسوں کی تمہارے لیے کوئی کمی نہیں ہے... پیسا بہت..." امتیاز نے اطمینان سے کہا۔

"اچھا... آپ کہتے ہیں تو مان لیتے ہیں۔" اس نے ہنستے ہوئے بات ختم کر دی۔

دن خوشیوں کے پنکھ لگائے تیزی سے اڑنے لگے۔ دونوں کی زندگی کے معمولات یکساں رفتار سے چلنے لگے تو صوفیہ کو اندازہ ہوا کہ اس کی زندگی کا زیادہ وقت تو صرف انتظار میں گزر رہا ہے۔ امتیاز کے گھر آنے کا کوئی وقت نہیں تھا۔ کبھی وہ سرِشام آ جاتا اور کبھی رات گئے تک وہ اس کے انتظار میں بھوکی پیاسی جاگتی رہتی۔ رات کے اس پہر اس کی آمد ہوتی جب اس کی بھوک مر چکی ہوتی تھی اور انتظار سے تنگ کر یا تو سو چکی ہوتی یا پھر سونے والی ہوتی۔ یہ چیز اسے کوفت میں مبتلا کر دیتی تھی۔

اس رات بھی دو بجے جب وہ آیا تو وہ ٹی وی کے سامنے صوفے پر بیٹھے بیٹھے سو چکی تھی۔ ٹی وی چل رہا تھا اور وہ ٹیڑھی گردن کیے، کشن بازوؤں میں دبائے سو رہی تھی۔

"گڈ مارننگ سوئٹ ہارٹ! آنکھیں کھولو۔ بستر چھوڑ دو اور منہ دھو لو۔ اتنا سونا ٹھیک نہیں ہے... وہ دیکھو! صبح ہو گئی ہے۔" وہ اس کے بالوں کو چھیڑ کر اسے جگا رہا تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور گھڑی پر نظر ڈالی۔

"رات کے دو بجے کون سی صبح ہوتی ہے کوتوال صاحب؟" اس نے دوبارہ آنکھیں موند لیں۔

"ارے بھئی! سنا نہیں ہے کہ جب آنکھ کھلے، تب ہی سویرا... جلدی اٹھو صوفی! میں بھوک سے فوت ہونے والا ہوں۔" اس نے اس کے ہلکے پھلکے وجود کو بازوؤں میں اٹھا کر نیچے کھڑا کر دیا تو وہ اسے گھورتی ہوئی کچن کی طرف بڑھ گئی۔

کھانے کے دوران امتیاز نے محسوس کیا کہ وہ کچھ چپ چپ سی ہے اور کھانا بھی بے دلی سے کھا رہی ہے۔

"کیا بات ہے؟ کھانا ٹھیک سے نہیں کھا رہی ہو... طبیعت ٹھیک ہے نا؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔"

"تو پھر؟" اس نے پوچھا۔

امتیاز! میں سو جاؤں تو پھر نیند سے اٹھ کر کھانا نہیں کھا سکتی... تمہیں معلوم تو ہے۔" اس کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

"اوہ... آئی ایم سوری! دراصل آج پھر ایک گروہ کو پکڑنے کی مہم آن پڑی تھی۔ ان کے معاملات نمٹاتے نمٹاتے اتنی دیر ہو گئی۔ تم بارہ بجے سے زیادہ میرا انتظار نہ کیا کرو۔ کھانا کھا لیا کرو۔ میری تو نوکری ہی ایسی ہے۔" امتیاز نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم اپنی سروس کے اوقات کو شیڈول کر لو۔ کبھی کبھی کی بات الگ ہے لیکن عموماً تو وقت پر گھر آ جایا کرو۔ ایسے کس طرح چلے گا؟" اس نے سنجیدہ سے لہجے میں کہا تو جلدی جلدی منہ چلاتا امتیاز اسے غور سے دیکھنے لگا۔ اس نے اس کے سنجیدہ لہجے میں چھپی ہلکی سی ناراضی کی جھلک کو محسوس کر لیا۔

"دیکھو میری جان! اگر تم اس قدر پریشان ہو رہی ہو تو میں ایسا کرتا ہوں کہ ایسی فضول نوکری کو ہی لات مار دیتا ہوں۔ اپنی زمینوں کی، دکانوں اور مکانوں کی آمدنی ہی اتنی ہے کہ ہم اور ہمارے ہونے والے بچے بھی آرام سے ساری زندگی بیٹھ کر کھاتے رہیں تو بھی کوئی کمی نہیں آئے گی۔ ٹھیک ہے! دے دوں استعفا کل ہی؟" اس نے مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا تو اس نے بے یقینی سے اسے دیکھا اور گردن جھکا کر کھانے کی پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"او کے بابا! اپنا موڈ ٹھیک کرو۔ میں کل ہی اپنے باس سے گن پوائنٹ پر ایک ہفتے کی چھٹی لیتا ہوں کیونکہ شرافت سے تو وہ دے گا نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ بہ قول اس کے میں ابھی بہت تھوڑے عرصے پہلے پورے ایک ماہ کی چھٹی کی عیاشی کر چکا ہوں۔ وہی جب اپنی شادی ہوئی تھی بھئی!" امتیاز نے رک کر صوفی کی آنکھوں سے جھانکنے والی ہلکی سی خوشی کو دیکھا۔

''گن پوائنٹ پر؟'' صوفیہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ استفسار کیا۔

''ہاں... اس کے بغیر مانے گا نہیں وہ بلکہ میں ایسا کرتا ہوں کہ گن کے بجائے راکٹ لانچر کے راکٹ پر درخواست لٹکا کر باس کو پیش کرتا ہوں۔ کندھے پر راکٹ لانچر ہوگا اور انگلی اس کے ٹریگر پر... باس! میری چھٹی کی درخواست ہے۔ ہاں یا نہ۔ ہاں ہے تو سائن کردو اور اگر نہ ہے تو صرف گردن ہلا دو۔ انگلی کی ایک معمولی حرکت۔ پھر ڈھشم...''

امتیاز نے باقاعدہ اداکاری سے اپنے ساؤنڈ ٹریک کے ساتھ پچویشن پیش کی تو صوفیہ زور سے ہنس پڑی۔

''مائی گڈنیس! چھٹی نہ ملنے پر تم راکٹ فائر کردو گے۔ پھر تیرا کیا بنے گا کالیا؟'' صوفی کا موڈ بحال ہوا تو وہ بھی چہکی۔

''ارے ہمارا کیا ہونا ہے؟ ہم تو بہت پہلے کسی کی تیر نظر کا شکار ہوکر شہید ہو چکے۔'' امتیاز نے زمانے بھر کی مٹھاس لہجے میں بھر کر کہا۔

''اچھا... یہ حادثہ کب ہوا کوتوال صاحب؟'' صوفی نے دونوں ہتھیلیوں پر اپنا چہرہ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''خاتون! یہ کوئی سال بھر پہلے کی بات ہے۔ کچھ ڈاکوؤں نے ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کی اور ہم نے اسے بچانے کی۔ وہ لڑکی ڈاکوؤں کے چنگل سے چھوٹی اور حواس باختگی میں دوڑتی ہوئی آئی اور آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ سے اس خادم کے دل میں اتر گئی... تیر کی طرح! بانہوں میں سما گئی... زنجیر کی طرح! ہم کہاں جانبر ہو سکتے تھے۔ بس اسی لمحے پٹ سے شہید ہوگئے۔'' اس نے مسخرے پن سے کہا تو وہ بھرپور طریقے سے مسکرائی اور یوں وقتی طور پر مشکل کا یہ لمحہ ٹل گیا۔

پھر نہ جانے کیا کیا جتن کر کے وہ ایک ہفتے کی چھٹی لینے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ ان لوگوں نے خوب گھومنے پھرنے اور تفریح کے پروگرام بنائے۔ پہلے دن ہی وہ اسپیڈ بوٹ پر سمندر کی سیر کو نکل گئے۔ کئی گھنٹے سمندر میں گھومتے رہے۔ کراچی کے آس پاس چھوٹے چھوٹے جزیروں کے ساحلوں پر رکتے رکاتے دوپہر کو واپس آئے۔ ساحل پر ہی ایک ریسٹورنٹ سے کھانا کھایا۔

''اب اس بھری دوپہر میں کیا کریں؟ کیا گھر چلیں؟'' صوفیہ نے پوچھا۔

''گھر؟ نو وے... گھر صرف رات کو جائیں گے... صوفی! تم نے پکچر ہاؤس میں کوئی مووی دیکھی ہے؟'' امتیاز نے پوچھا۔

''ہاں... شاید بچپن میں کوئی دیکھی تو تھی... کوئی انگلش مووی تھی۔'' صوفی نے اطمینان سے کولڈ ڈرنک پیتے ہوئے جواب دیا۔

''تو چلو... آج کوئی مووی دیکھتے ہیں۔'' امتیاز نے اٹھتے ہوئے کہا۔

لائن سے بنے ہوئے تین سینما ہالوں میں تین مختلف فلمیں لگی ہوئی تھیں... ایک میں انگلش، ایک میں انڈین اور تیسری کوئی پنجابی فلم تھی۔ انڈین فلم پر تو اتنا رش تھا کہ ٹکٹ ملنے کا سوال ہی نہ تھا۔ امتیاز انگلش مووی والے پکچر ہاؤس کی طرف گیا اور بھیڑ میں کہیں کھو گیا۔ وہ گاڑی میں بیٹھی اس کی واپسی کا انتظار کرتی رہی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ٹکٹ لے کر آ گیا۔

''آجاؤ! میں ٹکٹ لے آیا ہوں...'' اس نے ٹکٹ لہراتے ہوئے کہا تو وہ گاڑی لاک کر کے آ گئی۔ بھیڑ بھاڑ سے بچتے ہوئے وہ پکچر ہاؤس میں داخل ہوئے تو سامنے ہی پنجابی فلم کے بہت سے فوٹو لگے ہوئے تھے۔

''امتیاز! ہم لوگ غلط پکچر ہاؤس میں آ گئے ہیں... یہاں تو پنجابی مووی لگی ہوئی ہے۔'' صوفی نے رکتے ہوئے کہا۔

''نہیں... ہم صحیح پکچر ہاؤس میں آئے ہیں کیونکہ انگلش مووی کے بھی ٹکٹ نہیں ملے تھے اس لیے میں نے یہاں کے ٹکٹ لے لیے۔'' امتیاز اطمینان سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بولا۔

''لیکن امتیاز! مجھے پنجابی بالکل سمجھ میں نہیں آتی... میں کیا کروں گی؟'' صوفیہ نے تیز لہجے میں کہا۔

''وہ تو مجھے بھی سمجھ میں نہیں آتی لیکن ہمیں سمجھنے کی ضرورت کیا ہے... ہمیں پکچر صرف دیکھنا ہے، سمجھنا تھوڑی ہے... آجاؤ۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھا تو وہ بھی ہنستی ہوئی اس کے ساتھ چل دی۔

پنجابی فلم کا مختلف ماحول... جس نے سینما ہال کے ماحول کو بھی بدل دیا تھا، انہوں نے اس سے بھی بھرپور لطف اٹھایا۔ فلم بینوں کی بڑھکیں سیٹیاں اور نعرے بازی میں ان دونوں نے بھی بھرپور حصہ لیا۔ ہیروئن کے غضب کے ٹھمکوں اور اداؤں پر امتیاز نے خوب سیٹیاں بجائیں تو ہیروئن دس دس غنڈوں کی اکیلے پٹائی کرنے پر صوفیہ نے بھی خوب نعرے بازی کی اور تالیاں بجائیں۔ یہ ان دونوں کے لیے ایک نیا تجربہ تھا اس لیے اس قدر لطف آیا کہ فلم ختم ہونے پر وہ خود اپنی حالت پر ہنستے ہوئے باہر نکلے۔

شام ہو چکی تھی۔ ادھر ادھر گھومتے ہوئے انہوں نے

ایک پٹھان کے ہوٹل سے چائے پی اور پھر ارینا کلب آ گئے... باؤلنگ ایلے پر کچھ دیر باؤلنگ کرتے رہے پھر آئس اسکیٹنگ سے لطف اندوز ہوئے۔ کھانے کے بعد باہر نکلے تو بارہ بج رہے تھے۔ ایک بہت شان دار اور تفریح سے بھرپور دن گزارنے کے بعد اب وہ تھک کر گھر واپس آ رہے تھے۔ یہ ان دونوں کی زندگی کا ایک یادگار دن تھا۔

اگلی صبح ناشتے کے بعد وہ دونوں پروگرام بنا رہے تھے کہ آج کیا کیا جائے۔

''آج ڈریم ورلڈ چلتے ہیں۔'' امتیاز نے رائے پیش کی تو صوفیہ نے فوراً او کے کر دیا۔

''ٹھیک ہے... پھر ایسا کرتے ہیں کہ...'' امتیاز ابھی کچھ بول ہی رہا تھا کہ اس کے فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے جیب سے فون نکال کر کان سے لگایا اور ہیلو کہتا ہوا وہاں سے اٹھ کر باہر نکل گیا... صوفیہ سمجھ گئی کہ فون اس کے آفس سے ہے۔ وہ آہستہ آہستہ کسی سے بات کرتا رہا۔ صوفیہ سمجھ نہیں پائی کہ وہ کس سے بات کر رہا ہے اور کیا بات ہے؟ تھوڑی دیر بعد وہ اندر آیا تو کچھ سنجیدہ سا تھا۔

''صوفی! ہم ڈریم ورلڈ کل چلیں گے۔ آج ایسا کرتے ہیں... شام کو نکلیں گے... سی ویو چلیں گے... وہیں کھانا کھائیں گے۔ سمندر کے کنارے ٹہلیں گے... آج فل مون ہے۔ سمندر بہت خوبصورت لگ رہا ہوگا۔''

''اور ابھی... ابھی کیا کرنا ہے؟'' صوفی نے پوچھا۔

''ابھی مجھے ایک بہت ضروری کام سے کہیں جانا ہے... دو تین گھنٹوں میں آجاؤں گا... تم تیار رہنا... او کے؟'' وہ جلدی جلدی کہہ کر تیزی سے اپنے کمرے میں چلا گیا اور دس منٹ میں ہی تیار ہو کر باہر آ گیا۔

''او کے سوئٹ ہارٹ...! بائے... شام کو ملتے ہیں... ٹیک کیئر۔'' وہ ہاتھ ہلاتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا اور صوفیہ کے منہ میں کڑواہٹ سی گھل گئی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ وہ شام کو شاید ہی آئے... شادی کے بعد دس ماہ کے عرصے میں اسے امتیاز کے مزاج اور اس کے معمولات کا بخوبی اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ جس انداز میں تیزی سے اٹھ کر گیا تھا اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی ایمرجنسی آن پڑی ہے اور اسے نمٹانے کے چکر میں وہ شام تو کیا شاید رات کو بھی نہ آئے۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ اگلے کئی روز تک بھی نہ آ پائے۔

صوفیہ کوئی ناسمجھ لڑکی نہیں تھی... وہ اس کی پیشہ ورانہ مصروفیات کو اچھی طرح سمجھتی تھی اور اپنے آپ کو اس حقیقت کو ماننے کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش بھی کرتی رہتی تھی کہ امتیاز کی جاب اس کی ضرورت نہیں بلکہ پیشن ہے اور وہ اس کے بغیر رہ نہیں سکتا۔ کیونکہ وہ دیکھ چکی تھی کہ پیشہ ورانہ امور نمٹانے میں وہ اپنی جان کی بھی پروا نہیں کرتا تھا۔ خطرات کے ہجوم میں دیوانہ وار گھس جاتا تھا۔ یہ سوچے بغیر کہ کسی بھی لمحے کوئی ان دیکھی گولی... گرینیڈ یا بم اس کی کہانی کو ختم کر سکتا ہے۔

یہی بات صوفیہ کو سولی پر لٹکائے رکھتی تھی کہ اب جو گیا ہے... تو خدا کرے وہ خیر خیریت سے واپس آجائے۔ کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ کسی اسپتال سے فون آتا کہ وہ وہاں زخمی پڑا ہے۔ اور وہ پاگلوں کی طرح اسپتال کی طرف دوڑ لگاتی۔ راستے بھر دعائیں مانگتی اور آنسو بہاتی وہ اسپتال پہنچتی تو وہ خاصی ٹوٹی پھوٹی حالت میں نظر آتا۔

اسے اس حال میں دیکھ کر اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتیں اور دل پر چھری سی چل جاتی... لیکن وہ ہمیشہ کی طرح دیدے ہی شوخی اور زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کچھ نہ کچھ بولتا۔

''چلو بھئی پیاری بہنو! اب تمہاری ضرورت نہیں رہی... بلکہ کسی بھی چیز کی ضرورت نہیں رہی۔ اب میری پیاری بیوی آ گئی ہے۔ اب یہ مجھے دیکھ کر صبر کرتی رہے گی اور میں اسے دیکھ کر شکر کرتا رہوں گا... وقت کٹ جائے گا۔''

وہ وہاں موجود نرسوں کو سناتا تو وہ ہنستی ہوئی چلی جاتیں... وہ غصے بھری نظروں سے اسے گھورتی تو وہ زور سے کراہتا۔

''بہت تکلیف ہے... یہاں۔'' وہ صوفی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے دل پر رکھ لیتا۔ وہ غصے میں اسے مکا رسید کرتی اور دونوں ہنس پڑتے۔

☆☆☆

رات کی ویرانی اور اندھیرا آسیب زدگی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ وہ کراچی کے مضافات میں نئی آباد ہونے والی کوئی بستی تھی جو ابھی صرف دور دور اکا دکا مکانوں کے ڈھانچوں پر مشتمل تھی۔ کچھ کھنڈر نما گھروں میں ہلکی سی روشنی بھی ٹمٹما رہی تھی۔ ان کا مطلوبہ مکان مرکزی سڑک سے اتر کر تھوڑا اندر جا کر تھا۔ انہوں نے گاڑی سڑک سے تھوڑا ہٹ کر ایک نوتعمیر شدہ مکان کی آڑ میں چھوڑی اور محتاط طریقے سے مختلف سمتوں میں رہتے ہوئے پیش قدمی کرتے آگے بڑھے۔

مکان مکمل طور پر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اگر اس کے کوئی مکین تھے بھی تو شاید گہری نیند میں ہوں گے یا پھر اندھیرے میں گھات لگائے بیٹھے ہوں گے۔ اسی خطرے کے پیش نظر امتیاز نے اپنے ساتھیوں کو الگ الگ اور پھیل کر مکان کی سمت بڑھنے کی ہدایات دیں اور خود بھی محتاط طریقے

سے آگے بڑھتا ہوا مکان میں داخل ہوا۔ بیرونی گیٹ کو پھلانگ کر وہ سب ہی اندر آگئے اور مختلف سمتوں میں پھیل گئے۔ مکان کی پچھلی جانب جہاں کمروں کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں... پھر دائیں جانب سے اوپر جاتی سیڑھیاں... جہاں سے ایک سپاہی نے اوپر پہنچ کر سب کلیئر ہے کا اشارہ دیا۔ بیرونی جانب سے ہر طرح چیک کر لینے کے بعد انہوں نے اندر جانے کا فیصلہ کیا۔

''غلام رسول! تم چھت اور سیڑھیوں پر چیک رکھو گے... اور ارباز! تمہیں گیٹ اور فرنٹ سائڈ پر دھیان رکھنا ہے۔ بابر پچھلی جانب نظر رکھے گا... اور ہوشیار رہنا... وہ یہاں سے بھاگنے نہ پائے... قابو میں نہ آئے تو ٹانگ میں گولی مار دینا۔''

امتیاز نے اپنے ساتھیوں کو ہدایات دیں اور اندر داخل ہونے کے لیے بڑھا۔ اس کے ساتھی نے دروازے کے مضبوط قفل کو کسی ماسٹر کی سے کھولا اور وہ دبے پاؤں اندر داخل ہو گئے۔

''یہاں تو کوئی نظر نہیں آرہا ہے... ہر کمرے کو دیکھنا پڑے گا۔'' انہوں نے تیزی سے ہر کمرے کو کھنگالنا شروع کیا تو صرف ایک کمرے میں ایک بڑے عمر کے آدمی کو سوتا پایا اور وہیں فرش پر کوئی ملازم نما شخص بھی سو رہا تھا۔

انہوں نے ہر طرف گھوم کر دیکھ لیا۔ پورے گھر میں کوئی ذی روح نظر نہیں آیا تھا۔

''انفارمیشن تو صحیح تھی نا...؟'' امتیاز نے پوچھا۔

''یس سر! ہنڈریڈ پرسنٹ درست تھی۔ ہمارے انفارمر نے اس کی یہاں موجودگی کی اچھی طرح تصدیق کی تھی اور یہ بھی کہ ابھی تک وہ یہاں سے باہر بھی نہیں نکلا ہے۔'' اس کے ساتھی نے وضاحت سے بتایا۔

''تو پھر کہاں چھپا ہوا ہے؟'' وہ بڑبڑاتے ہوئے ایک بار پھر ہر ممکنہ جگہ پر اسے تلاش کرنے لگے۔ پھر آخر کار یہ فیصلہ کیا کہ بوڑھے شخص کو جگا کر اس سے پوچھا جائے۔

اس کے ساتھی نے پہلے ملازم کو بے ہوش کر کے دوسرے کمرے میں لے جا کر ڈال دیا۔ پھر بوڑھے آدمی کو جگانے کی کوشش کی۔ وہ شاید بیمار تھا کیونکہ اس کے بیڈ سائڈ کارنر پر کئی دوائیں رکھی ہوئی تھیں اور غالباً انہی دواؤں کے زیر اثر وہ بہت گہری نیند میں تھا۔ بہ مشکل وہ جاگا تو بھی امتیاز کو سخت مایوسی ہوئی کیونکہ جب وہ بیدار ہوا تو اس کا منہ ٹیڑھا کھلا تھا اور ہاتھ کو جنبش دینے کی کوشش میں وہ بری طرح کپکپا رہا تھا۔ لگتا تھا کہ اس کے بدن کا پورا دایاں حصہ مفلوج اور حرکت کرنے سے قاصر تھا۔

''یہاں تمہارے علاوہ اور کون ہے؟'' امتیاز نے پوچھا تو اس نے بے ساختہ نظریں گھما کر اس جگہ کو دیکھا جہاں اس کا ملازم سویا ہوا تھا۔

''اس ملازم کے علاوہ اور کون ہے... اور کہاں ہے؟'' امتیاز نے دوبارہ سوال کیا تو بوڑھے کا منہ ہلا۔ شاید اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی تھی لیکن کوشش کے باوجود کوئی واضح لفظ سنائی نہیں دیا۔ پھر امتیاز کافی کوششیں کرتا رہا کہ بوڑھا کچھ بتا سکے۔ زبان سے بول کر نہیں تو کسی اشارے کے ذریعے لیکن لگتا تھا کہ بوڑھے کی ذہنی کیفیت بھی کچھ ابنارمل سی ہی تھی۔ وہ مایوس ہو گیا۔

''یار! یہ تو کچھ بتانے کے قابل ہی نہیں ہے... خود ہی تلاش کرنا پڑے گا... تم ذرا اس ملازم کو کھنگالو... کچھ نہ کچھ تو اگلے گا۔ میں یہاں اس کمرے کو اچھی طرح چیک کر کے آتا ہوں۔'' امتیاز نے کہا تو اس کا ساتھی سر ہلا کر کمرے سے باہر نکل گیا اور وہ خود بیڈ کے نیچے جھک کر دیکھنے لگا... وہاں کچھ نظر نہ آیا تو وہ پستول تان کر باتھ روم کے ادھ کھلے دروازے کی طرف بڑھا۔ پھر یک دم نیچے بیٹھتے ہوئے اس نے دروازہ جھٹکے سے پورا کھول دیا... پر وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ اسے کچھ مایوسی ہوئی۔ وہ وہاں کھڑا ایک لمحہ کچھ سوچتا رہا۔ ایک نظر بوڑھے پر ڈالی جو پوری آنکھیں کھولے اسی کو تک رہا تھا۔

پھر اس کی نظر اس دیوار گیر الماری کی طرف گئی جو کمرے کی ایک دیوار سے دوسری دیوار تک بنی ہوئی تھی۔ اس نے پہلا پٹ کھولا تو اس میں مردانہ استعمال کے کچھ گرم کپڑے نظر آئے۔ دوسرا پٹ کھولنے پر کچھ کتابیں اور اسٹیشنری وغیرہ سامنے آئی۔ تیسرا پٹ کھولنے ہی لگا تھا کہ اس میں لگی چابی نیچے گری۔ وہ غیر ارادی طور پر چابی اٹھانے کو جھکا ہی تھا کہ ایک دھماکے کے ساتھ گولی الماری کے پٹ میں آکر لگی اور جہاں کھڑے ہوئے اس کا سر موجود تھا وہاں لکڑی کا کافی بڑا حصہ اڑ گیا اور گولی سوراخ کرتی ہوئی اندر گھس گئی۔

اس نے بچاؤ کی فطری جبلت کے تحت فرش پر لوٹ لگائی اور بیڈ کی آڑ میں ہو گیا کیونکہ وہ دیکھ چکا تھا کہ فائر زدہ بوڑھا لیٹے لیٹے اس پر فائر کر چکا تھا۔ پستول پر اس کی گرفت مضبوط تھی اور آنکھوں میں چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔

''اٹھو! اور میرے گھر سے نکل جاؤ... میرے گھر سے تمہیں کوئی مال و دولت ملنے والا نہیں ہے۔ جاؤ میں تمہیں نکلنے کا موقع دے رہا ہوں۔'' بوڑھے نے نہایت صاف الفاظ اور دبنگ لہجے میں کہا تو امتیاز اس کی اداکاری کی صلاحیتوں کا دل سے قائل ہو گیا۔

''میں یہاں کچھ لوٹنے نہیں آیا ہوں اور میں ڈاکو نہیں... فورسز کا آدمی ہوں۔ کسی کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔ مجھے بتاؤ وہ مجرم کہاں چھپا ہوا ہے؟'' امتیاز نے وہیں لیٹے لیٹے پوچھا۔

''سیاہ لباس میں... ہتھیار لے کر... چوری چھپے کسی کے گھر میں داخل ہونے والا... چور ڈاکو ہی ہو سکتا ہے۔ فورسز کا آدمی ہوتا تو دروازے سے گھنٹی بجا کر آتا۔ میں تمہیں گولی مارنے کا پورا اختیار رکھتا ہوں کیونکہ تم نے ٹریس پاسنگ کی ہے۔ اب اٹھو! اور یہاں سے دفع ہو جاؤ شرافت سے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ گولی نہیں چلاؤں گا۔'' بوڑھے کے لہجے میں گمن گرج تھی۔

''پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارے گھر میں داخل ہونے والا مجرم کہاں چھپا ہوا ہے؟'' امتیاز آڑ سے اس پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔

''یہاں کوئی مجرم نہیں آیا تم سے پہلے۔ میرے گھر میں داخل ہونے والا پہلے مجرم تم ہی ہو۔ اسی لیے تم سے کہہ رہا ہوں کہ نکل...'' بوڑھے نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایک فائر کی آواز آئی۔ دروازے کی جانب سے آنے والی گولی نے بوڑھے کے ہاتھ میں موجود پستول کو ایک جھٹکے سے اٹھا کر دور پرواز کرنے پر مجبور کر دیا۔

امتیاز نے پھرتی سے چھلانگ لگا کر پستول اٹھا لیا... دروازے سے اس کا ساتھی اندر داخل ہوا جس کی پستول کا رخ بوڑھے کی طرف تھا۔ ''واہ! کیا بات ہے... میں آپ کی اداکارانہ صلاحیت کا قائل ہو گیا انکل... کیا زبردست ایکٹنگ کی ہے آپ نے ایک مفلوج بوڑھے کی کہ مجھ جیسا شخص بھی دھوکا کھا گیا۔'' امتیاز نے قریب آکر بوڑھے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''یہ کوئی اداکاری نہیں... انتہائی خوف اور اپنے بچاؤ کے شدید احساس کے تحت انسان کے اعصاب اسی طرح متحرک ہوتے ہیں۔ جس طرح میرے مفلوج اعصاب نے یک دم جھٹکا لیا اور میرے ہاتھ کام کرنے لگے۔ شکر کرو اس اوپر والے کا جس نے جان بچا دی۔''

بوڑھے نے بھی ترکی بہ ترکی جواب اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیا تو امتیاز کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔

''ٹھیک ہے انکل! ویری سوری... مجھے آپ سے اجازت لے کر آپ کے گھر میں داخل ہونا چاہیے تھا۔ دراصل ہمارا ایک مطلوبہ ملزم آپ کے گھر میں چھپا ہوا ہے۔ یہ اطلاعات ملی تھیں ہمیں اور ہم اس کے پیچھے یہاں تک آئے تھے۔'' اس نے تحمل سے کہا۔

''پھر... ملا تمہیں تمہارا مطلوبہ مجرم؟ چھان لیا نا سارا گھر تم نے اور تمہارے ساتھیوں نے۔'' بوڑھے نے الفاظ چباتے ہوئے کہا تو امتیاز نے ٹھنڈی سانس بھری اور اپنے ساتھیوں کو واپسی کا اشارہ کیا۔

''او کے انکل! آپ آرام کریں... ہم جا رہے ہیں۔'' اس نے کہتے ہوئے باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ وہ سب باہر نکلتے چلے گئے کچھ آگے جا کر امتیاز رک گیا۔

''کیا ہوا سر؟'' اس کے ساتھی نے پوچھا۔

''اس بوڑھے کو پتا ہے کہ ہم یہاں سے چلے گئے ہیں... ہو سکتا ہے ہمارے مجرم نے بھی سن لیا ہو... اور اب وہ فوراً یہاں سے نکلنے کی کوشش کرے گا۔ لہٰذا ابھی صحیح وقت ہے کہ ہم اسے باہر نکلتے ہی گھیر لیں۔'' امتیاز نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''لیکن سر! ممکن ہے اس مکان سے ہمیں دیکھا جا رہا ہو۔'' اس کے ساتھی نے اندازہ لگایا۔

''او کے... ہم گاڑی میں بیٹھ جاتے ہیں۔'' امتیاز نے گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا اور دروازہ کھول کر بیٹھا۔ تھوڑا کھسک کر اپنے ساتھی کے لیے جگہ بنائی اور جیسے ہی وہ بیٹھا، وہ دوسرا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ پھر اپنے ساتھی کو بھی اشارہ کیا وہ بھی خاموشی سے باہر نکل آیا... دونوں جھاڑیوں کی آڑ میں چھپ گئے اور اپنے بقیہ دو ساتھیوں کو اشارہ کیا کہ گاڑی لے کر نکل جائیں۔ چنانچہ گاڑی آگے نکل گئی اور اسی وقت امتیاز نے دور اس مکان کی روشنیاں بجھتی ہوئی دیکھیں۔ وہ دونوں ہوشیار ہو گئے۔

امتیاز نے نائٹ ویژن چشمہ آنکھوں پر لگا لیا اور اپنے ساتھی کو آنے کا اشارہ کرتے ہوئے جھکا جھکا جھاڑیوں اور چھوٹے بڑے پتھروں اور ٹیلوں کی آڑ لیتا ہوا مکان کے نزدیک پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔

انہیں مکان کی عقبی سمت کچھ حرکات و سکنات نظر آئیں تو وہ تیزی سے اس طرف پہنچ کر جھاڑیوں کی آڑ میں دبک گئے۔

تھوڑی ہی دیر میں عقبی سمت کا چھوٹا گیٹ آہستگی سے کھلا اور اس میں سے ایک آدمی چوکنا انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا باہر آیا۔ حلیے سے وہ ملک کے شمالی علاقوں کا کوئی باشندہ نظر آتا تھا۔ اس کے پیچھے جو دوسرا آدمی باہر آیا، وہ ان کا مطلوبہ مجرم تھا۔ وہ دونوں باہر آئے اور فوراً ہی ایک گاڑی وہاں آکر رک گئی۔ وہ دونوں دروازہ کھول کر اس میں بیٹھے ہی تھے کہ امتیاز نے یکے بعد دیگرے فائرنگ کر کے گاڑی کے دونوں ٹائر

برسٹ کردیے۔ پھر بھی ڈرائیور نے گاڑی دوڑانے کی کوشش کی تو امتیاز نے نہ صرف گاڑی کے شیشوں کو نشانہ بنا کر ایک چھوٹا برسٹ فائر کیا بلکہ چیخ کر انتباہ بھی کیا کہ اب اگر بھاگنے کی کوشش کی تو وہ براہِ راست نشانہ لے کر انہیں اڑا دے گا۔

''سر پر ہاتھ رکھ کر سب باہر آجاؤ گاڑی سے۔'' اس نے وارننگ دی تو گاڑی تو کھڑی رہی لیکن اس میں سے باہر کوئی نہیں نکلا... امتیاز اپنے نائٹ ویژن چشمے کی مدد سے انہیں شش و پنج کی کیفیت میں صاف دیکھ رہا تھا... اس نے ایک اور فائر گاڑی کے انجن کی طرف کیا تو اس میں سے پیٹرول بہنے لگا۔ اب صرف ایک فائر کی ضرورت تھی۔ گاڑی دھماکے سے آگ کے شعلوں میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ کوئی راستہ نہ پا کر ان تینوں کو گاڑی سے باہر آنا پڑا۔

''اسلحہ پھینک کر سر پر ہاتھ رکھ لو۔'' امتیاز نے وارننگ دی تو وہ تینوں سر پر ہاتھ رکھ کر باہر نکل کر گاڑی سے آگے آ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ گنیں تانیں ان کے نزدیک پہنچ گئے۔

''بہت خوب! تم یہاں چھپے ہوئے ہو... یہ تو ہمیں معلوم تھا لیکن ہم تمہیں ڈھونڈ نہیں پائے۔ غالباً کوئی خفیہ جگہ ہے اس مکان میں... بلال! ان کی تلاشی لو۔'' امتیاز نے اپنے ساتھی کو ہدایت کی تو اس نے تیزی سے ان تینوں کی تلاشی لی۔

''چلو! اب آگے چلو... ہاتھ سر پر ہی رہنا چاہیے۔ ورنہ بلا تکلف کھوپڑی اڑا دوں گا۔'' اس نے انہیں ہدایت دی اور ان کے پیچھے قدم بڑھایا ہی تھا کہ پیچھے سے ٹھنڈا لوہا اس کی گردن سے آلگا۔

''گن پھینک دو۔ ورنہ ہم بھی تکلف نہیں کریں گے... نہ نہ... پیچھے مڑ کر دیکھنے کی زحمت نہ کرنا... ورنہ اڑا دیے جاؤ گے۔''

''یس!... ڈراپ دا گن... اپنے ساتھی کو بھی کہو گن ڈراپ کردے۔'' مجبوراً ان دونوں کو اپنے ہتھیاروں سے محروم ہونا پڑا... ان کا مطلوبہ مجرم ان کے پاس آیا۔

''مجھے لگتا ہے ہمارا تمہارا حساب لمبا چلے گا... دشمنی بھی تو بڑی ہے... میرے لیے بڑا آسان ہے۔ بابا کے ہاتھ سے گن لے کر تمہیں گولی ماردوں اور حساب کتاب ختم کردوں۔ لیکن اس میں مزہ نہیں آئے گا۔ تمہیں زندہ چھوڑ کر جارہا ہوں۔ ہم پھر کہیں نہ کہیں ملیں گے کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ تم میرے پیچھے ضرور آؤ گے... یار زندہ صحبت باقی... مجھے تمہارا انتظار رہے گا۔''

اس نے زہر خند کیا... اسی عرصے میں ایک دوسری گاڑی لے کر کوئی آگیا اور وہ تینوں اس میں بیٹھ کر چلے گئے۔ تب امتیاز نے پیچھے مڑ کر اس شخص کو دیکھا جس نے اسے گن پوائنٹ پر ہینڈز اپ کروایا تھا تو اسے کچھ زیادہ حیرت نہیں ہوئی اسی بوڑھے کو دیکھ کر جسے وہ مکان کے ایک کمرے میں بستر پر مفلوج حالت میں پڑے دیکھ چکا تھا۔

''تو وہ آپ کا بیٹا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''تمہیں کیسے معلوم؟'' بوڑھے نے پوچھا۔

''اس نے آپ کو پاپا کہا تھا۔'' امتیاز نے بتایا تو بوڑھا ہنسنے لگا۔

''ایک بات بتائیے... اس کو آپ نے کہاں چھپایا تھا؟ ہم لوگوں نے ہر جگہ تلاش کرلیا تھا لیکن وہ ہمیں ملا نہیں۔'' امتیاز نے یونہی پوچھا تو وہ بوڑھا زور سے ہنسا۔

''برخوردار! میرے کمرے کی الماری کے دو پٹ تم کھول کر دیکھ چکے تھے۔ اگر تیسرا کھول لیتے تو اس میں تمہیں تہ خانے کا دروازہ نظر آجاتا۔ اسی لیے میں نے گولی چلائی تھی۔ نشانہ تو تمہاری کھوپڑی کا لیا تھا۔ خوش بختی تھی تمہاری کہ چابی تمہارے ہاتھ سے گری اور تم عین اسی وقت جھک گئے اور بچ گئے۔ ورنہ تم مرجاتے اور مجھے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ تم اس وقت میرے نزدیک ایک چور یا ڈاکو سے زیادہ کچھ نہیں تھے... خیر، میرے بیٹے کی خواہش ہے کہ ابھی تم زندہ رہو۔ اس لیے جاؤ، میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔''

بوڑھے نے گن ہلاتے ہوئے اسے جانے کا اشارہ کیا تو امتیاز نے بھی اباؤٹ ٹرن کیا اور واپس اسی طرف چل پڑا جہاں اس کے ساتھی ایک مکان کی آڑ میں گاڑی لیے اس کے منتظر تھے۔

☆☆☆

رات جیسے جیسے بڑھ رہی تھی' اس کی اضطراری کیفیت بھی بڑھتی جارہی تھی۔ دل جیسے بار بار ڈوبنے سا لگتا تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے کھڑی ہو جاتی۔ لیٹنے کی کوشش کرتی تو بستر پر انگارے دہکتے محسوس ہوتے۔ پھر اٹھ کر ٹہلنے لگتی۔ وہ اپنی ان کیفیات کو خود سمجھنے سے قاصر تھی۔

اب نہ جانے کیوں اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ٹیلی فون کی پھر سے گھنٹی بجے اور وہ اس سے بات کرے۔ بار بار اس کی نظریں سائڈ بورڈ پر رکھے ٹیلی فون پر پڑتیں اور اسے بے جان دیکھ کر مایوس ہو جاتیں۔ پتا نہیں کیوں شدت سے اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ دوبارہ ٹیلی فون کرے... اسے خود نہیں معلوم تھا کہ اس سے کیا سننا چاہتی تھی... یا کیا کہنا چاہتی تھی؟

وہ بیڈ پر پیر لٹکائے بیٹھی اپنی انگلیاں مروڑ رہی تھی کہ فون کی اسکرین پر روشنیاں جھلملائیں۔ اس کی خوبصورت جلترنگ رنگ ٹون بجی اور اس کا دل رہا... مسکراتا چہرہ اسکرین پر نمودار ہوا۔

''ہیلو صوفی! دیکھو پلیز فون بند مت کرنا۔ میری بات غور سے سن لو... ہوسکتا ہے پھر مجھے تم سے بات کرنے کا موقع نہ ملے۔ میرے پاس مشکل سے پانچ دس منٹ ہیں۔'' امتیاز کی مضطرب سی آواز اس نے سنی جس میں ہلکی سی اداسی تیر رہی تھی۔

''ہاں کہو... میں سن رہی ہوں۔'' کوشش کے باوجود اس کے لہجے میں چھپی تلخی ظاہر ہو ہی گئی۔

''میں تمہیں بتائے بغیر چپکے سے یہاں اس لیے آگیا تھا کہ تم ناراض نہ ہو... کیونکہ تمہاری ناراضی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔''

''لیکن میں یہ بات جانتی تھی کہ تم شمالی علاقے میں ضرور جاؤ گے کیونکہ میں نے اخبار میں یہ خبر پڑھ لی تھی کہ جیل سے فرار ہونے والا مجرم پچھلے دنوں شمالی علاقے میں دیکھا گیا ہے۔'' اس کے لہجے کی تلخی کچھ اور بڑھ گئی۔

''اوہ! خیر چھوڑو... اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔''

''ہاں... میں جانتی ہوں کہ اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں... بے فکر رہو۔ اب تم کہیں جاؤ، یا نہ جاؤ... میری طرف سے نہ کوئی اعتراض ہوگا اور نہ ہی تمہیں کوئی پریشانی... ٹھیک ہے؟''

''صوفی! کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تم... اس وقت صرف اس وقت اپنی ناراضی ختم کر کے مجھ سے دو چار باتیں کرلو۔ اپنی پرانے لہجے میں... جب ہمارے درمیان صرف محبت تھی۔ کوئی ناراضی نہیں تھی... پلیز!'' امتیاز کی آواز آئی تو اس کا دل عجیب طرح سے دھڑکا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا تو اسے خیال آیا کہ ابھی اگر وہ نرم پڑگئی تو وہ اپنی روش کبھی نہیں بدلے گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ فی الحال وہ ناراضی کا ہی اظہار کرتی رہے۔ اس طرح ممکن ہے وہ اپنا رویہ بدلنے کی کوشش کرے۔ یہ سوچتے ہوئے اس نے فون رکھ دیا۔

☆☆☆

وہ دیوانوں کی طرح اسے ڈھونڈ رہا تھا لیکن اس کا پتا نہیں چل رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ آفس میں بیٹھا ہوا اسی سے متعلق مختلف رپورٹس پڑھ رہا تھا جو اس کے ساتھیوں نے شہزادے کی تلاش میں اپنی کوششوں کے بارے میں بھیجی تھیں۔ اس نے ساری رپورٹس دیکھیں لیکن کسی سے کوئی حوصلہ افزا خبر نہ پا کر وہ سب اٹھا کر ٹیبل پر پٹخ دیں اور دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھا رہا۔ نہ جانے کتنی دیر بیٹھا رہتا کہ فون کی گھنٹی نے اسے چونکا دیا۔

''ہیلو جانو!'' شہزادے کی جانی پہچانی آواز سن کر اس کی کھوپڑی گھوم گئی۔

''تم کہاں جا کر مر گئے ہو بدبخت؟'' اس نے غصے سے پوچھا تو وہ ہنستا چلا گیا۔

''بس تمہاری اسی بے بسی کا مزہ لینے کے لیے ہی تو فون کیا تھا تمہیں... ویسے تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ تم نے وہاں میرے گرد شکنجہ کچھ سخت کردیا تھا اور موسم بھی کچھ گرم ہوگیا تھا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ کچھ عرصے کے لیے وزیرستان کی سیر کرلوں۔ موسم کچھ بہتر ہو جائے تو واپس جاؤں... تو فی الحال تو میں رزمک میں ہوں۔ لیکن تھوڑی دیر بعد وزیرستان میں ہوں گا اور وہاں کافی عرصے تک اپنے میزبانوں کی مہمان نوازی کا لطف اٹھاؤں گا۔ اس لیے میری جان! کارِ جہاں دراز ہے، اب میرا انتظار کر۔''

''ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنا اور انتظار کرنا میرے مسلک میں شامل نہیں ہے۔ میں تمہیں آرام سے بیٹھنے اور مہمان نوازی کے مزے لوٹنے کی مہلت نہیں دوں گا۔ میں آرہا ہوں تمہارے اس گوشۂ عافیت کو تمہارے لیے جہنم بنانے۔ اس لیے میں بھی یہی کہنے والا ہوں کہ۔ اب میرا انتظار کر...'' امتیاز کے لہجے میں شعلوں کی گرمی تھی۔

امتیاز کی بات سن کر وہ اور زور سے ہنسا۔

''اپنے مقتل کی طرف خود چل کر آؤ گے۔ کوتوال صاحب! صوفی یہی کہہ کر پکارتی ہے نا تمہیں؟''

''یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ وہاں کس کا مقتل بننے والا ہے۔ لیکن ایک بات طے ہے کہ اب کی بار تمہارے اور میرے درمیان ہونے والا معرکہ فیصلہ کن ہی ثابت ہوگا۔'' امتیاز نے درشتی سے کہا تو شہزاد کی سنجیدگی سے بھرپور آواز سنائی دی۔

''ٹھیک کہتے ہو۔ میں بھی صوفی کو مزید تمہارے چنگل میں دیکھنا برداشت نہیں کرسکتا۔ اب کی بار واقعی ہم ایک فیصلہ کن جنگ لڑیں گے۔ یا تو تم نہیں... یا میں نہیں... روز روز کے چوہے بلی والے کھیل سے میں بھی تنگ آچکا ہوں۔ آجاؤ کھلے میدانِ جنگ میں... اپنی پوری طاقت کے ساتھ۔ میں بھی اپنے بھرپور وسائل کے ساتھ تمہارے مقابلے کے لیے اتروں گا اور صاف بتا دیتا ہوں کہ اگر آگئے میرے قابو میں تو اب کی بار موقع نہیں دوں گا۔ سیدھا اوپر... کھوپڑی اڑا دوں گا ایک لمحہ انتظار کیے بغیر۔''

''سیم ہیئر... میں قانون کا محافظ ہوں۔ یہی سوچ کر میں نے تمہیں سزا دلوانے کے لیے قانون کے حوالے کیا تھا لیکن اب میں بھی یہ غلطی نہیں کروں گا کیونکہ تمہارے بقیہ جرائم کی سزا تو قانون ہی دے سکتا ہے۔ لیکن میری بیوی پر بری نظر رکھنے والے کو صرف میں سزا دینے میں حق بجانب ہوں گا۔ لہٰذا میں بھی تمہارے ساتھ کوئی رعایت کرنے والا نہیں ہوں۔'' امتیاز نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

”دیکھیں گے… وقت بتائے گا کہ ہم میں سے کس کو زندگی… اور کس کو موت ملنے والی ہے۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔“ اس نے کہا۔

”میں آرہا ہوں…“ امتیاز نے جواب دیا اور جلتے ہوئے ذہن سے اسی وقت شمالی علاقوں کی طرف نکل جانے کا فیصلہ کرلیا۔

اس نے جلدی جلدی اپنے چند قابلِ اعتماد ساتھیوں کی میٹنگ بلائی اور ان کے سامنے یہ مسئلہ رکھا۔

”سر! اس کے لیے آپ کو خود وہاں جانے کی کیا ضرورت ہے؟ ہم وہاں کے پولیٹیکل ایجنٹ سے بات کرتے ہیں۔ وہ خاصہ دار فورس کے ذریعے اسے پکڑوا کر ہمارے حوالے کردے گا۔“ اس کے ایک ساتھی بلال نے مشورہ دیا۔

”تم جانتے تو ہو۔ وہاں کے پولیٹیکل ایجنٹ اور اس کے اسٹاف کے لوگ اب اتنے قابلِ اعتماد نہیں رہے کہ ہم ان پر بھروسا کر کے یہ ٹاسک ان کے حوالے کردیں۔ ان میں سے کئی مقامی شرپسندوں سے ملے ہوئے ہیں… یا پھر ان کی ہمدردیاں ان کے ساتھ ہیں۔ لہٰذا اسے اطلاع مل جائے گی اور وہ وہاں سے بھاگ کر کہیں اور روپوش ہوجائے گا۔ فی الحال میں اس کا پتا کھونا نہیں چاہتا۔ میں خود اسے گردن سے پکڑ کر یہاں لانا چاہتا ہوں۔“ امتیاز نے اس کی صلاح کو رد کردیا۔

”سر! وہاں کے حالات کے تحت کام کرنے میں خاصی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا ہمیں… بلکہ شاید ان علاقوں میں سفر کرنا بھی ہمارے لیے ممکن نہ رہے کیونکہ وہاں ٹھیک ٹھاک مار دھاڑ چل رہی ہے، اغوا وغیرہ کی وارداتیں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ اس لیے سر! بہت سوچ سمجھ کر پلان کرنا پڑے گا یہ ٹاسک۔“ اس کے دوسرے ساتھی نے بہت سے حقائق بیان کرنے کے بعد اسے حالات کی سنگینی کا احساس دلانے کی کوشش کی۔

”سر! آپ کو تو معلوم ہے کہ وہ لوگ اغوا کنندگان سے بھاری بھاری تاوان مانگتے ہیں۔ پیسا مل جائے تو چھوڑ دیتے ہیں۔ نہ ملے تو مار دیتے ہیں۔ تو سر! اگر ہم لوگ ان کے ہتھے چڑھ گئے تو ہمارے بدلے تاوان کون دے گا؟ ہمارے تو گھروں سے بھی کوئی ادائیگی نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ اتنے باحیثیت ہیں ہی نہیں۔ ہاں شاید آپ کے گھر والے بھاری بھرکم ادائیگی کر کے آپ کو چھڑوالیں۔ لیکن ہم لوگوں کے تو صرف مرنے کی خبر ہمارے محکمے کو مل جائے گی… اور بس۔“ تیسرے ساتھی کے خیالات سن کر امتیاز کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔

”او کے… او کے… یہ میری اکیلے کی جنگ ہے۔ میں تم لوگوں کو کسی خطرے میں نہیں ڈالوں گا۔ میں اکیلا ہی جارہا ہوں۔ وہاں پہنچ کر وہاں کی مقامی پولیس اور فورسز سے مدد طلب کرلوں گا۔ آپ لوگ جاسکتے ہیں۔ میٹنگ از اوور۔“

امتیاز نے بہ مشکل اپنے غصے پر قابو پاکر اپنے ساتھیوں کو رخصت کرنے کا اشارہ کیا۔

”سوری سر! آپ شاید ناراض ہوگئے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ آپ کی اکیلے کی جنگ نہیں ہے۔ ہم سب کی ذمّے داری ہے کہ ایک مفرور مجرم کو پکڑ کر قانون کے حوالے کرنے کی پوری پوری کوشش کریں لیکن زمینی حقائق پر نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ ان حالات میں وہاں جا کر کام کرنا سراسر خودکشی ہے… اور ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے پیچھے رونے والوں کی ایک لمبی قطار ہے… اور ہم یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمارے مرنے کے بعد کوئی انہیں پوچھنے والا بھی نہیں ہوگا۔ صرف ایک چھوٹی سی تقریب میں چند تعریفی کلمات اور چند ہزار کی ایک چھوٹی سی رقم ہمارے بیوی بچوں کو دے دی جائے گی۔ اور بس…“ ساتھی کے لہجے میں آخر میں تلخی سی اتر آئی۔

”اٹس او کے! میں تم لوگوں کو خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ شاید تم بھی اپنی جگہ ٹھیک ہی سوچتے اور کہتے ہو۔ میں وہاں کی مقامی پولیس اور فورسز سے مدد لے لوں گا۔ یہ زیادہ بہتر ہوگا۔ تم لوگ جاسکتے ہو۔“ امتیاز نے سنجیدگی سے کہا۔

”نہیں سر! یہ ہماری پیشہ ورانہ ذمّے داری ہے۔ ہم آپ کو تنہا نہیں چھوڑ سکتے۔ آپ اگر جائیں گے تو ہمیں ہر حال میں آپ کا ساتھ دینا پڑے گا۔ آپ بتائیے۔ کب تک روانہ ہونے کا ارادہ ہے؟ ہم تیار ہو کر آجائیں گے۔“ اس کے ساتھی بلال نے کہا۔

”اچھا… دیکھتے ہیں۔ دو چار دن میں تیاریاں مکمل کر کے نکلتے ہیں… آپ لوگ اپنی تیاری رکھیں۔ میں آپ کو کال کر کے بتادوں گا کہ کب نکلنا ہے۔“ امتیاز نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

پھر اس کے ساتھی انتظار کرتے ہی رہ گئے اور امتیاز کب اور کیسے گیا، انہیں معلوم ہی نہیں ہوسکا۔ اور نہ ہی ان کا اس سے فون پر رابطہ ہوسکا۔ وہ بالکل خاموشی سے نکل گیا تھا۔ اس نے صوفیہ کو بھی خبر نہیں دی۔ بس چپ چاپ نکل گیا۔ اس لیے کہ وہ جانتا تھا کہ اگر گھر گیا اور صوفیہ کے سامنے واپس جانے کو نکلا تو اس کی ناراضی اس کے ارادوں کو کمزور کردے گی۔ اس لیے وہ آفس سے گھر نہیں آیا۔ جاتے جاتے اپنے ماتحت سے کہہ گیا کہ اگر گھر سے کوئی فون آئے تو کہہ دینا کہ کسی ایمرجنسی میں گئے ہیں۔ دو چار دن بعد آجائیں گے۔

وہاں سے وہ پشاور پہنچا اور اپنے ہم پیشہ افراد سے ملاقاتیں کرتا رہا۔ ایک مفرور اور خطرناک مجرم کو پکڑنے کے لیے مناسب سی لائن آف ایکشن کا انتخاب کرنا تھا۔ پھر ایک مختصر سی ٹیم ترتیب دی گئی جس میں چھ افراد شامل تھے۔ ان میں سے دو ایسے تھے جو آزاد قبائلی علاقوں سے بہت اچھی طرح واقف تھے۔ ایک مواصلاتی رابطوں کا ماہر اور باقی اپنے اپنے پیشوں کے ماہر اور خطرناک فائٹر تھے۔ امتیاز بھی انہی میں سے ایک تھا۔

سب سے پہلے تو یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ وہ مجرم ہے کہاں… دو دنوں میں ہی معلوم ہوگیا کہ اس حلیے کا شخص رزمک میں دیکھا گیا ہے۔ لہٰذا انہوں نے رزمک سے اپنی تلاشی کی ابتدا کرنے کی پلاننگ کی اور اگلے روز ہی رزمک پہنچ گئے۔ لیکن بہت جلد انہیں معلوم ہوگیا کہ وہ مجرم رزمک سے نکل چکا ہے۔

امتیاز کو یاد تھا کہ اس نے جب فون کیا تھا تو کہا تھا کہ وہ وزیرستان کی طرف جارہا ہے۔ تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اس وقت وزیرستان میں ہی ہوسکتا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے ساتھیوں سمیت وزیرستان کی طرف کوچ کیا۔

دوپہر کا وقت تھا، سورج سر پر تھا اور اس بلند پہاڑی علاقے میں بھی دھوپ کی تمازت محسوس ہورہی تھی۔ وہ رزمک سے نکل کر مسلسل سفر میں تھے۔ وہ صوفیہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

اس نے پہلے وارننگ دے دی تھی کہ اب اگر وہ اس طرح اپنی جان سے کھیلنے کے لیے نکلا تو یہ آخری موقع ہوگا۔

’ہمیشہ ایسا ہی کہتی ہے… لیکن اگر میں تھوڑا سا بھی زخمی ہوجاؤں تو پاگلوں کی طرح روتی اور دوڑتی ہوئی آجاتی ہے اور پھر اسے ٹھیک دیکھ کر جی بھر کر کھری کھری سناتی ہے۔‘

سوچتے سوچتے اس کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ ابھری۔ گاڑی کے انجن کی گھر گھر کے ساتھ اس کے خیالات روانی سے آگے بڑھ رہے تھے کہ اچانک گاڑی کے بریک لگنے سے اسے زوردار جھٹکا لگا۔ وہ اپنے حال میں واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ نیم پختہ پہاڑی سڑک کے بیچ میں تین بڑے بڑے پتھر اس طرح ڈالے گئے تھے کہ راستہ بند ہوگیا تھا۔

”سب لوگ نیچے جھک جاؤ۔ ابھی کہیں سے فائر آنے والا ہے۔ میں واپس موڑتا ہوں گاڑی۔“ ڈرائیور نے بریک لگاتے ہی چلا کر بقیہ لوگوں کو ہدایات دیں اور گاڑی کو تیزی سے موڑنے کی کوشش کی تاکہ واپس جاسکے لیکن جگہ تنگ ہونے کے سبب یہ ممکن نہ ہوسکا اور اس عرصے میں ٹیلوں، جھاڑیوں اور بڑے پتھروں نے لوگ اگلنا شروع کردیے۔

وحشت ناک وضع قطع والے یہ لوگ جدید ترین اسلحے سے لیس تھے۔ فالتو ایمونیشن ان کے کاندھوں پر سجا ہوا تھا۔ ہتھیاروں کا رخ انہی کی جانب تھا۔ وہ کچھ کہے بغیر آگے بڑھ رہے تھے اور امتیاز اور اس کے ساتھیوں نے سمجھ لیا تھا کہ ان کی اتنی بڑی تعداد کے سامنے ان چھ لوگوں کی نفری کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ وہ اگر مقابلہ کرنے کی کوشش کرتے تو یہ صریحاً خودکشی ہوتی۔ چنانچہ وہ سب چپ چاپ گاڑی میں بیٹھے رہے۔ وہ آئے اور انہیں نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ ہتھیار لے لیے گئے اور انہیں ایک ٹرک میں بٹھا کر نامعلوم منزلوں کی طرف روانہ ہوگئے۔

دو ڈھائی گھنٹوں میں وہ ایسے پہاڑی حصے میں پہنچ گئے جہاں جگہ جگہ غار اور بڑی بڑی دراڑیں تھیں۔ وہ اسی جگہ اتر کر پیدل سفر کرتے ہوئے دراڑوں سے گزرتے ہوئے ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں پتھروں سے بنی ایک کچی چار دیواری تھی اور اس چار دیواری کے اندر کچھ کمرے بنے ہوئے تھے۔ ان سب کو ایک کمرے میں لے جا کر بند کردیا گیا۔

انہوں نے تلاشی لے کر ان کے ہتھیار تو لے لیے تھے لیکن پنڈلی پر بنی ایک خفیہ جیب میں رکھا ہوا موبائل فون ان کی دست برد سے محفوظ رہا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی وہ لوگ دروازہ باہر سے بند کر کے گئے، امتیاز نے جلدی سے موبائل نکالا اور سب سے پہلے اپنے محکمے کو اس واردات کی اطلاع دی۔ پھر مقامی خاصہ دار کو فون کر کے حالات بتائے اور مدد کی درخواست کی۔ انہوں نے تعاون کی بھرپور یقین دہانی کرائی۔ ان سب کو فون کر کے اس نے دوبارہ اسے چھپالیا۔

دوپہر سے شام اور پھر رات ہوگئی تو ایک شخص تندور کی موٹی موٹی روٹیاں اور ایک بڑا کٹورا بھر کر گوشت کا سالن انہیں دے گیا… ان لوگوں نے کھانا کھایا اور کھردرے فرش پر لیٹ گئے۔ آنے والے وقت کی سنگینیوں کے بارے میں سوچتے سوچتے انہیں نیند آہی گئی۔

اگلا دن بھی اسی طرح گزر گیا۔ تیسری رات کو اچانک چند لوگ اس کمرے میں داخل ہوئے اور امتیاز کو جگا کر اسے دھکے دیتے ہوئے کمرے سے باہر لے آئے۔

”تم لوگ مجھے کہاں لے جارہے ہو؟“ امتیاز نے ایک لمحے کو رکتے ہوئے پوچھا۔

”تمہارا تاوان جس نے بھرا ہے، وہ کل کسی وقت آئے گا۔ تمہیں اس کے حوالے کرنا ہے۔“ ان میں سے ایک نے جواب دیا۔

”کس نے بھرا ہے میرا تاوان؟“ امتیاز نے پھر پوچھا۔

”زیادہ بک بک نہیں کرو۔ کل آجائے گا تو پتا چل جائے گا۔“ وہ پھر اسے دھکا دیتے ہوئے آگے لے گئے اور

ایک دوسری کوٹھری میں بند کر دیا۔ امتیاز سوچتا ہی رہ گیا کہ اس کا تاوان کس نے بھرا ہے؟

''صوفیہ؟ شاید صوفیہ سے ان لوگوں نے رابطہ کیا ہو۔'' اس نے سوچا لیکن اسے یہ ممکنات میں سے نہیں لگا۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر وقت کا انتظار کرنے پر مجبور ہو گیا۔

اگلی صبح اس کے لیے بڑی قیامت خیز تھی۔ جو شخص اس کے لیے ناشتا لے کر آیا وہ کچھ خوش مزاج اور دوستانہ مزاج رکھنے والا تھا۔ وہ ناشتے کے برتن واپس لے جانے کے انتظار میں وہیں بیٹھ گیا تھا۔ وہ امتیاز سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ کچھ ہنستا مسکراتا بھی رہا جو امتیاز کو بڑا عجیب لگا کیونکہ اتنے دن میں اس نے ان لوگوں میں سے کسی کو ہنستے تو کیا مسکراتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ درشت مزاج اور خوں خوار چہروں والے لوگ تھے۔ امتیاز نے باتوں باتوں میں اس سے پوچھا۔

''مجھے اپنے سب ساتھیوں سے الگ کیوں رکھا گیا ہے... تمہیں کچھ معلوم ہے اس بارے میں؟''

''ہاں... تمہارے ساتھیوں کے لیے کسی نے تاوان نہیں دیا ہے ابھی تک۔ تمہارے لیے ایک آدمی تاوان کی رقم لے کر آج یہاں پہنچ رہا ہے۔ اس سے رقم لے کر تمہیں اس کے حوالے کر دیا جائے گا۔'' اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''نام معلوم ہے تمہیں اس آدمی کا... جو رقم لے کر آ رہا ہے؟'' امتیاز نے بھی سرسری انداز میں پوچھا۔

''ہاں، کمانڈر اس آدمی کو شہزادہ کہہ کر بات کر رہا تھا۔'' اس بات نے امتیاز کے دماغ کو بھک سے اڑا دیا۔

''کیا... شہزادہ؟'' اس نے بوکھلا کر پوچھا۔

''ہاں... یہی نام لے رہا تھا کمانڈر۔'' اس آدمی نے برتن سمیٹتے ہوئے جواب دیا اور باہر نکل گیا۔

امتیاز کے دل کو تو جیسے دھچکے سے لگ گئے۔

'یہ کیا ہوا؟ میں جس کو شکار کرنے آ رہا تھا، سیدھا آ کر اسی کے چنگل میں پھنس گیا۔ اوہ مائی گاڈ! اب تو سب کچھ ختم ہو گیا۔ اس نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ مجھے نہیں چھوڑے گا۔ میری کھوپڑی اڑا دے گا۔'

پھر اسے صوفیہ کا خیال آیا۔ 'وہ نہ جانے کیا کرے گی زندگی کس طرح گزارے گی۔ اسے کم از کم اتنا تو بتا دینا چاہیے کہ وہ مالی طور پر اسے اتنا مضبوط بنا چکا ہے کہ وہ ساری زندگی آرام سے گزار سکتی ہے۔ نہ کسی کی محتاج ہو گی اور نہ مجبور۔ نہ بتایا تو ممکن ہے لاعلمی کے سبب بہت سے اثاثے ضائع ہو جائیں۔' یہ سوچتے ہوئے اس نے بند دروازے کی طرف دیکھا اور پنڈلی پر خفیہ جیب میں چھپایا ہوا سیل فون باہر نکالا۔ نمبر پنچ کرتے ہوئے اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ وہ بہت سخت ناراض ہو گی اور ممکن ہے فون اٹینڈ ہی نہ کرے۔ لیکن پھر بھی وہ کوشش کر لینا چاہتا تھا۔

رنگ جا رہی تھی لیکن وہ اٹھا نہیں رہی تھی۔ اسے بھی یہی توقع تھی لیکن پھر بھی وہ آخری حد تک کوشش کرنا چاہتا تھا۔ اس میں کہیں اس کی اس چھوٹی سی خواہش کا بھی دخل تھا کہ وہ آخری وقت اس کی آواز سننا چاہتا تھا۔

''پک اپ دا فون... پلیز پک اپ دا فون۔'' وہ بے چینی سے بڑبڑا رہا تھا کہ اسے کلک کی آواز سنائی دی اور رنگ بند ہو گئی۔ اس نے فون بند کر دیا تھا۔ اسے اسی بات کی توقع تھی لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ بار بار نمبر ملاتا رہا اور کئی بار مسلسل کوششوں کے بعد آخر کار اس نے فون اٹھا لیا۔

''ہیلو صوفی! دیکھو میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ میں تمہیں بہت کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ پلیز! میری بات غور سے سنو۔''

پھر وہ اپنے اثاثوں کی تفصیل اسے بتاتا رہا جس کے اختتام پر اسے صوفی کا نہایت ٹھنڈے لہجے میں دیا ہوا جواب تڑپا گیا۔ اس نے کہا تھا۔

''مجھے یہ سب کچھ کیوں بتا رہے ہو... مجھے چیزیں نہیں، تم چاہیے ہو... صرف تم۔'' امتیاز کے دل پر چوٹ پڑی تھی۔ عجب مشکل میں تھا۔ اسے بتا نہیں سکتا تھا کہ اب وہ بس چند لمحوں کا مہمان ہے اس دنیا میں۔ اگر بتا دیتا تو شاید وہ چند ہی لمحوں میں تڑپ کر مر جاتی مگر اس کی بات سننے کے لیے راضی نہیں تھی۔

صوفی نے فون بند کر دیا تھا۔ اس نے دوبارہ اس کا نمبر ملایا جسے حسب توقع اس نے بہت سی کوششوں کے بعد اٹینڈ کیا اور امتیاز نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح اس کی ناراضی دور کر کے اسے منا کر ایک دو اچھی اچھی باتیں اس کے منہ سے سن سکے لیکن وہ تو واقعی بہت سخت ناراض ہو چکی تھی۔ جب ہی تو اس نے کہا تھا۔

''جب بھی تم جاتے تھے تو تمہاری واپسی کی اطلاع مجھے کسی اسپتال سے ملتی تھی لیکن اب مجھے یقین ہے کہ تمہیں ڈھونڈنے اور شناخت کرنے کے لیے کسی مردہ خانے جانا پڑے گا۔'' اور یہ کہہ کر وہ رو پڑی تھی۔

امتیاز اسی کشمکش و پیچ میں بار بار اسے فون کر رہا تھا کہ کسی طرح اسے منا سکے اور جاتے جاتے زندگی کی آخری خوشی گوار یا دکو اپنے ساتھ لے جا سکے۔ وہ اسی میں مصروف تھا کہ دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ وہ گھبرا کر کھڑا ہوا تو فون اس کے ہاتھ سے گر کر پانی کے برتن کے پیچھے چلا گیا۔ وہ مڑا تو دروازے کے باہر اسے شہزاد کا نفرت انگیز چہرہ نظر آیا جس پر بڑی زہریلی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

''آؤ کوتوال صاحب! بڑی مشکلوں سے ہاتھ آئے ہو۔ میں نے کہا تھا نا کہ اس دفعہ ہاتھ آئے تو بچ نہیں سکو گے۔ تو بس... آ گیا ہے تمہارا آخری وقت۔ جانتے ہو کتنا بھاری تاوان دیا ہے میں نے تمہیں حاصل کرنے کے لیے۔ پانچ کروڑ... پر پاپا نے کہا جس مگرمچھ نے تمہیں دانتوں میں دبوچ رکھا ہے اسے ٹھکانے لگانے کے لیے پانچ کروڑ کچھ بھی نہیں۔ انہوں نے فوراً بھجوا دیے۔ اب تم میرا شکار ہو۔ میں نے کہا تھا نا کھوپڑی اڑا دوں گا۔ تو چلو... مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' شہزاد نے زہر میں بجھے الفاظ کہے۔ پیچھے سے کسی نے دھکا دیا تو وہ کئی قدم بڑھا کر عین شہزاد کے سامنے رک گیا۔ کچھ دیر دونوں آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک دوسرے کو کینہ توز نظروں سے دیکھتے رہے۔ پھر شہزاد ہی اس سے مخاطب ہوا۔

''مقتل کی طرف جانے سے پہلے اگر کوئی آخری خواہش ہے تو بتا دو کوتوال صاحب!'' اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا تو امتیاز نے فوراً ہی سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں... ہے تو ایک آخری خواہش۔'' وہ بولے سے بولا۔

''کیا؟'' شہزاد نے پوچھا۔

یہ کہہ کر امتیاز نے پوری قوت سے شہزاد کے منہ پر ایسا زناٹے دار تھپڑ رسید کیا کہ وہ تھپڑ کی طاقت سے گھومتا ہوا زمین پر گرا اور لڑھکتا ہوا چند قدم آگے ڈھیر ہو گیا۔ وہاں ایک شور مچ گیا۔ پیچھے سے کسی نے امتیاز کو کسی گن کے بٹ سے مارا اور اسے دھکا دے کر زمین پر گرا دیا۔

شہزاد کو کسی نے سہارا دے کر کھڑا کیا تو وہ سر جھٹکتا ہوا اپنے آپ کو سنبھالتا رہا۔ زمین پر گرے ہوئے امتیاز کو کچھ لوگ ٹھوکروں سے مار رہے تھے کہ شہزاد نے انہیں اشارے سے روکا اور اسے کھڑا کرنے کا اشارہ کیا۔ انہی لوگوں نے پیچھے سے اس کا کالر پکڑ کر ایک جھٹکے سے کھڑا کر دیا۔ پہلے میرا ارادہ تھا کہ میں تمہیں اپنے ہاتھ سے گولی ماروں لیکن مجھے تھپڑ مار کر تم نے اپنی سزا میں اضافہ کر لیا ہے۔ میں تمہیں ان لوگوں کے حوالے کروں گا جو اپنے شکار کو بے رحمی سے مارتے ہیں۔ تمہاری گردن کاٹنے کی ویڈیو میں خود شوٹ کروں گا اور جانتے ہو یہ ویڈیو سب سے پہلے میں کس کو بھیجوں گا؟''

اس نے سوال کیا اور جواب نہ ملنے پر وہ زور سے حلق پھاڑ کر ہنسا۔

''تم جان ہی گئے ہو گے... صوفیہ کو۔'' امتیاز اس وقت کا تصور کر کے لرز گیا جب ایسی کوئی ویڈیو صوفی کی نظروں سے گزرے گی۔ ''اگر تم ایسا کرو گے تو بہت نقصان میں رہو گے۔ میں صوفی کو بتا چکا ہوں کہ میں تمہاری قید میں ہوں اور میری موت کے ذمے دار تم ہو گے۔ ایسی ویڈیو دیکھ کر وہ سمجھ جائے گی کہ یہ تمہارے کرتوت ہیں وہ زندگی بھر تم سے نفرت ہی کرتی رہے گی۔ تمہاری شکل دیکھ کر تم پر تھوکتی رہے گی۔'' امتیاز نے تلخ لہجے میں کہا تو شہزاد نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم نے اسے کچھ بھی بتایا ہے۔ یہ مجھے بلف کرنے کی ایک ناکام کوشش ہے جو کبھی کامیاب نہ ہو پائے گی۔ چلو اپنے انجام کی طرف۔'' شہزاد نے لوگوں کو اشارہ کیا تو وہ اسے دھکیلتے ہوئے ایک گوشے کی جانب لے گئے جہاں اسٹینڈ پر ایک کیمرا لگا ہوا تھا۔ چاروں طرف کچھ لوگ کھڑے ہوئے تھے۔

امتیاز وہاں پہنچا تو اسے دبوچ کر زمین پر گرا دیا گیا۔ کیمرے کی لائٹس آن ہوئیں اور آخری منظر جو امتیاز نے دیکھا وہ یہ تھا کہ ایک نوعمر لڑکا ہاتھ میں چمکتا ہوا خنجر اور آنکھوں میں وحشت لیے اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس نے بھینچ کر آنکھیں بند کر لیں اور کلمۂ شہادت کا ورد کرنے لگا۔

☆☆☆

اس نے فون بند تو کر دیا تھا لیکن اس کے کانوں میں امتیاز کی بے چین آواز گونج رہی تھی جس طرح اس نے کہا تھا... ''ایک بار... صرف ایک بار۔ مجھ سے اس پرانے لہجے میں بات کر لو۔ جب ہمارے درمیان محبت تھی۔''

جانے اس کے ٹوٹے ہوئے لہجے میں ایسا کیا تھا کہ اس کا دل تڑپ اٹھا تھا۔ اس نے اس وقت تو ناراضی کے اظہار کے لیے فون بند کر دیا تھا لیکن اب اس کی بے قراری مارے ڈال رہی تھی۔ وہ فون پر نظریں جمائے منتظر تھی کہ کب اس میں زندگی پیدا ہو۔ گھنٹی بجے، امتیاز کا شرارت سے مسکراتا چہرہ اسکرین پر نمودار ہو اور وہ لپک کر فون اٹھائے اور اس سے کہے۔

''میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ میں بہت بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ جلدی آ جاؤ۔''

لیکن فون خاموش تھا پھر اس سے صبر نہیں ہوا۔ اس نے لپک کر فون اٹھایا اور امتیاز کا نمبر ملایا۔ گھنٹی بجتی رہی، بجتی رہی، بجتی رہی اور بجتی چلی گئی۔

دوسرا رنگ

تماشائے

سلیم فاروقی

ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان ایک لمبے عرصے کے لیے آزمائش کی بھول بھلیوں میں بھٹک جاتا ہے ...... وہ جس بھی راستے پر سفر کرتا ہے اس کے آخر میں ایک موڑ ضرور ایسا پڑتا ہے ...... جو زندگی کو واپس اسی مقام پر لے جاتا ہے جہاں سے اس نے اپنے سفر کی ابتدا کی ہوتی ہے۔ اس کشمکش سفر میں اپنوں کی بے اعتنائی و جدائی کے رنگ اور انتظار کی کٹھن گھڑیاں قدموں کو لڑکھڑاتی ضرور ہیں ... مگر سچائی اور جذبۂ صادق اگر ساتھ ہو تو منزل مل ہی جاتی ہے ...... اسی تناظر میں سفر کرتا آزمائش کا سلسلہ در سلسلہ۔

سلیم فاروقی کے قلم کا شاہکار سرورق رنگ آپ کے ذوقِ طبع کی نذر

میں گزشتہ آٹھ مہینے سے بے روزگار تھا۔

آٹھ مہینے قبل میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں سیلز پروموشن منیجر تھا۔ کمپنی کی طرف سے مجھے خاصا معقول معاوضہ ملتا تھا۔ معقول اس لحاظ سے کہ میری ماہانہ تنخواہ چھ ہندسوں میں تھی۔ کمپنی کی طرف سے بہترین گاڑی ملی ہوئی تھی۔ گاڑی کے تمام اخراجات، پیٹرول اور مرمت وغیرہ کے اخراجات کی ذمے داری بھی کمپنی کی تھی۔ میرا کام مارکیٹ کا جائزہ لینا اور وقتاً فوقتاً کمپنی کو اپنی تجاویز سے آگاہ کرنا تھا۔ اس مقصد کے لیے مجھے اکثر سفر میں رہنا پڑتا تھا۔ کبھی لاہور، کبھی اسلام آباد، کبھی حیدرآباد اور کبھی بیرونِ ملک!

اپنی اس بے روزگاری میں میرا ہی ہاتھ تھا۔ گزشتہ دو سال سے کمپنی کے مقامی ایم ڈی فضل الرحمن صاحب نے پورا کاروبار اپنے بیٹے فرخ کے حوالے کر دیا تھا۔ اس نے برطانیہ اور امریکا میں تعلیم حاصل کی تھی اور وہ بزنس ایڈمنسٹریشن کی نہ جانے کون کون سی ڈگریاں لے کر واپس آیا تھا۔

وہ خاصا وجیہہ اور خوبرو نوجوان تھا لیکن مجھے پہلی ہی نظر میں اچھا نہیں لگا۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں جو بغیر کسی وجہ کے اچھے نہیں لگتے۔ فرخ کا شمار انہی لوگوں میں ہوتا تھا۔

میں نے اس کے برعکس محض کراچی یونیورسٹی سے ایم بی اے کیا تھا اور فرسٹ پوزیشن لی تھی۔ لوگ میری اس ڈگری ہی پر رشک کرتے تھے۔ مجھے خود بھی فخر تھا کہ اپنی محنت سے میں نے ایم بی اے میں فرسٹ پوزیشن لی ہے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ایم بی اے کرنا گویا لوہے کے چنے چبانے کے مترادف تھا۔ کراچی یونیورسٹی کا معیار بہت سخت تھا۔ اب تو گلی گلی ایسے ادارے قائم ہو گئے ہیں جہاں سے لوگ سیکڑوں کی تعداد میں ایم بی اے کر رہے ہیں۔ اس دور میں ایم بی اے خال خال لوگ ہی کرتے تھے اور مجھ جیسے پوزیشن ہولڈرز کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔

فرخ نے آتے ہی میرے کام میں مین میخ نکالنا شروع کر دی۔ اس کے پاس اعلیٰ ڈگریاں ضرور تھیں لیکن تجربہ صفر تھا۔ خاص طور پر پاکستانی مارکیٹ تو اس کے لیے بالکل ہی اجنبی تھی۔ اس کے باوجود وہ میرے کام میں ٹانگ اڑاتا تھا۔ شاید میری طرح اس نے بھی پہلی ہی نظر میں مجھے مسترد کر دیا تھا۔ حالانکہ میں شخصیت کے اعتبار سے اس کے مقابلے میں کہیں بہتر تھا۔ یہ خودنمائی نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ میں اس سے کہیں زیادہ وجیہہ، خوبرو، خوش لباس اور جامہ زیب تھا۔

ایک سال تک ہماری یہ سرد جنگ جاری رہی۔ میں اس کے خیالات سے واقف تھا کیونکہ ہماری ٹیلی فون آپریٹر روبی مجھے اس کے بارے میں بتاتی رہتی تھی کہ آج فرخ صاحب نے فلاں کلائنٹ سے آپ کے بارے میں یہ کہا... فلاں کلائنٹ سے یہ برائی کی... وغیرہ وغیرہ۔

یوں ہم دونوں کے درمیان تلخیاں بڑھتی چلی گئیں۔

ایک دن فرخ نے مجھے اپنے آفس میں بلایا۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو وہ ٹیلی فون پر گفتگو میں مصروف تھا۔ اس نے مجھ سے بیٹھنے تک کو نہیں کہا۔ وہ پانچ منٹ بعد اپنی اس ''بکواس'' سے فارغ ہوا۔ میں اس دوران میں کھڑا دیکھتا رہا اور پیچ و تاب کھاتا رہا تھا۔

ریسیور کریڈل پر رکھ کر وہ میری طرف متوجہ ہوا اور بولا۔ ''ارے مسٹر خرم! آپ کھڑے کیوں ہیں؟ پلیز تشریف رکھیں۔''

میں خون کے گھونٹ پیتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔

''مسٹر خرم! آپ تو جانتے ہیں کہ کمپنی کا پروفٹ آف ریشو وہ نہیں ہے جو پہلے تھا۔''

''میں اس بارے میں زیادہ نہیں جانتا ''میں نے تلخی میں کہا۔ ''یہ کام اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ کا ہے۔ میرا کام ہے سیلز پروموشن... اور اس میں اضافہ ہوا ہے۔ گزشتہ مہینے کے مقابلے میں اس ماہ ہماری کمپنی کی پروڈکٹس میں بارہ فیصد اضافہ ہوا ہے۔''

''گویا آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ میری انفارمیشن غلط ہے یا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟'' فرخ نے تلخ لہجے میں کہا۔

''میں صرف یہ بتانا چاہ رہا ہوں سر... کہ میرے شعبے میں بارہ فیصد اضافہ ہوا ہے۔'' میں نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''خیر، میری رپورٹ یہ ہے کہ ہمیں کم منافع ہوا ہے۔'' فرخ نے ڈھٹائی سے کہا۔ ''اس لیے اب آپ کو تیس فیصد زیادہ ٹارگٹ حاصل کرنا ہوگا۔''

''اوکے سر!'' میں نے کہا۔ ''میں کوشش کروں گا کہ...''

''کوشش نہیں۔'' فرخ نے میری بات کاٹ دی۔ ''آپ کو یہ ٹارگٹ پورا کرنا ہے۔''

میں اس کے کمرے سے باہر نکلا تو میرا موڈ بہت زیادہ خراب تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ دو دن پہلے ہی اکاؤنٹس آفیسر نے مجھے بتایا تھا کہ ہماری کمپنی نے گزشتہ ماہ کے مقابلے میں زیادہ منافع حاصل کیا ہے۔ ممکن ہے فرخ صاحب اسٹاف کو اضافی بونس بھی دے دیں۔ اس مہینے میں نے پوری محنت اور جانفشانی سے کام کیا اور ٹارگٹ سے بھی پانچ فیصد زیادہ یعنی پینتیس پرسنٹ حاصل کیا۔

کمپنی کے قواعد وضوابط کی رو سے نارگٹ حاصل کرنے پر مجھے اضافی الاؤنس ملتا تھا۔ فرخ تو شاید مجھے وہ الاؤنس نہ دیتا لیکن اکاؤنٹس والوں نے میرا چیک بنا کر فرخ کو بھیج دیا تو اسے چیک پر سائن کرنا پڑے۔

انہی دنوں فرخ نے ایک لڑکی رمشا کو اپنی پی اے کے طور پر رکھ لیا۔ اس سے پہلے اس کی پی اے فرزانہ تھی جو گزشتہ دنوں ملازمت چھوڑ گئی تھی۔

رمشا انتہائی حسین لڑکی تھی۔ مجھے وہ پہلی ہی نظر میں اچھی لگی تھی۔ فرخ بھی اس کے حسن پر ریجھ گیا تھا۔

رمشا کا جھکاؤ میری طرف تھا۔ وہ آہستہ آہستہ میرے ساتھ بے تکلف ہوتی گئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ میرے ساتھ لنچ بھی کرنے لگی۔ وہی مجھے بتاتی تھی کہ فرخ صاحب کو میرا آپ سے بے تکلف ہونا شدید ناگوار گزرتا ہے۔ وہ اکثر مجھے منع بھی کر چکے ہیں کہ میں آپ کے ساتھ زیادہ میل جول نہ بڑھاؤں۔

''میل جول؟'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''ان سے کہنا کہ بات اب میل جول سے بہت آگے بڑھ گئی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' رمشا نے اپنی خوب صورت پلکیں جھپکا کر پوچھا۔

''مطلب یہ ہے رمشا!'' میں نے جذباتی ہو کر کہا۔ ''کہ اب میں اس میل جول کو مستقل کرنا چاہتا ہوں۔ کیا تمہیں اس پر کوئی اعتراض ہے؟''

رمشا انتہائی ماڈرن لڑکی تھی، بولڈ تھی لیکن ایسے موقعے پر لڑکیاں نہ جانے کیوں شرما جاتی ہیں۔ وہ سر جھکا کر بولی۔ ''خرم... میں تو نہ جانے کب سے اس جملے کے انتظار میں تھی۔ پھر میں سوچتی تھی کہ کہیں تم کسی اور لڑکی کو پسند نہ کرتے ہو لیکن...''

''لیکن کیا؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''لیکن اس کے لیے تمہیں میرے پاپا اور مما سے ملنا پڑے گا۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا لیکن رسمی طور پر یہ بھی تو ضروری ہے۔''

''چلو، میں یہ بھی کرلوں گا لیکن...''

''لیکن؟'' اس نے بری طرح چونک کر پوچھا۔

''تمہیں اپنی اس ''شان دار'' ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔''

''مجھے جاب کی فکر نہیں ہے۔ میں تو محض شوقیہ جاب کرتی ہوں۔ مجھے اصل فکر تو تمہاری ہے۔ فرخ تمہیں بھی ملازمت سے فارغ کردے گا۔''

''کوئی بات نہیں... رازق تو اللہ تعالیٰ ہے۔ مارکیٹ میں میری ایک ساکھ ہے۔ اب بھی مجھے کئی ملٹی نیشنل کمپنیوں کی طرف سے آفر ہے اور وہاں سیکری بھی یہاں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ دیگر مراعات بھی ہیں۔ میرے بارے میں تمہیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

اس کے بعد میں نے پورے آفس میں باقاعدہ اعلان کردیا کہ میں رمشا سے شادی کرنے والا ہوں۔

میری توقع کے عین مطابق فرخ نے مجھے اپنے کمرے میں طلب کرلیا اور بغیر کسی تمہید کے بولا۔ ''خرم! سنا ہے تم نے رمشا سے شادی کی بات کی ہے؟''

''یس سر!'' میں نے کہا۔ ''آپ نے درست سنا ہے۔''

''تم جانتے ہو کہ رمشا کون ہے؟'' اس نے بلند آواز میں کہا۔ ''وہ میری منگیتر ہے۔ تمہاری جرأت کیسے ہوئی کہ اس کے بارے میں اس قسم کی بات کرو؟''

میں اس کی بات سن کر سناٹے میں رہ گیا۔ وہ اگر جھوٹ بھی بول رہا تھا تو بہت پُراعتماد انداز میں بول رہا تھا۔

''رمشا نے کبھی بتایا نہیں کہ وہ...''

''میڈم رمشا کہو۔'' وہ بلند آواز میں بولا۔ ''اور اسے کیا ضرورت ہے کہ وہ ہر ایرے غیرے کو بتاتی پھرے کہ وہ میری منگیتر ہے؟'' اس کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔

''میں اس کے لیے ایرا غیرا نہیں ہوں۔'' مجھے بھی غصہ آگیا۔ ''وہ میری دوست ہے اور یہ بات سارا دفتر جانتا ہے۔ وہ میرے ساتھ لنچ کرتی رہی ہے، ڈنر پر جاتی رہی ہے اور جب میں نے اسے پرپوز کیا تھا تو تب بھی اس نے نہیں بتایا کہ وہ آپ سے منسوب ہے۔ وہ تو مجھے...''

''بند کرو یہ بکواس۔'' فرخ نے انتہائی تلخ اور توہین آمیز لہجے میں کہا۔

''اگر تمہیں یقین نہیں ہے تو تم خود رمشا سے پوچھ سکتے ہو۔'' میں نے بھی سارا احترام بالائے طاق رکھ دیا۔

''یہ تم بات کس انداز میں کررہے ہو؟'' فرخ نے کہا۔ ''میں ابھی رمشا کو بلاتا ہوں اور اس سے تمہارے سامنے ہی سب کچھ پوچھوں گا۔'' اس نے چپراسی کو بلانے کے لیے گھنٹی بجائی۔

فوراً ہی چپراسی کمرے میں داخل ہوا۔

''مس رمشا کو میرے کمرے میں بھیجو۔'' اس نے سرد لہجے میں کہا۔ وہ اتنے غصے میں تھا کہ اسے انٹرکام کا خیال بھی نہیں آیا ورنہ چپراسی کو بلانے کی ضرورت نہ پڑتی۔

رمشا اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے اپنے مخصوص انداز میں پلکیں جھپکائیں پھر بولی۔ ''یس سر!''

''رمشا! یہ شخص تمہارے بارے میں کیا الٹی سیدھی بکواس کررہا ہے؟'' فرخ نے کہا۔ ''اس نے پورے آفس میں یہ اعلان کردیا ہے کہ یہ تم سے شادی کرنے والا ہے اور...''

''وھاٹ؟'' رمشا نے حیرت سے کہا۔ ''اس نے ایسا کہا ہے؟ میں تو ابھی کچھ دیر پہلے ہی آئی ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس نے کیا کہا ہے اور کب کہا ہے؟''

''بات یہ نہیں ہے رمشا کہ میں نے کب یہ کہا ہے، بات اصل میں یہ ہے کہ میں نے غلط کیا کہا ہے؟''

''مسٹر خرم! آپ ہوش میں تو ہیں؟'' رمشا نے ناگواری سے کہا۔

لمحے بھر کو ایسا لگا جیسے میں زمین میں اندر ہی اندر دھنستا جارہا ہوں۔

''میں اور آپ سے شادی کروں گی؟ آپ نے کبھی اپنے اور میرے اسٹیٹس پر غور کیا ہے؟ میں نے آپ سے ہنس کر بات کیا کرلی کہ آپ شادی کے خواب دیکھنے لگے۔''

اس کی بات سن کر میں آپے سے باہر ہوگیا۔ میں نے چیخ کر کہا۔ ''مجھے معلوم نہیں تھا رمشا کہ تم اتنی گھٹیا اور کمینی عورت ہو۔ میں...''

''اپنی زبان کو لگام دو خرم!'' فرخ نے چیخ کر کہا۔ ''ورنہ میں سیکیورٹی کو بلا کر ابھی تمہیں آفس کے باہر پھنکوا دوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ میری طرف بڑھا اور مجھے دروازے کی طرف دھکیل کر بولا۔ ''دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ مجھے ایسے جھوٹے اور بددیانت لوگوں کی ضرورت نہیں ہے۔''

اس کے اس جملے نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا۔ میں نے اس کی ٹائی پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا اور اس کے چہرے پر اتنی زور سے پھٹ مارا کہ اس کی آواز پورے آفس نے سنی ہوگی۔

وہ چیخ کر بولا۔ ''سیکیورٹی کو بلاؤ... احمد خان۔'' اس نے چپراسی کو آواز دی۔

چپراسی فوراً ہی کمرے میں داخل ہوا اور کمرے کا منظر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ فرخ کی ٹائی ابھی تک میرے ہاتھ میں تھی۔ چپراسی الٹے پیروں باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اس کے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ مزید رسید کر کے پیچھے دھکیل دیا۔

فوراً ہی آفس سیکیورٹی کے دو گارڈز کمرے میں داخل ہوئے۔

کون کہتا ہے کہ؟

اولاد نہیں ہوسکتی

آج بھی لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ اِنشاءاللہ اولاد ہوگی۔ خاتون میں کوئی اندرونی پرابلم ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے۔ جو آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا ہے۔ آپکے گھر میں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہوسکتا ہے۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر تمام حالات سے آگاہ کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوائیں۔

المُسلم دارالحکمت رجسٹرڈ (دواخانہ)

ضلع وشہر حافظ آباد۔ پاکستان

0300-6526061

0547-521787

فون اوقات

صبح 9 بجے سے رات 11 بجے تک

آپ ہمیں صرف فون کریں

دوائی آپ تک ہم پہنچائیں گے

"اسے اٹھا کر باہر پھینک دو۔" فرخ نے اپنے ہونٹوں سے بہتا ہوا خون صاف کیا۔

دونوں گارڈز نے میری طرف دیکھا۔ ان کے انداز میں ہچکچاہٹ تھی۔ وہ بھلا مجھ پر کیسے ہاتھ اٹھا سکتے تھے؟

"پولیس کو بلاؤ۔" رمشا نے چیخ کر کہا۔

"پولیس کو بلانے سے پہلے اتنا ضرور سوچ لینا کہ میرے پاس ایسی تصویریں ہیں جن میں تم میرے ساتھ کھڑی ہو۔ ان میں سے کچھ تصاویر تو پولیس والے بھی بہت شوق سے دیکھیں گے اور میڈیا الگ چٹخارے لے کر اس خبر کو نشر کرے گا۔"

"یو بلڈی بلیک میلر!" فرخ نے کہا۔ "دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ اب کمپنی کو مزید تمہاری ضرورت نہیں ہے۔ رہی ان تصویروں کی بات تو وہ تم خود مجھے لوٹاؤ گے۔"

"مجھے بھی ایسے گھٹیا اور کمینے لوگوں کے ساتھ کام کرنے کا شوق نہیں ہے۔" میں نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

پھر میں نے اپنے کمرے میں آ کر اپنی ذاتی اشیا بریف کیس میں ڈالیں۔ الماری اور ہر دراز کی اچھی طرح تلاشی لی کہ میری کوئی ضروری چیز وہاں رہ نہ جائے۔

میں نے بریف کیس اٹھایا، کچھ سامان بڑے بڑے دو شاپرز میں بھی تھا۔ میں نے وہ تمام چیزیں اٹھائیں اور باہر نکل آیا۔ استقبالیہ کاؤنٹر کے پاس رک کر میں نے جیب سے گاڑی کی چابی نکالی اور روبی کے حوالے کرتے ہوئے بولا۔ "گاڑی کی یہ چابی فرخ کے حوالے کر دینا۔" پھر مجھے خیال آیا کہ گاڑی میں بھی میرا بہت سا ذاتی سامان ہے۔ میں نے چابی دوبارہ اٹھالی اور بولا۔ "میں گاڑی سے اپنا سامان نکال کر ابھی چابی بھجواتا ہوں۔"

روبی کے خوب صورت چہرے پر اداسی کے سائے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بہت مشکل سے اپنے آنسو ضبط کر رہی ہے۔

میں سامان اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھا تو دفتر کے ایک چپراسی نے وہ سامان میرے ہاتھ سے لے لیا اور بولا۔ "چلیے سر! میں آپ کو نیچے تک چھوڑ دوں۔"

"رہنے دو اکرام!" میں نے کہا۔ "فرخ کو معلوم ہو گیا تو تمہاری نوکری بھی چلی جائے گی۔"

"نوکری جاتی ہے تو جائے۔" اس نے کہا اور سامان میرے ہاتھ سے لے لیا۔

میں نے گاڑی سے اپنا سامان نکالا اور ایک ٹیکسی روک کر اس میں سوار ہو گیا۔ مجھے رہ رہ کر رمشا کے رویے کا خیال آ رہا تھا۔ کیا رمشا اور فرخ نے مل کر میرے خلاف سازش کی تھی یا پھر فرخ نے اسے ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا؟ وجہ کچھ بھی رہی ہو، مجھے اب رمشا کی شکل سے بھی نفرت ہو گئی تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ عورت کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ میں نے زندگی میں پہلی دفعہ ایک عورت کے ہاتھوں زک اٹھائی تھی۔ مجھے شدید توہین محسوس ہو رہی تھی۔ میں جو خود کو مارکیٹنگ کا ماہر سمجھتا تھا، بڑی سے بڑی کمپنی کے مالک کو خاطر میں نہیں لاتا تھا اور اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ مجھے چہرے پڑھنے کا فن آتا ہے۔ آج میں معمولی لڑکی کے ہاتھوں ذلیل ہو گیا تھا۔ فرخ اگر مجھے ملازمت سے نکالنا ہی چاہتا تھا تو کسی بھی وقت مجھ سے استعفا طلب کر سکتا تھا۔ وہ کمپنی کا مالک تھا اور اسے یہ اختیار حاصل تھا لیکن شاید وہ مجھے ذلیل اور رسوا کر کے اپنے آفس سے نکالنا چاہتا تھا۔ اسے نہ جانے مجھ سے کیا پرخاش تھی۔ یہ شخصیات کا ٹکراؤ تھا یا پھر مارکیٹ میں میری اہمیت کا احساس؟

وہ کمپنی کا مالک ضرور تھا لیکن ہماری کمپنی کا ہر کلائنٹ مجھ سے ہی بات کرتا تھا۔

میں ان دنوں ڈیفنس میں رہتا تھا۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ مکان اپنا تھا۔ میرے والد ایک سرکاری محکمے کے چیف سیکریٹری تھے۔ وہ ایسی سیٹ پر تھے کہ اگر وہ ناجائز کمائی کرتے تو آج میں بھی فرخ جیسی کسی کمپنی کا مالک ہوتا لیکن وہ تو حرام کی کمائی کے ایک پیسے کے بھی روادار نہیں تھے۔ ڈیفنس کا یہ بنگلا ہی ان کی زندگی بھر کی کمائی تھا۔

وہ اکثر ہنس کر کہا کرتے تھے۔ "میرا بینک تو خرم ہے۔ میں نے اسے اتنی تعلیم دلوا دی ہے کہ کم از کم یہ مجھے بھوکا نہیں مرنے دے گا۔"

انہوں نے مجھے ملک کے اعلیٰ اسکولوں میں تعلیم دلائی تھی۔ میری تعلیم پر خصوصی توجہ دی تھی۔ میں نے بھی انہیں مایوس نہیں کیا تھا۔

امی کا انتقال تو میرے بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ جس سال میں نے ایم بی اے کیا، اسی سال ابو بھی ہارٹ اٹیک سے انتقال کر گئے۔ میرے والدین اکلوتے تھے اس لیے دور و نزدیک کا کوئی عزیز، رشتے دار بھی نہیں تھا۔ ابو کے دوست بھی چند ہی تھے۔ ان میں سے دو اسلام آباد میں تھے، تیسرے کا انتقال بھی ابھی حال ہی میں ہوا تھا۔ یوں ایک طرح سے میں اس دنیا میں اکیلا تھا۔ مجھے اس سے قبل کبھی اپنے اکیلے پن کا اتنا احساس نہیں ہوا تھا جتنا رمشا کے گھٹیا رویے کی وجہ سے ہوا تھا۔

میں گھر آ کر بھی اسی موضوع پر سوچتا رہا۔ مجھے احساس بھی نہیں ہوا کہ کب رات کا اندھیرا پھیلا۔

مجھے بھوک محسوس ہوئی تو میں چونکا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ گویا مجھے لائٹ آن کرنے کا ہوش بھی نہیں رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر لائٹ آن کی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ میں نے ابھی تک کپڑے بھی نہیں بدلے۔ میں نے کوٹ اتار کر الماری میں لٹکایا، ٹائی کھولی اور شاور کے لیے باتھ روم میں گھس گیا۔ اس دوران میں میرے ٹیلی فون کی گھنٹیاں بجتی رہیں۔ میرا حلقۂ احباب خاصا وسیع تھا لیکن دوست صرف ایک ہی تھا، ارسلان۔ وہ بھی آج کل ملک سے باہر تھا۔

شاور لینے کے بعد میں نے آئینے میں اپنی شکل دیکھی تو حیران رہ گیا۔ میرا تر و تازہ اور شاداب چہرہ ایک ہی دن میں ست کر رہ گیا تھا۔ میں نے سر جھٹک کر خود سے کہا۔ "واہ میاں خرم! ایک احمق اور گھٹیا لڑکی کی وجہ سے تمہارا یہ حال ہو گیا۔ لعنت بھیجو اس پر اور اب مستقبل کے بارے میں سوچو۔"

میں نے فریج کھول کر اس میں سے کھانا نکالا۔ میں کھانا بھی خود پکایا کرتا تھا اور اب تو اچھا خاصا کک ہو گیا تھا۔

پھر میں نے واقعی رمشا پر لعنت بھیجی اور خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد کافی نے عجیب سرور اور تازگی بخشی۔

اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف ہماری ٹیلی فون آپریٹر روبی تھی۔

"ہاں روبی!" میں نے کہا۔ "خیریت تو ہے؟"

"سر! آپ تو خیریت سے ہیں؟ میں نہ جانے کب سے آپ کا سیل فون ٹرائی کر رہی ہوں لیکن وہ آف ہے۔ گھر کا فون آپ ریسیو نہیں کر رہے ہیں۔ کیا آپ گھر میں موجود نہیں تھے؟"

"ہاں، میں ابھی ابھی آیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم کہاں سے بول رہی ہو؟"

"سر! اس وقت تو میں گھر ہی سے بول رہی ہوں۔ فرخ آپ کے خلاف کوئی خطرناک چال چلنے والا ہے۔ میں نے اس لیے ٹیلی فون کیا تھا کہ آپ محتاط رہیں۔"

"تھینک یو روبی۔" میں نے کہا۔ "اور اب یہ سر کہنا چھوڑ دو۔ اب میں تمہارا سر نہیں ہوں۔ ویسے میں محتاط رہوں گا۔ تم بھی اپنا خیال رکھنا۔ اس کمینی رمشا کو معلوم ہے کہ تم مجھ سے قریب تھیں۔"

"آپ تو پورے دفتر کے پسندیدہ شخص تھے سر... ہر شخص آپ کے قریب تھا۔ آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو سیکیورٹی گارڈز نہ صرف اس کی خوب اچھی طرح پٹائی کرتے بلکہ واقعی آفس سے باہر پھینک دیتے۔ لیکن ان افراد نے ایسا نہیں کیا۔ اس کا مطلب یہی ہے نا کہ آپ سب کا خیال رکھتے تھے۔"

"خیر، تم خاص طور پر محتاط رہنا اور کوئی بھی نئی اطلاع ہو تو مجھے ضرور دینا۔"

"اپنا خیال رکھیے گا سر!" روبی نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

دوسرے دن حسب معمول میں علی الصباح اٹھ گیا اور جوگنگ کے لیے نکل گیا۔ گھر آ کر میں نے ایکسرسائز کی۔ میں نے گھر میں چھوٹا سا ایک جم بنا رکھا تھا۔

میں ایکسرسائز کر کے فارغ ہوا اور اپنے لیے جوس کا گلاس بنا کر صوفے پر بیٹھا ہی تھا کہ میرے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ میں نے سیل فون اٹھا کر دیکھا اور اس پر روبی کا نمبر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اتنی صبح صبح اسے کال کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں نے فوراً ہی اس کی کال ریسیو کر لی۔ "ہیلو روبی! تم نے..."

"سر! آپ کے لیے اچھی خبر نہیں ہے۔ آپ نے آج کا اخبار دیکھا؟"

"نہیں۔" میں نے چونک کر کہا۔ "میں نے ابھی تک اخبار نہیں دیکھا ہے۔"

"تو پھر دیکھ لیجیے۔" روبی نے کہا۔ "میں بعد میں آپ کو کال کروں گی۔"

اخبار ابھی تک باہر برآمدے میں پڑا ہوا تھا۔ میں ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد کافی پیتے ہوئے اخبار پر سرسری نظر ڈالتا تھا۔

میں نے اخبار اٹھایا تو اس کے بیک پیج پر میری تصویر موجود تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک خبر بھی تھی۔ "خرم سرفراز ولد سرفراز احمد ہماری کمپنی میں سیلز منیجر تھا۔ اس نے کمپنی کے حساب میں لاکھوں روپے کا ہیر پھیر اور غبن کیا ہے۔ اب کمپنی اس سے کیے ہوئے ایگریمنٹ اور کین دین کی ذمے دار نہ ہو گی۔ خرم سرفراز کا اس کمپنی سے اب کوئی تعلق نہیں ہے۔ کمپنی خرم سرفراز کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنے کا حق محفوظ رکھتی ہے۔"

خبر کیا تھی بم کا گولہ تھا جو میرے وجود میں پھٹ گیا۔ میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ سرفراز احمد جس

نے کروڑوں کی دولت ٹھکرا کر صرف رزقِ حلال پر قناعت کی تھی، اس کا بیٹا لاکھوں روپے کے غبن کے الزام میں ملوث کیا جا رہا تھا۔ ابو اگر زندہ ہوتے تو شاید یہ خبر پڑھ کر ہی ان کا ہارٹ فیل ہو جاتا۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ ابھی آفس جاؤں اور فرخ کو جان سے مار دوں۔ نہ صرف فرخ کو بلکہ رمشا کو بھی اس وقت تک مارتا رہوں جب تک اس کا دم نہ نکل جائے۔

میں چند لمحے اخبار ہاتھ میں لیے کھڑا رہا۔ نہ جانے میں کب تک اسی حالت میں کھڑا رہتا کہ ہمارے پڑوسی صدیقی صاحب نے مجھے آواز دی اور کہا۔ ''خرم! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ لگتا ہے آج تم چھٹی کرنے کے موڈ میں ہو۔''

ہم دونوں تقریباً ساتھ ہی آفس کے لیے نکلا کرتے تھے۔ وہ میرے گھر کے باہر گاڑی میں بیٹھے تھے۔

پھر وہ ہنس کر بولے۔ ''اوہ، اب سمجھا، تمہاری گاڑی ورک شاپ میں ہے۔ اگر کوئی پرابلم ہے تو مجھے بتاؤ۔ میں کچھ دیر تمہارا انتظار کر لوں گا۔ جلدی سے تیار ہو کر آ جاؤ۔''

''شکریہ صدیقی صاحب!'' میں نے جبراً مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں آج واقعی چھٹی کے موڈ میں ہوں۔''

ان کے جانے کے بعد میں اندر آیا، اخبار ایک طرف پھینکا، شاور لیا اور کپڑے تبدیل کر کے اپنی گن نکال کر کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھی اور گھر سے باہر آ گیا۔

میری آنکھوں میں اس وقت صرف اور صرف فرخ کا چہرہ تھا۔ میں واقعی اسے گولی مار دینا چاہتا تھا۔

میں ٹیکسی کی تلاش میں مین روڈ تک آ گیا۔ صبح کے وقت ٹیکسی ملنے میں اتنی دشواری ہوتی ہے، مجھے اس کا بالکل اندازہ نہیں تھا۔ میں نے کبھی ٹیکسی یا بس میں سفر ہی نہیں کیا تھا۔ میرے اکاؤنٹ میں کافی رقم تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آج سب سے پہلے کوئی مناسب سی گاڑی خریدوں گا۔ میں پیسے بچانے کا قائل نہیں تھا اور خاصا شاہ خرچ تھا۔ میرے دوست مجھے طنز میں ''ہمدرد دواخانہ'' کہتے تھے۔ اس کے باوجود میں شاہانہ زندگی گزارتا تھا۔ مہنگے سے مہنگے کپڑے اور قیمتی پرفیوم استعمال کرتا تھا۔ میرے پاس قیمتی گھڑیوں کا ایک ڈھیر تھا۔ مجھے اچھی گھڑیاں جمع کرنے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔

جب کافی دیر تک ٹیکسی نہ ملی تو میں پیدل ہی آگے کی طرف چلنے لگا۔ چلتے چلتے مجھے خیال آیا کہ فرخ کو قتل کر کے تو میں پھانسی کے تختے پر لٹک جاؤں گا۔ اس سے ایسا انتقام لوں کہ وہ زندگی بھر یاد رکھے۔ میں رمشا کو بھی عبرت ناک سزا دینا چاہتا تھا۔

میں جانتا تھا کہ اب تک سارے شہر کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ خرم سرفراز کمپنی سے لاکھوں روپے کا غبن کر کے گیا ہے۔

میں نے فرخ کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا فیصلہ کر لیا۔ شہر کے کئی بڑے وکیل مجھے جانتے تھے۔ ان میں سے کئی تو مجھ سے بہت زیادہ بے تکلف بھی تھے۔

اسی وقت مجھے ایک ٹیکسی مل گئی اور میں نے اس سے پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی چلنے کو کہا۔ وہاں گاڑیوں کے بے شمار شوروم تھے۔

''سوسائٹی میں کہاں جائیں گے صاحب؟'' ڈرائیور نے پوچھا۔

''گاڑیوں کے کسی بھی اچھے شوروم پر لے چلو۔'' میں نے کہا۔

ٹیکسی والا مسکرا کر بولا۔ ''صاحب! یہ کراچی ہے۔ یہاں گیارہ بارہ بجے سے پہلے نہ کوئی شوروم کھلتا ہے، نہ کوئی بڑی دکان۔ آپ کو کم از کم دو گھنٹے انتظار کرنا پڑے گا۔''

''تو پھر مجھے کسی ہوٹل کے ریسٹورنٹ پر چھوڑ دو۔'' میں نے کہا۔ مجھے خیال آیا کہ میں نے غصے میں ناشتا بھی نہیں کیا تھا۔

ٹیکسی والے نے مجھے ریسٹورنٹ پر چھوڑ دیا۔

میں نے ناشتا کیا تو یہ انکشاف ہوا کہ میری خبر نہ صرف انگلش کے ایک خاصے کثیر الاشاعت اخبار میں لگی تھی بلکہ اردو کے بھی سب سے بڑے اخبار کے فرنٹ پیج پر موجود تھی۔ خبر کیا، وہ اشتہار تھا۔ فرخ نے اسے خاصے نمایاں انداز میں لگوایا تھا۔ ایک بار پھر خون میری کھوپڑی میں ٹھوکریں مارنے لگا مگر میں نے بہ مشکل تمام ضبط کیا اور کسی نہ کسی طرح دو ڈھائی گھنٹے وہاں گزارے۔

وہاں سے میں ایک شوروم پر پہنچا اور اپنے لیے ایک ہنڈا سٹی پسند کی۔ شوروم کے مالک نے کہا کہ وہ شام تک تمام کاغذی کارروائی مکمل کر کے گاڑی میرے حوالے کر دے گا۔

''مجھے فوری طور پر گاڑی کی ضرورت ہے۔'' میں نے کہا۔

''آپ اپنی گاڑی کا بیعانہ دے دیں، فارم وغیرہ فل کر دیں اور ہمارے شوروم کی کوئی بھی گاڑی استعمال کر لیں۔ اس کے کوئی ایکسٹرا چارجز نہیں ہوں گے۔''

اس نے ایک ٹویوٹا کرولا میرے حوالے کر دی۔ وہ گاڑی بھی تقریباً نئی تھی اور اسی سال کا ماڈل تھا۔

''یہ گاڑی آپ کی ہے یا کسی کلائنٹ کی ہے؟'' میں نے پوچھا۔ وہ گاڑی مجھے اچھی لگی تھی۔

''آپ بے فکر ہو کر لے جائیں، یہ میری ذاتی گاڑی ہے۔''

''پھر میں یہی گاڑی خریدنا چاہوں گا۔''

تھوڑی سی حیل و حجت کے بعد وہ گاڑی میں نے ...دلی۔ اس میں ایک تو مجھے ایک لاکھ روپے کم دینا پڑے، ...رے یہ کہ شوروم کے مالک نے گاڑی کے کاغذات اسی ...ن میرے حوالے کر دیے۔

گاڑی ملتے ہی مجھ میں وہی اعتماد پھر پیدا ہو گیا جو ...لے تھا۔

وہاں سے میں نے اپنے ایک وکیل دوست وقار ہاشمی ...ٹیلی فون کیا۔ اس نے بتایا کہ وہ شام کو پانچ بجے آفس پہنچے ...۔ بہت زیادہ ایمرجنسی ہے تو ہائی کورٹ آ جاؤ۔

میں نے اس سے پانچ بجے ملنے کا وعدہ کیا۔ اب ...رے پاس پھر کئی گھنٹے تھے۔ میری رسٹ واچ میں اس ...ت سوا ایک بجا تھا۔

میرے سیل فون کی بیل بجی تو میں نے گاڑی سڑک ...ے کنارے روک کر سیل فون دیکھا۔ روبی کی کال تھی۔ میں ...نے کال ریسیو کر لی۔ ''ہاں روبی! کوئی خاص بات؟''

''بہت سی باتیں ہیں سر!'' روبی نے کہا۔ ''آپ اگر ...فس کے آس پاس ہیں تو اسی فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ میں آ جائیں جہاں آپ لنچ کرتے تھے۔''

''احمقانہ باتیں مت کرو روبی!'' میں نے کہا۔ ''وہاں ...فس کے دوسرے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ تم ایسا کرو، ٹیکسی پکڑ ...کر ریجنٹ پلازا پہنچو۔ میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، میں آ رہی ہوں۔'' روبی نے کہا اور ...سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں ریجنٹ پلازا کے نزدیک ہی تھا اس لیے دس ...منٹ کے اندر وہاں پہنچ گیا۔ میں گاڑی پارک کر کے ہوٹل کے مین گیٹ کے نزدیک کھڑا ہو گیا۔ پانچ منٹ بعد روبی ...بھی وہاں پہنچ گئی۔ میں اسے لے کر ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں ...چلا گیا اور ایک الگ تھلگ گوشے میں بیٹھنے کے بعد میں نے ...اس سے کہا۔ ''ہاں روبی! اب بتاؤ کیا خبریں ہیں؟ کیا ان ...لوگوں نے میرے خلاف پولیس میں ایف آئی آر درج کرا ...دی ہے؟''

''نہیں سر! وہ...''

''دیکھو روبی! اب میں تمہارا باس نہیں ہوں۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ مجھے سر مت کہو۔''

''باس نہیں ہیں تو کیا ہوا؟'' روبی نے کہا۔ ''میرے ...لیے تو آپ آج بھی قابلِ احترام ہیں سر!'' روبی نے ہنس کر کہا۔ اسی وقت ویٹر آ گیا۔ اسے کھانے کا آرڈر دینے کے بعد روبی نے کہا۔

''ان لوگوں نے ایف آئی آر تو نہیں کٹوائی ہے۔ فرخ، رمشا سے کہہ رہا تھا کہ پولیس کو انوالو کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ خرم تو اب اپنی موت آپ ہی مر جائے گا۔ ملک کے ہر اخبار میں اس کے حوالے سے غبن کا اشتہار چھپا ہے۔ وہ تو اب کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہے گا۔''

روبی ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ جب تک میں اپنی بے گناہی ثابت نہ کر دیتا، واقعی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں تھا۔

''ہاں، رمشا اور فرخ میں بھی کسی بات پر تلخ کلامی ہوئی ہے۔ فرخ کے پیون احمد نے بتایا ہے کہ ان دونوں میں رقم کے لین دین پر تلخ کلامی ہوئی ہے۔ رمشا کہہ رہی تھی کہ میں نے تمہارا اتنا بڑا کام کیا ہے، میں ففٹی پرسنٹ لوں گی۔ فرخ نے کہا کہ شادی کے بعد تو سب کچھ تمہارا ہی ہو گا۔ رمشا نے طنزیہ لہجے میں کہا... شادی... میں تم سے شادی کب کر رہی ہوں۔ وہ تو صرف ایک ڈراما تھا۔''

''اگر ڈراما تھا تو میں تمہیں صرف دس لاکھ دوں گا۔'' فرخ نے کہا۔

''دس لاکھ!'' رمشا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''کروڑوں روپے کے بدلے میں صرف دس لاکھ... میں دیکھوں گی کہ تم میرا حصہ کیسے ہڑپ کر سکتے ہو۔'' یہ کہہ کر رمشا غصے میں وہاں سے چلی گئی تھی۔

لنچ کے بعد روبی جانے لگی تو میں نے کہا۔ ''آج تم آفس سے آدھے دن کی چھٹی کر لو۔ میں بہت تنہائی محسوس کر رہا ہوں۔''

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ اس لمحے اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔

اس نے سیل فون پر آفس اطلاع کی کہ میری طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ میں اب آفس نہیں آ سکوں گی۔

پھر میں اسے لے کر بی ویو کی طرف نکل گیا۔

''ہمارا یوں کھلے عام گھومنا پھرنا مناسب نہیں ہے خرم!'' روبی نے پہلی دفعہ مجھے میرے نام سے مخاطب کیا۔ ''مجھے اپنی ملازمت کی تو پروا نہیں ہے لیکن پھر آپ کو وہاں کی اطلاعات نہیں مل سکیں گی۔''

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ پریشانی کی وجہ سے یہ بات میرے ذہن میں نہیں آئی تھی۔

''اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میرے گھر چلو۔'' میں نے کہا۔

’’مجھے بھلا کیوں اعتراض ہوگا؟‘‘ روبی نے کہا۔
’’تم تو جانتی ہو کہ میں بالکل اکیلا رہتا ہوں اور...‘‘
’’میں جانتی ہوں۔‘‘ روبی نے کہا۔ ’’اب یہاں سے سیدھے گھر چلیں۔‘‘ اس کے انداز میں اپنائیت تھی۔
میں نے پہلی دفعہ اسے غور سے دیکھا۔ وہ رمشا سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ اس کے لمبے بال کھلے ہوئے تھے۔ چہرے کا رنگ سفید و سرخ تھا جو دھوپ کی تمازت سے مزید سرخ ہوگیا تھا۔ وہ رمشا کے مقابلے میں دراز قد تھی اور اس کا متناسب جسم کسی کو بھی پاگل کردینے کے لیے کافی تھا۔ وہ اگر رمشا کی طرح اسکن ٹائٹ جینز اور ٹی شرٹ پہنتی تو نہ جانے کیا غضب ڈھاتی۔ میں اس کا یہ روپ پہلی دفعہ دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے عموماً میں نے اسے کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھے دیکھا تھا اور کبھی اتنے غور سے اس کا جائزہ نہیں لیا تھا۔
’’کیا دیکھ رہے ہیں خرم؟‘‘ اس نے جھینپ کر پوچھا۔
میں چونک اٹھا۔ ’’آں... نہیں... کچھ نہیں۔ میں کچھ سوچ رہا تھا۔ چلو، گھر چلیں۔‘‘
اس دن روبی شام تک میرے ساتھ رہی۔ پھر میں نے اسے گھر ڈراپ کرنا چاہا لیکن اس نے پھر وہی عذر پیش کردیا کہ ہمارا ایک ساتھ دیکھا جانا مناسب نہیں ہے۔ ’’میں ٹیکسی سے چلی جاؤں گی۔‘‘
اسے رخصت کرکے میں ایڈووکیٹ وقار ہاشمی کے پاس پہنچا۔ رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد وہ بولا۔ ’’میں جانتا ہوں کہ تم کس سلسلے میں میرے پاس آئے ہو۔ میں اخبار میں وہ اشتہار پڑھ چکا ہوں۔‘‘
’’تم جانتے ہو تو یہ بھی بتاؤ کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟‘‘ میں نے کہا۔
’’تم سب سے پہلے تو کمپنی کی انتظامیہ اور فرخ پر ہتک عزت کا دعویٰ کرو اور کم سے کم دو کروڑ روپے کا ہرجانہ طلب کرو۔‘‘ وقار نے کہا۔ ’’ہاں، تم ضمانت قبل از گرفتاری بھی کرالو۔ ممکن ہے ان لوگوں نے غبن کے کیس کی ایف آئی آر کٹوادی ہو اور پولیس تمہیں گرفتار کرلے۔‘‘
’’انہوں نے اب تک ایف آئی آر نہیں کٹوائی ہے۔‘‘ میں نے کہا۔
’’کیا تمہیں یقین ہے؟‘‘ وقار نے پوچھا۔
’’ہاں، مجھے یقین ہے۔‘‘ میں نے کہا۔
دوسرے دن کے اخبارات میں میری طرف سے فرخ اور کمپنی کی انتظامیہ پر ہتک عزت کا دعویٰ کردیا گیا اور فرخ کو لیگل نوٹس بھی بھیج دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کورٹ میں فرخ کے خلاف پٹیشن بھی داخل کردی۔
پھر گویا میری آزمائش کا دور شروع ہوگیا۔ پہلی پیشی دس دن بعد تھی۔
میں نے اپنا سی وی تیار کیا اور انہیں مختلف کمپنیز کو ای میل کردیا۔ ان میں سے بیشتر کمپنیز وہ تھیں جو وقتاً فوقتاً دگنے معاوضے اور مراعات کے ساتھ ملازمت کی آفر کرچکی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ دوسرے ہی دن میرا ای میل باکس ان کمپنیوں کی پیشکش سے بھر جائے گا۔ میرا ارادہ تھا کہ روبی کو بھی میں اپنے ساتھ وہاں لے جاؤں گا جہاں میں خود جاب کروں گا۔
دوسرے دن شام کو میں نے اپنا ای میل باکس دیکھا، وہ بالکل خالی تھا۔ مجھے بہت حیرت ہوئی کہ اب تک کسی کمپنی نے مجھے بلایا کیوں نہیں؟ پھر میں نے سوچا کہ ممکن ہے ان لوگوں نے میری ای میل دیکھی ہی نہ ہو۔ ایسا عموماً ہوتا نہیں ہے۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ اب میں خود ہی ان اداروں کے مالکان سے ملوں گا۔ تقریباً سبھی مجھے اچھی طرح جانتے تھے اور مجھ سے بے تکلف بھی تھے۔
دوسری صبح میں ایک بڑی اور ملٹی نیشنل کمپنی کے آفس پہنچ گیا۔ وہاں جونیئر اسٹاف سے لے کر کمپنی کے ایم ڈی تک سبھی مجھے بہت اچھی طرح جانتے تھے۔
میں کمپنی کے جی ایم اکرام شیخ کے کمرے میں داخل ہونے لگا تو ان کی پی اے نے بہت مؤدب انداز میں کہا۔ ’’مسٹر خرم! سر اس وقت ایک امپورٹنٹ میٹنگ میں ہیں۔ آپ کو کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔‘‘
’’او کے!‘‘ میں نے ہنس کر کہا اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ’’آپ شیخ صاحب کو میرے بارے میں انفارم تو کردیں۔‘‘
’’یس سر!‘‘ اس نے کہا اور انٹرکام پر شیخ صاحب کو بتایا۔ ’’سر! مسٹر خرم سرفراز آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔‘‘
’’سوری سر!‘‘ اس نے انٹرکام کا ریسیور رکھا اور سپاٹ لہجے میں بولی۔ ’’مسٹر خرم! آپ کی وجہ سے سر نے مجھے بھی ڈانٹ پلادی۔ انہوں نے کہا تھا کہ انہیں بالکل ڈسٹرب نہ کیا جائے۔‘‘
’’سوری مس نوشین!‘‘ میں نے کہا۔ ’’میں ویٹ کرلیتا ہوں۔‘‘
میں نے وہاں رکھا ہوا اخبار اٹھالیا اور اس پر یونہی سرسری سی نظر ڈالی۔ پھر ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا اخبار دیکھنے کے بعد میں نے اپنی رسٹ واچ میں
...دیکھا۔ مجھے وہاں آئے ہوئے چالیس منٹ ہوچکے تھے۔
اسی وقت شیخ صاحب کے کمرے سے دو آدمی باہر ... میں انہیں جانتا تھا۔ وہ دونوں ایک مقامی کمپنی کے منیجرز ... میں نے سوچا کہ شیخ صاحب ان لوگوں سے ایسی کون سی ...م میٹنگ کررہے تھے؟
اسی وقت انٹرکام بجا۔ شیخ صاحب کی پی اے نے ...یور اٹھایا اور بولی۔ ’’یس سر... جی ہاں سر، وہ ابھی موجود ...ں... او کے سر!‘‘ وہ ریسیور رکھ کر بولی۔ ’’مسٹر خرم! سر آپ ...بلا رہے ہیں۔‘‘
میں کمرے میں داخل ہوا تو اکرام شیخ نے پھیکی سی ...کراہٹ سے میرا استقبال کیا۔ میں نے ایک اور بات ...وس کی۔ وہ پہلے اپنی کرسی سے اٹھ کر نہایت پرتپاک انداز ...ں مجھ سے ملا کرتا تھا۔ اس وقت وہ اپنی ریوالونگ چیئر پر نیم ...از تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بیٹھنے کا اشارہ ...یا پھر بولا۔ ’’سوری مسٹر خرم! آپ کو اتنا طویل انتظار کرنا ...ا۔‘‘ پھر اس نے انٹرکام پر کافی بھیجنے کو کہا اور بولا۔ ’’جی مسٹر ...م! فرمایئے۔‘‘
’’شیخ صاحب!‘‘ میں نے مسکرا کر کہا۔ ’’آپ نے ...اید میری ای میل نہیں پڑھی؟‘‘
’’مجھے آپ کی ای میل مل چکی ہے۔‘‘ اکرام شیخ نے ...ٹ لہجے میں کہا۔ ’’لیکن مجھے افسوس ہے کہ فوری طور پر ...رے آفس میں آپ جیسے ہائی پروفائل آدمی کے لیے گنجائش ...یں ہے۔‘‘
میں نے حیرت سے اسے دیکھا، میرے جاب ...وڑنے سے ایک دن قبل ہی اس نے مجھے ملازمت کی ...یشکش کی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے ملازمت نہیں دینا چاہتا۔ ...س نے جان بوجھ کر مجھے انتظار کرایا۔ وہ جانتا تھا کہ میں پانچ ...ٹ سے زیادہ انتظار نہیں کروں گا اور غصے میں وہاں سے چلا ...ؤں گا۔ مجھے اس وقت تو غصہ نہیں آیا تھا لیکن اب یہ سوچ ...ر غصہ آگیا۔ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ’’شیخ صاحب! ابھی ...ند روز پہلے ہی تو آپ نے مجھے جاب آفر کی تھی۔ اب کیا ...چانک آپ کو مجھ جیسا کوئی دوسرا آدمی مل گیا؟‘‘
’’مسٹر خرم! اصل بات تو یہی ہے کہ میں اب آپ کو ...یں رکھ سکتا۔ آپ پر لاکھوں روپے کے غبن کا الزام ہے۔ ...رکیٹ میں اب آپ کی وہ ساکھ نہیں رہی۔ میں یہ بھی جانتا ...وں کہ آپ نے اپنی کمپنی پر کیس کردیا ہے۔ کیس کا فیصلہ آپ ...ے حق میں ہوجائے تو میری کمپنی کے دروازے آپ کے ...یے کھلے ہوئے ہیں لیکن اس وقت...‘‘
’’او کے مسٹر شیخ!‘‘ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔
’’مجھے اجازت دیں۔‘‘ میں اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔
’’میں نے آپ کے لیے کافی منگوائی ہے مسٹر خرم! پلیز... تشریف رکھیں۔‘‘
’’تھینک یو مسٹر شیخ! آپ کی کافی ڈیو رہی۔ اسے ہم آئندہ کسی موقعے اور خوش گوار ماحول میں پئیں گے... اللہ حافظ۔‘‘ میں نے جھٹکے سے دروازہ کھولا اور داخلی دروازے کا رخ کیا۔
پھر تین دن تک میں نے مختلف اداروں میں کوشش کی لیکن ہر جگہ سے مجھے مایوسی ہوئی۔
اس دوران میں روبی ہر شام مجھ سے گھر پر آکر ملتی رہی۔ مجھ پر ایک روز اچانک انکشاف ہوا تھا کہ میں روبی سے محبت کرنے لگا ہوں۔ میں نے اس دن اس کا اظہار بھی کردیا۔
روبی کا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا، پھر وہ نظریں جھکا کر بولی۔ ’’خرم! میں نے تو اسی دن تمہیں اپنے دل میں بسالیا تھا جب پہلی دفعہ تمہیں دیکھا تھا۔‘‘ اب ہمارے درمیان ’’آپ جناب‘‘ کا تکلف بھی نہیں رہا تھا۔
’’روبی! اگر تم نہ ہوتیں تو شاید میں اب تک فرخ کا خون کرچکا ہوتا یا پھر پاگل ہوگیا ہوتا۔ تمہاری وجہ سے مجھ میں جینے کی امنگ پیدا ہوگئی ہے۔ ورنہ یہ بھی ممکن ہے کہ میں خودکشی ہی کرلیتا۔‘‘
’’ایسی باتیں مت کرو خرم! ہمیں ان حالات کا مقابلہ کرنا ہے۔‘‘
جس دن کورٹ میں پیشی تھی، اس دن فرخ شہر کے ایک معروف وکیل کے ساتھ کورٹ پہنچا۔ اس کے ساتھ رمشا بھی تھی۔
اس نے کچھ جعلی چیکس اور واؤچرز کورٹ میں پیش کردیے۔
وقار نے اس پر جرح کرتے ہوئے کہا۔ ’’مسٹر فرخ! آپ کو کب معلوم ہوا کہ مسٹر خرم کمپنی کے اکاؤنٹ میں ہیر پھیر کررہے ہیں؟‘‘
’’مجھے اس بات کا علم کافی دیر میں ہوا کیونکہ میں خرم پر اندھا اعتماد کرتا تھا۔‘‘
’’جب آپ کو علم ہوا تو آپ نے پولیس کو انفارم کیا؟‘‘ وقار نے پوچھا۔
’’میں نے کمپنی کی گڈول بچانے کے لیے پولیس میں رپورٹ نہیں کی۔‘‘ فرخ نے کہا۔

''کون سی گڈول؟'' وقار نے سخت لہجے میں کہا۔

''آپ نے تو اخبارات میں اشتہار دے کر کمپنی کی گڈول مٹی میں ملا دی۔ اس کے باوجود آپ نے پولیس میں رپورٹ درج نہیں کرائی؟''

''میں نے سوچا کہ خرم کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ پولیس تو اس کے ساتھ بہت برا سلوک کرتی۔ یہی سوچ کر میں نے رپورٹ درج نہیں کرائی۔'' فرخ نے کہا۔

''آپ کو مسٹر خرم سے اتنی ہی ہمدردی تھی تو اخبارات میں ان کے خلاف بے بنیاد اور جھوٹے اشتہارات کیوں چھپوائے؟ آپ کے بیان میں تضاد ہے مسٹر فرخ'' وقار نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''عموماً جب کسی ادارے میں غبن کا کوئی ایسا کیس ہوتا ہے اور وہ ثابت بھی ہو جاتا ہے تو مالکان اس ملازم کو دو تین دن کی مہلت دیتے ہیں کہ وہ غبن کی رقم واپس کر دے ورنہ کیس پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ آپ نے ایسا نہیں کیا بلکہ بغیر کسی ریکوری کے خرم کو کمپنی سے نکال دیا۔ یہ سب آپ نے کمپنی کو بدنامی سے بچانے کی خاطر کیا لیکن دوسرے ہی دن آپ یہ بات بھول گئے اور خرم کے خلاف اخبارات میں اشتہارات چھپوا دیے۔ آپ کے بیان میں تو کھلا تضاد ہے۔''

اس موقعے پر فرخ کے وکیل صمدانی نے دخل اندازی کی۔ ''یور آنر! یہ تو میرے کلائنٹ کی شرافت ہے کہ اس نے مسٹر خرم کے خلاف کوئی قانونی چارہ جوئی نہیں کی۔ صرف اخبارات میں اشتہار دینے پر اکتفا کیا۔ اسے بھی میرے فاضل دوست نامناسب سمجھ رہے ہیں۔''

''اس لیے یور آنر کہ یہ تمام اشتہارات جھوٹ اور بدنیتی پر مبنی ہیں۔ اس سے میرے کلائنٹ کی ساکھ کو جو نقصان پہنچا ہے اس کا ازالہ کیسے ہوگا۔ اسی لیے میرے کلائنٹ نے ہتک عزت کا دعویٰ کیا ہے۔''

جج نے دونوں طرف کے دلائل سننے کے بعد اگلی تاریخ دے دی۔

کورٹ سے باہر آ کر وقار نے مجھ سے کہا۔ ''ان کے کیس میں جان نہیں ہے خرم... اگلی دو تین پیشیوں میں فیصلہ تمہارے حق میں ہو جائے گا۔''

☆☆☆

میں گھر پہنچا تو روبی وہاں پہلے سے موجود تھی۔ میں نے گھر کی ایک چابی اسے بھی دے دی تھی۔ وہ اکثر میری غیر موجودگی میں بھی آ جاتی تھی اور گھر کی صفائی کر دیتی تھی۔ نہ صرف گھر کی صفائی کرتی تھی بلکہ وہ تو استعمال شدہ برتن اور میلے کپڑے تک دھو دیتی تھی۔ میرا گھر اب آئینے کی طرح چمکنے لگا تھا۔

روبی نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔ ''کیس کا کیا فیصلہ ہوا خرم؟''

''ایسے کیسوں کے فیصلے پہلی پیشی میں نہیں ہوتے۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''یہاں کے عدالتی نظام سے تم بھی واقف ہو۔ ایسے کیس تو برسوں عدالتوں میں چلتے ہیں۔''

''پھر... پھر کیا سوچا ہے تم نے؟'' اس نے تشویش سے پوچھا۔

اس کی فکرمندی ایک طرح سے جائز بھی تھی۔ میں کوئی صنعت کار یا جاگیردار تو تھا نہیں کہ کچھ کیے بغیر عیش و آرام سے رہ لیتا۔ میری جمع پونجی بھی تیزی سے ختم ہو رہی تھی اور میرا اندازہ تھا کہ اگر یہی حال رہا تو شاید میرا بینک بیلنس تین چار مہینے ہی میں ختم ہو جائے گا۔ اس سے پہلے پہلے مجھے کوئی ملازمت ڈھونڈنا تھی۔

''میں جاب تلاش تو کر رہا ہوں روبی لیکن اس الو کے پٹھے فرخ نے ایسی صورتِ حال پیدا کر دی ہے کہ مجھے کہیں جاب بھی نہیں مل رہی ہے۔''

''ایک تجویز ہے۔'' روبی نے کہا۔ ''ضروری تو نہیں ہے کہ پاکستان ہی میں جاب کی جائے۔ تم پاکستان سے باہر بھی جا سکتے ہو۔''

''نہیں روبی۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''میں میدان چھوڑ کر نہیں بھاگوں گا۔ ملک چھوڑنے کا مطلب تو یہ ہوگا کہ میں نے فرخ کے تمام الزامات کو تسلیم کر لیا ہے اور ملک چھوڑ کر بھاگ گیا ہوں۔''

''سوری خرم!'' روبی نے کہا۔ ''میں نے اس پہلو سے نہیں سوچا تھا۔''

''آئندہ مجھے کوئی ایسا بزدلانہ مشورہ مت دینا۔'' میں نے کہا پھر ہنس کر بولا۔ ''چلو اسی بات پر اچھی سی کافی بنا کر لاؤ۔''

وہ الیکٹرک کیٹل پر چند منٹوں میں کافی بنا لائی۔

کافی پیتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا۔ ''آفس کی کوئی تازہ ترین خبر؟''

''تازہ ترین تو یہی ہے کہ آج کل رمشا پھر پابندی سے آفس آ رہی ہے۔ ان دونوں میں شاید کوئی معاہدہ ہو گیا ہے۔ دونوں ہی خوش گوار موڈ میں نظر آتے ہیں۔''

''تم پر کسی کو شبہ تو نہیں ہوا کہ تم مجھ سے ملتی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی تک تو کسی کو شبہ نہیں ہوا ہے۔'' روبی نے ہنس کر کہا۔ ''سب کچھ حسبِ معمول ہے۔''

کچھ دیر مزید بیٹھنے کے بعد روبی چلی گئی۔ مجھے اپنے تیزی سے کم ہوتے ہوئے بینک بیلنس کی فکر تھی۔ میں نے لیپ ٹاپ آن کر کے اپنا بینک اکاؤنٹ معلوم کیا تو میرے پیروں کے نیچے سے گویا زمین نکل گئی۔ اکاؤنٹ میں صرف دو لاکھ تین ہزار اور چار سو ستر روپے تھے۔

میں اگر انتہائی کنجوسی سے کام لیتا تو یہ دو لاکھ مزید چار مہینے چل سکتے تھے۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ آج کے بعد باہر کا کھانا بند... شاپنگ بند اور کسی بھی قسم کے کوئی فالتو اخراجات نہیں کروں گا۔ زیادہ وقت گھر میں گزاروں گا تاکہ گاڑی کی مد میں خرچ ہونے والے فیول کی بچت ہو سکے۔ صرف انتہائی ضروری کام سے باہر نکلوں گا۔

یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں نے نئی قائم ہونے والی اور ذرا کم اہمیت کی حامل کمپنیوں کو اپنا سی وی ای میل کر دیا کہ ممکن ہے ان میں سے کسی کا جواب آ ہی جائے۔

دوسرے دن میں گھر سے نکلا اور تقریباً پندرہ دن کا راشن خرید لیا۔ اس میں گوشت، چکن، سبزیاں، دالیں، چینی، چائے کی پتی، کافی اور خشک دودھ وغیرہ شامل تھا۔ وہ تمام سامان لا کر میں نے ڈیپ فریزر میں بھر دیا۔

میں اپنے لان کی دیکھ بھال بھی خود ہی کرتا تھا۔ گزشتہ دو تین ہفتے سے میں نے اس پر بھی توجہ نہیں دی تھی۔ لان کی گھاس تراشنے اور پودوں کو پانی دینے کے بعد میں نے برآمدے اور پورچ کا فرش بھی اچھی طرح دھویا۔ مین گیٹ پر اچھی خاصی دھول جم گئی تھی۔ میں نے اسے بھی دھو ڈالا۔ اب مجھے اپنا گھر واقعی گھر لگ رہا تھا۔ اس کام میں بھوک چمک اٹھی تھی۔ فریزر میں کباب بھی تھے۔ میں نے لنچ میں سینڈوچز لیے اور کافی پی کر لمبی تان کے سو گیا۔

☆☆☆

آئندہ پیشی پر فرخ کے ساتھ رمشا پھر موجود تھی۔ اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں عدالتی کارروائی سے آپ کو بور نہیں کروں گا۔ فرخ نے جو واؤچرز اور چیک کورٹ میں پیش کیے تھے، انہیں وقار نے جعلی ثابت کرنے کے لیے کمپنی کے اکاؤنٹنٹ کو ریکارڈ سمیت کورٹ میں طلب کرنے کی درخواست کی جسے جج صاحب نے قبول کر لیا اور آئندہ پیشی پر اکاؤنٹنٹ اور متعلقہ عملے کو عدالت میں طلب کر لیا۔ آئندہ پیشی کے لیے بھی وقار نے کسی نہ کسی طرح آئندہ ہفتے کی تاریخ لے لی۔

''آئندہ پیشی میں اس مقدمے کا فیصلہ تمہارے حق میں ہو جائے گا۔'' وقار نے بہت وثوق سے کہا۔ ''ہاں، تم نے بتایا تھا کہ کمپنی کا سارا عملہ تم سے ہمدردی رکھتا ہے۔ اگر اکاؤنٹ سیکشن میں تمہارے اعتبار کا کوئی آدمی ہے تو اس سے کہو کہ وہ اکاؤنٹ پر نظر رکھے اور کسی بھی قسم کا ہیر پھیر نہ ہونے دے۔ فرخ اس ایک ہفتے کے دوران میں اپنی سی کوشش تو کرے گا نا۔''

وقار کے جانے کے بعد میں سوچتا رہا کہ اکاؤنٹس میں ایسا کون سا آدمی ہے جو میری مدد کر سکتا ہے؟ مجھے فوراً اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ علی رضا کا خیال آیا۔

پانچ سال پہلے میں نے ہی اسے کمپنی میں جاب دلوائی تھی۔ دو سال پہلے اس کی بہن کی شادی کے موقعے پر اسے ایک لاکھ روپے دیے تھے۔ اس نے تھوڑے تھوڑے کر کے وہ پیسے مجھے لوٹانے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیا تھا۔ ''وہ پیسے تو میری طرف سے بہن کے لیے گفٹ تھا۔ اب اس موضوع پر کوئی بات مت کرنا۔''

اس دن کے بعد سے وہ میرا کچھ زیادہ ہی احترام کرنے لگا تھا۔

گھر واپس آ کر میں نے روبی کو سیل فون پر کال کی اور اس سے کہا۔ ''اگر ہو سکے تو آج چار بجے تک علی رضا کو بہت احتیاط اور رازداری سے میرے گھر بھیج دو۔ مجھے اس سے بہت ضروری کام ہے۔''

ٹھیک چار بجے کال بیل کی آواز گونجی۔ میں نے دروازہ کھولا تو علی رضا کھڑا تھا۔ میں فوراً اسے اندر لے آیا۔

''علی رضا! کیا تم بھی یہی سمجھتے ہو کہ میں نے کمپنی میں غبن کیا ہے؟'' میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتا سر!'' علی رضا نے کہا۔ ''اور میں ہی کیا، ادارے کا ہر فرد جانتا ہے کہ آپ پر یہ الزام سراسر جھوٹا ہے۔''

''تو پھر تم میرا ایک کام کرو۔'' میں نے کہا۔ ''اب فرخ کمپنی کے اکاؤنٹس میں ہیر پھیر کرنے کی کوشش کرے گا۔ واجد صاحب یوں بھی ان کاموں میں ماہر ہیں۔'' واجد صاحب کمپنی کے اکاؤنٹس منیجر تھے اور نہ جانے کیوں ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے تھے۔

''سر! کمپنی کے اکاؤنٹس میں ردوبدل کا کام تو واجد صاحب نے بہت پہلے شروع کر دیا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا؟'' میرے لہجے میں مایوسی تھی۔

''ہو کیوں نہیں سکتا سر!'' علی رضا نے ہنس کر کہا۔ ''جب آپ نے کمپنی پر کیس کیا تو مجھے اندازہ تھا کہ واجد صاحب اب اکاؤنٹس میں کوئی گڑبڑ کر سکتے ہیں۔ میں نے اکاؤنٹس کے ڈیٹا کا پورا فولڈر اپنے ذاتی کمپیوٹر میں محفوظ کر لیا ہے۔''

''لیکن تم نے کورٹ میں وہ ڈیٹا پیش کیا تو تمہاری ملازمت بھی جا سکتی ہے۔''

''میری ملازمت آپ کی عزت سے زیادہ نہیں ہے سر!'' اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''مجھے تو ایک دو مہینے میں دوسری جاب مل جائے گی لیکن آپ کی نیک نامی پر لگا ہوا داغ تو دھل جائے گا۔ سر! آپ ہی نے تو میری بہن کو اپنی بہن کہا تھا۔ اس لحاظ سے میں آپ کا چھوٹا بھائی ہوں۔ کیا میں آپ کے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتا؟ آپ فکر مت کریں۔ میں کورٹ میں اصلی اکاؤنٹ کا ڈیٹا ہی پیش کروں گا۔''

میں نے اٹھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''علی رضا! یہ تمہارا مجھ پر احسان ہوگا۔''

''احسان کیسا سر! میں کورٹ میں صرف اور صرف سچ بولوں گا۔''

اسے دوبارہ آفس جانا تھا اس لیے میں نے اسے زیادہ دیر نہیں روکا۔ اس کے جانے کے بعد میں مطمئن ہو گیا تھا کہ اب تو فیصلہ ہر صورت میں میرے ہی حق میں ہوگا۔

پھر ایک ہفتہ اسی روٹین میں گزر گیا۔ میں صبح سویرے جاگنگ کرتا، گھر آ کر ایکسر سائز کرتا، اخبار پڑھتا، کھانا بناتا پھر شام کو روبی آ جاتی تو اسے دیکھ کر دن بھر کی تھکن اور... بیزاری دور ہو جاتی۔

ایک دن روبی آئی تو شدید بارش ہو رہی تھی۔ وہ اچھی خاصی بھیگی ہوئی تھی اور بری طرح کانپ رہی تھی۔

میں نے اس سے کہا۔ ''روبی! کپڑے بدل لو ورنہ بیمار پڑ جاؤ گی۔ یہاں زنانہ کپڑے تو نہیں ملیں گے، تم کچھ دیر کے لیے میرے کپڑے پہن کر اپنے کپڑے سکھا لو۔''

آسمان بادلوں سے کالا ہو رہا تھا۔ کمرے میں اچھا خاصا اندھیرا تھا۔ میں نے اسی لیے ٹیوب لائٹ روشن کر رکھی تھی۔ روبی میرا ایک شلوار سوٹ لے کر باتھ روم میں چلی گئی۔

وہاں سے واپسی پر وہ اس حلیے میں برآمد ہوئی کہ بے اختیار میری ہنسی نکل گئی۔ ڈھیلی ڈھالی شلوار قمیص میں بھی وہ اچھی لگ رہی تھی اور اس کا متناسب جسم چھپنے کے بجائے مزید نمایاں ہو رہا تھا۔

اس وقت بہت زور سے بادل گرجے اور خوف ناک انداز میں بجلی کی کڑک سنائی دی۔ روبی چیخ مار کے مجھ سے لپٹ گئی۔ اسی وقت لائٹ بھی چلی گئی۔

وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔ میں بھی کانپ کر رہ گیا لیکن بجلی کے کڑاکے اور بادل کی گرج سے نہیں بلکہ روبی کے بالوں سے اٹھتی ہوئی بھینی بھینی خوشبو اور اس کے جسم کے گداز سے!

اچانک روبی کو بھی احساس ہو گیا کہ وہ کس حالت میں ہے۔ اس نے کسمسا کر میرے بازوؤں کے حلقے سے نکلنا چاہا لیکن میری گرفت مضبوط تھی۔

ایک دو بار کی کوشش کے بعد اس نے گویا ہتھیار ڈال دیے۔

اچانک مجھے بھی احساس ہوا کہ میں حد سے زیادہ آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ پھر میرے ضمیر نے مجھے ملامت کیا تو میں نے آہستگی سے اسے چھوڑ دیا اور اٹھ کر ایمرجنسی لائٹ روشن کر دی۔ وہ بیڈ پر گری گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ روشنی ہوتے ہی اسے اپنی حالت کا احساس ہوا اور وہ جھپٹ کر اٹھ بیٹھی۔ میں اسے نظر انداز کر کے کچن میں چلا گیا اور چولہا جلا کر کافی کے لیے پانی رکھ دیا۔

چند منٹوں بعد میں کافی لے کر آیا تو روبی کی حالت خاصی نارمل تھی لیکن وہ مجھ سے نظریں نہیں ملا رہی تھی۔

میں نے کافی کا کپ اس کی طرف بڑھایا تو وہ تھرتھراتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''خرم! تم مجھ سے ناراض ہو؟''

''ناراض؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''کیوں بھئی۔ میں تم سے کیوں ناراض ہونے لگا؟''

وہ میرے اس جملے کو بھی طنز ہی سمجھی اور نظریں جھکا کر بولی۔ ''میں نے شاید تمہیں دو تین دفعہ پیچھے دھکیلا تھا۔''

''ناراض تو میں خود سے ہوں روبی!'' میں نے کہا۔ ''ایسی نوبت ہی کیوں آئی؟ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ بروقت میں ہوش میں آ گیا ورنہ...'' میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ پھر ہنس کر بولا۔ ''اب تم بھی خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے ہمیں شرمندہ ہونے سے بچا لیا۔ اب اس بات کو بھول جاؤ اور کافی پیو ورنہ ٹھنڈی ہو جائے گی۔''

''بارش تو اس وقت بھی بہت شدید ہو رہی ہے۔'' روبی نے کہا۔ ''میں گھر کیسے جاؤں گی؟''

''تمہارے کپڑے سوکھ جائیں تو میں تمہیں گاڑی میں گھر تک چھوڑ دوں گا۔ تم پہلے اپنے گھر ٹیلی فون کر دو کہ بارش کی وجہ سے گھر آنے میں دیر ہو جائے گی۔''

☆☆☆

اگلے ہفتے پیشی پر فرخ کے ساتھ رمشا کے علاوہ کمپنی کے اکاؤنٹس منیجر واجد شمس الرحمٰن، ڈپٹی منیجر وسیم احمد اور اکاؤنٹس آفیسر علی رضا بھی تھا۔

واجد صاحب نے اکاؤنٹس رجسٹر جج صاحب کو پیش کر دیا۔ فرخ کے وکیل نے رجسٹر پر نہ صرف ان رقوم کو گلابی رنگ سے ہائی لائٹ کر دیا تھا بلکہ اس صفحے پر ان چیکس کے کاؤنٹر فائل اور واؤچرز بھی لگا دیے تھے جن کے ذریعے میں نے غبن کیا تھا۔ جج صاحب نے اکاؤنٹس کے ایک ماہر کو وہ رجسٹر دے دیا اور عدالت ایک گھنٹے کے لیے برخاست کر دی۔

فرخ اور رمشا کے چہروں پر فتح کی خوشی اور میرے لیے حقارت تھی۔ میں وقار کو بتا چکا تھا کہ کورٹ میں میرا بھی ایک آدمی موجود ہے۔

کیس کی سماعت دوبارہ شروع ہوئی تو اکاؤنٹس کے ماہر نے جج صاحب کو بتایا کہ مسٹر فرخ کی پیش کی ہوئی رپورٹ درست ہے۔

''وہ رپورٹ بعد میں تیار کی گئی ہے۔'' وقار نے کہا۔ ''میرے پاس ایک ایسا گواہ موجود ہے جو نہ صرف فرخ صاحب کے اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں خاصے اہم عہدے پر فائز ہے بلکہ اس کے پاس کمپنی کے اکاؤنٹس کا اوریجنل ڈیٹا بھی موجود ہے۔''

پھر اس نے علی رضا کا نام لیا تو گویا واجد صاحب اور فرخ کو سانپ سونگھ گیا۔

علی رضا نے کمپنی کے اصل اکاؤنٹس جج صاحب کو پیش کر دیے اور انہیں بھی مختصراً وہی بتایا جو وہ مجھے بتا چکا تھا کہ اس کی ضرورت کیوں پیش آئی۔

اس نے جج صاحب کو بتایا۔ ''سر! میں نے ان کاغذات میں کچھ ایسی کمپنیز کو ہائی لائٹ کیا ہے جن سے ہم نے بزنس کیا ہے۔ ان کمپنیوں کا ریکارڈ واجد صاحب کے اکاؤنٹس رجسٹر میں موجود نہیں ہے لیکن دوسری کمپنیوں کے اکاؤنٹس میں تو واجد صاحب ہیرا پھیری نہیں کر سکتے۔ میرا اکاؤنٹس رجسٹر دوسری کمپنیوں سے چیک کیا جا سکتا ہے۔''

''آبجیکشن یور آنر!'' فرخ کے وکیل نے کہا۔ ''علی رضا بھی مسٹر خرم کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ پھر واجد صاحب کمپنی کے اکاؤنٹس منیجر ہیں اور علی رضا جونیئر ہے۔ اس کی رپورٹ بھلا کیسے ہو سکتی ہے؟''

''بہت آسانی سے۔'' وقار نے سرد لہجے میں کہا۔ ''جن گیارہ کمپنیوں کو علی رضا نے ہائی لائٹ کیا ہے اور جن کا ریکارڈ واجد صاحب کے رجسٹر میں موجود نہیں ہے، ان سے کنفرم کیا جا سکتا ہے۔''

''فرخ صاحب!'' جج صاحب نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''عدالت کا وقت برباد کرنے سے بہتر یہی ہے کہ آپ ابھی سچ بول دیں۔ بعد میں یہ بات سچ ثابت ہوئی تو آپ کے ساتھ اکاؤنٹس منیجر کو بھی فراڈ کے جرم میں جیل جانا پڑے گا۔''

''یور آنر!'' فرخ کے وکیل نے کہا۔ ''گواہ علی رضا کی رپورٹ خود ساختہ اور جھوٹ پر مبنی ہے۔ میں چاہوں گا کہ کورٹ ان کمپنیز سے کنفرم کرے جنہیں گواہ نے ہائی لائٹ کیا ہے۔''

''یور آنر!'' وقار نے کہا۔ ''میرے گواہ علی رضا نے یہ رپورٹ اٹھائیس ستمبر کو اپنی ای میل میں سیو کی ہے جیسا کہ کمپیوٹرائز ڈ ڈیٹ سے ثابت ہو رہا ہے۔ کیا گواہ ایک دن میں اتنی طویل اور تفصیلی رپورٹ تیار کر سکتا ہے؟ یہ رپورٹ پانچ سو سے زائد صفحات پر مبنی ہے۔ اس میں چیک نمبرز، ڈرافٹ، دوسری کمپنیز کو پے منٹ، اسٹاف کو پے منٹ جیسی تمام جزئیات بھی شامل ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی آدمی صرف ایک دن میں اتنے صفحات نہ صرف تیار کرے بلکہ ان میں تبدیلی بھی کر دے؟ جہاں تک کنفرمیشن کا تعلق ہے تو وہ میں ابھی کنفرم کر سکتا ہوں۔'' وقار کے اس جملے نے فرخ کے رہے سہے ہوش بھی اڑا دیے۔ اس نے ایک فائل جج صاحب کو پیش کر دی۔ ''یہ ان کمپنیز کی رپورٹ ہے جن کی نشان دہی گواہ نے کی ہے۔'' گویا وقار نے پہلے ہی تمام تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ اس ایک ہفتے کے دوران میں جب واجد صاحب جعلی رپورٹ بنانے میں مصروف تھے، وقار ان کمپنیز سے کنفرمیشن لیٹرز لے رہا تھا۔

جج صاحب نے ان کاغذات کا جائزہ لیا۔ پھر کھنکھار کر بولے۔ ''تمام ثبوت اور شواہد دیکھتے ہوئے یہ عدالت اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ مسٹر فرخ نے مسٹر خرم پر جھوٹا الزام لگا کر ان کی عزت اور ساکھ کو نقصان پہنچایا ہے۔ یہ عدالت مسٹر فرخ کو حکم دیتی ہے کہ وہ فوری طور پر مسٹر خرم کو ہرجانے کے دو کروڑ روپے ادا کریں اور ملک کے تمام اخبارات میں نمایاں اشتہار دے کر اپنے اس جرم کا اعتراف کریں۔ عدالت مسٹر واجد شمس الرحمٰن کو جعل سازی کے الزام میں تین سال قید با مشقت اور ایک لاکھ روپے جرمانے کی سزا سناتی ہے۔ بہ صورت عدم ادائیگی جرمانہ، مسٹر واجد کی سزا میں چھ ماہ کا

اضافہ ہو جائے گا۔ دی کورٹ از ایڈجرنڈ!'' یہ کہہ کر جج صاحب اٹھے تو وہاں موجود تمام لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ جج صاحب پنے تلے قدم رکھتے ہوئے اپنے چیمبر میں چلے گئے۔

فرخ کا چہرہ توہین اور غصے کی زیادتی کی وجہ سے سرخ ہو رہا تھا۔ رمشا کا چہرہ بھی غصے سے مسخ ہو رہا تھا۔ وہ دونوں مجھ سے زیادہ علی رضا کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ واجد صاحب کا حال بُرا تھا۔ ان کا چہرہ کورے لٹھے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ بنیادی طور پر وہ ایسے آدمی نہیں تھے۔ انہوں نے تو یہ کام فرخ کے ایما پر کیا تھا۔

جب پولیس نے انہیں ہتھکڑی لگائی تو ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

''سر! ہم کورٹ کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کریں گے۔'' فرخ کے وکیل نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔

''گوٹو ہیل!'' فرخ نے چیخ کر کہا۔ ''مجھے سپریم کورٹ جانے میں کوئی انٹرسٹ نہیں ہے۔ فراڈ تو فراڈ ہوتا ہے۔ میں نے ایک فراڈ کیا ہے تو اسے سپریم کورٹ بھی کیسے سچ مان لے گی۔''

''سر...'' واجد صاحب نے شکستہ لہجے میں کہا۔ ''میرا کیا ہوگا؟''

''آپ تو بہت ماہر بنتے تھے اکاؤنٹس کے... یہی آپ کی مہارت ہے؟ آپ کی سزا یہی ہے۔'' یہ کہہ کر فرخ اور رمشا عدالت سے باہر نکل گئے۔

''واجد صاحب!'' میں نے کہا۔ ''آپ فکر مت کریں۔ میں آپ کا کیس لڑوں گا۔ یہ وقار بہت ذہین وکیل ہے۔ یہ کوئی نہ کوئی راستہ نکال لے گا۔''

باہر آکر وقار نے مجھ سے کہا۔ ''اب فرخ سپریم کورٹ بھی نہیں جاسکتا۔ میں نے اس کی وہ گفتگو ریکارڈ کرلی ہے جو وہ اپنے وکیل سے سپریم کورٹ کے بارے میں کر رہا تھا۔ ایک وکیل ہونے کے ناتے مجھے اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنا پڑتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر میں منی ٹیپ ریکارڈر اپنی جیب میں ضرور رکھتا ہوں۔ اس کا مائیکروفون اتنا حساس ہے کہ پندرہ فٹ دور کی آواز بھی بالکل صاف صاف ریکارڈ کر لیتا ہے۔ اب تم یہ بتاؤ کہ مجھے پارٹی کب دے رہے ہو؟''

''اینی ٹائم... جب تم کہو۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''او کے یار! مجھے ابھی ایک اور کیس کے لیے سپریم کورٹ جانا ہے۔ وش یو گڈ لک... اللہ حافظ۔'' وقار مسکراتا ہوا چلا گیا۔

عدالت کے احاطے میں فرخ گاڑی کے انتظار میں کھڑا تھا۔ ڈرائیور پارکنگ سے گاڑی لینے گیا ہوا تھا۔

میں نے اس کے قریب پہنچ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر فرخ! ایک پرانی کہاوت ہے جو لوگ دوسروں کے لیے گڑھا کھودتے ہیں، وہ خود اسی میں گرتے ہیں۔''

''شٹ اپ!'' فرخ نے بھنا کر کہا۔ اسی وقت اسے علی رضا دکھائی دیا۔ فرخ نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''میں تمہیں ابھی اور اسی وقت جاب سے فارغ کر رہا ہوں۔ مجھے ایسے آستین کے سانپوں کی ضرورت نہیں ہے۔''

''سر! میں یہاں آنے سے پہلے ہی جی ایم صاحب کو اپنا ریزائن دے آیا تھا۔'' فرخ نے بھی تلخ لہجے میں کہا۔

''ہاں، ظاہر ہے... تمہیں خرم نے اچھی خاصی رقم دی ہوگی۔ تمہیں فی الحال جاب کی ضرورت بھی نہیں ہے۔''

''او کے گائز!'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''اگر آپ چاہیں تو سپریم کورٹ میں ملاقات ہو سکتی ہے ورنہ خدا حافظ۔'' میں نے مسکرا کر کہا اور آگے بڑھ گیا۔

علی رضا میرے ساتھ ہی گھر آ گیا تھا۔ ہم نے آتے ہوئے ایک اچھے ریسٹورنٹ سے لنچ کا سامان پیک کرالیا تھا کیونکہ گھر پر روبی بھی آنے والی تھی۔ ہم لوگ آج کی فتح کو سیلی بریٹ کرمنانے والے تھے۔ روبی کو میں نے سیل فون پر بتا دیا تھا۔ ''فیصلہ ہمارے حق میں ہو گیا ہے لیکن تم ابھی اسی طرح کام کرتی رہو۔ ہاں، لنچ میرے ساتھ کرلو۔''

''ہم گھر پہنچے ہی تھے کہ روبی بھی آگئی۔ وہ علی رضا کو دیکھ کر کچھ جھجکی۔ میں نے ہنس کر کہا۔ ''فکر مت کرو روبی.. علی رضا اپنا ہی آدمی ہے۔'' میں تو خیر خوش تھا ہی، روبی کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ بات بات پر کھلکھلا رہی تھی۔ ہم سب کا یہی خیال تھا کہ اب فرخ سپریم کورٹ نہیں جائے گا اور جائے گا بھی تو عدالت، ہائی کورٹ کا فیصلہ مسترد نہیں کرے گی کیونکہ اس کا کیس بہت کمزور تھا۔ لنچ کے بعد علی رضا اور روبی علیحدہ علیحدہ رخصت ہو گئے۔

دوسرے دن کے اخبارات میں فرخ کی طرف سے میرے لیے اشتہار چھپا تھا۔ اشتہار کیا، وہ ایک طرح سے معافی نامہ تھا۔ اشتہار میں میری تصویر کے ساتھ لکھا تھا کہ خرم سرفراز ولد سرفراز احمد ایک دیانت دار آدمی ہیں۔ اکاؤنٹس آفس کی کچھ غلطیوں کی بنا پر کمپنی کی انتظامیہ نے ان کی ایمان داری اور نیک نیتی پر شک کیا۔ اس کے لیے ہم مسٹر خرم سرفراز سے معذرت خواہ ہیں۔ ہماری وجہ سے ان کی ساکھ کو جو نقصان پہنچا ہے، اس کا ازالہ تو نہیں ہو سکتا لیکن ہم چاہتے ہیں کہ وہ ہماری ماضی کی غلطیوں کو بھلا کر ایک مرتبہ پھر ہماری کمپنی میں شامل ہو جائیں۔

اسی وقت وقار کا ٹیلی فون آگیا۔ وہ بھی بہت خوش تھا۔ اس نے کہا۔ ''خرم! تم نے آج کا اخبار دیکھا؟''

''ہاں دیکھ لیا ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''فرخ نے یہ اشتہار ملک کے تقریباً ہر بڑے اخبار میں شائع کرایا ہے۔''

''بھئی، میں مانتا ہوں کہ تم بہت بڑے اور ذہین ایڈووکیٹ ہو۔ یہ بتاؤ تمہاری فیس کتنی باقی ہے؟''

''فیس کی بات بعد میں ہوگی، پہلے تو تم مجھے کسی اچھے سے فائیو اسٹار ہوٹل میں ڈنر کراؤ اور میری ہونے والی بھابی سے ملواؤ۔''

میں اسے روبی کے بارے میں بتا چکا تھا۔ میں نے ہنس کر کہا۔ ''یار! فی الحال صرف ڈنر کرلو۔ اپنی بھابی سے بعد میں مل لینا۔ ابھی وہ مصلحتاً وہیں جاب کر رہی ہے۔''

''چلو ٹھیک ہے، پھر آج کا ڈنر کنفرم!'' وقار نے ہنس کر کہا۔ ''میں آٹھ، ساڑھے آٹھ بجے تک تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔''

میں نے رسمی جملوں کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔

ابھی میں نے فون رکھا ہی تھا کہ میرے سیل فون پر کال آگئی۔ اسکرین پر صرف نمبر تھا، نام نہیں تھا۔ مجھے یاد پڑتا تھا کہ میں نے وہ نمبر پہلے بھی دیکھا ہے۔ میں نے کال ریسیو کرلی۔ ''ہیلو!'' میں نے کہا۔

''مسٹر خرم سرفراز!'' دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ ''میں زیڈ این ایکس انٹرپرائزز سے بول رہی ہوں۔''

''یس!'' میں نے کہا۔

''پلیز ہولڈ آن! ایم ڈی صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

فوراً ایم ڈی لائن پر آگیا۔ ''مسٹر خرم! میں اعجاز احمد بول رہا ہوں۔ آپ نے کچھ دن پہلے اپنا سی وی ہمیں بھیجا تھا۔ کیا آج سیکنڈ ہاف میں آپ سے میٹنگ ممکن ہے؟''

زیڈ این ایکس مقامی کمپنی تھی۔ اس سے قبل اعجاز صاحب مختلف حیلوں بہانوں سے ٹال مٹول کرتے رہے تھے۔ آج کے اخبارات دیکھتے ہی انہوں نے مجھے کال کرلیا تھا۔

''مسٹر اعجاز!'' میں نے کہا۔ ''آج تو میں بہت بزی ہوں۔ ٹائم ملتے ہی آپ کو کال کرلوں گا پھر میٹنگ کی ڈیٹ کنفرم کرلیں گے۔ سوری سر! بٹ...''

''ٹھیک ہے مسٹر خرم! سوری کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں آپ کی کال کا انتظار کروں گا۔''

ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع کرنے کے بعد میرے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ آگئی۔ کل تک یہی اعجاز صاحب تھے جن کے پاس مجھ سے ملاقات کرنے کا وقت نہیں تھا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر وہ اخبار اٹھا لیا جس میں فرخ کی طرف سے اشتہار چھپا تھا۔ اسی صفحے پر ایک طرف دو کالمی ایک خبر بھی تھی۔ ''ملک کے معروف بزنس مین مسٹر فرخ فضل الرحمٰن کی شکست۔ انہوں نے اپنے ایک سینئر آفیسر مسٹر خرم پر غبن کا الزام لگایا تھا جو عدالت میں جھوٹا ثابت ہوا۔ انہوں نے کورٹ میں نہ صرف اپنے اس جرم کا اقرار کیا بلکہ وہ مسٹر خرم سرفراز کو ہتک عزت کے دعوے پر دو کروڑ روپے بھی ادا کریں گے۔ کمپنی کے اکاؤنٹس منیجر مسٹر واجد شمس الرحمٰن کو ہیر پھیر اور جعلی ریکارڈ بنانے پر عدالت نے تین سال قید بامشقت اور ایک لاکھ روپے جرمانے کی سزا بھی سنائی ہے۔''

یہ خبر پڑھ کر مجھے مزید خوشی ہوئی۔ اب یا تو یہ بھی وقار کا کارنامہ تھا یا پھر اخبار کا رپورٹر بھی کورٹ میں موجود تھا۔ کچھ بھی تھا.. خبر پڑھ کر میرا سیروں خون بڑھ گیا تھا۔

ہائی کورٹ نے فرخ کو ادائیگی کے لیے تین دن کی مہلت دی تھی۔ اس موقعے پر مجھے نہ جانے کیوں فرخ کے والد یاد آگئے۔ وہ انتہائی شفیق اور شریف النفس انسان تھے۔ مجھے تو وہ اپنے بیٹوں کی طرح چاہتے تھے اور اکثر کہتے تھے کہ میرے دو بیٹے ہیں۔ ایک فرخ اور دوسرا خرم! وہ اگر زندہ ہوتے تو یہ واقعہ رونما ہی نہیں ہوتا۔

پھر مجھے رمشا کا خیال آیا۔ وہ میری جیت پر کس بُری طرح پیچ و تاب کھا رہی ہوگی۔

اچانک پھر میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسکرین پر ملک کی ایک معروف کمپنی آصف برادرز پرائیویٹ لمیٹڈ کا نام تھا۔ ان کا نمبر میرے پاس محفوظ تھا۔ میں نے سیل فون کان سے لگا کر کہا۔ ''یس، خرم اسپیکنگ!''

''مسٹر خرم! باس آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ ہولڈ آن پلیز!'' آپریٹر نے خالص کاروباری لہجے میں کہا۔

پھر آصف برادرز کے ایم ڈی مسٹر عاطف لائن پر آگئے۔ ''ہیلو خرم! میں عاطف بول رہا ہوں۔'' ان کے لہجے میں مصنوعی اپنائیت تھی۔

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ میں ضبط کر کے بولا۔ ''مسٹر عاطف! فرمائیے کیسے زحمت کی؟''

"سب سے پہلے تو میری طرف سے مبارک باد وصول کیجیے کہ آپ نے عدالت میں خود کو بے گناہ ثابت کیا اور فرخ جیسے خودسر آدمی کو پوری مارکیٹ میں رسوا کر دیا۔"

"سوری سر!" میں نے کہا۔ "فرخ صاحب میرے باس ہیں۔ ان سے بھی ایک غلطی ہو گئی تھی۔ وہ بڑے دل اور بڑے ظرف والے آدمی ہیں۔ انہوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔ اصل میں تو یہ اکاؤنٹس منیجر کا ہیر پھیر تھا۔" میں نے منافقت سے کہا۔ میں جانتا تھا کہ انہوں نے مجھے کیوں کال کی ہے۔

"تو کیا آپ اب بھی مسٹر فرخ کے ساتھ کام کریں گے؟" ان کے لہجے میں حیرت سے زیادہ مایوسی تھی۔

"میں نے ابھی تک حتمی فیصلہ نہیں کیا ہے... ویسے بھی ابھی کچھ دن میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

"مسٹر خرم! ہماری کمپنی کے دروازے آپ کے لیے کھلے ہوئے ہیں اور میری وہ آفر اب بھی برقرار ہے۔"

"تھینک یو سر! اگر میں نے کہیں اور جوائننگ کا فیصلہ کیا تو آپ کی کمپنی کو ترجیح دوں گا۔"

"تھینک یو مسٹر خرم! میں آپ کا انتظار کروں گا۔"

مجھے پھر ہنسی آ گئی اور میں بے تحاشا ہنسنے لگا۔ مجھے لوگوں کی منافقت پر ہنسی آ رہی تھی۔ چند دن پہلے یہی عاطف صاحب مجھ سے بہت سرد مہری سے ملے تھے اور گول مول بات کرنے کے بعد مجھے ٹرخا دیا تھا۔

اسی وقت پھر سیل فون کی گھنٹی بجی۔ میں اس مرتبہ جھنجلا گیا اور فیصلہ کر لیا کہ یہ کال ریسیو نہیں کروں گا۔ میں نے اسکرین پر روبی کا نام دیکھا تو اپنا فیصلہ بدلنا پڑا۔ "ہاں روبی ڈیئر!"

"اچھی خبر نہیں ہے خرم!" روبی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ابھی ابھی فرخ اور رمشا میں زبردست تلخ کلامی ہوئی ہے۔ یہ خبر مجھے احمد خان نے دی تھی۔ مسٹر فرخ کہہ رہے تھے کہ اب وہ رمشا کو ایک پیسا بھی نہیں دیں گے۔ میں یہ بات تمہیں بتانے ہی والی تھی لیکن تمہارا سیل فون بزی جا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس وقت لینڈ لائن پر کال کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ میں تمہارا نمبر ملا ہی رہی تھی کہ احمد خان پھر آ گیا اور بولا۔ 'روبی بی بی! ان دونوں میں ابھی تک لڑائی ہو رہی ہے۔'

"اسی وقت علی رضا آفس آیا۔ وہ اپنے ڈیوز لینے آیا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ تم نے تو بہت زبردست کام کیا ہے۔ پورے کیس کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا۔

"'اس سے زیادہ اہم کام تو تمہارا تھا۔ یہاں کی خبریں تو تم ہی خرم صاحب کو پہنچاتی تھیں۔'

"چچا آؤٹ تھے اس لیے آس پاس کوئی نہیں تھا۔ ہم دونوں خاصے غیر محتاط انداز میں بات کر رہے تھے۔

"رمشا نہ جانے کب وہاں آ گئی اور اس نے ہماری باتیں سن لیں۔

"وہ چیخ کر بولی۔ 'کمینی عورت، یہ تو تھی جو یہاں کی خبریں خرم کو پہنچاتی تھی۔ جس تھالی میں کھاتی ہے، اسی میں چھید کرتی ہے۔ دفع ہو جا یہاں سے۔ تیرا تو میں وہ حشر کر دوں گی کہ تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی۔'

"مجھے بھی غصہ آ گیا۔ میں نے کہا۔ 'اپنی زبان کو لگام دو رمشا! کم سے کم تم جیسی گھٹیا عورت کی زبان سے ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں۔ اور تم ہوتی کون ہو مجھے یہاں سے نکالنے والی؟ میں تمہاری ایمپلائی نہیں ہوں۔ دفع تم ہو یہاں سے۔ ہاں اگر مسٹر فرخ کہیں گے تو میں سو بار اس ملازمت پر لعنت بھیج دوں گی۔'

"اس کی چیخ پکار سے فرخ بھی کمرے سے نکل آیا اور چیخ کر رمشا سے بولا۔ 'تم نے میرے آفس کو کیا سمجھ رکھا ہے۔ تمہیں میرے کسی بھی اسٹاف ممبر سے اس لہجے میں بات کرنے کا حق نہیں ہے۔ اب تم دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'

"'یہ کمینی...'

"رمشا نے فرخ کو بتانا چاہا لیکن اس نے رمشا کی بات کاٹ دی۔ 'گیٹ لاسٹ۔'"

"تم ایسا کرو کہ ابھی اپنا ریزائن جی ایم صاحب کو دے دو اور اس میں صاف صاف لکھ دو کہ میں اس ماحول میں کام نہیں کر سکتی جہاں باہر کے لوگ بھی بے عزتی کر کے چلے جائیں۔ یہ کام ابھی اور اسی وقت کر لو۔ کچھ معلوم نہیں کہ رمشا پھر آفس آ جائے اور فرخ کو اپنی اداؤں سے رام کر لے۔"

"میں ریزائن دے کر تمہارے پاس آ رہی ہوں۔"

مجھے روبی کی طرف سے تشویش پیدا ہو گئی تھی۔ اگر رمشا ٹیلی فون پر فرخ سے رابطہ کر کے اس سے صلاح کر لیتی تو فرخ روبی کے ساتھ نہ جانے کیا سلوک کرتا۔

وہ جب تک آ نہیں گئی، میں اسی طرح بے چینی کے عالم میں ٹہلتا رہا۔

روبی آئی تو میری جان میں جان آئی۔ وہ اب بھی بہت پریشان تھی۔

"اب تم اپنا یہ سہما ہوا پریشان چہرہ درست کر لو۔" میں نے مصنوعی غصے سے کہا۔ "ورنہ..."

میری بات پر وہ جبراً مسکرا دی۔

"ایسی بھی کیا پریشانی؟" میں نے جھنجلا کر کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ رمشا بہت گھٹیا اور کمینی لڑکی ہے۔ اس نے تمہیں نہ جانے کیا کچھ کہا ہوگا۔ اس سے تو اب میں نمٹوں گا۔ ہاں، میری وجہ سے تمہاری بے عزتی ہوئی ہے' اس کے لیے میں معافی مانگ رہا ہوں۔" میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

اس نے میرے ہاتھ تھام لیے اور بولی۔ "بات ذلیل یا توہین کی نہیں ہے خرم! مجھے اپنے گھر کی فکر ہے۔ یہ بات میرے گھر تک نہ جانے کس انداز میں پہنچے گی۔ میرے ابو بھی نہیں ہیں۔ امی ہیں اور دو چھوٹے بھائی بہن ہیں۔"

"تمہیں جاب ختم ہونے کی وجہ سے پریشانی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پریشانی یہ نہیں ہے خرم!" روبی نے کہا۔ "تمہاری خاطر میں جاب تو کیا یہ دنیا بھی چھوڑ سکتی ہوں۔ مجھے پریشانی صرف یہ ہے کہ آفس کے لوگ اس بات کو میرے گھر تک نہ جانے کس رنگ میں پہنچائیں گے۔ مجھے محلے والوں کی طرف سے پریشانی ہے۔ وہ لوگ بہت ہی گھٹیا ذہنیت کے ہیں۔ وہ طرح طرح کی باتیں بنائیں گے۔ ممکن ہے فرخ کا کوئی آدمی وہاں آ کر ہنگامہ کرے۔"

"تم اس کی فکر مت کرو۔ میں اس کا بھی بندوبست کر دوں گا۔ رہی بات محلے والوں کے باتیں بنانے کی تو ان کی زبانیں بھی اس وقت خاموش ہو جائیں گی جب میں تم سے منگنی کروں گا۔"

"منگنی؟" روبی نے حیرت سے کہا پھر اچانک ہی اس کا چہرہ حیا سے سرخ ہو گیا۔

"ہاں بھئی منگنی!" میں نے ہنس کر کہا۔ "کیا تم منگنی کا مطلب نہیں سمجھتیں؟ انگلش میں اسے انگیج منٹ کہتے ہیں اور فارسی میں..."

"خرم!" روبی نے میری بات کاٹ دی۔ "میں فی الحال منگنی اور شادی کے بکھیڑوں میں نہیں پڑ سکتی۔"

"کیوں؟" میں اچانک سنجیدہ ہو گیا۔

"اس لیے کہ اپنی بیمار ماں اور چھوٹے بہن بھائیوں کی ذمے داری مجھ پر ہے۔ ثمینہ ابھی میٹرک میں ہے اور سعود آٹھویں میں پڑھ رہا ہے۔ پھر امی کی بیماری کے اخراجات ہیں... گھر کے دیگر اخراجات ہیں۔ یہ سب کیسے پورے ہوں گے؟"

"اب تک کیسے پورے ہو رہے تھے؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"میری جاب سے۔" روبی نے سادگی سے کہا۔

"کیا ہم دونوں مل کر یہ بوجھ نہیں اٹھا سکتے؟" میں نے کہا۔ "میرا ابھی آگے پیچھے کون ہے روبی! مجھے بھی ایک ماں اور بہن بھائی مل جائیں گے۔" میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "میں جانتا ہی نہیں ہوں کہ ماں کا پیار کیا ہوتا ہے، بہن کی محبت کیسی ہوتی ہے۔ ہاں فلموں میں ضرور دیکھا ہے۔"

"امی بہت خوددار ہیں خرم!" روبی نے بھی سنجیدگی سے جواب دیا۔ "وہ کبھی داماد کے ساتھ رہنا قبول نہیں کریں گی۔"

"میرے ساتھ نہ رہیں، اپنے گھر میں ہی رہیں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"اس کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ میں بھی جاب کرتی رہوں اور پہلے کی طرح گھر کے تمام اخراجات صرف میں پورے کروں۔" روبی نے کہا۔

"چلو، مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔ میں ان شرائط پر تو تمہاری امی سے منگنی کی بات کر سکتا ہوں؟"

روبی نے شرما کر نظریں جھکا لیں۔

اسی وقت میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسکرین پر ایورگرین انٹرنیشنل کمپنی کا نام تھا۔ یہ کمپنی بھی ان کمپنیوں میں سے ایک تھی جہاں میں نے اپنا سی وی بھیجا تھا۔ یہ بھی خاصی بڑی اور ملٹی نیشنل کمپنی تھی۔ میں نے کال ریسیو کر لی۔ "یس، خرم اسپیکنگ!"

"مسٹر خرم! میں ای جی آئی سے نعیم بول رہا ہوں۔"

نعیم اس کمپنی کا ایم ڈی تھا۔

"السلام علیکم سر!" میں نے کہا۔ "کیسے ہیں آپ؟"

"آئی ایم فائن!" اس نے خالص امریکن لہجے میں کہا پھر اس نے بھی مجھے پیشکش کی کہ میں اس کی کمپنی میں شامل ہو جاؤں۔

"مسٹر خرم! کیا یہ ہو سکتا ہے کہ کل لنچ ہم ساتھ ہی کریں؟"

"آئی ایم سوری سر!" میں نے کہا۔ "میں کل کا لنچ اپنے ایک دوست کے ساتھ کروں گا۔ بٹ نو پرابلم... میں ٹائم ملتے ہی آپ کو دو تین دن میں خود ہی کال کر لوں گا۔ میں تو خود بھی آپ سے ملنا چاہ رہا تھا۔" میں نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔ اس قسم کے منافق لوگوں کے ساتھ تو ایسا چھوٹا موٹا جھوٹ بولنا جائز تھا۔

"تھینک یو مسٹر خرم! مجھے امید ہے کہ آپ جلد ہی مجھے

کال کریں گے۔"

"سر! آپ سے چھوٹی سی ایک ریکویسٹ تھی۔" میں نے کہا۔

"اوہو... آپ یہاں پہلے سے تشریف فرما ہیں؟" علی رضا ہنس کر بولا۔ "میں نے سنا ہے کہ آپ نے بھی جاب سے ریزائن کر دیا ہے؟" علی رضا نے کہا۔

روبی نے کہا۔ "تم نے ٹھیک سنا ہے لیکن یہ "آپ جناب" کا تکلف کس سلسلے میں ہے؟"

"بھئی... میں بچہ تو ہوں نہیں۔" علی رضا مسکرا کر بولا۔ "جو صورتِ حال کی نوعیت کو سمجھ نہ سکوں۔ آپ میری ہونے والی بھابی یعنی مسز خرم ہیں تو پھر آپ کا احترام تو کرنا پڑے گا نا۔"

"اچھا، زیادہ بک بک مت کرو۔" روبی نے نظریں جھکا کر کہا۔

"تم نے جاب کے لیے کہیں اپلائی کیا ہے؟" میں نے موضوع بدلنے کے لیے علی رضا سے پوچھا۔

"سر! میں نے دو تین اداروں کو اپنا سی وی بھیجا ہے۔ اب ان کے جواب کا انتظار کر رہا ہوں۔"

مجھے اچانک سن رائز مارکیٹنگ انٹرنیشنل کا خیال آیا۔ وہ خاصی بڑی ملٹی نیشنل کمپنی تھی۔ میں نے وہاں اس لیے اپلائی نہیں کیا تھا کہ وہ بھی ٹال مٹول سے کام لیں گے۔ میرے پاس ان کا نمبر موجود تھا۔ میں نے ٹیلی فون سیٹ اپنی طرف گھسکایا اور سن رائز مارکیٹنگ کا نمبر ملایا۔

دوسری طرف سے آپریٹر کی گنگناتی ہوئی مترنم آواز سنائی دی۔ "سن رائز مارکیٹنگ!"

"حامد صاحب سے بات کرائیے۔" میں نے انگلش میں کہا۔ "میں خرم بول رہا ہوں... خرم سرفراز۔"

آپریٹر نے ہولڈ کرنے کو کہا اور دوسرے ہی لمحے حامد احمد علی لائن پر تھا۔ وہ سن رائز مارکیٹنگ کا ایم ڈی تھا۔ اس سے میری پہلے سے شناسائی تھی۔

"جی خرم صاحب!" حامد کی بھاری آواز سنائی دی۔ "فرمائیے، اتنے عرصے بعد اس ناچیز کا خیال کیسے آ گیا؟"

"ابھی میں ایک دوست کے ساتھ بیٹھا تھا۔ آپ کی کمپنی کا تذکرہ ہوا تو مجھے یاد آیا کہ آپ سے بہت دن سے ملاقات تو دور کی بات ہے، ٹیلی فون پر علیک سلیک بھی نہیں ہوئی ہے۔ بس یہی سوچ کر ٹیلی فون کر لیا۔"

"آپ سنائیے، آپ نے کون سی کمپنی جوائن کی ہے؟ اس وقت تو وہ آپ سے انتقام لینے کے لیے پاگل ہو رہا ہو گا۔"

اس کی آواز سن کر روبی بھی کچن سے باہر آ گئی۔ اس نے علی رضا کے لیے بھی کافی بنالی تھی۔

"او ہو... آپ یہاں پہلے سے تشریف فرما ہیں؟" علی رضا ہنس کر بولا۔ "میں نے سنا ہے کہ آپ نے بھی جاب سے ریزائن کر دیا ہے؟" علی رضا نے کہا۔

روبی نے کہا۔ "تم نے ٹھیک سنا ہے لیکن یہ "آپ جناب" کا تکلف کس سلسلے میں ہے؟"

"بھئی... میں بچہ تو ہوں نہیں۔" علی رضا مسکرا کر بولا۔ "جو صورتِ حال کی نوعیت کو سمجھ نہ سکوں۔ آپ میری ہونے والی بھابی یعنی مسز خرم ہیں تو پھر آپ کا احترام تو کرنا پڑے گا نا۔"

"اچھا، زیادہ بک بک مت کرو۔" روبی نے نظریں جھکا کر کہا۔

"تم نے جاب کے لیے کہیں اپلائی کیا ہے؟" میں نے موضوع بدلنے کے لیے علی رضا سے پوچھا۔

"سر! میں نے دو تین اداروں کو اپنا سی وی بھیجا ہے۔ اب ان کے جواب کا انتظار کر رہا ہوں۔"

مجھے اچانک سن رائز مارکیٹنگ انٹرنیشنل کا خیال آیا۔ وہ خاصی بڑی ملٹی نیشنل کمپنی تھی۔ میں نے وہاں اس لیے اپلائی نہیں کیا تھا کہ وہ بھی ٹال مٹول سے کام لیں گے۔ میرے پاس ان کا نمبر موجود تھا۔ میں نے ٹیلی فون سیٹ اپنی طرف گھسکایا اور سن رائز مارکیٹنگ کا نمبر ملایا۔

دوسری طرف سے آپریٹر کی گنگناتی ہوئی مترنم آواز سنائی دی۔ "سن رائز مارکیٹنگ!"

"حامد صاحب سے بات کرائیے۔" میں نے انگلش میں کہا۔ "میں خرم بول رہا ہوں... خرم سرفراز۔"

آپریٹر نے ہولڈ کرنے کو کہا اور دوسرے ہی لمحے حامد احمد علی لائن پر تھا۔ وہ سن رائز مارکیٹنگ کا ایم ڈی تھا۔ اس سے میری پہلے سے شناسائی تھی۔

"جی خرم صاحب!" حامد کی بھاری آواز سنائی دی۔ "فرمائیے، اتنے عرصے بعد اس ناچیز کا خیال کیسے آ گیا؟"

"ابھی میں ایک دوست کے ساتھ بیٹھا تھا۔ آپ کی کمپنی کا تذکرہ ہوا تو مجھے یاد آیا کہ آپ سے بہت دن سے ملاقات تو دور کی بات ہے، ٹیلی فون پر علیک سلیک بھی نہیں ہوئی ہے۔ بس یہی سوچ کر ٹیلی فون کر لیا۔"

"آپ سنائیے، آپ نے کون سی کمپنی جوائن کی ہے؟

ویسے بھی آپ خاصے مشہور ہو گئے ہیں۔"

"میں ابھی کچھ دن آرام کرنا چاہتا ہوں۔ سوچ رہا ہوں کہ دو چار ماہ کے لیے ملک سے باہر چلا جاؤں۔"

"ضرور جائیں۔ ویسے جوائننگ کا جب بھی ارادہ ہو، سن رائز مارکیٹنگ کو بھی نظر میں رکھیے گا۔"

"شیور سر!" میں نے کہا۔ "ابھی تو آپ سے ایک ریکویسٹ ہے۔"

"آپ تو خاص آدمی ہیں خرم صاحب! آپ تو حکم کریں۔" حامد ہنس کر بولا۔

"میرے آفس کا اکاؤنٹس آفیسر جاب لیس ہے۔ وہ..."

"یہ وہی صاحب تو نہیں ہیں جنہوں نے آپ کے حق میں گواہی دی ہے؟"

"جی ہاں، میں انہی کی بات کر رہا ہوں۔ اگر آپ کی کمپنی میں ان کی..."

"اگر مگر چھوڑیں۔" حامد نے کہا۔ "آپ منڈے کو فرسٹ ہاف میں انہیں میرے پاس بھیج دیں۔"

"بہت بہت شکریہ سر!" میں نے کہا۔ "کسی دن آپ سے تفصیلی ملاقات ہو گی... خدا حافظ۔" میں نے سلسلہ منقطع کرنے کے بعد کہا۔ "لو میاں علی رضا! تمہاری جاب تو پکی ہو گئی۔ یہ اچھی خاصی بڑی کمپنی ہے اور سیکرٹری پیکیج بھی بہت معقول ہے۔"

"آپ کا بہت شکریہ!" علی رضا نے خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "آپ نے میرا ایک بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا۔ میرا تو خیال تھا کہ مجھے کم از کم ایک دو مہینے تو جاب تلاش کرنا ہی پڑے گی۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "سر! میرا تو خیال ہے کہ آپ بھی یہی کمپنی جوائن کر لیں۔"

"مجھے دو تین جگہ سے آفر تو ہوئی ہے لیکن ابھی میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ مجھے بھی جلد ہی کہیں جاب تو کرنا پڑے گی۔ میں دو تین دن میں فیصلہ کر لوں گا۔"

علی رضا کچھ دیر بیٹھنے کے بعد چلا گیا۔ روبی بھی کچن وغیرہ صاف کرنے کے بعد کچھ دیر وہاں ٹھہری، پھر وقار کی کال آ گئی۔ وہ میرے ساتھ ڈنر کرنا چاہ رہا تھا۔

روبی کو میں نے اس کے گھر کے پاس ڈراپ کیا اور واپس آ کر ڈنر پر جانے کی تیاری کرنے لگا۔

☆☆☆

وقار سے باتوں میں وقت کا پتا ہی نہیں چلا اور ایک بج گیا۔ ہم دونوں میں سے کسی کو بھی وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ مجھے تو خیر کوئی کام نہیں تھا لیکن وقار کو صبح کورٹ جانا تھا اس لیے ہم اٹھ گئے ورنہ ابھی مزید بیٹھتے۔ وقار کے قصے اتنے ہی دلچسپ تھے۔

میں اپنے گھر کی سڑک پر مڑا تو میری گاڑی جھٹکے کھانے لگی۔ دو تین جھٹکے لے کر وہ بند ہو گئی۔ گاڑی میں سی این جی ختم ہو گئی تھی۔ جاتے ہوئے میں نے سوچا تھا کہ سی این جی ڈلوا لوں گا لیکن پھر ذہن میں ہی نہیں رہا۔ میں نے گاڑی پیٹرول پر لگائی تو اچانک خیال آیا کہ اس میں پیٹرول بھی نہیں ہے۔

"شٹ!" میں نے اسٹیئرنگ پر گھونسا مارتے ہوئے کہا اور دل ہی دل میں اپنی اس بے پروائی پر خود کو لعنت ملامت کی۔

وہاں سے میرا بنگلا زیادہ دور نہیں تھا لیکن گاڑی سڑک کے عین درمیان میں کھڑی تھی۔ اسے دھکیل کر سڑک کے کنارے لگانا مجھے عذاب لگ رہا تھا۔

میں نے بہ مشکل تمام گاڑی دھکیل کر ایک طرف کھڑی کی۔ ٹویوٹا کرولا اچھی خاصی بھاری گاڑی ہوتی ہے۔ اسے دھکیلنے میں مجھے خاصی دقت ہوئی۔

گاڑی لاک کرنے کے بعد میں پیدل ہی گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ گاڑی میں آئل والا ڈحائی لیٹر کا کین موجود ہے جس میں ایسی ہی کسی ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے میں نے پیٹرول بھر کے رکھ لیا تھا۔

میں آدھا راستہ پیدل طے کر چکا تھا اس لیے میں نے سوچا کہ اب صبح جاگنگ کے وقت ہی گاڑی کو وہاں سے لے جاؤں گا۔ اس میں شہر کی ایک معروف ٹریکر کمپنی کا ٹریکر لگا ہوا تھا۔ گاڑی میں الارم بھی تھا اس لیے مجھے اس کی طرف سے کوئی فکر نہیں تھی۔ یوں بھی وہاں ارد گرد کے بنگلوں میں گارڈز موجود تھے۔ کوئی بھی گاڑی کو کھولنے کی کوشش کرتا تو اس کا الارم اتنا شور کرتا کہ چور گھبرا کر فوری وہاں سے فرار ہو جاتا۔

میں اپنی گلی میں مڑا تو مجھے اپنے گھر سے کچھ فاصلے پر ایک گاڑی دکھائی دی۔

ممکن ہے میری نظر اس پر نہ پڑتی لیکن اس میں جو شخص بیٹھا تھا، اس نے سگریٹ سلگانے کے لیے ماچس جلائی تھی۔

'یہ کون ہو سکتا ہے اور اتنی رات کو یہاں کیا کر رہا ہے؟' میں نے سوچا۔

اچانک میری چھٹی حس بیدار ہو گئی۔ 'کہیں ایسا تو نہیں کہ فرخ نے میرے قتل کے لیے کرائے کے کسی آدمی کی خدمات حاصل کی ہوں اور وہ میرا انتظار کر رہا ہو؟' پھر میں

نے خود ہی اپنے خیال کی تردید کر دی اور سوچا۔ ممکن ہے اس کے ساتھ بھی یہی ہوا ہو کہ گاڑی میں سی این جی اور پیٹرول ختم ہو گیا ہو؟ لیکن یہ شخص گاڑی میں کیا کر رہا ہے؟' میں نے خود سے سوال کیا۔ یہ تمام خیالات سیکنڈوں میں میرے ذہن میں گونج کر رہ گئے۔

پھر میں نے سوچا کہ وہ جو کوئی بھی ہو، میں مین گیٹ کے بجائے عقبی دروازے سے گھر میں جاؤں گا۔ وہ شخص اگر واقعی میرے انتظار میں کھڑا ہوا ہے تو صبح تک یونہی کھڑا رہے گا۔

یہ سوچ کر میں نے اپنا رخ تبدیل کیا اور سامنے سے گھوم کر اپنے گھر کی عقبی گلی میں داخل ہو گیا۔

میں جانتا تھا کہ کچن کی کھڑکی کھلی ہوئی ہے۔ میں اس کی گرل سے ہاتھ اندر ڈال کر دروازے کی چٹخنی کھول سکتا تھا۔

عقبی گیٹ میں زنگ آلود تالا لگا ہوا تھا لیکن باؤنڈری وال اتنی اونچی نہیں تھی۔ میں اچھل کر باؤنڈری وال پر چڑھا اور احتیاط سے دوسری طرف کود گیا۔

پھر میں کچن کے ذریعے اندر داخل ہوا۔

بیڈ روم میں تاریکی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ جاتے ہوئے میں بیڈ روم کی لائٹ آن کر گیا تھا۔ میں اپنے برآمدے اور بیڈ روم کی لائٹ کہیں بھی جاتے ہوئے بند نہیں کرتا تھا۔ یہ میری عادت تھی۔ اس وقت بیڈ روم کی لائٹ آف تھی۔

میں نے سوچا کہ ممکن ہے ٹیوب لائٹ خراب ہو گئی ہو لیکن فوراً ہی مجھے برآمدے کی لائٹ کا خیال آیا۔ وہ بھی آف تھی۔

اچانک مجھے شدید خطرے کا احساس ہوا۔ گویا میری غیر موجودگی میں کوئی گھر میں داخل ہوا تھا۔ ممکن ہے کوئی چور گھر میں گھسا ہو اور چوری کر کے نکل گیا ہو۔ لیکن پھر باہر جو آدمی گاڑی میں بیٹھا تھا وہ کیا کر رہا تھا؟ مجھے ایک ہولناک خیال یہ بھی آیا کہ کوئی اندھیرے میں میری گھات میں بیٹھا ہو اور میرے بیڈ روم میں داخل ہوتے ہی وہ مجھ پر حملہ کر دے۔

میری آنکھیں اب کسی حد تک اندھیرے سے مانوس ہو گئی تھیں۔ میں نے محتاط انداز میں کوریڈور کا جائزہ لیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ میں نے ربر سول کے جوتے پہن رکھے تھے اس لیے میرے چلنے سے آواز پیدا نہیں ہو رہی تھی۔

مجھے اپنے پسٹل کا خیال آیا۔ وہ بھی اس وقت میرے بیڈ کے سائیڈ ریک میں تھا۔ میں نے ایک دفعہ پھر خود کو لعنت ملامت کی کہ ان حالات میں مجھے مسلح رہنا چاہیے تھا۔

میں بیڈ روم کے دروازے کے پاس بیٹھ گیا۔ اندر اگر کوئی ہو گا تو اسے یہ توقع نہیں ہو گی کہ میں بیٹھ کر اندر آؤں گا۔

میں نے دروازے کے پاس رک کر چند لمحے تک اندر کی سن گن لی، پھر اندر داخل ہو گیا۔

اندر داخل ہوتے ہی مجھے ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی گہری گہری سانسیں لے رہا ہو۔ پھر ہلکی سی ایک کراہ سنائی دی۔

میں نے ساری احتیاط بالائے طاق رکھ کر اچانک لائٹ آن کر دی۔ روبی کی وجہ سے میں بیڈ روم کے پردے لگا کر رکھتا تھا کہ مبادا کوئی اسے میرے گھر میں دیکھ لے۔ اس لیے روشنی باہر جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

لائٹ آن کر کے میں مڑا تو میرے ہوش اڑ گئے۔ فرش پر کوئی لڑکی غیر فطری انداز میں پڑی تھی۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ یہ روبی ہے۔ میں دیوانہ وار اس کی طرف جھپٹا۔ وہ روبی نہیں بلکہ رمشا تھی۔ اس کے سینے میں گولی لگی تھی اور زخم سے خون ابھی تک بہہ رہا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اسے گولی لگے زیادہ دیر نہیں گزری ہے۔ گولی نے اس کے دل کو نقصان نہیں پہنچایا تھا اور وہ ابھی تک زندہ تھی۔

''رمشا... آنکھیں کھولو رمشا!'' میں نے اس کا چہرہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''چلو، میں تمہیں اسپتال لے چلتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

رمشا نے لمحے بھر کو آنکھیں کھولیں۔ اس نے ویران ویران نظروں سے مجھے دیکھا، پھر کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اچانک اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

میں نے اس کی نبض دیکھی، جسم میں حرارت تھی لیکن نبض بالکل خاموش تھی۔ رمشا مر چکی تھی۔

میں چند لمحے تک خالی الذہنی کی حالت میں بیٹھا رہا، پھر اچانک بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔

میرا خیال تھا کہ رمشا کو اسی شخص نے قتل کیا تھا جو باہر گاڑی میں بیٹھا تھا۔ اب وہ میری گھات میں تھا لیکن اس کے لیے اسے اتنا تردد کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ میرے بیڈ روم میں یا باتھ روم میں کہیں بھی چھپ کر بیٹھ سکتا تھا۔ میرے آتے ہی وہ ایک دو گولیاں میرے جسم میں اتارتا اور روانہ ہو جاتا۔

بات کچھ اور تھی۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر میرا پسٹل بھی

پڑا ہوا تھا۔ میں نے پسٹل اٹھا لیا۔ گویا قاتل نے رمشا کو میرے ہی پسٹل سے قتل کیا تھا۔ میں نے پسٹل کی نال سونگھی، اس میں سے بارود کی بو آ رہی تھی۔ مزید تسلی کے لیے میں نے اس کا چیمبر نکال کر دیکھا، اس میں ایک گولی کم تھی۔ اس کا مطلب تو یہی تھا کہ کوئی مجھے رمشا کے قتل کے جرم میں پھنسانا چاہتا تھا۔ وہ فرخ کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟

میں نے سیل فون پر وقار کا نمبر ملایا۔ وہ ابھی سویا نہیں تھا بلکہ نیم غنودگی میں تھا۔

''ہیلو!'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''یار وقار! میں بہت مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''خرم! یہ تم ہو؟ میں نے تو سیل فون کی اسکرین دیکھے بغیر کال ریسیو کی ہے... بولو کیا پرابلم ہے؟''

میں نے مختصراً اسے ساری بات بتا دی۔

''تمہارے پاس پسٹل کا کوئی دوسرا چیمبر یا فاضل گولیاں تو ہوں گی؟'' وقار نے کہا۔

''ہاں، میرے پاس پسٹل کے مزید دو چیمبر بھرے ہوئے موجود ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''تم پہلے تو پسٹل کا چیمبر بدلو تاکہ گولیوں کی تعداد پوری رہے پھر...''

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ گھر کے باہر مجھے پولیس سائرن کی آواز سنائی دی تھی۔ میں نے کھڑکی کا پردہ خفیف سا سرکا کر باہر جھانکا۔ پولیس کی ایک موبائل وین میرے گیٹ پر موجود تھی اور اس سے ایک سب انسپکٹر اور تین کانسٹیبلو اتر کر میرے گھر میں داخل ہو رہے تھے۔

میں نے سوچا کہ اگر میں ان کے ہاتھوں پکڑا گیا تو شاید وقار بھی مجھے نہیں چھڑا سکے گا۔

اس کی ایک ہی صورت تھی کہ میں فی الحال وہاں سے فرار ہو جاؤں اور اپنی بے گناہی ثابت ہونے تک روپوش رہوں۔

وقار سے تو میں نے اسی وقت سلسلہ منقطع کر دیا تھا جب پولیس وین کا سائرن سنا تھا۔

میں نے پھرتی سے الماری کھولی۔ اس میں رکھا ہوا سارا کیش نکال کر جیب میں ٹھونسا، پسٹل کو کوٹ کی جیب میں ڈالا اور کچن کے دروازے سے باہر نکل کر پہلے کی طرح اس کی چٹخنی چڑھا دی۔ میں نے احتیاطاً کچن کی کھڑکی بھی بند کر دی۔ پھر میں نے باؤنڈری وال پھلانگی اور تیزی سے اس طرف روانہ ہو گیا جہاں میری گاڑی کھڑی تھی۔

میں نے گاڑی میں پیٹرول ڈالا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ میں وہاں سے مین روڈ پر آیا اور سب سے پہلے ایک پیٹرول پمپ سے سی این جی کا سلینڈر فل کرایا پھر دس لیٹر پیٹرول بھی لے لیا کہ آئندہ نہ جانے کس قسم کے حالات پیش آئیں۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ممکن ہے صبح تک پولیس رمشا کے قتل کے الزام میں میرا بینک اکاؤنٹ بھی سیز کرا دے۔ میں نے ایک قریبی بینک کے اے ٹی ایم کے ذریعے جتنی رقم نکلوا سکتا تھا، نکال لی۔

اب سوال یہ تھا کہ میں اس وقت کہاں جاؤں جہاں پولیس نہ پہنچ سکے؟

پہلے مجھے روبی کے گھر کا خیال آیا پھر میں نے خود اپنے اس خیال کو مسترد کر دیا۔ پولیس میری تلاش میں وہاں پہنچ سکتی تھی۔ رمشا نے فرخ کو روبی کے بارے میں ضرور بتایا ہو گا کہ وہ مجھے اطلاعات دیتی رہی ہے۔ میں علی رضا کے گھر بھی نہیں جا سکتا تھا۔

اچانک مجھے اپنے پیون شرافت علی کا خیال آیا۔ میں اکثر و بیشتر اس کی مدد بھی کر دیا کرتا تھا۔ کبھی اسے کسی دوا کی ضرورت پڑتی تھی تو میں اسے رقم دیا کرتا تھا۔ وہ خود تو فاقے کر رہا تھا لیکن اپنی بیٹی کو تعلیم دلا رہا تھا۔ گزشتہ سال میں نے ہی اس کی بیٹی کے ایڈمیشن اور دوسرے اخراجات کے لیے رقم دی تھی۔ یہ میں اپنی کوئی بڑائی بیان نہیں کر رہا ہوں بلکہ اپنی فطرت کے بارے میں بتانا چاہ رہا ہوں۔ شرافت علی کا خیال مجھے اس لیے آیا تھا کہ ایک دفعہ میں نے دیر تک آفس میں کام کیا تھا تو وہ بھی میری وجہ سے آفس میں رک گیا تھا۔ بعد میں اسے میں نے گھر تک ڈراپ کیا تھا۔ آفس کے بہت سے افراد میں سے میں صرف روبی، علی رضا اور شرافت علی کے گھروں سے واقف تھا۔

شرافت علی کورنگی نمبر ڈھائی میں رہتا تھا۔ کورنگی کا فاصلہ بھی وہاں سے زیادہ نہیں تھا۔

میں دس منٹ کے اندر اندر شرافت علی کے گھر پہنچ گیا۔ اس وقت رات کے تقریباً ڈھائی بج رہے تھے۔

اس کی گلی میں پرانی سی ایک گاڑی کھڑی تھی جس کی وجہ سے راستہ رکا ہوا تھا۔ میں نے گاڑی گلی کے باہر ہی چھوڑی اور پیدل ہی شرافت علی کے گھر پہنچ گیا۔ میری دستک کے جواب میں کسی عورت کی آواز آئی۔ ''کون ہے؟''

''میرا نام خرم ہے اور مجھے شرافت علی سے ملنا ہے۔''

اندر خاموشی چھا گئی۔ پھر کچھ آوازیں سنائی دیں اور

فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والا شرافت علی تھا۔

وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ''سر! آپ... اور اس وقت... خیریت... تو ہے؟''

''میں اس وقت ایک مصیبت میں پھنس گیا ہوں شرافت علی۔'' میں نے کہا۔ ''مجھ پر ایک قتل کا الزام ہے۔ پولیس میری تلاش میں ہے۔ میرے پاس فی الحال رات گزارنے کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ اگر تم میری مدد کر سکتے ہو تو مجھے بتا دو ورنہ میں کہیں اور چلا جاتا ہوں۔''

''کیسی باتیں کرتے ہیں سر!'' شرافت علی نے کہا۔ ''ہم لوگ غریب ضرور ہیں لیکن بزدل نہیں۔ آپ کچھ سوچ کر ہی میرے گھر آئے ہوں گے۔ میں آپ کے اس اعتبار کو کیسے ٹھیس پہنچا سکتا ہوں۔ آیئے، اندر آجایئے۔''

''میری گاڑی باہر کھڑی ہے۔ اس کا میں کیا کروں؟''

''آپ کچھ مت کریں، آپ گاڑی کی چابی مجھے دے دیں۔ میں سب بندوبست کر دوں گا۔ ہاں، گاڑی میں سے کچھ نکالنا ہو تو مجھے بتا دیں۔''

''فی الحال مجھے گاڑی میں سے کچھ نہیں نکالنا۔''

''تو پھر آپ اندر چل کر بیٹھیں۔ میں گاڑی کا بندوبست کر کے آتا ہوں۔''

''گاڑی کا نمبر تو سن لو۔'' میں نے کہا۔

''سر! گلی کے نکڑ پر اس وقت آپ ہی کی گاڑی ہو سکتی ہے۔ اس علاقے کے لوگ ایسی گاڑیاں نہیں رکھتے۔'' پھر اس نے بلند آواز میں کہا۔ ''ربیعہ! خرم صاحب کو اندر لے جاؤ۔''

''اندر آجایئے۔'' اندر سے ایک پُرکشش نسوانی آواز سنائی دی۔

میں جھجکتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ ایک لڑکی معمولی سے ملگجے کپڑوں میں کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر میں قائل ہو گیا کہ حسن کا... امیری یا غریبی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ لڑکی اتنی حسین تھی کہ چند لمحے کو میں پلکیں جھپکانا بھول گیا۔ وہ اگر جدید تراش کے لباس میں ہوتی تو رمشا جیسی لڑکیاں اس کے حسن کے سامنے ماند پڑ جاتیں۔

''آیئے، اس کمرے میں آجایئے۔''

میں اس کی آواز پر چونکا اور اس کمرے میں داخل ہو گیا جس کی طرف اس نے اشارہ کیا تھا۔

وہ اسی گز کا مکان تھا جس میں کھینچ تان کر کے شرافت علی نے تین کمرے نکال لیے تھے۔ لڑکی نے جس کمرے میں مجھے بٹھایا تھا اس میں پرانا سا ایک صوفہ سیٹ اور ایک تخت پڑا تھا جس پر سفید براق چادر بچھی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ویلوٹ کے دو گاؤ تکیے بھی تھے۔ صوفوں کے کشن بھی بہت صاف ستھرے تھے اور کمرے کی ترتیب میں ایک سلیقہ اور حسن تھا۔

میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ مجھے رہ رہ کر یہی خیال آرہا تھا کہ اب پولیس رمشا کی تصویریں لے رہی ہو گی، فنگر پرنٹس اٹھائے جا رہے ہوں گے یا پھر پولیس کی کوئی پارٹی میری تلاش میں نکل پڑی ہو گی۔

''یہ پانی پی لیں۔'' لڑکی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

مجھے اس وقت پانی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے ایک سانس میں پورا گلاس خالی کر دیا۔

میں نے لڑکی سے پوچھا۔ ''نام کیا ہے آپ کا؟''

''میرا نام ربیعہ ہے۔'' اس نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔

مجھے یاد آگیا کہ شرافت علی نے گزشتہ سال مجھ سے یہی کہا تھا کہ مجھے اپنی بیٹی ربیعہ کے ایڈمیشن کے لیے کچھ رقم کی ضرورت ہے۔ ''آپ فرسٹ ایئر میں پڑھتی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''میں اب سیکنڈ ایئر میں آگئی ہوں۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی فرسٹ ایئر کا رزلٹ آیا ہے۔'' پھر وہ چونک کر بولی۔ ''آ... آپ... وہ خرم صاحب ہیں جو... ابو کے آفس میں...''

''کام کرتا تھا۔'' میں نے اس کا جملہ پورا کر دیا۔

''آپ کے تو ہم پر بہت احسانات ہیں خرم صاحب! آپ...''

''ربیعہ پلیز!'' میں نے اسے ٹوک دیا۔ ''مجھے اس قسم کے الفاظ اچھے نہیں لگتے۔''

''ابو آپ کی بہت تعریف کرتے ہیں۔'' ربیعہ نے کہا۔ ''ابھی جب کمپنی نے آپ کے خلاف اخبارات میں اشتہارات شائع کرائے تو ابو نے یہی کہا تھا کہ یہ خرم صاحب پر سراسر الزام ہے اور آپ نے ثابت بھی کر دیا کہ واقعی وہ الزام تھا۔''

''لیکن اس دفعہ مجھ پر جو الزام ہے وہ بہت بڑا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس مرتبہ شاید جج ثابت کرنے میں مجھے دانتوں پسینا آجائے یا ممکن ہے میں اپنی بے گناہی ثابت نہ کر سکوں اور پھانسی کے پھندے پر لٹک جاؤں۔''

''اللہ نہ کرے۔'' ربیعہ نے بے ساختہ کہا۔ ''اس مرتبہ آپ پر کیا الزام ہے؟'' ربیعہ نے پوچھا۔

اسی وقت شرافت علی واپس آگیا اور بولا۔ ''میں نے آپ کی گاڑی ایسی جگہ کھڑی کی ہے کہ وہ کسی کو نظر ہی نہیں آئے گی۔'' پھر وہ ربیعہ سے مخاطب ہوا۔ ''بیٹا! اس تخت پر ایک گدّا اور بچھا دو اور دوسرے تکیے لا کر رکھ دو۔ خرم صاحب کو آرام کرنے دو۔''

''کسی بھی تکلف کی ضرورت نہیں ہے شرافت علی۔'' میں نے کہا۔ ''میں اسی تخت پر لیٹ جاؤں گا۔ ویسے اس وقت مجھے نیند بھی نہیں آرہی ہے۔ ربیعہ! اگر زحمت نہ ہو تو مجھے ایک کپ چائے پلا دو۔''

''خرم صاحب کافی پیتے ہیں بیٹا!'' شرافت علی نے کہا۔ ''گھر میں کافی بھی موجود ہے۔ تم کافی بنا لاؤ۔'' پھر وہ مجھ سے بولا۔ ''ہاں سر! اگر مناسب سمجھیں تو مجھے بتا دیں کہ اب فرخ صاحب نے کیا حرکت کی ہے؟''

''تمہیں کیسے معلوم کہ یہ حرکت فرخ صاحب ہی کر سکتے ہیں؟'' میں نے کہا۔

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟'' شرافت علی نے کہا۔ ''آپ کا دشمن اور کون ہو سکتا ہے؟''

''اس نے اس دفعہ مجھے رمشا کے قتل کے الزام میں پھنسانے کی کوشش کی ہے۔'' میں نے کہا پھر اسے مختصراً بتایا کہ کس طرح میں اپنے بنگلے میں داخل ہوا اور میں نے رمشا کو زخمی حالت میں اپنے بیڈ روم میں دیکھا۔

''آپ تو واقعی مصیبت میں پھنس گئے ہیں سر!'' شرافت علی نے کہا۔

''آپ کو اپنے وکیل دوست سے پھر بات کرنا چاہیے تھی۔'' ربیعہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ وہ شاید کافی بناتے ہوئے میری باتیں سنتی رہی تھی۔

اس کے کہنے پر مجھے وقار کا خیال آیا۔ اس وقت تو میں نے بوکھلاہٹ میں اس سے رابطہ منقطع کر دیا تھا پھر بعد میں بھی اس سے رابطہ نہیں کیا۔ میں نے اپنا سیل فون نکالنے کی کوشش کی تو وہ میری جیب میں نہیں تھا۔ مجھے یاد آیا کہ فون میں نے گاڑی میں رکھا تھا۔ جب میں نے پیٹرول پمپ پر سی این جی والے کو پیسے دیے تھے تو سیل فون گیئر کے پاس موجود جگہ میں رکھا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ میں نے اسے سائیلنٹ پر لگا رکھا تھا۔

میری پریشانی دیکھ کر شرافت علی نے پوچھا۔ ''کیا ہوا سر! کوئی چیز تم کھو گئی ہے؟''

''نہیں، میرا سیل فون گاڑی میں رہ گیا ہے۔''

''سیل فون تو میرے پاس بھی ہے اور ربیعہ کے پاس بھی!'' شرافت علی نے کہا۔ ''آپ میرا سیل فون استعمال کر لیں۔''

''مسئلہ سیل فون کا نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے جن نمبرز پر کال کرنا ہے، وہ میرے سیل فون میں محفوظ ہیں۔ نمبر مجھے زبانی یاد نہیں ہیں۔''

''کوئی بات نہیں...'' شرافت علی نے کہا۔ ''میں ابھی آپ کا سیل فون لے آتا ہوں۔'' اس نے دوبارہ گاڑی کی چابی اور ریموٹ اٹھایا اور باہر نکل گیا۔

''گھر سے نکلتے ہی آپ کو اپنے وکیل سے بات کرنا چاہیے تھی۔ ممکن ہے، وہ اس کا کوئی مناسب حل بتا یا بہتر مشورہ دیتا۔ یوں فرار ہو کر تو آپ نے اپنے لیے مزید پریشانیاں پیدا کر لیں۔''

''اس وقت میں بہت زیادہ حواس باختہ ہو گیا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''میرا سیل فون سائیلنٹ پر تھا۔ وقار نے مجھے کال ضرور کی ہوگی۔ میں نے اس افراتفری میں اس طرف دھیان ہی نہیں دیا۔''

''ابو سے آپ کا نام تو بہت سنا تھا۔'' ربیعہ نے مسکرا کر کہا۔ ''میں سمجھتی تھی کہ یہ کوئی..... عمر والے صاحب ہوں گے لیکن آپ تو بالکل ینگ ہیں۔''

''آپ مستقبل میں کیا کرنا چاہتی ہیں؟'' میں نے موضوع بدلنے کے لیے پوچھا۔

''میں کمپیوٹر سائنس میں ماسٹرز کے ساتھ ساتھ ایم بی اے کرنا چاہتی ہوں۔''

میں اس کا منفرد جواب سن کر حیران رہ گیا۔ اس طبقے کے بچے عموماً مستقبل میں ڈاکٹر یا انجینئر بننے کی خواہش رکھتے ہیں۔

''لیکن آپ تو غالباً سائنس پڑھ رہی ہیں؟'' میں نے کہا۔

''یہ بھی ابو کی ضد ہے۔ وہ مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے، جب مجھے میڈیکل سے کوئی انٹرسٹ ہی نہیں ہے تو میں ڈاکٹر کیوں بنوں؟ ممکن ہے میں ابو کی خواہش کے احترام میں ڈاکٹر بن بھی جاؤں تو کیا ہوگا۔ میں اس فیلڈ میں وہ مقام حاصل نہیں کر سکوں گی جس کی مجھے خواہش ہے۔'' ربیعہ نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ مجھے اپنی باتوں سے خاصی ذہین اور سلجھی ہوئی لڑکی لگ رہی تھی۔

''اب آپ ہی بتائیں، مجھے میڈیکل پڑھنا چاہیے یا نہیں؟''

اسی وقت شرافت علی واپس آگیا۔ اس نے غالباً ربیعہ کا جملہ سن لیا تھا۔ اس نے میرا سیل فون مجھے دیتے ہوئے کہا۔ ''سر! آپ ہی اسے سمجھائیں۔ یہ اتنی ذہین ہے، ہر کلاس میں اب تک پہلی پوزیشن لیتی آئی ہے۔ اب بھی اس کے نمبرز بہت زیادہ اچھے ہیں۔ یہ کہتی ہے کہ میں ڈاکٹر نہیں بنوں گی۔''

''شرافت علی! اگر تم برا نہ مانو تو ایک بات کہوں۔'' میں نے کہا۔ ''طالب علمی کے زمانے میں، میں بھی بہت اچھا طالب علم تھا۔ ہر کلاس میں پہلی پوزیشن لیتا تھا۔ میں نے پڑھائی میں بہت محنت کی تھی لیکن میرے پاپا نے کبھی مجھے مجبور نہیں کیا کہ مجھے آئندہ ڈاکٹر، انجینئر یا پائلٹ بننا ہے۔ انہوں نے فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔ میں نے اس وقت ایم بی اے کیا اور میرا خیال ہے کہ میں عملی زندگی میں ناکام نہیں ہوں۔ اس کے بعد بھی میں نے بہت سے کورس کیے۔ کمپنی نے مجھے مزید تعلیم کے لیے ملک سے باہر بھی بھیجا۔ پھر تم بیٹی کو کیوں مجبور کر رہے ہو کہ وہ ڈاکٹر ہی بنے؟''

''سر! اگر آپ کہتے ہیں تو میں اسے بالکل مجبور نہیں کروں گا۔ آج کے بعد اسے آزادی ہے کہ یہ جو کچھ پڑھنا چاہتی ہے پڑھے۔''

ربیعہ کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ اس نے تشکر آمیز نظروں سے مجھے دیکھا پھر نظریں جھکا لیں۔

میں نے اپنے سیل فون کی اسکرین پر نظر ڈالی۔ وہاں اٹھارہ مس کالز تھیں۔ ان میں سے جو وہ تو وقار کی تھیں۔ ایک کال علی رضا کی تھی، ایک روبی کی تھی اور بقیہ دو نمبر میرے لیے اجنبی تھے۔ میں نے وقار کی آخری کال کا وقت دیکھا، وہ اب سے دس منٹ پہلے کی گئی تھی۔ میں نے سوچا، وقار اب بھی جاگ رہا ہوگا۔

میں نے اس کا نمبر ملایا۔

دوسری ہی بیل پر اس نے کال ریسیو کر لی اور جھنجلا کر بولا۔ ''تم اچانک کہاں غائب ہو گئے تھے؟''

''وہ... اصل میں اچانک ہی میرے گھر پر پولیس...''

''میں جانتا ہوں۔'' وقار نے کہا۔ ''پولیس کی گاڑی کے سائرن کی آواز میں نے بھی سنی تھی لیکن تم نے لائن کیوں کاٹ دی؟''

''میں اس وقت بہت گھبرا گیا تھا وقار!''

''تم نے وہاں سے فرار ہو کر اچھا نہیں کیا۔ اب پولیس کو یقین ہو گیا ہوگا کہ رمشا کا مرڈر تم ہی نے کیا ہے۔ تم اس وقت ہو کہاں؟''

''میں اپنے ایک دوست کے گھر پر ہوں۔'' میں نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔

''پولیس تمہاری تلاش میں تمہارے ہر دوست اور ہر شناسا کے گھر چھاپے مار رہی ہے۔ وہ لوگ تم تک پہنچنے میں دیر نہیں لگائیں گے۔ تم اپنے ساتھ اپنے اس دوست کو بھی مصیبت میں ڈالو گے۔''

''اس جگہ کا علم میرے سوا کسی کو بھی نہیں ہے۔ پولیس کبھی یہاں نہیں پہنچ سکے گی۔''

''اس وقت تو تم وہیں رہو... بلکہ اب تم اس وقت تک وہیں رہو جب تک میں نہ کہوں۔''

''میں یہاں زیادہ دن نہیں رک سکتا وقار!'' میں نے کہا۔

''صرف چند دن کی بات ہے۔ مجھے کچھ سوچنے دو کہ اب کیا ہو سکتا ہے۔ تم نے وہاں سے فرار ہو کر پھانسی کا پھندا خود ہی اپنے گلے میں ڈال لیا ہے۔ مجھے یہ پھندا نکالنے میں کچھ وقت تو لگے گا ہی۔ اور ایسا کون سا دوست ہے جس کے ساتھ تم چند دن بھی نہیں گزار سکتے؟''

''وہ میرا ایسا بے تکلف دوست نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''فی الحال تو مجبوری ہے۔ پولیس تمہیں تلاش کر رہی ہے۔ لگتا ہے اس مرتبہ فرخ نے یا تو پولیس کے کسی اعلیٰ افسر کو بھاری رقم دی ہے یا پھر کسی چیف سیکریٹری یا منسٹر کی طرف سے پولیس پر دباؤ ہے۔ تم ابھی جہاں چھپے ہو، وہیں چھپے رہو۔ اگر کوئی متبادل انتظام ہو گیا تو میں تمہیں وہاں شفٹ کرا دوں گا۔ اور اب مجھ سے رابطے میں رہنا۔'' یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

''آپ پریشان مت ہوں صاحب!'' شرافت علی نے کہا۔ ''یہ بھی آپ کا اپنا ہی گھر ہے۔ جتنے دن چاہیں، یہاں رہیں۔ یہاں آپ کو وہ آرام تو نہیں ملے گا جس کے آپ عادی ہیں لیکن کوئی تکلیف بھی نہیں ہوگی۔ کسی کو آپ کی یہاں موجودگی کی بھنک بھی نہیں پڑے گی۔ شرافت علی مر تے مر جائے گا لیکن آپ کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائے گا۔''

''پھر تمہیں میری بھی ایک شرط ماننا ہوگی شرافت علی!'' میں نے کہا اور اپنا پرس نکال لیا۔ اس میں سے ہزار ہزار کے پانچ نوٹ نکالے اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''کل صبح میرے لیے ٹوتھ پیسٹ، برش، شیونگ کٹ، ایک سلیپنگ سوٹ، تولیا اور چپل وغیرہ لے آنا۔'' میں نے مزید

پانچ ہزار روپے نکالے اور کہا۔ ''یہ گھریلو اخراجات چائے، کافی، اخبارات، کھمن، ڈبل روٹی وغیرہ کے لیے کچھ رقم ہے۔ میں چاہتا ہوں...''

''صاحب! اب آپ مجھے اتنا ذلیل بھی مت کریں۔'' شرافت علی نے افسردگی سے کہا۔ ''گھر آئے مہمان سے کوئی کھانے پینے کے پیسے لیتا ہے؟''

''مہمان!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ میں اسے اپنا گھر سمجھوں، اب تم نے اچانک مجھے مہمان بنا دیا۔ اگر واقعی یہ میرا گھر ہے تو مجھے خرچ کرنے سے کیوں روک رہے ہو؟''

''وہ تو ٹھیک ہے صاحب لیکن...''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''اگر تمہیں میری یہ شرط منظور ہے تو ٹھیک ہے ورنہ میں صبح ہوتے ہی یہاں سے نکل جاؤں گا۔''

شرافت علی نے میری اس بات پر گویا ہتھیار ڈال دیے۔

صبح ہونے میں اب کچھ ہی دیر باقی تھی۔ شرافت علی اور ربیعہ کمرے سے چلے گئے۔ میں بھی تخت پر لیٹ گیا۔ مجھے تخت پر لیٹنے کی عادت نہیں تھی لیکن مجبوری میں تو سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔

مجھے نیند بھی آئی تو میرا ذہن فرخ اور پولیس میں الجھا رہا۔ کبھی میں نے دیکھا کہ پولیس نے مجھے گرفتار کرلیا ہے اور مجھے پھانسی گھاٹ کی طرف لے جایا جارہا ہے۔ کبھی مجھے فرخ نظر آیا جو اپنی فتح پر دیوانہ وار قہقہے لگا رہا تھا۔

میری آنکھ کھلی تو میرا پورا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ گھر میں بالکل سناٹا تھا۔ نہ جانے کوئی گھر میں تھا بھی یا نہیں۔ شرافت علی تو آفس چلا گیا ہوگا، ربیعہ کالج گئی ہوگی۔

میں نے سوچا، یہ شرافت علی بھی عجیب احمق آدمی ہے۔ ایسے میں اس کا کوئی محلے دار یا رشتے دار آجاتا تو مجھے وہاں دیکھ کر کیا سوچتا؟

کمرے کے باہر ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ پھر ربیعہ کا دمکتا ہوا چہرہ دکھائی دیا۔ مجھے بیٹھا دیکھ کر وہ اندر آگئی اور بولی۔ ''مجھے یقین ہے کہ رات آپ کو بہت تکلیف ہوئی ہوگی لیکن ابو آج آفس سے واپسی پر آپ کے لیے بیڈ کا انتظام کردیں گے۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے رات کو بالکل تکلیف نہیں ہوئی۔''

''آپ بیڈ ٹی کے عادی ہوں گے، میں آپ کے لیے...''

''نہیں ربیعہ! میں ناشتے سے پہلے بیڈ ٹی کا عادی نہیں ہوں۔ مجھے بتاؤ کہ باتھ روم کہاں ہے؟''

''آئیں میرے ساتھ۔'' وہ مجھے باتھ روم تک لے گئی اور بولی۔ ''میں نے باتھ روم میں بالکل نیا تولیا رکھ دیا ہے۔ ٹوتھ پیسٹ اور برش تو ابو آفس جانے سے پہلے ہی لے آئے تھے۔ آپ نہالیں، اس وقت تک میں آپ کے لیے ناشتا تیار کرتی ہوں۔''

شرافت علی کا باتھ روم بہت چھوٹا تھا۔ اس میں ایک طرف فلیش اور دوسرے کونے میں شاور لگا ہوا تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ وہاں شاور تھا ورنہ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ مجھے بالٹی میں پانی بھر کے نہانا پڑے گا۔

☆☆☆

ناشتا کرنے کے بعد میں نے روبی کا نمبر ملایا۔ اس نے فوراً ہی فون اٹھا لیا اور بولی۔ ''خرم! تم خیریت سے تو ہو؟''

''ہاں، ابھی تک تو خیریت سے ہوں۔''

''تم ہو کہاں؟ کل رات پولیس تمہاری تلاش میں یہاں آئی تھی۔ انسپکٹر نے تمہارے بارے میں پوچھا تو میں نے لاعلمی کا اظہار کردیا۔ انسپکٹر گھر کی تلاشی لینا چاہتا تھا۔ ہمارے کمپلیکس میں ایک وکیل صاحب کا بھی فلیٹ ہے۔ وہ خاصے معروف وکیل ہیں۔ انہوں نے انسپکٹر سے پوچھا کہ آپ کے پاس سرچ وارنٹ ہے؟ انسپکٹر کے انکار پر وکیل صاحب نے سختی سے کہا کہ بغیر سرچ وارنٹ کے آپ اس گھر کی تلاشی نہیں لے سکتے۔

''میں نے بات بڑھتی دیکھ کر کہا۔ 'انسپکٹر صاحب! میں ایک قانون پسند شہری ہوں۔ سرچ وارنٹ کا مطالبہ میرا قانونی حق ہے لیکن میں آپ سے کوآپریٹ کروں گی۔ آپ شوق سے میرے گھر کی تلاشی لے سکتے ہیں۔' پھر میں نے وکیل صاحب سے کہا۔ 'انکل! انہیں تلاشی لے لینے دیں۔'

''انسپکٹر کا رویہ کچھ نرم ہوگیا۔ اس نے کہا۔ 'گھر میں کتنے افراد رہتے ہیں؟'

''مجھ سمیت چار افراد۔' میں نے جواب دیا۔ 'میری والدہ ہیں، مجھ سے چھوٹی ایک بہن اور ایک بھائی ہے۔' پھر میں نے دروازے کے آگے سے ہٹتے ہوئے کہا۔ 'آیئے، آپ اپنا کام کیجیے۔'

''سوری مس... روبینہ!' انسپکٹر نے کہا۔ 'مجھے یقین آگیا کہ مسٹر خرم یہاں نہیں ہیں۔ ہاں، آپ سے ایک ریکویسٹ ہے۔ جیسے ہی آپ کو ان کے بارے میں کوئی اطلاع ملے، مجھے ضرور دیجیے گا۔'

''تم آج آفس نہیں گئیں؟ آج ہی تو تمہیں نئی جاب جوائن کرنا تھی۔''

''میں نے نئی جاب جوائن کرلی ہے اور اس وقت آفس ہی سے بول رہی ہوں۔''

''مبارک ہو روبی!'' میں نے ہنس کر کہا۔

''خرم! سچ پوچھو تو مجھے جاب ملنے کی ذرہ برابر بھی خوشی نہیں ہے۔ تم اتنی بڑی مصیبت میں گرفتار ہو اور میں خوشیاں مناؤں۔ ابھی تک یہ کیس اخبارات میں نہیں آیا ہے۔ ممکن ہے کل کے اخبارات میں یہ خبر پڑھتے ہی ایم ڈی صاحب مجھے فارغ کردیں۔ خیر، مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ مجھے تو تمہاری پروا ہے۔ تم نے کچھ کھایا پیا بھی ہے یا...''

''میں ابھی ابھی ناشتا کرکے بیٹھا ہوں اور اب کافی پی رہا ہوں۔''

''اوکے خرم! اپنا خیال رکھنا، باس مجھے بلا رہے ہیں۔ خدا حافظ!'' اس نے یہ کہہ کر سلسلہ منقطع کردیا۔

اس کے بعد میں نے علی رضا کو کال کی۔ اس کی بھی ایک مس کال موجود تھی۔

وہ میری آواز سنتے ہی بولا۔ ''خرم صاحب! آپ خیریت سے تو ہیں؟''

''ہاں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''رات آپ کی تلاش میں پولیس یہاں آئی تھی۔ پہلے تو ان لوگوں نے میرے گھر کی تلاشی لی۔ پولیس انسپکٹر کا رویہ بہت جارحانہ تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ 'اوئے! عدالت میں تو تم نے خرم کے حق میں بہت لمبے چوڑے بیان دیے تھے۔ تمہارے خیال میں وہ بہت نیک اور شریف آدمی ہے۔ اس نے آج ایک لڑکی کا مرڈر کردیا ہے اور خود فرار ہوگیا ہے۔'

''''لڑکی کا مرڈر؟' میں نے حیرت سے دہرایا۔

''''ہاں، تمہارے باس کی بی اے رمشا کا مرڈر۔' انسپکٹر نے کہا۔ 'اس نے کوئی بہانہ بنا کر رمشا کو اپنے گھر بلایا اور اسے گولی مار کے فرار ہوگیا۔ تم ذرا میرے ساتھ تھانے تک چلو۔'

''''چلیے۔' میں فوراً تیار ہوگیا۔

''تھانے جاکر وہ مجھ سے مختلف قسم کے سوالات کرتا رہا کہ میں آپ کو کب سے جانتا ہوں۔ آفس میں میرا رویہ دوسروں کے ساتھ کیسا تھا۔ رمشا سے آپ کے کیسے تعلقات تھے۔

''وہ مجھ سے آدھے گھنٹے تک مختلف سوالات کرتا رہا اور میں اسے جواب دیتا رہا۔ میں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی گھر پہنچا ہوں۔''

''رضا! احتیاطاً تم میری یہ کال ڈی لیٹ کردینا اور روبی کو بھی فون کرکے ہدایت کردو کہ...'' اچانک لائن کٹ گئی۔ میں نے دوبارہ نمبر ملانے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ میرا بیلنس صفر ہوچکا ہے۔

فوراً ہی علی رضا کی کال آگئی۔ ''ہاں رضا! شاید لائن کٹ گئی تھی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ تم اپنے سیل فون سے میری کالز کا ریکارڈ ڈی لیٹ کردو۔ روبی کو بھی یہی ہدایت کردو۔''

''اوکے سر!'' رضا نے کہا۔ ''اپنا خیال رکھیے گا اور میرے لائق کوئی بھی خدمت ہو تو ضرور بتایئے گا۔''

''اوکے، اللہ حافظ!'' میں نے سلسلہ منقطع کردیا اور ربیعہ سے پوچھا۔ ''یہاں مارکیٹ کتنی دور ہے؟''

ربیعہ بے ساختہ مسکرائی۔ ''مارکیٹ! مارکیٹ تو یہاں سے بہت دور ہے۔ ہاں مین روڈ پر دونوں طرف مکانوں ہی میں لوگوں نے دکانیں نکال لی ہیں۔ وہاں ضرورت کی تقریباً ہر چیز مل جاتی ہے۔ آپ کو کچھ چاہیے؟''

''مجھے اپنے سیل فون کے لیے کارڈ چاہیے۔''

''ارے، اس کی دکان تو نکڑ ہی پر ہے۔ میں ابھی جاکر لے آتی ہوں۔''

''نہیں ربیعہ! کارڈ یہاں سے مت لینا، تم وہاں سے اپنے سیل فون کے لیے کارڈ کیتی ہوگی یا ایزی لوڈ کراتی ہو گی۔ دکان والا سمجھ جائے گا کہ یہ کارڈ تم کسی اور کے لیے خرید رہی ہو۔''

''آپ کا نیٹ ورک کون سا ہے؟''

میں نے نیٹ ورک کا نام بتایا۔

''تو پرابلم... یہی نیٹ ورک تو میرا بھی ہے۔ پھر بھی میں خود دکان پر نہیں جاؤں گی بلکہ محلے کے کسی بچے کو بھیج دوں گی۔''

☆☆☆

رات کو تقریباً دس بجے شرافت علی لوٹا تو وہ سامان سے لدا پھندا تھا۔ وہ میری ضرورت کی تقریباً ہر چیز لے آیا تھا۔

وہ منہ ہاتھ دھو کر آیا تو ربیعہ کھانا لے آئی۔ کھانا کھاتے ہوئے اس نے ربیعہ سے کہا۔ ''ذرا ٹی وی تو کھولو۔''

میں نے پھر خود کو لعنت ملامت کی۔ گھر میں ٹی وی موجود تھا اور مجھے اس کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ ٹی وی چینلز نے اس خبر کو دن میں کئی مرتبہ نشر کیا ہوگا۔

ٹی وی پر اس وقت اشتہارات چل رہے تھے پھر ٹھیک دس بجے نیوز شروع ہوگئیں۔ چند ملکی اور بین الاقوامی اہم خبروں کے بعد نیوز کاسٹر نے کہا۔ ”شہر کے ایک معروف بزنس مین اور مقامی ملٹی نیشنل کمپنی کے ایم ڈی جناب فرخ فضل الرحمن کی پی اے مس رمشا کا بہیمانہ قتل... اسی کمپنی کے ایک سابق اعلیٰ افسر خرم سرفراز نے مس رمشا کو اپنے بنگلے پر بلایا اور اسے گولی مار کر فرار ہوگیا۔“

نیوز ہیڈ لائنز میں اتنا ہی تھا۔

میں نے ریموٹ سے ایک دوسرا نیوز چینل لگایا۔ وہاں سے بھی نیوز آرہی تھیں، نیوز کاسٹر ابھی ہیڈ لائنز پڑھ رہی تھی۔

پھر ایک وقفے کے بعد خبریں دوبارہ اور تفصیل سے شروع ہوئیں۔

”شہر کے جانے پہچانے بزنس مین کی پی اے کو قتل کر دیا گیا۔ ملزم نے کسی بہانے سے مقتولہ کو اپنے بنگلے پر بلا کر اسے گولی مار دی۔“

اس کے ساتھ ہی میرے بنگلے، بیڈ روم اور رمشا کی لاش کے مناظر تھے۔ نیوز کاسٹر نے کہا۔ ”آیئے ہم مزید تفصیلات اپنے نمائندے سے معلوم کرتے ہیں۔ ان کے نمائندے نے بتایا کہ پولیس کا مؤقف ہے کہ یہ قتل کسی دشمنی کا نتیجہ بھی ہوسکتا ہے۔ اب سے چند ماہ قبل مس رمشا اور خرم میں بہت قریبی تعلقات تھے جو بعد میں بعض وجوہ کی بنا پر منقطع ہوگئے تھے اور ایک ہی آفس میں رہتے ہوئے دونوں ایک دوسرے سے بات بھی نہیں کرتے تھے۔ ایک موقعے پر تو مس رمشا نے ملزم کو کسی بات پر آفس میں تھپڑ بھی مار دیا تھا۔ ممکن ہے ملزم نے اپنی توہین کا بدلہ لینے کے لیے مس رمشا کو ہلاک کر دیا ہو۔ پولیس ملزم کی تلاش میں مختلف مقامات پر چھاپے مار رہی ہے۔“

اس چینل کا رپورٹر واقعی بہت باخبر تھا۔ اس نے ہمارے آفس جا کر یہ تمام معلومات اکٹھی کی ہوں گی۔ اب میڈیا رمشا کو مظلوم بنا کر پیش کر رہا تھا۔ چینل نے رمشا کے بوڑھے والدین کو بھی دکھایا اور رپورٹر نے ان سے بات چیت بھی کی۔ ان سب باتوں کا یہ نتیجہ نکل رہا تھا کہ میں عام آدمی کی نظروں میں ایک درندہ صفت انسان تھا جس نے ایک معصوم لڑکی کو محض انتقام کی خاطر گولی مار دی تھی۔ رپورٹر نے یہ بھی بتایا کہ چند ماہ قبل کمپنی کے مالک مسٹر فرخ نے غبن کے الزام میں ملزم کو ملازمت سے نکال دیا تھا لیکن کوئی ثبوت نہ ملنے کی بنا پر مسٹر فرخ نے نہ صرف کورٹ میں ملزم سے معافی مانگی بلکہ ہتک عزت کے ازالے کے طور پر کورٹ نے انہیں ملزم کو دو کروڑ روپے ادا کرنے کی ہدایت بھی کی تھی۔ نیوز کاسٹر نے پوچھا۔ ”یہ بتایئے کہ کیا مسٹر فرخ نے ملزم کو ہرجانے کی رقم ادا کر دی تھی؟“

”جی ہاں، قتل کی صبح مسٹر فرخ نے ملزم کے ایڈووکیٹ وقار کو دو کروڑ روپے کا پے آرڈر کورٹ میں ادا کر دیا تھا۔ مسٹر وقار نے وہ رقم ملزم کے اکاؤنٹ میں منتقل بھی کر دی تھی لیکن اب پولیس نے ملزم کا اکاؤنٹ سیز کر دیا ہے۔“

میں نے جھنجلا کر ٹی وی آف کر دیا اور کھانے کے چند لقمے لے کر اٹھ گیا۔

”خرم صاحب! آپ کھانا تو کھائیں۔“ ربیعہ نے کہا۔ ”میڈیا تو تصویر کا صرف وہی رخ دکھاتا ہے جو اسے دکھایا جاتا ہے۔ آپ اتنے پریشان اور مایوس ہوں گے تو کام کیسے چلے گا؟ کھانا کھائیں اور حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ آپ بے گناہ ہیں تو کوئی آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔“

ربیعہ کی بات میرے دل کو لگی۔ وہ میرے مقابلے میں بالکل ناتجربے کار تھی اس کے باوجود میرا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔ میں نے بھی تمام خیالات کو ذہن سے جھٹک کر کھانا کھایا اور وقار کا نمبر ڈائل کیا۔

اس نے چھوٹتے ہی کہا۔ ”دیکھ لیا... اپنے فرار کا انجام! اگر تم موقعے پر موجود رہتے تو شاید تمہاری اتنی رسوائی نہ ہوتی۔ الیکٹرانک میڈیا تو خاص طور پر اس قسم کی خبروں کو مرچ مسالا لگا کر نشر کرتا ہے۔ ہاں، میں نے پولیس کے اس اقدام کے خلاف کورٹ میں پٹیشن داخل کر دی ہے کہ ملزم کا بینک اکاؤنٹ کیوں سیز کیا گیا ہے؟ اس قتل میں پیسے کا لین دین انوالو نہیں ہے، پھر ایسا کیوں کیا گیا ہے۔ ممکن ہے جج میری بات پر غور کرے اور تمہارا بینک اکاؤنٹ بحال ہو جائے۔ ابھی تم وہیں رہو جہاں ہو۔ کسی سے بھی ملنے کی کوشش مت کرنا اور اپنا خیال رکھنا۔ میں کوئی نہ کوئی صورت نکال لوں گا۔“

وقار نے رابطہ منقطع کر دیا لیکن میں اسی طرح بیٹھا رہا۔ اللہ نے مجھے نہ جانے یہ کس آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ میں نے تو ہمیشہ یہی کوشش کی تھی کہ میری ذات سے دوسروں کو فائدہ ہی پہنچے۔ میں نے صدقِ دل سے دعا کی۔ ”اے رب العزت! میں تیرا انتہائی گناہ گار بندہ ہوں لیکن میرے گناہ ایسے بھی نہیں ہیں کہ مجھے اتنی بڑی سزا ملے۔ یا اللہ! میری مدد فرما اور مجھے حوصلہ دے کہ میں ایک دفعہ پھر دنیا والوں کے سامنے سر اٹھا کر چل سکوں۔“

اس رات نیند کے لیے میں نے خواب آور گولیوں کا استعمال کیا۔ میں نے روبی اور رضا کو جان بوجھ کر ٹیلی فون نہیں کیا کہ وہ خود بھی مایوس ہوں گے اور ان کی باتوں سے مجھے بھی مایوسی ہوگی۔

مجھے شرافت علی پر بھی حیرت تھی۔ اسے میری ذات پر ایسا اندھا اعتماد تھا کہ وہ اپنی جوان بیٹی کو میرے پاس چھوڑ جاتا تھا۔ ربیعہ واقعی انتہائی حسین تھی۔ اسے دیکھ کر تو اچھے خاصے زاہد و عابد کی نیت بھی ڈانواں ڈول ہوسکتی تھی۔

دوسرے دن بھی ٹی وی کے مختلف چینلز پر میری خبر نشر کرتے رہے۔ میں نے روبی اور رضا سے بھی مختصر بات کی۔ ان دونوں نے میرا حوصلہ بڑھایا۔

شام کو شرافت علی آفس سے لوٹا تو اس نے بتایا۔ ”خرم صاحب! آپ فضل الرحمن صاحب کے خاص ملازم غلام حسین کو جانتے ہیں؟“

”میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ ان کا گھریلو ملازم تھا بلکہ ملازم خاص تھا۔ ان کے بہت سے امور میں اس کا عمل دخل بھی تھا۔ فضل الرحمن صاحب کے انتقال کے بعد وہ ملازمت چھوڑ کر چلا گیا تھا۔“

”مجھے آج ایک خاص بات معلوم ہوئی ہے۔“ شرافت علی نے کہا۔ ”غلام حسین آج کل ڈیفنس کے ایک بنگلے میں شاہانہ زندگی گزار رہا ہے۔ اس کے بچے شہر کے اعلیٰ اسکولوں میں پڑھ رہے ہیں۔ اس کے پاس دو گاڑیاں ہیں۔ اب آپ سوچیے کہ ایک گھریلو ملازم کے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی کہ وہ ایسی زندگی گزار سکے۔“

میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔ واقعی شرافت علی کی بات میں وزن تھا۔

”شرافت علی! تم ایسا کرو کہ کسی نہ کسی طرح غلام حسین کا پتا معلوم کرو۔“

”میں نے اس کا پتا بھی معلوم کر لیا ہے۔ ہمارے ہی آفس میں ایک پیون اللہ بخش ہے۔ غلام حسین سے اس کی دوستی تھی۔ آج باتوں باتوں میں اس نے بتایا کہ غلام حسین نے فضل الرحمن صاحب کی اتنی خدمت کی ہے کہ آج وہ شاہانہ انداز میں زندگی گزار رہا ہے لیکن ہے بہت تو تا چشم... اب تو وہ مجھ سے بھی نہیں ملتا۔ میں نے باتوں باتوں میں غلام حسین کا پتا بھی پوچھ لیا۔“

”شرافت علی! اس غلام حسین سے پوچھ گچھ کرنا بہت ضروری ہے۔ مجھے بتاؤ کہ وہ کہاں رہتا ہے؟“

”میں سب معلوم کر چکا ہوں سر!“ شرافت علی نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ”اس کے بنگلے میں دو ملازمین، ایک چوکیدار اور ایک ڈرائیور ہے جو اس کی بیوی اور بچوں کے لیے ہے۔ اپنی گاڑی وہ خود ڈرائیو کرتا ہے۔“

میں اچانک اٹھ کھڑا ہوا اور جوتے پہننے لگا۔

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“ شرافت علی گھبرا کر بولا۔

”تم میری گاڑی لے آؤ۔ میں غلام حسین کے گھر جا رہا ہوں۔“

”آپ کا وہاں جانا مناسب نہیں ہے۔“ شرافت علی نے کہا۔

”شرافت علی! میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے کب تک بیٹھا رہوں گا؟ مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ یہ غلام حسین بہت کچھ جانتا ہے۔“

”سر! بات تو آپ کی ٹھیک ہے لیکن آپ وہاں اکیلے مت جائیں۔ وہاں نہ جانے کس قسم کے حالات پیش آئیں۔“

”ابھی تو مجھے وہاں اکیلا ہی جانا پڑے گا۔“ میں نے کہا۔

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسکرین پر ارسلان کا نام دیکھ کر مجھے خوش گوار حیرت ہوئی۔ ارسلان میرا بچپن کا دوست تھا جو پچھلے دو برس سے لندن میں تھا۔ میں نے فوراً کال ریسیو کر لی۔ ”ہیلو ارسلان! تو زندہ ہے؟“

”میں تو زندہ ہوں لیکن مجھے تیری طرف سے بہت زیادہ تشویش ہے۔ میں ابھی تھوڑی دیر پہلے لندن سے کراچی پہنچا ہوں۔ یہاں آتے ہی پہلی خبر مجھے یہی ملی کہ تو نے کسی لڑکی کو قتل کر دیا ہے۔“

میں نے مختصراً اسے بھی پورا واقعہ بتا دیا اور کہا۔ ”مجھے ایک کلیو ملا ہے۔ وہ اس قتل سے متعلق تو شاید نہ ہو لیکن اس کے ذریعے ہم قاتل تک ضرور پہنچ سکتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تو تھکا ہوا ہوگا لیکن میں ابھی اور اسی وقت نکل رہا ہوں۔ مجھے تیری مدد کی ضرورت ہے۔“

”ارے یار! میں کون سا پیدل لندن سے آیا ہوں۔ سارا وقت تقریباً سوتا رہا ہوں۔ اب میں بالکل فریش ہوں۔ بتا کہاں چلنا ہے؟“

میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں ساڑھے دس بجے تک ڈیفنس ۱۱ کے پیٹرول پمپ پر پہنچوں گا۔ وہی پیٹرول پمپ جہاں ایک دفعہ ہمارا پمپ والوں سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ تم اپنی کار میں آنا۔ میں ٹیکسی کے ذریعے وہاں پہنچوں گا۔ پھر

میں بتاؤں گا کہ ہمیں کہاں چلنا ہے۔ اپنی گن بھی ساتھ لے لینا... ٹھیک ساڑھے دس بجے!''

''خرم صاحب!'' شرافت علی نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں آپ کو اکیلا نہیں جانے دوں گا۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''میرا ایک بھتیجا جیسی چلاتا ہے۔ وہ کسی زمانے میں بدمعاش تھا۔ اب اس نے ہر برائی سے توبہ کرلی ہے۔ وہ ہمارے بہت کام آسکتا ہے۔''

''شرافت علی! یہ میری زندگی اور موت کا سوال ہے۔ تمہارے بھتیجے کو معلوم ہوگیا کہ میں کون ہوں اور کیا چاہ رہا ہوں تو وہ فوراً ہی پولیس کو لے کر پہنچ جائے گا۔ میں اور ارسلان اس کام کے لیے کافی ہیں۔ ہاں، تم ساتھ چلنا چاہو تو چلو لیکن کسی تیسرے آدمی کو تو کانوں کان خبر نہیں ہونا چاہیے کہ میں تمہارے گھر میں چھپا ہوا ہوں۔''

''جیسے آپ کی مرضی!'' شرافت علی نے کہا۔

☆☆☆

ارسلان نے اپنی گاڑی اس گلی کے نکڑ پر پارک کردی تھی جس میں غلام حسین کا بنگلا تھا۔ اس سے پہلے ہم نے اس گلی کا ایک چکر لگایا تھا۔ دروازے پر پیتل کی نیم پلیٹ پر انگلش میں غلام حسین لکھا ہوا تھا جو گیٹ پر لگے ہوئے بلب کی روشنی میں چمک رہا تھا۔

''یار! ابھی تو گیارہ ہی بجے ہیں۔'' ارسلان نے کہا۔ ''ہم یہاں تین گھنٹے بعد آئیں گے تو زیادہ مناسب ہوگا۔''

''یہ وقت کہاں گزارے گا؟''

''ارے، یہ کوئی پرابلم ہے؟'' ارسلان نے کہا۔ ''شرافت بھائی کا گھر یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ مشکل سے دس منٹ کی ڈرائیو پر ہوگا۔ ہم دو تین گھنٹے وہاں گزار سکتے ہیں۔ وہاں بیٹھ کر گرما گرم کافی پئیں گے۔ یوں بھی سردی آج زیادہ ہی ہے۔ میں تجھ سے یہاں کے واقعات سنوں گا اور لندن کے واقعات سناؤں گا۔ تین گھنٹے تو یوں چٹکی بجاتے گزر جائیں گے۔''

''ارسلان صاحب ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔'' شرافت علی نے کہا۔ ''آپ جوش میں آکر کچھ جلد ہی گھر سے نکل پڑے۔''

ہم ایک دفعہ پھر شرافت علی کے گھر پہنچے۔

ربیعہ ہمارے لیے کافی لے کر آئی تو ارسلان اسے دیکھ کر پلکیں جھپکانا بھول گیا۔ وہ بھی ارسلان کو عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس وقت شرافت علی موجود نہیں تھا۔ وہ دونوں چند لمحے تک ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے، پھر ربیعہ ہی نے شرما کر نظریں جھکالیں اور کافی کی ٹرے میز پر رکھ کر وہاں سے چلی گئی۔

''اس گدڑی میں یہ لعل کہاں سے آیا؟'' ارسلان نے اپنے مخصوص لہجے میں پوچھا۔

''یہ شرافت علی کی بیٹی ربیعہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن ابھی بہت چھوٹی ہے اور انٹرمیڈیٹ میں پڑھتی ہے اور...''

''چھوٹی ہے؟'' ارسلان نے آنکھیں نکالیں۔ ''وہ تجھے کس طرف سے چھوٹی لگ رہی ہے۔ اس کا قد تقریباً 5 فٹ چار یا پانچ انچ ہوگا، وزن پچپن کے جی اور...''

''بس بس!'' میں نے اسے ٹوک دیا۔ ''میں جانتا ہوں کہ اب تو کیا بتانے والا ہے۔ یہاں میری جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں اور تو...''

''ابے تو جان کے لالے کیا میں نے ڈالے ہیں یا اس بلبلِ بغداد نے جسے تو ربیعہ کہہ رہا ہے۔ یہ سب تیری کرنی کا پھل ہے۔ تو ہمیں کیوں الزام دے رہا ہے؟'' پھر وہ گھڑی دیکھ کر بولا۔ ''دیکھ رات کا ڈیڑھ تو بج گیا۔ میرے خیال میں اب ہمیں نکلنا چاہیے۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''یار خرم! تو اس بڈھے کو ساتھ کیوں لے جارہا ہے؟ اس کی وجہ سے کام خراب نہ ہوجائے۔''

''تو فکر مت کر... یہ بہت کام کا آدمی ہے۔ اس کی وجہ سے کام خراب نہیں ہوگا بلکہ یہ ہمارے بہت کام آئے گا۔''

☆☆☆

ایک دفعہ پھر ہم غلام حسین کی گلی کے نکڑ پر موجود تھے۔ پھر ارسلان بڑبڑایا۔ ''یار! ہم گاڑی یہیں چھوڑتے ہیں اور سامنے کے گیٹ سے چلتے ہیں۔ گیٹ پر ایک پٹھان چوکیدار ہی تو ہے۔ اس سے نمٹنا کیا مشکل ہے؟'' پھر وہ چونک کر بولا۔

''شرافت بھائی! آپ کو ڈرائیونگ آتی ہے؟''

''جی صاحب! میں نے کمپنی میں دو سال ڈرائیوری بھی کی ہے۔''

''ویری گڈ!'' اس نے کہا۔ ''آپ ڈرائیونگ سیٹ پر آجائیں اور ہمیں غلام حسین کے بنگلے سے کچھ آگے جاکر اتار دیں۔ اس گلی کا دوسرا سرا غلام حسین کے گھر سے زیادہ نزدیک ہے۔ آپ گاڑی لے کر گلی کے دوسرے سرے پر کھڑے ہو جائیں اور اس کا یونٹ کھول کر یونہی انجن کو دیکھیں جیسے کوئی خرابی ہوگئی ہو۔ یہ میں احتیاط کے لیے کہہ رہا ہوں کہ اگر کوئی وہاں سے گزرے بھی تو اسے آپ پر شبہ نہ ہو۔ چلیے، اب اللہ

کا نام لے کر روانہ ہوجاتے ہیں۔''

شرافت علی ڈرائیونگ سیٹ پر آگیا اور ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھادی اور لمحوں میں گلی کے دوسرے سرے پر پہنچ گیا۔ وہاں سے تیسرا بنگلا غلام حسین کا تھا۔

ہم دونوں ٹہلتے ہوئے بنگلے تک آئے۔ سردی کی وجہ سے میں نے سر پر گرم ٹوپی پہن رکھی تھی اور مفلر کو کچھ اس انداز میں لپیٹ رکھا تھا کہ میرا چہرہ واضح طور پر نظر نہیں آرہا تھا۔ ہم دونوں قمری پیس سوٹ میں تھے تاکہ چوکیدار ہمارے حلیے سے متاثر ہوجائے۔

غلام حسین کے بنگلے پر پہنچ کر ارسلان نے آہستہ سے گیٹ پر دستک دی۔ میں اس کی آڑ میں تھا۔

دوسری دستک پر گیٹ کی ذیلی کھڑکی کھلی اور چوکیدار نے باہر جھانک کر دیکھا۔ وہ ارسلان کی شاندار شخصیت سے مرعوب ہوگیا۔ ''جی صاب؟'' اس نے ادب سے پوچھا۔

''ہمیں غلام حسین صاحب سے ملنا ہے۔'' ارسلان نے کہا۔

''صاب! اس ٹیم تو صاب سو گیا ہوگا... آپ صبح آجاؤ۔''

''اس وقت ہمارا ملنا بہت ضروری ہے خان! تم ایسا کرو کہ صاحب کو جگادو... ان سے کہنا کہ لندن سے آصف آیا ہے۔ وہ فوراً ہمیں بلوالیں گے۔''

چوکیدار چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔ ''اچھا، آپ لوگ ٹھہرو... میں صاحب کو اطلاع کرتا ہوں۔''

''آج تو سردی کچھ زیادہ ہی ہے خان!'' ارسلان نے کہا۔ ''ہمیں اندر تو آنے دو۔ ہم اس ٹھنڈی ہوا سے تو بچ جائیں گے۔''

''اندر آجائیں صاب!'' چوکیدار نے کہا۔

گیٹ کے ساتھ ہی اس کا کمرا تھا۔ مجھے کھڑکی کے شیشے میں سے انٹرکام نظر آگیا۔ وہ انٹرکام پر یا تو کسی ملازم کو اطلاع دیتا یا براہِ راست غلام حسین کو اطلاع دیتا۔

ارسلان نے بھی شاید انٹرکام دیکھ لیا تھا۔ وہ تیزی سے چوکیدار کے پیچھے لپکا۔ چوکیدار نے انٹرکام کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ارسلان نے اس کی کنپٹی پر وار کردیا۔

ارسلان کے ہاتھ کی ضرب سے چوکیدار کھڑے کھڑے آگے پیچھے جھولا پھر اس کے فرش پر گرنے سے پہلے ہی ارسلان نے اسے سنبھال لیا اور اٹھا کر اسے چارپائی پر ڈال دیا جو کمرے کے ایک کونے میں پڑی تھی۔ چارپائی پر بستر اور لحاف بھی موجود تھا۔

میں نے پلنگ کی ادوائن کھول کر اس سے چوکیدار کے ہاتھ پیر باندھے اور کمرے میں پڑا ہوا ایک کپڑا اس کے منہ میں اندر تک ٹھونس کر اس کا منہ بھی باندھ دیا۔ پھر ارسلان نے اسے بستر پر ڈالا اور اوپر سے لحاف بھی ڈال دیا تاکہ وہ سردی اور دوسرے لوگوں کی نظروں سے بچا رہے۔

اس کے بعد ہم پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے اندر کی طرف بڑھے۔ پورچ میں دو گاڑیاں موجود تھیں۔ پورچ کے بعد برآمدہ تھا لیکن بنگلے کا داخلی دروازہ اندر سے بولٹ تھا۔

ہم دونوں محتاط انداز میں گھوم کر بنگلے کی پشت پر پہنچے۔ میں نے کچن کی کھڑکی کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ اندر سے بند تھی۔

ارسلان نے جیب سے چوڑا سا ایک ٹیپ نکالا اور کھڑکی کے ایک شیشے پر اچھی طرح لگا دیا۔ پھر اس نے مجھ سے مفلر لیا۔ اسے شیشے پر رکھا اور شیشے پر ضرب لگائی۔ ہلکی سی چٹ کی آواز آئی تو مجھے اندازہ ہوگیا کہ کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ چکا ہے۔ ٹیپ کی وجہ سے اس کے شیشے نہیں بکھرے تھے۔ ارسلان نے بہت احتیاط سے وہ شیشے نکالے اور انہیں جھاڑیوں میں رکھ دیا۔ ان کے پھینکنے سے بھی آواز پیدا ہوسکتی تھی۔

کھڑکی میں گرل نہیں تھی۔ ارسلان نے ٹوٹے ہوئے شیشے میں سے ہاتھ ڈال کر کھڑکی کھول لی اور کچھ دیر اندر کی سن گن لیتا رہا کہ مبادا کوئی ملازم یا ملازمہ کچن میں سو رہی ہو۔ پھر وہ اچھل کر اندر داخل ہوگیا۔

اس کے پیچھے پیچھے میں بھی اندر کود گیا۔

ہمارے جسموں پر قمری پیس سوٹ ضرور تھے لیکن پیروں میں کریپ سول کے جوتے تھے۔ ویسے ہمارے کودنے سے ہلکی سی آواز پیدا ہوئی جیسے بلی کودی ہو۔

اندر داخل ہونے کے بعد میں نے کھڑکی کے پٹ دوبارہ برابر کردیے۔

کچن سے نکل کر ہم ایک کوریڈور میں پہنچے۔ اس سے کچھ فاصلے پر وسیع و عریض ٹی وی لاؤنج تھا جس میں تیس انچ کا پلازما ٹی وی رکھا ہوا تھا۔ لاؤنج خاصا بڑا تھا اور اس کی چاروں طرف کمرے تھے۔ اب یہ معلوم کرنا خاصا دشوار تھا کہ غلام حسین کا کمرا کون سا ہے؟

میں نے ایک کمرے کا دروازہ دھکیلا تو وہ کھل گیا۔ نائٹ بلب کی روشنی میں مجھے ایک لڑکی نظر آئی جو اس وقت گہری نیند میں لحاف میں دبکی سو رہی تھی۔ دوسرے کمرے

میں بھی ایک لڑکی تھی۔ تیسرے کمرے میں تقریباً ساٹھ پینسٹھ سال کا ایک شخص اور ادھیڑ عمر کی ایک عورت سو رہی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ یہی غلام حسین ہوسکتا ہے۔ ارسلان کا بھی یہی خیال تھا۔

ہم کمرے میں داخل ہوئے۔ دروازہ اندر سے بولٹ کیا اور بیڈ کی طرف بڑھے۔ ارسلان نے جیب سے ایک شیشی نکالی اور رومال نکال کر اسے رومال پر چھڑک دیا۔ میں سمجھ گیا کہ ارسلان کلوروفارم بھی ساتھ لایا ہے۔ وہ اسی قسم کا آدمی تھا۔ باہر ٹیپ بھی اس نے اپنی جیب سے نکالا تھا۔

وہ رومال لے کر آگے بڑھا اور عورت کی ناک پر رکھ دیا۔ عورت تھوڑی سی کسمسائی پھر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ ارسلان نے رومال دوبارہ جیب میں رکھا اور اس شخص کے سر پر پہنچ گیا جو بیڈ کے دوسرے سرے پر لحاف میں دبکا سو رہا تھا۔ اس کی مصنوعی بتیسی اس وقت قریب ہی ایک گلاس میں رکھی تھی اور سانس لیتے ہوئے اس کے ہونٹ عجیب انداز میں پھڑپھڑا رہے تھے۔ بالوں کو رنگنے کے لیے اس نے کلر استعمال کیا تھا اور اس کے سر پر سرخ سرخ بال نظر آرہے تھے۔

ارسلان نے جیب سے پسٹل نکالا، اس پر سائیلنسر فٹ کیا اور کچھ بھاری آواز میں بولا۔ ''غلام حسین!''

غلام حسین کچھ کسمسایا پھر پُرسکون ہوگیا۔ دوسری مرتبہ میں نے اس کا شانہ جھنجوڑا اور آواز دی۔ ''اٹھو غلام حسین! تمہارا آخری وقت آگیا ہے۔''

وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور ہکلا کر بولا۔ ''کک... کون ہو تم لوگ؟''

''ہم موت کے فرشتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

میرا چہرہ اس وقت مکمل طور پر مفلر میں چھپا ہوا تھا۔

''میں کیش گھر میں نہیں رکھتا۔ زیور بھی بینک کے لاکر میں ہے۔ یہاں سے تمہیں کچھ بھی نہیں ملے گا۔''

میں نے اچانک اس کے چہرے پر زناٹے دار تھپڑ رسید کردیا اور بولا۔ ''تو ہمیں چور سمجھ رہا ہے؟ ہم موت کے فرشتے ہیں۔ اپنا نام بتا۔'' میں نے مزید تصدیق کے لیے پوچھا۔

''غلام حسین۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''باپ کا نام؟'' ارسلان نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''احمد حسین۔'' اس نے جواب دیا۔

''غلام حسین! تم نے بہت دن عیش کرلیے۔ ہم پولیس کے آدمی ہیں اور ہمیں سب کچھ معلوم ہوچکا ہے کہ تم یہ عیش کس بل بوتے پر کررہے ہو۔ اب ہم سے جھوٹ مت بولنا ورنہ میرا یہ پسٹل بے آواز چلتا ہے۔ صبح تک لوگوں کو یہاں تمہاری لاش ملے گی۔ سچ بولو گے تو ممکن ہے کہ میں تمہیں سزا سے بچالوں۔ جلدی فیصلہ کرو۔ ہمارے پاس وقت کم ہے۔'' پھر وہ مجھ سے بولا۔ ''ایس پی شرافت صاحب کو اطلاع دے دو کہ ہم غلام حسین تک پہنچ گئے ہیں اور اگر اس نے بولنے میں دیر کی تو اسے گولی مار کے اسی طرح خاموشی سے نکل جائیں گے۔ حقائق معلوم کرنے کے ہمارے پاس دوسرے ذرائع بھی ہیں۔''

میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور شرافت کا نمبر ڈائل کرکے دوسرے کونے میں چلا گیا۔ اس نے فوراً ہی فون اٹھالیا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ''پریشان مت ہونا، حالات ہمارے قابو میں ہیں۔ اگر تم کوئی خطرہ محسوس کرو تو یہاں سے نکل جانا۔ یہاں بھی دو دو گاڑیاں موجود ہیں۔''

''یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے، میں آپ کا انتظار کروں گا۔'' شرافت نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے لائن کاٹ دی، پھر غلام حسین کو سنانے کے لیے اس کے قریب آگیا اور قدرے بلند آواز میں بولا۔ ''سر! ہمارے لیے کیا حکم ہے؟ دوست، ابھی گولی ماردیں۔ اوکے سر!'' یہ کہہ کر میں نے سیل فون جیب میں ڈال لیا۔

''دیکھو، اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔'' غلام حسین نے کہا۔

''یہ معلوم کرنا تو ہمارا کام ہے کہ قصوروار کون ہے۔ تم صرف یہ بتاؤ کہ تمہارے ساتھ اور کون شریک ہے؟'' ارسلان نے اندھیرے میں تیر چلایا۔

''یہ سب میں نے فرخ صاحب کے کہنے پر کیا ہے۔''

اس بڈھے نے فوراً دھماکا کردیا۔

اس نے فرخ صاحب کے کہنے پر کیا کیا تھا؟

''ہم جانتے ہیں کہ تم نے یہ سب کچھ فرخ صاحب کے کہنے پر کیا ہے... لیکن کیوں؟ تمہارے پاس کس چیز کی کمی تھی؟''

''میں لالچ میں آگیا تھا۔'' غلام حسین نے کہا۔

''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ فضل الرحمٰن صاحب تم پر کتنا اعتبار کرتے تھے۔'' میں نے پھر ہوا میں تیر چلایا۔

''میں تو آج بھی ان کا وفادار ہوں۔'' غلام حسین نے کہا۔ ''انہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونے دی ورنہ فرخ

صاحب تو انہیں جانوروں کی طرح رکھنا چاہتے تھے لیکن میرا دل نہیں مانا۔''

وہ بڈھا دھماکے پر دھماکے کررہا تھا۔ اس کی باتوں سے تو یہی ظاہر ہورہا تھا کہ فضل الرحمٰن صاحب زندہ ہیں۔

''جب وہ علاج کے لیے لندن گئے تھے تو تم بھی ان کے ساتھ تھے نا؟'' میں نے پوچھا۔

''بس وہیں سے تو میری بربادی شروع ہوئی ہے۔'' غلام حسین نے کہا۔ ''فرخ صاحب نے دھوکے سے بڑے صاحب سے وصیت نامے پر سائن کرالیے۔ وہ فرخ صاحب کو زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔ فرخ صاحب کو خطرہ تھا کہ کہیں وہ اپنی جائیداد کسی اور کے حوالے نہ کردیں۔

''وہ تو شاید انہیں مار دیتے لیکن عین وقت پر انہیں معلوم ہوا کہ بڑے صاحب کی تیس کروڑ کی بیمہ پالیسی بھی ہے۔ وہ بیمہ پالیسی ان کی ولایتی بیگم کے نام تھی۔ فرخ صاحب چاہتے تھے کہ اس پالیسی پر پرانی تاریخ میں ان کے سائن لے لیں۔ بڑے صاحب بھی یہ بات سمجھتے تھے کہ اگر انہوں نے سائن کردیے تو فرخ انہیں مار دے گا۔ ان کی موت کی خبر تو فرخ صاحب پہلے ہی مشہور کرچکے تھے۔''

''وہ انہیں لندن سے واپس پاکستان کیسے لایا؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ انہیں لندن لے کر گئے ہی نہیں تھے۔ صرف یہ مشہور کردیا تھا کہ لندن میں ان کا علاج ہورہا ہے۔ پھر انہوں نے لندن ہی میں رہنے والے کسی پاکستانی ڈاکٹر کو لاکھوں روپے دے کر ان کی موت کا سرٹیفکیٹ بنوایا اور مشہور کردیا کہ لندن میں بڑے صاحب کا انتقال ہوگیا اور ان کی وصیت کے مطابق انہیں ان کی ولایتی بیگم کے ساتھ دفن کردیا گیا۔ فرخ صاحب وہ سرٹیفکیٹ لے کر پاکستان آگئے۔ بڑے صاحب اس وقت پاکستان ہی میں تھے۔ جب انہیں بڑے صاحب کی بیمہ پالیسی کے بارے میں معلوم ہوا تو انہوں نے کمپنی پر تیس کروڑ روپے کا کلیم کردیا۔ کمپنی نے جواب دیا کہ جب تک پالیسی فرخ کے نام نہیں ہوگی، اسے ادائیگی نہیں کی جائے گی۔ کوئی پاکستانی کمپنی ہوتی تو فرخ صاحب شاید کسی نہ کسی طرح یہ رقم بھی نکلوا لیتے لیکن وہ لندن کی بہت بڑی بیمہ کمپنی ہے۔ فرخ صاحب نے اسے لکھ دیا کہ ڈیڈی نے پالیسی میرے نام کردی تھی۔ وہ پیپرز کہیں گم ہوگئے ہیں، میں جلد ہی انہیں تلاش کرکے بھیج دوں گا۔

''کمپنی نے جواب دیا کہ ہمیں جیسے ہی فضل الرحمٰن صاحب کی وصیت موصول ہوگی، ہم آپ کا کلیم ادا کردیں گے۔''

اسی وقت عورت کچھ کسمسائی۔ ارسلان لپک کر اس کے سر پر پہنچا اور رومال نکال کر ایک مرتبہ پھر اس کی ناک پر رکھ دیا۔

''فضل الرحمٰن صاحب اس وقت کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ اس وقت اپنے فارم ہاؤس میں ہیں اور وہاں بہت آرام سے ہیں۔''

''اٹھو، ہمارے ساتھ چلو۔'' میں نے کہا۔

''کک... کہاں؟'' غلام حسین ہکلایا۔

''اس فارم ہاؤس پر جہاں اس وقت فضل الرحمٰن صاحب موجود ہیں۔''

''مم... میں وہاں جاکر کیا کروں گا؟'' غلام حسین نے کہا۔

میں نے پھر زناٹے کا ایک تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کردیا۔

''اٹھتا ہے یا میں فائر کروں؟'' ارسلان نے درشت لہجے میں کہا۔

غلام حسین کانپتا ہوا اٹھا۔ وہ بوڑھا آدمی تھا۔ میرا اندازہ غلط تھا۔ وہ کم سے کم ستر سال کا رہا ہوگا۔ اس نے ایک موٹا اونی سوئٹر پہنا۔ اوپر ایک جیکٹ پہنی، کانوں تک اونی ٹوپی اوڑھی اور چلنے کے لیے تیار ہوگیا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر شرافت کو کال کی اور کہا۔ ''گاڑی غلام حسین کے گیٹ پر لے آؤ۔''

ہم تینوں بہت احتیاط سے باہر نکلے اور داخلی دروازہ کھول کر برآمدے میں آگئے۔ غلام حسین ہم دونوں کے بیچ میں تھا اور کانپتا ہوا چل رہا تھا۔ روانگی سے پہلے اس نے اپنی نقلی بتیسی بھی لگالی تھی۔

فضل الرحمٰن صاحب کا فارم ہاؤس وہاں سے دو گھنٹے کے فاصلے پر تھا۔ میں نے رسٹ واچ پر نظر دوڑائی۔ اس وقت اس میں تین بج رہے تھے۔ گویا یہ کارروائی ہم نے ایک گھنٹے میں کی تھی۔ فرخ کے فارم ہاؤس کا علم شرافت کو بھی تھا لیکن وہاں کوئی جاتا نہیں تھا۔ کسی کو جانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

میں جانتا تھا کہ فرخ نے فضل الرحمٰن صاحب کی نگرانی کے لیے وہاں گارڈز بھی رکھے ہوں گے۔ اس لیے ہم غلام حسین کو ساتھ لے جارہے تھے کہ وہ وہاں جاتا رہتا تھا۔

گارڈز اسے پہچانتے ہوں گے۔

شرافت نے اس روز گویا تیز رفتاری کے تمام ریکارڈ توڑ دیے اور دو گھنٹے کا فاصلہ ڈیڑھ گھنٹے میں طے کرلیا۔ فارم ہاؤس کی چار دیواری سے پہلے ایک خالی قطعہ زمین تھا جس پر چاروں طرف نکیلے آہنی تاروں کی باڑ لگی ہوئی تھی۔ اس کے سرے پر ایک گیٹ تھا۔

گیٹ پر دو گارڈز موجود تھے۔ دونوں مقامی تھے اور شلوار قمیص میں ملبوس تھے۔

گیٹ بند تھا اس لیے شرافت نے گاڑی روک دی۔

ارسلان نے ریوالور کی نال غلام حسین کی کمر سے لگا دی اور سفاک لہجے میں بولا۔ ''اگر کوئی گڑبڑ کی تو میں سب سے پہلے تمہیں گولی مار کے ٹھنڈا کروں گا۔''

دونوں گارڈز گاڑی کے پاس آئے تو غلام حسین نے بلند آواز میں کہا۔ ''دھنی بخش... گیٹ کھولو۔''

''حاضر سائیں!'' دھنی بخش نے جواب دیا اور اپنے ساتھی سے کچھ کہا۔ پھر اس نے گیٹ کھول دیا۔ شرافت گاڑی اندر لے گیا۔ اندر دو تین ڈوبرمین کتے دیکھ کر میں لرز کر رہ گیا۔ ان کتوں کی موجودگی میں باہر قدم رکھنا بھی گویا موت کو دعوت دینا تھا۔ وہ کتے کچھ دور تک گاڑی کے ساتھ دوڑے پھر ایک طرف چلے گئے کیونکہ یہاں عمارت کا گیٹ تھا۔ وہاں بھی ایک گارڈ موجود تھا۔

گاڑی دیکھ کر اس نے اپنی رائفل سیدھی کرلی۔ میں نے شرافت سے کہا۔ لائٹس آن کردو تاکہ آنے والے کو غلام حسین نظر آسکے۔

''سومر خان!'' غلام حسین نے بلند آواز میں کہا۔ ''بابا گیٹ کھول۔''

''سائیں، سب خیر تو ہے؟''

''ہاں، خیر ہے۔ بڑے سائیں کی طبیعت کچھ خراب تھی اس لیے میں ڈاکٹر صاحب کو لایا ہوں۔'' غلام حسین نے کہا۔

سومر خان نے بھی گیٹ کھول دیا۔ وہاں سے بھی تقریباً آدھے کلومیٹر کے فاصلے پر فارم ہاؤس کی عمارت تھی، باقی حصے میں آم اور امرود کے درخت لگے ہوئے تھے۔

غلام حسین کے کہنے پر شرافت نے گاڑی ایک برآمدے کے سامنے روک دی۔

ہم گاڑی سے اترے تو ہم نے غلام حسین کو پھر اپنے درمیان کرلیا تاکہ وہ اِدھر اُدھر بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔ ویسے بھی وہ بے چارہ بھاگنے کی پوزیشن میں کب تھا۔ وہ تو بری طرح کانپ رہا تھا۔ اس کی وجہ سردی نہیں بلکہ وہ خوف زدہ تھا۔

وہ بوجھل قدموں سے ایک کمرے کے سامنے رک گیا اور دروازے پر دستک دی۔

دروازہ کھولنے والا کسی انسان سے زیادہ جن لگ رہا تھا۔ اس کا قد ساڑھے چھ فٹ کے قریب ہوگا۔ وہ مجھے چوڑائی میں بھی اتنا ہی لگ رہا تھا۔ اس کے بڑے بڑے بال تھے اور ہاتھوں کے پنجے اتنے بڑے تھے کہ وہ میرے دونوں ہاتھ ایک ہاتھ سے پکڑ سکتا تھا۔

''سائیں غلام حسین! آپ؟''

اس کمرے میں ایک دوسرا دروازہ بھی تھا۔ اس ادھ کھلے دروازے سے مجھے فضل الرحمٰن نظر آئے جو اس وقت گہری نیند سو رہے تھے۔

مارے خوشی کے میرا دل بلّیوں اچھلنے لگا۔

غلام حسین کھڑے کھڑے اچانک کمرے کے دوسرے کونے کی طرف بھاگا اور چیخا۔ ''اللہ یار! یہ مجھے زبردستی یہاں لائے ہیں۔''

غلام حسین کی یہ حرکت اتنی اچانک تھی کہ میں اور ارسلان ہکا بکا رہ گئے۔

اللہ یار نے ہماری اس حیرت سے فائدہ اٹھایا اور ارسلان کے گن والے ہاتھ پر کلغ رسید کردی۔ ارسلان کا پسٹل ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔ اس نے اچانک چھلانگ لگائی اور ایک ساتھ ہم دونوں کو دبوچ کر فرش پر گرگیا۔ وہ انتہائی طاقتور اور پھرتیلا آدمی تھا۔ فرخ نے بہت سوچ سمجھ کر اسے فضل الرحمٰن صاحب کی نگرانی پر رکھا ہوگا۔ ہم دونوں کی گردنیں اس کے بازوؤں کے حلقے میں تھیں اور ہم کچھ اس پوزیشن میں گرے تھے کہ اپنے ہاتھوں سے اسے ضرب بھی نہیں لگا سکتے تھے۔

میں نے دیکھا کہ غلام حسین نے وہاں سے نکل کر باہر بھاگنا چاہا لیکن شرافت نے اس کا راستہ روک لیا اور اچھل کر اس کی ناک پر ٹکر ماری۔

غلام حسین لہرایا اور فرش پر ڈھیر ہوگیا۔

اللہ یار ہماری گردنیں توڑنے کی کوشش کررہا تھا۔ ہم دونوں کے پیر آزاد تھے۔ میں نے پیر سے اس کی پنڈلی پر بھرپور ضرب لگائی لیکن ہمارے پیروں میں کریپ سول کے جوتے تھے۔ وہ ضرب بھلا اس پر کیا اثر کرتی؟ لمحہ بہ لمحہ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میری سانس گھٹتی جارہی ہو۔ میرے آنکھوں کے آگے نیلے پیلے دائرے ناچ رہے تھے۔ مجھے

معلوم نہیں کہ ارسلان کا کیا حال تھا۔ وہ اس کے دائیں ہاتھ کی گرفت میں تھا اس لیے یقینی طور پر اس کا حال مجھ سے بُرا ہو گا کیونکہ ہر انسان کے دائیں ہاتھ میں زیادہ قوت ہوتی ہے۔

میں نے جسم کی پوری قوت مجتمع کرکے اپنا دایاں ہاتھ اس دیو نما انسان کے نیچے سے نکال لیا۔ پھر میں نے اس کے چہرے پر بھرپور پنچ مارا۔ سانس گھٹنے کی وجہ سے میرے پنچ میں بھی وہ قوت نہیں تھی جو عام حالات میں ہوتی ہے۔ اس پنچ سے صرف اتنا فرق پڑا کہ اس کے ہاتھ کی گرفت میری گردن کے گرد کچھ کمزور پڑ گئی۔ میں نے دوسرا پنچ زیادہ قوت سے مارا جو اس کی پکوڑا سی ناک پر لگا۔ وہ بری طرح کراہا اور ہاتھ کی گرفت مزید ڈھیلی ہوگئی۔

میں پھرتی سے اس کی گرفت سے نکل گیا اور قلابازی کھا کر اس سے کچھ فاصلے پر چلا گیا۔ پھر میں نے اس کے لمبے لمبے بال پکڑے اور اس کا سر پوری قوت سے فرش سے ٹکرا دیا۔ اس کے حلق سے بھیانک کراہ بلند ہوئی اور اس نے ارسلان کو بھی چھوڑ دیا۔

ارسلان اسی طرح بے سدھ پڑا رہا۔ یہ سوچ کر میں لرز کر رہ گیا کہ کہیں ارسلان دم گھٹنے سے مر تو نہیں گیا۔

میں بوکھلاہٹ میں ارسلان کی طرف بڑھا تو مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا، گویا وہ صرف بے ہوش ہوا تھا۔

ارسلان کا جائزہ لینے کے چکر میں اس دیو کی طرف سے میں کچھ غافل ہوگیا تھا۔

اسے پھر موقع مل گیا اور اس مرتبہ اس نے مجھے پشت سے دبوچ لیا اور اپنی گرفت آہستہ آہستہ سخت کرنے لگا۔

میں نے اپنا سر پوری قوت سے اس کے منہ پر مارنا چاہا لیکن اس کا منہ میرے سر سے بہت اونچا تھا۔ میری ٹکر اس کے سینے پر پڑی۔ یہ ٹکر بھی خاصی زبردست تھی۔ ٹکر لگنے سے اللہ یار کی گرفت کچھ کمزور ہوئی تو میں نے دوسری ٹکر اسی انداز میں ماری اور اس کی گرفت سے نکل گیا۔

پھر گھوم کر میں نے اس کے بال پکڑ لیے اور اس کا چہرہ جھکا کر اپنا گھٹنا پوری قوت سے اس کے چہرے پر مارا۔ میرے گھٹنے کی دوسری ضرب سے وہ آگے پیچھے جھولا اور فرش پر گر گیا۔ اس کے گرنے کے باوجود میں نے اس کی کنپٹی پر دو زوردار پنچ رسید کردیے مگر میں نے دیکھا کہ وہ کچھ سنبھل کر پھر اٹھنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں بہت بُری طرح تھک گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اب اگر اس نے پکڑ لیا تو پھر یہ میری جان لیے بغیر نہیں چھوڑے گا۔ میں نے جھنجلا کر ایک ہاتھ اس کی ٹھوڑی کے نیچے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کا سر تھام کر اس کی گردن کو زوردار جھٹکا دیا۔ سوکھی لکڑی کے چٹخنے جیسی آواز آئی۔ میں سمجھ گیا کہ اس کی گردن ٹوٹ چکی ہے۔ وہ فرش پر پڑا بُری طرح ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ شرافت، ارسلان کو ہوش میں لانے کی کوشش کررہا تھا۔

اسے کونے میں پانی کا گھڑا نظر آگیا۔ اس کے نزدیک ہی اسٹیل کا ایک گلاس بھی رکھا تھا۔ شرافت نے گھڑے سے پانی لیا اور ارسلان کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ ارسلان تھوڑا سا کسمسایا پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس وقت تک شرافت چلو میں پانی لے کر ارسلان کے منہ پر دوبارہ چھینٹے مار چکا تھا۔

''ارے بس کرو بھائی... میں اس دیو کے ہاتھوں تو نہیں مرا لیکن ان سے ضرور مر جاؤں گا۔'' ارسلان نے ہنس کر کہا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر اس کی نظر اللہ یار پر پڑی جو ساکت ہو چکا تھا۔ اس نے حیرت سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''کیا تم نے اسے مار دیا؟''

''ہاں تو پھر اور کیا کرتا؟ کم بخت بہت سخت جان تھا۔''

''اور اس غلام حسین کو کیا ہوا؟'' ارسلان نے پوچھا۔

''اس نے باہر بھاگنے کی کوشش کی تھی لیکن شرافت نے ٹکر مار کے اسے بے ہوش کردیا۔''

''اس کا خون صاف کرو اور اسے ہوش میں لاؤ۔ ہمیں ابھی یہاں سے باہر بھی نکلنا ہے۔''

شرافت نے جیب سے رومال نکال کر اسے پانی میں بھگویا اور غلام حسین کی ناک سے بہنے والا خون صاف کرنے لگا۔ پھر اس نے غلام حسین کے چہرے پر بھی پانی کے چھینٹے مارے۔ وہ بھی کسمسا کر ہوش میں آگیا۔

''یہ تم نے کیا حرکت کی تھی؟'' ارسلان نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''اس سے بعد میں نمٹ لیں گے، پہلے فضل الرحمٰن صاحب کی خبر تو لے لیں۔''

میں کمرے میں داخل ہوا اور جا کر آہستہ سے آواز دی۔ ''سر... آنکھیں کھولیں سر!''

''میں مر جاؤں گا لیکن اس وصیت نامے پر سائن نہیں کروں گا۔'' وہ چیخ کر بولے۔

''سر! میں آپ سے سائن کرانے نہیں آیا ہوں۔'' میں نے کہا۔

انہوں نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ چند لمحوں تک وہ حیرت سے مجھے دیکھتے رہے پھر بولے۔ ''خرم بیٹا! تو

یہاں پہنچ گیا؟ مجھے امید تھی کہ تو ہی مجھے اس کمینے فرخ کے چنگل سے چھڑا سکتا ہے۔"

"چلیے اب جلدی سے کوٹ پہن لیں اور ہمارے ساتھ چلیں، باہر بہت سردی ہے۔"

"میرے پاس تو کوٹ نہیں ہے۔" فضل الرحمٰن صاحب نے بے بسی سے کہا۔

"آپ میرا کوٹ پہن لیں، اوپر سے یہ چادر اوڑھ لیں۔" میں نے اپنا کوٹ انہیں دیا اور بستر کی چادر کھینچ لی۔ میں نے اپنا مفلر بھی فضل الرحمٰن صاحب کو دے دیا تاکہ انہیں سردی نہ لگ جائے۔ پھر ہم باہر آ گئے۔

"تم لوگ مجھے یہاں سے چھپا کر لے جاؤ ورنہ وہ حرامزادے گارڈز ہمیں یہاں سے نکلنے نہیں دیں گے۔"

"آپ فکر مت کریں۔ اچھا ہوا آپ نے بتا دیا۔" میں نے کہا۔ ہم گاڑی میں کچھ اس انداز میں بیٹھے کہ فضل الرحمٰن کو عقبی نشست کے پائے دان پر لٹا دیا گیا۔ ان کے ساتھ عقبی سیٹ پر میں اور غلام حسین بیٹھ گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ اس مرتبہ بھی شرافت کے ہاتھ میں تھی اور پسنجر سیٹ پر ارسلان بیٹھا تھا۔ اس نے اپنا پسٹل لوڈ کر کے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا اور وہ اتنا بھنایا ہوا تھا کہ کسی بھی لمحے فائر کر سکتا تھا۔ واپسی میں سومر خان نے بغیر کسی پوچھ گچھ کے دروازہ کھول دیا اس نے گزرتے ہوئے غلام حسین کو سلام بھی کیا۔

دوسری چیک پوسٹ پر دمنی بخش اور اس کے ساتھی نے ہمیں روک لیا۔

"کیا بات ہے دمنی بخش؟" غلام حسین نے پوچھا۔

"سائیں! گاڑی کی تلاشی لینا ہے۔"

"گاڑی کی تلاشی؟" غلام حسین نے تلخ لہجے میں کہا۔ "لیکن کیوں؟"

"سائیں! سومر خان نے کہا ہے کہ مجھے گاڑی میں کچھ دکھائی دیا ہے لیکن اس وقت میں نے دھیان نہیں دیا۔"

"چل تو اب تلاشی لے لے اور اپنی تسلی کر لے۔" غلام حسین نے کہا۔ "ہم لوگ نیچے اتر جاتے ہیں لیکن اگر مجھے دیر ہو گئی تو یاد رکھنا کہ سائیں فرخ تمہاری کھال کھینچ لے گا۔"

"ڈرائیور!" غلام حسین نے کہا۔ "نیچے اترو اور اسے ڈکی بھی کھول کر دکھا دو کہ ہم گاڑی میں کیا خزانہ لے جا رہے ہیں۔"

"برا مت مانو سائیں... یہ سومر خان نے کہا ہے۔ میں نے اسے کہا بھی کہ گاڑی میں بھلا کیا چیز ہو سکتی ہے۔"

"ایسا کرو خادم کو بھی بلا لو تاکہ تم یہ تو کہہ سکو کہ تلاشی کے وقت میں اکیلا نہیں تھا بلکہ میرے ساتھ خادم بھی تھا۔"

دمنی بخش نے آواز دی۔ "اے خادم! سائیں بلا رہا ہے۔"

وہ دونوں جیسے ہی نزدیک آئے، ارسلان نے یکے بعد دیگرے دو فائر کیے اور ان کی کھوپڑیوں میں سوراخ کر دیا۔ اس کے پسٹل میں سائیلنسر فٹ تھا اس لیے ٹھک کی ہلکی سی آوازیں آئیں۔ وہ دونوں گر کے تڑپنے لگے۔

"گاڑی آگے بڑھاؤ۔" ارسلان نے سفاک لہجے میں کہا۔

شرافت علی نے گاڑی جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

"فضل الرحمٰن صاحب! اب آپ سیٹ پر بیٹھ جائیں۔" میں نے کہا۔

"ابھی نہیں بیٹا! جب تک ہم مین روڈ تک نہیں پہنچ جاتے خطرہ موجود رہے گا۔ اکثر اس راستے پر فارم ہاؤس کے دوسرے ملازمین بھی آتے رہتے ہیں۔ وہ سبھی فرخ کے زرخرید ہیں اور سب مسلح ہوتے ہیں۔ وہ گاڑی کی تلاشی تو نہیں لیں گے لیکن اگر مجھے گاڑی میں دیکھ لیا تو گاڑی رکوا لیں گے۔ شاید اس حرامزادے نے اپنے آدمیوں کو یہ حکم دیا ہو کہ مجھے اس فارم ہاؤس کی حدود سے باہر نہیں جانا چاہیے۔"

شرافت تیز رفتاری سے گاڑی چلاتا رہا۔ وہ راستہ کچا لیکن ہموار تھا اس لیے تیز رفتاری کے باوجود ہمیں کوئی تکلیف نہیں ہو رہی تھی۔

مین روڈ پر آنے کے بعد بھی فضل الرحمٰن صاحب نے سیٹ پر بیٹھنے سے انکار کر دیا اور بولے۔ "جب تک ہماری گاڑی قومی شاہراہ پر ہے، مجھے یہیں رہنے دو۔"

شرافت علی نے جب گاڑی بلوچ کالونی کے پل پر چڑھائی تو ہمیں وہاں پولیس کی ایک وین نظر آئی۔ وہ لوگ معمول کے گشت پر تھے۔ شرافت نے گاڑی کی اسپیڈ کم کر دی۔

فضل الرحمٰن صاحب بھی اٹھ کر پچھلی نشست پر بیٹھ چکے تھے۔

پل سے نیچے اتر کے جب ہم آگے بڑھے تو ہمیں پولیس کی ایک اور موبائل وین دکھائی دی۔ اس کے سپاہی اور انچارج گاڑی سے باہر روڈ پر کھڑے تھے۔ ایک اے ایس آئی نے ہاتھ کے اشارے سے ہماری گاڑی رکوالی۔

"روکوں؟" شرافت علی نے پوچھا۔

"ہاں روکو۔" ارسلان نے درشت لہجے میں کہا۔ "تم کیا چاہتے ہو کہ پولیس ہمیں ان کاؤنٹر میں مار دے؟"

شرافت نے گاڑی سڑک کے کنارے روک دی۔

اے ایس آئی گاڑی کے نزدیک آیا تو ارسلان نے خالص امریکن لہجے میں پوچھا۔ "یس آفیسر! ہاؤ کین آئی ہیلپ یو؟"

"سر... اٹ... از... یوزول... چیکنگ... پلیز... اوپن... یور ڈکی۔" اس نے اٹک اٹک کر اپنا انگلش کا ذخیرہ الفاظ جمع کرتے ہوئے کہا۔

شرافت علی نے بیٹھے بیٹھے ڈکی کا لیور کھینچ لیا جو ڈرائیونگ سیٹ کے دروازے کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔

اے ایس آئی نے گاڑی کی ڈکی چیک کی پھر ہم لوگوں کا جائزہ لیا تو ارسلان نے کہا۔ "آفیسر! اگر آپ گاڑی کی تلاشی لینا چاہتے ہیں تو ہم لوگ گاڑی سے اتر جائیں؟"

"نو سر! آپ جا سکتے ہیں۔" وہ ڈکی یوں ہی کھلی چھوڑ کر چلا گیا۔

شرافت نے گاڑی آگے بڑھانا چاہی تو ارسلان نے کہا۔ "شرافت بھائی! گاڑی کی ڈکی بند کر دیں۔ وہ.... بے وقوف ڈکی کھلی چھوڑ گیا ہے اور آپ اب پسنجر سیٹ پر آ جائیں۔"

شرافت نے اتر کر ڈکی بند کی تو ارسلان اندر بیٹھے ہی بیٹھے ڈرائیونگ سیٹ پر کھسک گیا۔

ہماری گاڑی ایک مرتبہ پھر روانہ ہو گئی۔

"خرم!" ارسلان نے کہا۔ "اب ایسا کرو کہ غلام حسین کی آنکھوں پر پٹی باندھو اور اسے گاڑی کے پائے دان پر لٹا دو۔"

"لیکن کیوں... میں نے تو کوئی گڑبڑ نہیں کی۔"

ارسلان نے ہنس کر کہا۔ "گڑبڑ نہیں غلام حسین... یہ تمہاری سیفٹی کے لیے ہے۔"

پھر میں نے فضل الرحمٰن صاحب سے اپنا مفلر لے کر غلام حسین کی آنکھوں پر باندھا اور اسے گاڑی کے پائے دان پر لٹا دیا۔

ارسلان نے گاڑی کالے پل سے اتار کر فیز II کی طرف موڑ لی، پھر کچھ آگے جا کر یوٹرن لیا اور دوبارہ مین روڈ پر آ گیا پھر اس کی گاڑی کا رخ ڈیفنس ویو کی طرف ہو گیا۔ یہاں بھی کچھ دور چلنے کے بعد وہ ایک دوسرے راستے سے دوبارہ مین روڈ پر آ گیا اور گاڑی واپسی کا سفر طے کرنے لگی۔ اگلے سگنل سے ارسلان نے پھر گاڑی موڑ لی اور اسے فیز ٹو کی طرف لے گیا۔ اس مرتبہ اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور چار پانچ جگہوں سے بلامقصد چکر لگانے کے بعد وہ ایک بنگلے کے گیٹ پر رک گیا۔

پھر اس نے چیخ کر کہا۔ "جان محمد... شیر گل! دروازہ کھولو۔" یہ کہہ کر اس نے دو تین مرتبہ ہارن بھی دیا اور خود ہی اتر کر مین گیٹ کھول دیا۔

وہ دوبارہ اسٹیئرنگ پر بیٹھا اور گاڑی پورچ میں جا کر روک دی۔ پھر شرافت سے آہستگی سے بولا۔ "آپ جا کر مین گیٹ بند کر دیں اور اندر سے لاک کر دیجیے گا۔" یہ کہہ کر اس نے ایک چابی بھی شرافت کی طرف بڑھا دی۔

"شیر گل! اس مہمان کو گاڑی سے اتارو اور خیال رکھنا کہ کوئی کتا اس کے نزدیک نہ آئے۔" اس نے مجھ سے کہا کہ غلام حسین کو عقبی دروازے سے اندر لے آؤ تاکہ اسے یہ معلوم نہ ہو کہ وہ اس وقت گھر کے کس حصے میں ہے۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور بنگلے کے عقب میں پہنچ گیا۔ کچن کے دروازے کے پاس شرافت علی پہلے ہی موجود تھا۔ ہم نے غلام حسین کو کوریڈور میں دو تین چکر لگوائے پھر اسے اندرونی جانب لیے ہوئے ایک بیڈروم میں لے گئے۔

وہاں صرف ایک بیڈ اور دو تین ٹوٹی پھوٹی کرسیاں تھیں۔ ارسلان کافی عرصے بعد پاکستان آیا تھا۔ اس کی فیملی کے تمام ممبران بھی بیرون ملک میں مقیم تھے اس لیے اس کے بنگلے کی حالت ابتر ہو رہی تھی۔

"بس شیر گل... تم جاؤ اور جا کر باہر بیٹھو۔ یہ اگر بھاگنے کی کوشش کرے تو اسے بلا جھجک گولی مار دینا۔"

شرافت بھی وہاں سے چلا گیا۔ میں نے غلام حسین کی آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی کھول دی۔

وہ چندھیائی ہوئی نظروں سے اردگرد دیکھنے لگا۔ پھر وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "تم لوگوں نے مجھے کیوں روکا ہے؟"

"اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔" میں نے کہا۔ "جب فرخ کو معلوم ہو گا کہ فضل الرحمٰن صاحب وہاں سے غائب ہیں تو وہ سب سے پہلے تم ہی پر شبہ کرے گا اور سیدھا تمہارے گھر کا رخ کرے گا۔ ممکن ہے وہ مشتعل ہو کر تمہیں نقصان پہنچا دے۔ اس وقت فرخ کے علاوہ فضل الرحمٰن صاحب کے ٹھکانے سے صرف تم ہی واقف تھے یا پھر اس کے گارڈز... اب بولو کیا کہتے ہو... گھر چھوڑ آؤں یا کچھ دیر یہاں رہو گے؟"

"آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔ اگر ہو سکے تو میرے لیے.... چائے اور درد دور کرنے والی گولی بھجوا دیں۔ آپ کے آدمی نے بہت زور سے ٹکر ماری تھی۔ میری ناک میں ابھی تک شدید تکلیف ہے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ میری ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔"

"میں تمہارے لیے چائے اور گولی بھجواتا ہوں۔ اب تم آرام کرو۔ ہاں، میں تمہارے لیے کسی کمبل کا انتظام بھی

کرتا ہوں۔"

"مجھے یہاں کب تک رہنا ہوگا؟" غلام حسین نے پوچھا۔

"جب تک فرخ پکڑا نہیں جاتا۔" میں نے کہا۔

پھر میں اسے کمرے میں چھوڑ کر باہر آگیا۔ میں نے ارسلان سے کہہ کر اس کے لیے ایک کمبل بھجوا دیا تاکہ وہ سردی میں ٹھٹھر کر نہ مر جائے۔ میں نے غلام حسین کے کمرے کا دروازہ باہر سے بولٹ کر دیا تھا اور کمرے کا اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا۔ وہاں کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں سے وہ فرار ہو سکتا۔ نہ کمرے میں ایسی کوئی چیز تھی جو اسے فرار میں مدد دیتی۔

فضل الرحمٰن صاحب ارسلان کے بیڈ پر نیم دراز تھے۔ ان کی صحت مجھے پہلے سے بھی ابتر لگ رہی تھی۔

میں نے ان سے پوچھا۔ "سر! آپ بتائیے، آپ کے ساتھ کیا حالات پیش آئے۔"

☆☆☆

انہوں نے کہنا شروع کیا۔

"ان دنوں مجھے السر کی شکایت ہوگئی تھی۔ اس کی وجہ سے مجھے اکثر پیٹ میں تکلیف رہتی ہے۔ انہی دنوں میری بیوی مریم کا انتقال ہوا تھا۔ مجھے اس کی موت کا شدید صدمہ تھا۔ فرخ میری پہلی بیوی نفیسہ کا بیٹا ہے جو اس کی پیدائش کے دو سال بعد ہی انتقال کر گئی تھی۔ میں نے بعد میں مریم کو مسلمان کر کے اس سے شادی کر لی۔ وہ بہت دولت مند خاتون تھی۔ جتنی دولت اس وقت ہمارے کاروبار اور اکاؤنٹس میں ہے، اس میں سے ساٹھ فیصد مریم کی ہے۔ فرخ، مریم کو شروع ہی سے ناپسند کرتا تھا۔ حالانکہ اس کے کہنے پر ہی میں نے فرخ کو اعلیٰ تعلیم کے لیے پہلے لندن پھر امریکا بھجوایا تھا۔

میں نے پندرہ سال پہلے ایک بیمہ پالیسی لی تھی، وہ برٹش پاؤنڈز میں تھی اس وقت پاکستانی روپے میں اس کی مالیت تقریباً تیس کروڑ روپے کے لگ بھگ بنتی ہے۔

فرخ، مریم سے بدسلوکی کرتا تھا، اسے الٹے سیدھے جواب دیتا تھا۔ اس کے ساتھ گستاخی کرتا تھا۔ میں اکثر اسے اس بات پر ڈانٹتا ڈپٹتا رہتا تھا۔ وہ میرا بھی مخالف ہوگیا۔ پھر مریم کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت ہم لندن میں تھے۔ میں نے وہیں اس کی تدفین کر دی اور خود چند ماہ بعد پاکستان آگیا۔

یہاں آکر میں نے آفس کے تمام ورکرز اور منیجرز کا بغور جائزہ لیا۔ مجھے ان سب میں خرم ہی سب سے زیادہ مخلص اور دیانت دار نظر آیا۔ میں نے اسے ترقی دے کر پہلے سیلز پروموشن ڈپٹی منیجر بنایا پھر سیلز پروموشن منیجر بنا دیا۔ میرا ارادہ تھا کہ ایک ڈیڑھ سال بعد اسے ڈائریکٹر مارکیٹنگ بنا دوں گا اور اس سے کہوں گا کہ وہ ہماری کمپنی کے کچھ شیئرز خرید لے تاکہ اس کا نام بورڈ آف ڈائریکٹرز میں بھی آجائے۔

میری یہ گفتگو ایک دفعہ فرخ نے بھی سن لی۔ اسے خدشہ پیدا ہوگیا کہ شاید آہستہ آہستہ میں خرم کے حوالے پورا کاروبار کرنا چاہتا ہوں۔ سچ کہوں تو میرا ارادہ بھی یہی تھا۔

انہی دنوں مجھے السر کی شدید تکلیف ہوئی۔ فرخ نے کہا کہ یہاں آپ کا علاج ٹھیک طرح سے نہیں ہو رہا ہے، میں آپ کو لندن لے جاتا ہوں۔

میں بھی راضی ہوگیا۔ اپنے علاج سے زیادہ میں مریم کی قبر پر جانے کا خواہش مند تھا۔ میں نے کہا کہ غلام حسین بھی ہمارے ساتھ جائے گا۔

یہ سن کر فرخ کچھ پریشان ہوگیا اور بولا۔ "ڈیڈی! اس کی کیا ضرورت ہے؟ آپ کا خیال رکھنے کو میں ہوں نا... پھر وہاں تو آپ اسپتال میں رہیں گے، اسپتال کا عملہ ہوگا۔ آپ کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

"میں وہاں اسپتال میں نہیں بلکہ اپنے فلیٹ میں رہوں گا۔ میں اسی فلیٹ میں رہنے اور مریم کی قبر پر جانے کے ارادے سے تو لندن جا رہا ہوں ورنہ علاج تو پاکستان میں بھی ہو سکتا ہے۔"

لندن والے فلیٹ میں ہم دونوں شادی کے بعد رہے تھے۔ وہ فلیٹ ایک طرح سے ہماری محبت کی یادگار تھا۔

فرخ راضی ہوگیا کہ چلیں آپ کی خواہش ہے تو غلام حسین کو بھی لے چلیں گے۔

اس نے مجھے بتایا کہ ہم بائیس تاریخ کو لندن کے لیے روانہ ہوں گے۔

میں نے اپنے ہر کلائنٹ اور جاننے والے کو یہی بتایا کہ میں بائیس تاریخ کو لندن جا رہا ہوں۔ ممکن ہے مجھے واپسی میں ایک مہینا لگ جائے۔

یوں یہ بات پکی ہوگئی کہ میں بائیس تاریخ کو لندن جا رہا ہوں۔

بائیس تاریخ کی رات کو ہم لوگ ائیرپورٹ کے لیے روانہ ہوئے۔ گاڑی غلام حسین ڈرائیو کر رہا تھا۔ میں نے فرخ سے پوچھا۔ "گاڑی واپس کون لائے گا اور ڈرائیور کہاں ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "ڈرائیور کی طبیعت عین وقت پر خراب ہوگئی۔ میں نے اسے ہدایت کر دی ہے کہ وہ ائیرپورٹ کے پارکنگ لاٹ سے اپنی گاڑی لے آئے۔ میں پارکنگ لاٹ کی پرچی گاڑی کے ڈیش بورڈ میں چھوڑ دوں گا۔"

جلد ہی مجھے احساس ہوگیا کہ غلام حسین ائیرپورٹ نہیں بلکہ کہیں اور جا رہا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "غلام حسین! تم اس طرف کہاں جا رہے ہو؟"

"ہم اپنے فارم ہاؤس جا رہے ہیں ڈیڈی!" فرخ نے ہنس کر کہا۔

"فارم ہاؤس!" میں نے حیرت سے کہا۔ "وہاں جا کر میں کیا کروں گا؟"

"وہاں سے مجھے کچھ ضروری کاغذات لینا ہیں۔ میں پرسوں فارم ہاؤس پر گیا تھا تو وہاں کچھ ضروری کاغذات چھوڑ دیے تھے۔ ان پر آپ کے سائن بہت ضروری ہیں۔ یوں بھی ابھی فلائٹ میں چار گھنٹے ہیں۔"

"چار گھنٹے؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"جی ڈیڈی! میں نے ابھی کچھ دیر پہلے ائیرپورٹ سے معلوم کیا تھا تو وہاں سے معلوم ہوا کہ فلائٹ چار گھنٹے بعد روانہ ہوگی۔ ہم لوگ اس وقت تک گھر سے نکل چکے تھے۔ پہلے میں نے سوچا کہ واپس گھر چلا جاؤں لیکن پھر مجھے یاد آگیا کہ فارم ہاؤس پر میں نے ایک ضروری فائل چھوڑ دی ہے، اس پر آپ کے دستخط بھی لینا ہیں۔"

مجھے یاد آیا کہ فرخ فون پر کسی سے بات تو کر رہا تھا۔ اس میں چار گھنٹے کا بھی تذکرہ تھا۔ میں یہی سمجھا کہ وہ فلائٹ کی بات کر رہا ہے۔

فارم ہاؤس پہنچ کر اس نے ایک فائل نکالی اور میرے سامنے رکھ دی۔ وہ مختلف کمپنیوں کے خطوط تھے، کچھ آفس سے متعلق کاغذات تھے۔ میں پڑھے بغیر ان پر سائن کرتا رہا۔

سائن کر کے وہ فائل میں نے فرخ کے حوالے کی تو اس کا لہجہ بدل گیا اور وہ بولا۔ "اب آپ کبھی لندن نہیں جائیں گے۔ آپ نے آج کی تاریخ میں اپنا تمام کاروبار، جائیداد اور بنگلا میرے نام کر دیا ہے۔ اب میں مشہور کر دوں گا کہ لندن میں آپ کا انتقال ہوگیا اور آپ کی وصیت کے مطابق آپ کو وہیں دفن کر دیا گیا۔ اللہ اللہ خیر سلا!"

مجھے غلام حسین پر شدید غصہ آیا۔ وہ کمینہ فرخ کے پلان سے واقف تھا۔ اس آستین کے سانپ نے بھی مجھے کچھ نہیں بتایا۔

پھر فرخ نے میرا وہ وصیت نامہ نکالا جو میں نے آج ہی لکھا تھا اور اسے وکیل کو بھجوانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کی رو سے میں نے اپنے کاروبار کا ایک بورڈ آف ڈائریکٹر مقرر کر دیا تھا۔ فرخ اس فرم کا ایم ڈی تھا لیکن اس میں زیادہ شیئرز خرم کے تھے جو میں نے ہی اس کے نام سے خریدے تھے۔ میں جانتا تھا کہ خرم بعد میں خود ان جھمیلوں سے نمٹ لے گا اور فرخ کی جگہ ایم ڈی کی سیٹ سنبھالے گا۔ دو چار دن میں اسے میں اپنے اعتماد میں بھی لے لیتا لیکن مجھے اس کا موقع ہی نہیں ملا۔

پھر مجھے اس انشورنس پالیسی کا خیال آیا اور میں نے مسکرا کر کہا۔ "فرخ میاں! یہاں تم دھوکا کھا گئے۔ تمہیں شاید علم نہیں کہ میں نے کئی لاکھ پاؤنڈز کی انشورنس پالیسی خریدی تھی۔ وہ پالیسی مریم کے نام تھی۔ اب بدقسمتی سے اس کا انتقال ہوگیا۔ انشورنس کمپنی والوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کی پالیسی اب کس کے نام ہوگی۔ میں نے کہا کہ اب تک میں نے اس کا فیصلہ نہیں کیا ہے۔ جلد ہی آپ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دوں گا۔"

جب فرخ کو پالیسی کا علم ہوا تو اس میں حرص و ہوس پیدا ہوگئی۔ اگر وہ پالیسی کا لالچ نہ کرتا تو شاید اپنے اس پلان میں کامیاب رہتا۔ یہاں تو خرم سمیت سب لوگوں نے یقین کر لیا تھا کہ میں لندن میں مر چکا ہوں۔

بعد میں مجھے علم ہوا کہ غلام حسین، فرخ کو بلیک میل کر رہا ہے۔ اس نے کچھ ایسا چکر چلایا تھا کہ فرخ اسے قتل بھی نہیں کرا سکتا تھا۔ اس لیے وہ غلام حسین کے ہاتھوں بلیک میل ہوتا رہا۔

اور تم جانتے ہو کہ رمشا کون تھی؟ فضل الرحمٰن صاحب نے کہا۔ رمشا، غلام حسین کی بہن کی بیٹی تھی۔ غلام حسین کی بہن، ایک متوسط گھرانے کی عورت تھی لیکن اس نے اپنی بیٹی کو اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی۔ رمشا کے باپ کو بہت شوق تھا کہ اس کے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ غلام حسین نے فرخ کی نگرانی کے لیے رمشا کو آفس میں رکھوا دیا۔

وہاں اس کی ملاقات خرم سے ہوگئی۔ وہ خرم کی شخصیت سے متاثر ہوگئی۔ خرم بھی اسے پسند کرنے لگا۔ یہ دیکھ کر غلام حسین کو اپنا منصوبہ کمپل ہوتا نظر آیا کیونکہ اب وہ رمشا کے ذریعے میری پوری دولت اور کاروبار پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس نے رمشا کو سمجھایا کہ خرم تو اس فرم کا معمولی ملازم ہے۔ مالک تو فرخ ہے اور وہ بھی تمہیں پسند کرتا ہے۔ تم مالک کو چھوڑ کر ایک ملازم کے چکر میں پڑ رہی ہو؟

ماں کے برعکس رمشا بنیادی طور پر لالچی لڑکی تھی۔ وہ ماموں کی باتوں میں آگئی اور فرخ سے تعلقات بڑھا لیے۔ لیکن جلد ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ فرخ کے ساتھ اس کی بنے

گی نہیں۔ پھر نہ جانے کیسے اسے علم ہو گیا کہ میں ابھی زندہ ہوں۔ رمشا بھی فرخ کو بلیک میل کرنے لگی۔ اسی چکر میں وہ ماری گئی۔ فرخ نے میرے سامنے خود اعتراف کیا ہے کہ اس نے رمشا کو قتل کر کے خرم کو اس کیس میں پھنسا دیا ہے اور اب پھانسی یا عمر قید خرم کا مقدر ہے۔''

☆☆☆

دوسرے دن میں نے وقار سے رابطہ کیا اور اسے سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔ وقار نے میڈیا سے رابطہ کیا، پولیس کو انفارم کیا اور پھر پولیس نے فوری طور پر فرخ اور غلام حسین کو گرفتار کر لیا۔ میڈیا والوں نے ارسلان کے گھر دھاوا بول دیا۔ پھر میڈیا ہی کے ذریعے مجھے اپنی کھوئی ہوئی عزت دوبارہ مل گئی۔ فضل الرحمٰن صاحب دوبارہ آفس آنے لگے اور انہوں نے مجھے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شامل کر دیا۔

پھر جب انہیں معلوم ہوا کہ میں روبی کو پسند کرتا ہوں اور وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے تو وہ خود روبی کے گھر گئے اور اس کی والدہ سے اس کا رشتہ مانگ لیا۔ فوری طور پر ہماری منگنی ہو گئی۔

ارسلان نے ایک دن فضل الرحمٰن صاحب سے کہا۔

''انکل! آپ کو اپنے ایک بیٹے کا تو خیال ہے، دوسرے بیٹے کا بالکل خیال نہیں ہے۔''

''میں اسے عاق کر چکا ہوں۔ اب میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

وہ سمجھے کہ ارسلان فرخ کے بارے میں کہہ رہا ہے۔

''میں اپنی بات کر رہا ہوں انکل! کیا آپ مجھے اپنا بیٹا نہیں سمجھتے؟''

''ارے بھئی، تم تو میرے لیے بیٹوں سے بڑھ کر ہو۔ تمہاری اور خرم کی وجہ سے تو مجھے اس عقوبت خانے سے نجات ملی ہے۔''

''تو انکل... پھر میری شادی بھی کرا دیں۔'' ارسلان نے سنجیدگی سے کہا۔ وہ اس دوران میں فضل الرحمٰن صاحب سے خاصا بے تکلف ہو گیا تھا۔

''کوئی لڑکی نظر میں ہے یا لڑکی بھی میں ہی تلاش کروں؟'' فضل الرحمٰن صاحب نے ہنس کر پوچھا۔

''انکل! لڑکی تو ہے لیکن بات تو آپ کو ہی کرنا پڑے گی۔''

''بھئی، تم ہمیں لے چلو... ہم آج ہی بات کر لیتے ہیں۔''

''آپ تو لڑکی کے والد سے ابھی اور اسی وقت بات کر سکتے ہیں۔ وہ آپ ہی کے ایک ملازم شرافت علی کی بیٹی ربیعہ ہے۔''

فضل الرحمٰن صاحب نے شرافت علی سے بات کی تو وہ بھی فوراً مان گیا۔ اسے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ یوں میری اور ارسلان کی شادی ایک ہی دن طے ہو گئی۔

شادی کے بعد فضل الرحمٰن صاحب نے مجھے ایک بند لفافہ دکھایا اور کہا: ''یہ تمہاری شادی کا گفٹ ہے، جب تم ہنی مون سے واپس آؤ گے تو یہ میں تمہارے حوالے کر دوں گا۔''

ہم لوگ ہنی مون کے لیے سوئٹزرلینڈ چلے گئے۔

☆☆☆

مجھے ہنی مون سے لوٹے ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ ارسلان ربیعہ کو لے کر ایک مرتبہ پھر لندن چلا گیا تھا۔ فضل الرحمٰن صاحب میرے کمرے میں آئے تو میں کھڑا ہو گیا۔

''بیٹھو بیٹھو!'' انہوں نے خود بھی میرے سامنے والی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ان کے ہاتھ میں وہی لفافہ تھا جو وہ مجھے پہلے بھی شادی کے گفٹ کے طور پر دکھا چکے تھے۔

انہوں نے وہ لفافہ میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''خرم! میں نے کہا تھا نا کہ میں ہنی مون سے واپسی پر تمہیں شادی کا گفٹ دوں گا۔ یہ لو تمہاری شادی کا گفٹ! اس وقت کچھ کاغذی کارروائی باقی تھی ورنہ میں اسی وقت یہ لفافہ تمہارے حوالے کر دیتا۔''

میں نے وہ لفافہ کھول کر دیکھا تو میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

فضل الرحمٰن صاحب نے اپنی انشورنس پالیسی کا وارث مجھے نامزد کر دیا تھا۔ روپے کی قدر کے ساتھ ساتھ اب وہ پالیسی تقریباً پینتیس کروڑ کی ہو چکی تھی۔

میں نے دیکھا، ان کے چہرے پر پُرسکون اور شفیق مسکراہٹ تھی۔ میں اپنی سیٹ سے اٹھا اور بے اختیار ان کے سینے سے لگ گیا۔

اہم انتباہ

جملہ اشتہارات (جن کے مندرجات سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں ہوتا) نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ مشتہرین کے لیے ادارے کی معرفت آنے والی ڈاک ضائع کر دی جاتی ہے، قارئین رابطے یا معلومات کے لیے براہ راست مشتہرین سے رجوع کریں۔ اس ضمن میں کسی نقصان یا شکایت کی صورت میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی کوئی اخلاقی یا قانونی ذمے داری نہیں ہوگی۔